خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

PAKISTANIPOINT
WWW.PAKISTANIPOINT.COM

اکتوبر 2020ء

بانی
معراج رسول

صفحات 290
قیمت 100 روپے

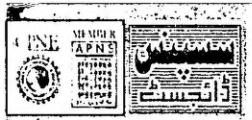

CPNE
MEMBER APNS
سسپنس ڈائجسٹ

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ یمنیٰ احمد
نائب مدیر اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

انشائیہ — 07
جون ایلیا

شعروشاعری میں اندازِ گفتگو اتحاد و اتفاق کا درس مرحوم کی یادگار تحریر

آپ کے خط — 08
مدیر اعلیٰ

سسپنس کی مجلس مشاورت و قارئین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

بے منزل مسافر — 12

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

منصوبہ ساز — 44

محبت سے ایک ہونے والے جوڑے کی الگ ہونے کی کارروائیوں کا دلچسپ احوال

وصیت — 59

کسی کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے والے وصیت کے دو حرفوں کا کمال

شہ زور — 68

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

بے نام — 99
امجد جاوید

بے نام رشتوں میں پناہ تلاش کرنے والے چند لوگوں کا قصہ

آتشیں سوال — 105

غربت میں لمحوں اور سکوں کی گنتی کرنے والے ایک معصوم کا آتشیں سوال

غور طلب — 110

سوتیلے رشتوں کے درمیان جائداد کی تقسیم اور پنپتے جرائم کی داستان

www.pakistanipoint.com

جلد 49 ° شمارہ 10 اکتوبر 2020 ° زرِ سالانہ 1500 روپے ° قیمت فی پرچا پاکستان 100 روپے °

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 ° فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

147 انگوٹھی کی تلاش
حسن عبداللہ
مرحوم ماں کی آخری خواہش کی
تکمیل کا حیرت انگیز ماجرا

156 محفلِ شعر و سخن
قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

159 منزل
[illegible]
منزل پر پہنچ کر بھی بے منزل
رہنے والے مسافروں کا قصہ

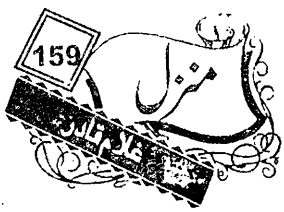

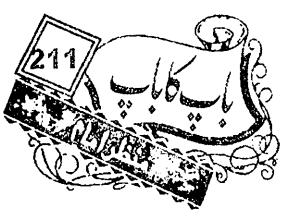

170 ساشا
[illegible]
طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرنے
والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

197 سنگ دل
[illegible]
اعتماد اور دل کو پتھر سمجھ کر توڑنے
والی بیوی کا عبرت ناک انجام

201 لازوال محبت
[illegible]
مسائل کا شکار ایک باوقار
لازوال محبت کا اچھوتا قصہ

211 باپ کا باپ
[illegible]
نہلے پہ دہلا کی عملی تفسیر......
اور مصنف کا دلچسپ انداز

215 حضرت جنید بغدادی
[illegible]
حصولِ علم کے لیے مسلسل محوِ سفر رہنے
والے اللہ کے نیک بندے کا زندگی نامہ

229 پس منظر
[illegible]
نفرتوں کے حصار میں زندگی سے
نبرد آزما ماں اور بیٹی کی عجیب روداد

246 زندان
[illegible]
محبت کی زنجیروں میں قید ایک خوبصورت رشتے
کے بکھرتے مان کی عبرت اثر داستان......

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ٭ مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ٭ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

ایجنٹ و قارئین متوجہ ہوں

تمام ایجنٹ حضرات/قارئین کرام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی طرف سے اب مندرجہ ذیل تاریخوں میں ڈائجسٹ جاری کیے جائیں گے۔

نئے شمارے اکتوبر 2020ء سے ان تاریخوں میں دستیاب ہوں گے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
ہر ماہ کی 20 تاریخ تک

ماہنامہ پاکیزہ لاہور
ہر ماہ کی 25 تاریخ تک

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
ہر ماہ کی 30 تاریخ تک

ماہنامہ سرگزشت کراچی
ہر ماہ کی 03 تاریخ تک

نوٹ: تمام ایجنٹ حضرات جاسوسی اور پاکیزہ کے آرڈر 10 تاریخ تک بتا دیں۔
سسپنس اور سرگزشت کے آرڈر 15 تاریخ تک بتا دیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: (021)-35804200، (021)-35895313

جون ایلیا

خواہش

مینھ کا جھکا لگا ہے۔ پرنالے بہہ رہے ہیں۔ برآمدے سے ایک لڑکے کی آواز آرہی ہے۔ ''چلنی میں مرچیں بادل کی کرچیں'' میری بھابی ام ریحانہ نے ایک کاغذ پر چہل قاف لکھ کر اور اس کے بالائی حصے میں دھاگا پرو کر ہار سنگھار کی ٹہنی میں لٹکا دیا ہے۔ بس اب کوئی دم میں بادل چھٹ جائیں گے۔

میرا ہمزاد بائیں دروازے سے داخل ہو کر میرے سامنے آن بیٹھا ہے۔ وہ بہت اداس دکھائی دیتا ہے۔ چند لمحے بعد وہ آپ ہی آپ ایک اداس محویت کے ساتھ خود کلامی کے انداز میں مصروف تکلم ہو جاتا ہے۔ ''سنا ہے کہ ایک ہی معاشرے میں ایک ہی زبان بولنے اور ایک ہی سا احساس رکھنے والے دو گروہ، دو جلالت مآب گروہ ایک دوسرے کا جیتا لہو بہا رہے ہیں۔ میں نے غلط کہا، جیتا لہو نہیں، یہ تو سات سو ساڑھے سات سو برس کا بگڑا ہوا لہو ہے۔ اردو معاشرے کی سیاست اور اردو تہذیب کی تاریخ کا بگڑا لہو۔ میں تو اب اپنے وجود سے گھن کھانے لگا ہوں۔ میں وقت کی ایک سڑاند ہوں۔

''میرا لمحہ ایک بہتان اور اتہام ہے۔ میرا لہو اونٹ رہا ہے اور وہ تلاملی ہے کہ بس! میں زندگی کے بہاؤ سے کٹ گیا ہوں اور ایک جوہڑ بن کے رہ گیا ہوں۔ مجھے ''جوہڑ'' پر یاد آیا کہ میرے بزرگ اپنی زبان کو کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان کہتے تھے۔ کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان۔ ہنہ، ہشت۔ ''اردو تہذیب کے بے چارے بزرگوں، عالی شان بزرگوں کے کچھ نام ہیں جو کسی ترتیب کے بغیر میرے ذہن میں آرہے ہیں۔ مسعود سعد سلمان لاہوری، امیر خسرو، بھگت کبیر، رحیمن (عبدالرحیم خان خاناں) شمس العشاق، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، قلی قطب شاہ، وجہی، فضلی، شاعر شاعراں ولی، ارسطوئے ہند خان آرزو، خدائے سخن میر، مرزا سودا، حیدر بخش حیدری، مصحفی، لبھو رام دیگر، خدائے سخن میر انیس، غالب علی کل غالب، پیرو مرشد حضرت بہادر شاہ ظفر، حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، علامہ اقبال، منشی پریم چند، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، جوش ملیح آبادی، فراق، جگر، یگانہ چنگیزی، منٹو، مولانا عبدالمجید سالک، ن م راشد، کرشن چندر...... یہ ہیں اردو تہذیب کے چند جاوداں نام۔ مگر یہ کیوں تھے؟ انہیں کیوں ہونا چاہیے تھا؟ ان کے نہ ہونے سے آخر کیا فرق پڑتا؟ ان کے ہونے سے آخر کیا فرق پڑا؟ جب کہ ان کے وارث ہم ہیں، بے ہودہ ترین ہم۔ مینھ تو کبھی کبھی برستا ہے، پرنالے تو کبھی کبھی بہتے ہیں، پر ان ناموں کے وارث ایک دوسرے کا لہو روز بہاتے ہیں۔ میں، تم اور ہم سب لہو بہنے اور بہانے کا لگاتار، موسم منانے اور خاک کو لہو سے رچانے میں ایسے طاق اور مشاق ہو گئے ہیں کہ بس۔

میں تمہاری زبان کی گرہ کھولنے والوں، اسے اس کے طور سے بولنے والوں اور اس ناشدنی کے جوہر تولنے والوں میں سب سے زیادہ ہیچ اور پوچ متنفس ہوں۔ پر مجھ ایسے لوگ، رائگاں لوگ تو سالہا سال سے ہونے کی طرح ہیں ہی نہیں۔ اور اس شہر، اس خود آزار اور خوں خوار شہر کا کوئی شہری ہونے کی طرح ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

میں اپنے حسابوں اس نحوست زدہ قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جس نے تمہیں، اردو تہذیب کے جواں فکر، نمایندو، وقت اور حالات کے ناز پروردہ نمایندو! تمہیں سیدھ کے سبھاؤ پر لانا چاہا۔ پر تم نے ہمیں اپنی ٹھوکروں پر رکھا۔ ہم تمہاری بد بخت زبان کے ادیب و شاعر تھے اس لیے تم نے ہمیں دھتکار دیا۔ کیا تاریخ یہ حقیقت محفوظ نہیں رکھے گی کہ دھتکارنے والے کون تھے اور دھتکارے جانے والے کون؟

تمہارے اور ہمارے بعض معتبر بزرگوں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ وہ خواب درست تھا یا نادرست، یہ ایک بے نتیجہ بحث کی بات ہے مگر بہرحال خواب دیکھا گیا تھا اور بڑی لگن سے دیکھا گیا تھا۔ جب اس خواب کی تعبیر مل گئی تو نو ظہور اور مقدس سیاست مداروں نے اس تعبیر کو خواب کے منہ پر دے مارا اور ارشاد فرمایا کہ یہ ملک انسانوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے نہیں، فرشتوں کی بہبود اور بہداشت کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

یہ داستان نہ مختصر ہے اور نہ خوشگوار۔ بہرحال پھر ایک نئی نسل برروئے کار آئی، تم برروئے کار آئے اور تم نے خیالوں کے بجائے حقیقت کی، حقیقی مسئلوں کی بات کی۔ اور یہ ایک خیر طلبی کی بات تھی مگر یہ خیر طلبی صرف اپنے گروہ سے تعلق رکھتی تھی اور یہیں سے سارا معاملہ چوپٹ ہو گیا۔ یہ طور صرف تمہی نے نہیں اختیار کیا، اس ملک کے ہر گروہ نے اختیار کیا۔

میں یہ خواہش رکھتا ہوں کہ اردو بولنے والے ہوں یا سندھی بولنے والے، بلوچ ہوں یا پختون، پنجابی ہوں یا سرائیکی یا دوسرے، یہ سب کے سب ان حساس اور باشعور نوجوانوں اور جوانوں کی ذمے داری ہیں جو لوگوں کا حق منوانے کی اہلیت اور استطاعت رکھتے ہوں اور جنہیں قبول عام اور قبول عوام کی سند حاصل ہو۔ سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی ایسا گروہ نہیں پایا جاتا جس کی جیب میں دوسرے گروہوں کے لیے بھی کوئی مژدہ نامہ ہو...... میں انسانوں کو زبانوں میں، علاقوں میں، عقیدوں میں اور نسلوں میں بانٹنا، ذہن اور عمل کا سب سے زیادہ گندہ اور گھناؤنا جرم خیال کرتا ہوں۔

میری حقیر ترین مگر عزیز ترین خواہش یہ ہے کہ نئی نسل کے مقتدر سیاست داں نئی توانائی، نئی پرماجرائی، نئے حوصلے اور نئے ولولے کے ساتھ اپنی صف بندی کریں، ایسی صف بندی جو اس ملک کے تمام عوام، محروم عوام کے لیے زندگی خیز اور دل انگیز امیدوں کا جاں پرور سرمایہ قرار پائے۔ یہی نہیں بلکہ مژدہ قرار پائی۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں جس طرح اب اداس ہوں، آیندہ بھی اداس رہوں گا مگر بھلا میں کون!''

یہ تھا میرے ہمزاد کا کلام جو تمام ہوا .... ☆☆☆

عزیزانِ من
السلام علیکم!

اکتوبر 2020ء کا سسپنس اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ یہ سال بھی اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ وقت گزرتے دیر نہیں لگتی لیکن..... وقت کو ہم نے کیسے گزارا یہ چھوٹا سا جملہ اپنے دامن میں بہت سے سوال سمیٹے ہوئے ہے۔ بے شمار دعاؤں اور احتیاطی تدابیر کے طفیل کورونا کی شدت میں کچھ کمی تو آئی تھی اور تعلیمی درسگاہوں کی رونقیں بحال ہونے کی نوید بھی ملی مگر مزید نئے کیسز کی وجہ سے شاید پھر سے درسگاہوں کی رونقیں فی الحال واپس ممکن نظر نہیں آتیں۔ کورونا کی ہی وجہ سے تاحال ہماری معیشت میں استحکام پیدا نہ ہوسکا جس کے باعث مہنگائی کے بڑھتے طوفان اور بیروزگاری کی آندھی نے عوام کو بے حال کیا ہوا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے سبب اسٹریٹ کرائمز میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ کسی بھی معاشرے کی تنزلی کا سب سے بھیانک پہلو ہے، نہ صرف یہ بلکہ کتنے ہی ملازمین کو جبراً اپنے روزگار سے ہٹادیا گیا جبکہ روزگار کے دیگر ذرائع بھی نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں اگرچہ مہنگائی کا مقابلہ کرنے کی مد میں جگہ جگہ یوٹیلٹی اسٹورز کا قیام ہوا مگر ان پر ضرورت کی زیادہ تر اشیا مفقود ہی ہوتی ہیں، بالخصوص چینی کی قیمتوں میں مزید اضافے کے باوجود چینی اور آٹے کی فراہمی میں مشکلات سے عوام مسلسل دوچار ہیں۔ دعا ہے کہ ہمیں جلد از جلد اس وبا بلکہ مسلسل بڑھتی ہوئی مہنگائی سے بھی چھٹکارا ملے، آمین اور ان نامساعد حالات میں اللہ سے اچھے کی امید رکھتے ہیں کہ خلوصِ نیت سے اگر کچھ اچھے اقدامات ہوجائیں تو انشاء اللہ جلد ہی مستحکم پاکستان کی صورت میں کچھ خوش حالی عوام کا بھی مقدر بن جائے گی۔ (آمین) اور جناب انہی دعاؤں کے سہارے اب ہم کچھ خبر لیتے ہیں اپنی پیاری محفل کی..... تو چلیے جناب.....

✠ شاہانہ سلطان کی تشریف آوری گلشنِ ظہور سے ہورہی ہے۔ ''ستمبر 2020ء کا شمارہ ملا مگر ٹائٹل دیکھ کر احساس ہوا کہ سرورق کی ہیروئن کو تھر کے علاقے سے مہمان بنایا گیا ہے اور کیسا چہرہ قحط والا اور باقی جسم..... اللہ معافی۔ نہ بھئی کوئی تناسب تو ہمیں نظر نہیں آیا، نہ یہ کلر کومبی نیشن آنکھوں کو اچھا لگا۔ بہت معذرت کے ساتھ، میری تنقید کو برداشت تو کرنا پڑے گا۔ اس بار آخری صفحات پر نشور ہادی فیصلے دل کے لے کر حاضر ہیں۔ کمال ہے کوئی مرد بھی اتنا تصورات کی دنیا میں غرق ہوسکتا ہے۔ کیا اسے بھی پہلے آئیڈیل بنانے اور ہر اک کو تلاشنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے؟ یا حیرت۔ جمال اتنا حقیقت پسند ہونے کے باوجود آئیڈیل کے لیے اتنا پاگل ہوا کہ اس کی خاطر کتنی بڑی بڑی قربانیاں دے ڈالیں۔ بہرحال کہانی تو کہانی ہوتی ہے اور ہمیں بھی کہانی کو کہانی کی طرح ہی لینا چاہیے۔ اس لیے بہرحال یہ ایک اچھی کاوش تھی۔ نشور ہادی نے بہت خوب لکھا۔ اس بار رضوانہ ساجد قومِ سبا لے کر آئیں اور چھا گئیں۔ بہت سی باتیں ہمارے علم میں نہیں تھیں مگر یہ تحریر پڑھ کر احساس ہوا کہ ہمیں بھی یہ سب کچھ معلوم ہونا چاہیے۔ بہت شکریہ رضوانہ ساجد صاحبہ۔ شاہ زین رضوان کی ''کاروبار'' نے بھی لطف دیا۔ عجیب کاروبار تھا انتقام لینے والا۔ اس بار ناہید سلطانہ اختر کا ''خدا اور امید'' کا دوسرا حصہ بہت لاجواب رہا۔ انسان اپنے کروفر اور گھمنڈ میں ڈوب کر کس طرح اللہ کی نافرمانی اور انسانوں سے ظلم وزیادتی کا مرتکب ہوتا ہے اور اسے احساس تک نہیں ہوپاتا کہ وہ کس قدر خسارے کا سودا کررہا ہے۔ سب سے مختصر اور بہترین کہانی ''سزائے موت'' ایم الیاس لے کر آئے اور چھا گئے۔ بھئی واہ! کیا خوب آئیڈیا ہے۔ اگر مجرم کو ایک بار سدھرنے کا موقع دے دیا جائے تو یقیناً اس کے بہت بہترین نتائج نکل سکتے ہیں۔ ساشا اور شہ زور دونوں سلسلے اپنے عروج کی طرف گامزن ہیں۔ بہت بہترین واقعات اور سسپنس لیے بڑھ رہے ہیں۔ ارے واہ! اس بار تو طاہر جاوید ایک مختصر مگر بہت بہترین پیغام رساں کہانی لے کر آئے ہیں۔ آپ کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ ہم کتنے بدنصیب لوگ ہیں کہ اللہ نے اتنے خوبصورت رشتوں سے نوازا اور ہم انہیں دھتکار دیتے ہیں۔ قدرت کے کارخانے میں سب کچھ ملتا ہے، اچھا بھی اور بُرا بھی۔ اب یہ اپنے اوپر منحصر ہے کہ ہم قدرت سے کیا چاہتے ہیں۔ محفلِ شعروسخن میں بھی تمام اشعار ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی بہت دنوں بعد آئی ہے۔ پلیز انہیں ہر ماہ شامل کیا کریں۔ ''بھوبل'' مرزا امجد بیگ نے بہت خوب لکھی۔ جرم سے پردہ چاک کرنا کوئی مرزا امجد بیگ سے سیکھے۔ غلام قادر کی ''زنجیر'' نے کوئی خاص لطف نہیں دیا..... بہت اچھی تھی۔ ''بے منزل مسافر'' نے تو اس بار کمال کردیا۔ بہت عرصے بعد تاریخی صفحات پر ایسی رومانٹک اسٹوری آئی ہے۔ ورنہ تو خشک واقعات اکثر دماغ میں بھی خشکی پیدا کردیتے ہیں۔ بہرحال اس بار سارا پرچہ ماشاء اللہ بہت

زبردست رہا۔ (بہت شکریہ محترمہ آپ کے دلچسپ تبصرے کا)۔''

✠ چودھری محمد رفیق مہر، گوجرانوالہ سے تشریف لارہے ہیں۔ ''ستمبر 2020ء کے بارے میں ستمبر کے مہینے کی یادوں کو پاکستانی عوام کیسے بھول سکتی ہے۔ سب سے پہلے رضوانہ ساجد کی قوم سبا پڑھی جو کافی دلچسپ تحریر تھی۔ شہ زور بھی سلسلے وار کہانی اسماء قادری کی بڑی زبردست جارہی ہے۔ اسماء قادری خواتین لکھاریوں میں دوسرے نمبر پر ہیں جن کی تحریریں میں پڑھتا ہوں۔ پہلے نمبر پر رضیہ بٹ جن کے دو ناول میں پڑھ چکا ہوں۔ عمر عبداللہ کی ساشا بھی ہے تو اچھی مگر کبھی تو ایسے لگتا ہے کوئی تاریخی کہانی ہے اور کبھی لگتا ہے کہ خزانے کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے گروہ ہیں جو ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں، اپنے مفادات کی خاطر۔ مرزا امجد بیگ صاحب کی بھوبل بھی پڑھ کر مزہ تو آیا مگر اینڈ پر یہ جان کر افسوس بھی ہوا کہ اصل قاتل قانون کی دسترس سے دور جا چکا تھا۔ آپ کے خط کی محفل میں پہنچے تو سبھی دوستوں کے تبصرے زبردست تھے۔ ریاض بٹ حسن ابدال سے میرا خط پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ محفل شعروسخن میں ریاض بٹ اور رانا کلیم کے اشعار پسند آئے۔ باقی ڈائجسٹ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

✠ ناہید یوسف کا مفصل خط اسلام آباد سے۔ ''ستمبر 2020ء کے شمارے پر تبصرے سے پہلے (اگر اجازت ہو تو......) کچھ اندرونی مسائل پر آواز اٹھانے کی جرأت کر رہے ہیں۔ ویسے تو ہمارے ملک میں مسائل اتنے ہیں کہ صفحات کم پڑ جائیں، بہرحال سرفہرست تو کورونا کا مسئلہ اہم ہے۔ ایک بار پھر صورت حال غیر یقینی لگ رہی ہے۔ بچوں کی پڑھائی کا پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا ہے مگر کیا کریں یہ کورونا عذاب کی طرح ہم پر مسلط ہوا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ ایک عذاب ہی ہے۔ ایسے میں ہمیں اپنے معاملات درست کرنے اور اللہ رب العزت کے حضور گڑگڑا کر توبہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم میں سے بہت سے لوگ اپنے کیے پر شرمندہ ہونے کے بجائے اپنے کارناموں پر فخر محسوس کرتے ہیں اور ظاہر ہے یہاں قانون کی کمزوری بھی ان کی مدد کرتی ہے۔ سو ہمیں اپنے گناہوں پر نادم و شرمسار ہونے کی ضرورت ہے۔ دعا ہے اللہ پاک ہمیں ہدایت دے۔ سب سے پہلے جون ایلیا صاحب (مرحوم) کی حکمت عملی دیکھی۔ اس کے بعد فہرست پر نگاہ ڈالی۔ تھوڑی سی مایوسی ہوئی کیونکہ ہم امید کر رہے تھے کہ شاید طاہر مغل کی کوئی 2 یا 4 اقساط کی کہانی پڑھنے کو ملے گی مگر یہ کیا؟ چند صفحات کی کہانی نظر آئی۔ خیر ''نگہبان'' کو جب پڑھنا شروع کیا تو اداسی دور ہو گئی۔ کیا شاندار کہانی تھی۔ زبردست۔ بشارت بیگم نے پوتے پوتی کی محبت میں بہت قربانی دی مگر افسوس کہ بیٹے اور بہو کو احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ طاہر مغل کا واقعی کوئی جواب نہیں۔ جو بھی لکھتے ہیں، کمال لکھتے ہیں۔ اچھوتا آئیڈیا...... لاجواب اندازِ بیاں۔ طاہر صاحب جیسے رائٹر ہمارا سرمایہ ہیں۔ اس دفعہ خلافِ عادت اسما صاحبہ کی شہ زور پڑھنا شروع کی۔ اسما جی نے واقعی اندازِ تحریر کو بدلا ہے۔ کہانی بہت تیز ہوتی جا رہی ہے۔ بہت اچھے۔ کہانی کو ایسے ہی ''فلو'' میں ہونا چاہیے۔ بشریٰ کی انتقاماً حکمتِ عملیاں ناکامی سے دوچار ہیں اور بے چاری کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ساتھ ہی اس کا ساتھ دینے کی پاداش میں بے چارہ اعجاز اپنی جان سے گیا۔ ادھر معاذ بھی خود کو بچانے کی کوششوں میں مصروف ہے مگر قسمت ہر بار اسے مجبور کر دیتی ہے۔ قسط بہت جاندار رہی۔ نشور ہادی کی ''فیصلے دل کے'' نہایت بورنگ کہانی لگی۔ نہ اس میں کوئی دلچسپی کا سامان تھا۔ زویا اعجاز کی بے منزل مسافر پڑھنا شروع کی تو کہانی کے ٹیمپو نے متوجہ کر لیا اور بس پھر کیا تھا، ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ ویسے تاریخی واقعات ذرا خشک تاثر لیے ہوتے ہیں، اس کو صحیح پیرائے اور اندازِ بیاں کی خوبصورتی ہی دلچسپ بناتی ہے۔ اس لیے رائٹر داد کا مستحق ہے۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی بے درد مسیحا بھی زبردست تھی۔ ڈاکٹر صاحب تو لکھتے ہی لاجواب ہیں۔ عمر عبداللہ کی ساشا بھی تیزی کی طرف گامزن ہونا شروع ہوئی ہے۔ امید ہے چار پانچ اقساط میں کہانی تیز رفتار ہو جائے گی۔ مرزا امجد بیگ کی بھوبل پڑھی۔ تھوڑی طوالت لگی ہمیں کہانی میں۔ بہرحال کہانی ٹھیک لگی۔ تنویر ریاض کی دھمکی نے واقعی اثر دکھایا اور ہم نے بھاگ کر ایک کپ چائے بنائی اور پڑھنے بیٹھ گئے۔ دو بھائیوں کی خونیں دشمنی اور ولی کوستا کی کوششیں...... آخرکار ولی نے اپنی ذمے داری پوری کر دی اور بھائیوں میں صلح کروا دی۔ کہانی اچھی تھی۔ ایم الیاس کی ''سزائے موت'' مختصر مگر ٹھیک تھی۔ ناہید سلطانہ کی خدا اور امید موجودہ حالات پر اچھی کہانی تھی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ شاہ زین رضوان کی کاروبار بھی لاجواب کہانی تھی۔ ہینک نے بیوی کی موت کا انتقام تو لے لیا مگر وہ خود ایک جال میں جا پھنسا۔ بہت اچھا آئیڈیا تھا کہانی کا۔ تھوڑی جدا جدا لگی کہانی۔ قوم سبا کے بارے میں پڑھا۔ جزاک اللہ رضوانہ ساجد۔ انجم فاروق ساحلی کی بیس سال ہلکی پھلکی کہانی تھی۔ اشعار بھی اچھے تھے۔ مجموعی طور پر رسالہ شاندار تھا۔''

✠ محمد انور ندیم کا گزشتہ شمارے پر تبصرہ، حویلی لکھا سے۔ ''اگست کا شمارہ دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ ہاتھوں پر مہندی لگائے، کانچ کی چوڑیاں پہنے ٹائٹل حسینہ بہت دلکش لگی۔ آپ کی محفل میں ریاض بٹ کرسی صدارت پر متمکن، ان کے تفصیلی تبصرے اسی

قابل ہیں کہ انہیں اولین جگہ دی جائے۔ انجم فاروق کا مختصر مگر جامع تبصرہ اچھا لگا۔ تدبیر رانا کو بزم سسپنس میں خوش آمدید! چودھری محمد رفیق مہر، بابر عباس، فضل عباس اور شاہانہ سلطان نے بھی خوب تبصرے قلمبند کیے۔ اس مرتبہ بہت کم تبصرے شاملِ اشاعت کیے گئے۔ شاید دیگر تبصرے بشمول ہمارے کورونا کی نذر ہوگئے۔ کیا ای میل کیے گئے تبصرے جگہ نہیں پاتے؟ (ضرور جگہ پاتے ہیں..... کیوں نہیں)۔ آج کل تو انٹرنیٹ کا دور دورہ ہے۔ نجم مودی کی ''پارٹ ٹائم'' ایک سبق آموز کہانی ہے۔ اسما قادری کے شاہکار ''شہ زور'' کا جواب نہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ مختصر کہانی ''لاٹری'' بدقسمت لوگوں کی نامردگی کا عبرت اثر قصہ ہے۔ غلام قادر نے ''طوائف زادی'' میں ہمارے معاشرتی حقائق بیان کیے ہیں۔ دراصل ان حقائق کو بیان کرنا بہت دل گردے کا کام ہے۔ طوائف کے ساتھ کچھ بھی کرلو، وہ طوائف ہی رہتی ہے۔ اس میں معاشرتی رویّے کا بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات کی ''لیلۃ الحساب'' قابلِ ستائش ہے۔ ملزم چاہے جس قدر شاطر ہو پھر بھی قانون اسے کٹہرے میں لاکھڑا کرتا ہے۔ شاہ زین رضوان نے ''وہ رات'' کیا خوب لکھی۔ بدیانتی، رشوت خوری اور طاقت کے بل پر خود کو منوانے کی روایت صرف مشرق میں ہی نہیں بلکہ مغرب میں بھی موجود ہے۔ ''محفلِ شعر و سخن'' میں سبھی اشعار لاجواب تھے۔ کترنیں اور کٹ پیس میں ریاض بٹ چھائے رہے۔ دو ایک جگہ ہماری بھی حاضری لگ گئی۔ ظاہر جاوید مغل کی لاجواب تحریر ''بدلتے راستے'' کا انجام خوب رہا۔ لورونا لاک ڈاؤن کے بعد اب زندگی دوبارہ معمول پر آتی جارہی ہے۔ معیشت کے ساتھ ساتھ شعبۂ تعلیم میں بہت نقصان ہوا۔ طلبہ کا بہت قیمتی وقت برباد ہوا۔ بہرحال دوبارہ بہتری کی امید کے ساتھ زندگی گامزن ہے۔ آخر میں قارئین کے لیے تجویز کہ روزانہ کم از کم ایک نئی چیز ضرور سیکھیں کیونکہ سیکھنے کا سلسلہ پوری عمر جاری رہنا چاہیے (بے شک..... آپ نے درست فرمایا۔ علم کی پیاس اور زندگی کی سانس..... ایک ساتھ شروع ہو کر ایک ساتھ ہی ختم ہوتی ہیں)۔''

✠ بابر عباس، فضل عباس کی گلیانہ روڈ کھاریاں سے آمد ''سر جی! سسپنس کا نیا شمارہ حیران کن طور پر خلافِ توقع 12 اگست کو اس طرح ملا جس طرح کسی غریب آدمی کو تنخواہ ملتی ہے اور وہ خوش ہو جاتا ہے۔ یہ ایک لمبی داستانِ غم ہے۔ کس طرح میں بازار گیا اور کس طرح جانِ تمنا کا دیدار ہوا۔ سرورق دیکھ کر ڈاکر صاحب بے حد یاد آئے۔ خدا ڈاکر صاحب کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے (آمین)۔ سرورق اس بار قدرے بہتر تھا۔ گہری سوچوں میں گم، راکی طرح دار اور خوبصورت ایجنٹ مایا دیوی سوچوں میں گم شاید یہی سوچ رہی ہے۔ سوری سر! میں فرہاد علی تیمور نہیں ہوں۔ ویسے بھی راسے کسی اچھے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ بس پاکستان زندہ باد، پاکستان پائندہ باد۔ سر جی! یہ ہے نیا پاکستان جو پاکستانی لفافہ کسی زمانے میں آٹھ روپے کا تھا نئے پاکستان میں اب وہی لفافہ 20 روپے کا ہے۔ 14 اگست کی خوشیوں کو دوبالا کرتا ہوں اور دل کو گرماتا ہوں۔ سسپنس ہاتھ آیا تو سرورق سے فارغ ہو کر فہرست کو سرسری سا چیک کرتے ہوئے اپنے جون ایلیا صاحب سے ہیلو ہائے کرتا ہوا محفل میں پہنچا تو آپ کی باتوں کو جو کہ بڑی پُرمغز تھیں، فرائی کر کے یوں کھایا جیسے کوئی بچہ ضد کر کے ٹافی کھاتا ہے۔ کرسیِ صدارت پر اپنے ریاض بٹ صاحب کو دیکھ کر اسی طرح دھچکا لگا جس طرح کسی کھٹارا گاڑی میں بیٹھ کر لگتا ہے (آپ اب گاڑی بدل لیں پھر جھٹکا نہیں لگے گا..... بہت لطف آئے گا)۔ تین چار سال بعد خط لکھا تھا، امید تھی آپ کچھ خیال کریں گے مگر وہی بات ہوئی..... تو خیال ہے کسی اور کا تجھے سوچتا کوئی اور ہے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب لاہور میں تو دریا ہے سمندر نہیں۔ آپ پھر ساحلی کہاں سے ہوگئے؟ اوا چھا اچھا جانے دیں۔ چھوڑیں، خدا آپ کی کشتی بھی ساحل سے لگائے (آمین)۔ قدیر رانا آف راولپنڈی صاحب، اپنی پیاری اور خوبصورت محفل میں آپ کو سینئر ہونے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سسپنس اور سرگزشت میں بہت فرق ہے، دھیان سے۔ چودھری محمد رفیق صاحب آپ بہت ذہین ہیں۔ شاہانہ سلطان صاحبہ طاہر بھائی گریٹ ہیں اور بہت خوبصورت لکھتے ہیں اور جب بھی لکھا خوب لکھا ہے۔ باقی ہر رائٹر کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ غلام قادر صاحب اپنے انداز کے دکھرے رائٹر ہیں۔ اب ذرا کہانیوں پر بات ہو جائے تو سر جی بات یوں بنی کہ سب سے پہلے میں نے اسما قادری صاحبہ کی شہ زور پڑھی۔ کہانی میں وہ اٹھان نہیں جو ہونی چاہیے۔ اسما جی کہانی کو ذرا تیز کریں۔ دوسرے نمبر پر عمر عبداللہ کی ساشا پڑھی۔ ابھی کہانی کھلی نہیں جب کھلے گی تو مزید بہتر ہو جائے گی، انشاء اللہ۔ بدلتے راستے یہی کہوں گا کہ نام ہی کافی ہے طاہر بھائی کا اپنا ایک اندازِ اسلوب ہے۔ وہ مٹی کو سونا بنانا جانتے ہیں۔ بدلتے راستے کا دی اینڈ اچھا تھا، پسند آیا۔ ویل ڈن طاہر بھائی۔ خدا آپ کو صحت دے (آمین)۔ رضوانہ ساجد کی عرق ریزی کا ثمر بری امام سرکار خوبصورت اندازِ تحریر کی وجہ سے پسند آیا۔ سر جی! آپ سے عرض کرنی تھی اولادِ نبی اولادِ علی کے بارے میں بھی کسی کو کچھ لکھنے کی زحمت دیں، مہربانی ہوگی۔ نئی نسل کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ اس بار حسام بٹ، ملک صفدر حیات کی ڈائری سے لیلۃ الحساب لے کر آئے۔ غلام قادر صاحب کی صاحب زادی..... اوہ سوری غلطی ہوگئی۔ میرا مطلب ہے طوائف زادی نے اتنا ہی متاثر کیا جتنا کہ آج کل بجلی کے بلوں نے عوام کو متاثر کیا ہے۔ غلام قادر صاحب

بہت زبردست۔ آپ کی طوائف زادی نے دل، گردے، پھیپھڑے سب کو متاثر کیا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر آپا کی تحریر کردہ ہر کہانی اپنے اندر ایک خوبصورتی لیے ہوتی ہے۔ ان کا اندازِ تحریر زبردست ہے۔ خدا اور امید کی بھلا کیا تعریف کروں۔ یہی کہوں گا ویل ڈن آپا۔ فہمی فردوس کی موجودہ حالات پر ایک خوبصورت پیاری تحریر وبا اپنے اندر بہت کچھ لیے ہوئے تھی۔ فہمی جی! ویسے آپ کی عمر کیا ہے؟ امجد اقبال کی ہلکے پھلکے انداز کی تحریر کردہ روزگار نے احمد اقبال صاحب کی یاد تازہ کر دی۔ محمود احمد مودی صاحب کی نصف بہتر نجمہ مودی نے پارٹ ٹائم کے ذریعے بے روزگار لوگوں کے لیے بہت اچھا طریقہ بتایا ہے۔ اتنا کہہ سکتا ہوں پارٹ ٹائم بس سو سو تھی۔ تنویر ریاض کی حسنِ کارکردگی، نعمان اسحاق کی لاٹری، شاہ زین رضوان کی وہ رات اور سید افتخار حسین کی اسمگلر سسپنس کے عین مطابق کہانیاں تھیں۔ سب نے مل کر سسپنس کو ایک خوبصورت اور معیاری ڈائجسٹ بنایا ہے اور آخر میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تاریخی کہانی کا ذکر کروں جس کا نام ہے تدبیر بنی تقدیر۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے خوبصورت انداز میں کہانی کو پیش کیا ہے۔ ویل ڈن ڈاکٹر صاحب۔''

ذاتی مصروفیات کی بنا پر محفل میں ذرا تاخیر سے شامل ہونے والے رازق بخش ذکی آہیر کی جلال پور پیر والا سے حاضری۔ ''ماہنامہ سسپنس ماہ مئی کورونا وبا کی نذر رہوا۔ جون جولائی کا جڑواں رسالہ ایک تو لیٹ ملا اور دوسرا یہ کہ میں اپنے بیٹے انجینئر غضنفر عباس مدنی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ شادی 18 جولائی کو ہوئی اور اس کے ساتھ ہی بچوں کے ان فرائض سے سرخرو ہو گیا (مبارک ہو جناب۔ ہماری مٹھائی کہاں ہے؟) اور اپنے مالک کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں۔ اس وجہ سے خطوط کی محفل میں غیر حاضر ہونا پڑا۔ بھائی ریاض بٹ نے لفظوں کی لاج رکھنے یعنی باقاعدگی سے آنے کا فرمایا تو عرض ہے کہ اگر کوئی بہت مصروفیت یا کوئی خاص مجبوری نہ ہوئی تو لاج ہوگی پوری۔ ورنہ پھر غیر حاضری ہوگی ضروری۔ البتہ سسپنس کا مطالعہ باقاعدگی سے ہوتا رہے گا، انشاء اللہ۔ اگست کی کہانیوں کے بارے میں یہ کہ پارٹ ٹائم کے شرجیل کا پہلے اپنی اور دوسروں کی جان بچانے والا طریقہ درست تھا پھر اس کا پارٹ ٹائم جاب کا سوچنا غلط تھا۔ طوائف زادی کی سوچ اور فیصلے قابلِ داد ہیں۔ ملک صفدر حیات کی یہ تحریر ''لیلۃ الحساب'' بھی ناقابلِ فراموش اور خوبصورت کہانی ہے۔ سلسلے وار کہانیاں شہ زور اور ساشا بہترین ہیں۔ ان کی اگلی قسطوں کا شدت سے انتظار ہے۔ بدلتے راستے کی ظالم فریال سے ظلم کا حساب ضرور ہونا چاہیے اور جب راستے بدلے تو سنبل اور عدیل اک دوجے کے ہوں گے اور ہم سسپنس کے ساتھ ہی سسپنس کے ہوں گے (بہت شکریہ)۔''

رمضان پاشا جون، جولائی اور اگست کے شماروں پر تبصرہ لیے حاضر ہیں۔ (لگتا ہے گاڑی نہیں مل رہی تھی اس لیے بہت دیر ہو گئی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ محفل تو آپ کی ہی ہے)۔ ''دو ماہ کا اکٹھے چھپا سسپنس مل گیا مگر ضخامت کم تھی۔ مئی کا پرچہ بھی غائب تھا۔ خیر وہ تو لاک ڈاؤن کھا گیا۔ تازہ شمارے کا سرورق حسبِ روایت شاندار تھا۔ چھوٹی کہانیوں میں ''سودا'' اچھی تھی بلکہ بہت اچھی تھی۔ ''فرار'' پسند نہیں آئی۔ بیگ صاحب کی ''ملی بھگت'' بھی دل کو لگی۔ ''شہ زور'' اور ''ساشا'' نے سسپنس میں اُدھم مچا رکھا ہے۔ مغل صاحب اپنے مخصوص موضوع پر ڈٹے ہوئے ہیں یعنی عشق و محبت۔ موصوف کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ خوب لطف آتا ہے۔ ''اونچی اڑان'' کا بھی جواب نہیں۔ ''ہوش مند'' کا اختتام بہت خوب تھا..... ''پراسرار ہمسفر'' اور ''خارِ زیست'' بھی لاجواب کہانیاں تھیں۔ ''عجوبہ'' ایک پُرلطف کہانی تھی، مزہ آ گیا۔ اشعار کی محفل میں تمام اشعار قابلِ داد تھے۔ باقی پرچہ زیرِ مطالعہ ہے۔ (اگست) لاک ڈاؤن ختم ہو گیا۔ کورونا کا زور بھی اسّی فیصد ٹوٹ گیا۔ تازہ شمارہ بھی مارکیٹ میں آ گیا، اب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ پتا نہیں لکھتا بھی ہے یا نہیں۔ اس بار سسپنس میں دو کہانیاں نہایت بور چھپی ہیں۔ ایک ''لاٹری'' دوسری ''وہ رات''۔ البتہ ''روزگار'' بہت اچھی تھی۔ ملک صفدر حیات کی کہانی حسبِ معمول اور حسبِ روایت بہت عمدہ تھی۔ موضوع بھی نیا، عنوان بھی نرالا تھا۔ بہت خوب حسام بٹ صاحب۔ اس بار دو عالمی وباؤں کو کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ کہانی کے اعتبار سے ''وبا'' باقاعدہ کہانی لگ رہی ہے۔ اس کا مرکزی خیال ہے جو ہے۔ دوسری کہانی ''خدا اور امید'' یہ تو سرے سے کہانی ہی نہ تھی۔ یہ تو ایک معلوماتی مضمون تھا۔ قلم کار نے کرداروں کے ذریعے کورونا کے بارے میں بہت مفید اور کارآمد باتیں ہم تک پہنچائیں۔ شکریہ ناہید۔ ''اسمگلر'' بھی قابلِ داد کہانی تھی مگر اس کا اختتام اچھا نہیں لگا۔ ''شہ زور'' اور ''ساشا'' نے کئی ماہ سے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ محفل شعر و سخن کے نوے فیصد اشعار دل کو بھائے۔ کترنیں بھی لاجواب تھیں۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ریحانہ خالد، شانگلہ ہل۔ سلمان عبداللہ، کراچی۔ سلیم خان، حیدرآباد۔ غلام فرید، سکھر۔ رانا احسان، کراچی۔ فرخندہ سلیم، سرگودھا۔ ریاض فیروز، میرپور خاص۔ محمد انور، کوئٹہ۔ امتیاز خان، حیدرآباد۔

مقناطیسی کشش کے باوجود کچھ لوگ مخالف سمت میں چلنے پر مجبور ہوتے ہیں مگر یہ کشش گاہے بگاہے اپنی جانب کھینچتی رہتی ہے... اور یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب کسی کو تمام ان دیکھی زنجیریں... توڑتے ہوئے اپنے مقصدِ حیات کے لیے اپنی مخصوص راہوں پر گامزن رہنا پڑتا ہے اور ایسی ہی آزمائش انہیں ثابت قدم ثابت کرتی ہے... وہ جو مشرق کا شہزادہ تھا جانے کیسے مغربی حسینہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا لیکن... بروقت آگاہی اور آزادی کی چاہ نے اس کے تمام مہکتے جذبوں کو کچل کر رکھ دیا... اپنی جاگیروں میں بسنے والے لوگوں کی فلاح کی خاطر اس نے اپنے دل کی جاگیر کو تباہ کر ڈالا کیونکہ... اس کے فرض کی پکار اور وطن دوستی کا تقاضا بھی یہی تھا... وہ جو پتھروں کی چٹانوں پر ایک خوب صورت ساز کی دھنوں سے کھیلتا رہتا تھا اب اس کے ہاتھوں میں تلوار نے جگہ لے لی تھی اور بالآخر مشرق و مغرب کے درمیان پروان چڑھنے والی محبت نے کسی خوب صورت لمحے کی تلاش میں اپنی اپنی سمتوں کا سفر اختیار کر لیا...

آدمی کی اسیری، با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے حیرت انگیز واقعات

دوسرا اور آخری حصہ

بے منزل مسافر

زویا اعجاز

عید کے بعد آنے والی پہلی جمعرات کو پالے خلافِ معمول صبح ہی گاؤں پہنچ گیا۔ والد کی قبر پر فاتحہ خوانی کے بعد وہ گھر میں داخل ہوا تو راجا بی کی کہیں کوئی آہٹ نہ تھی۔ پالے کو شدید پریشانی لاحق ہوگئی۔ مختصر سے گھر میں وہ کہیں نظر نہ آئی تو دیوانہ وار گھر سے باہر چلا آیا۔ کچھ لمحوں بعد وہ زلیخا کے ساتھ آتی دکھائی دی تو جان میں جان آگئی۔ اس کے چہرے پر نقاہت اور وجود ایک عجیب سی تھکاوٹ میں مبتلا محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا ہوگیا ہے ماں؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟ کہاں گئی تھیں؟'' پالے نے زلیخا کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''حکیم صاحب کے ہاں گئی تھی۔ آنکھوں میں کچا موتیا اتر آیا ہے۔ اسی کے لیے دوائی دی تھی انہوں نے۔'' ماں کے اس جواب پر پالے تڑپ گیا اور فوراً سہارا دیتے ہوئے اسے اندر لے آیا۔ زلیخا بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔

''خالہ خانم! میں چلتی ہوں یہاں سے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلوا لیجیے گا۔''

''میں ابھی مرا نہیں زندہ ہوں۔ اپنی ماں کی ضروریات پوری کرسکتا ہوں۔'' اس کے درشت جواب پر زلیخا کی آنکھیں جلنے لگیں۔

''پروردگار آپ کو سلامت ہی رکھے۔'' وہ دھیرے سے کہہ کر اپنے گھر کی طرف چل دی۔

''پالے! کیوں دل دکھاتا ہے اس یتیم بچی کا؟'' راجا بی نے اسے ٹوکا۔

''کیونکہ اسی یتیم کی وجہ سے میں یتیم ہوا تھا۔ میں اپنے والد کی وہ اذیت ناک موت ساری زندگی فراموش نہیں کرسکتا۔''

''نہ کیا کر ایسے! ایک وہی تو ہے جو دن رات سائے کی طرح میری خدمت میں لگی رہتی ہے۔'' راجا بی اس کے لہجے کی تلخی اور نفرت سے آزردہ ہوگئیں۔

''وہ سونے کی بھی بن جائے تو میں کبھی اسے معاف نہیں کروں گا۔'' پالے نے حتمی انداز میں کہا اور جرگے میں ہونے والے واقعات سنانے لگا۔ راجا بی کے نحیف چہرے پر خوشی، فخر اور جوش کے رنگ نمایاں تھے۔

''ارے! مجھے... یاد آیا۔ کل چھاؤنی سے ایک قاصد تمہارے لیے خط دے گیا تھا۔ کہہ رہا تھا بڑا ضروری پیغام ہے۔'' وہ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اٹھی اور طاق پر رکھی لالٹین کے نیچے دھرا بادامی لفافہ اسے تھما دیا۔ پالے نے بے تابی سے لفافہ کھول کر خط نکال لیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ایلن نے ملاقات کے لیے اسی کھنڈر نما مقام پر بلوایا تھا جہاں سے سرحدی چوکی کا آغاز ہوتا تھا۔ پالے نے پل بھر میں ہی اس سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔ طے شدہ وقت پر اس کھنڈر نما مقام پر پہنچ کر اسے ایلن پہلے سے ہی اپنی منتظر نظر آئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کی جانب چلی آئی تھی۔

''خود کو سنبھالو ایلن!'' اس کے سامنے وہ بھی اپنا ضبط اور رکھ رکھاؤ بھول جایا کرتا تھا۔

''تمہیں اپنے قریب پاکر سنبھلا ہی تو نہیں جاتا پالے!'' ایلن بے حد جذباتی ہو رہی تھی۔

''مجھے یہاں کیوں بلوایا ہے؟''

''پاپا تم سے دوستی کی جانب دوسرا قدم بڑھانا چاہتے ہیں۔'' وہ سنبھل کر بولی۔

''ہاں! ایک پیغام ملا تو تھا لیکن میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔''

''لیکن کیوں پالے؟ کیا تم صلح اور دوستی کا یہ سفر مزید طے نہیں کرنا چاہتے؟'' ایلن مچل گئی۔

''مجھے برطانوی حکومت پر بھروسا ہی نہیں۔ ان کا ہر ایک قدم ہماری غلامی اور تباہی سے ہی مشروط ہوتا ہے۔'' پالے نے دوٹوک جواب دیا۔

''مجھ پر تو بھروسا ہے نا؟ میری بات کا یقین کرو۔ پاپا تمہاری بہادری سے بہت متاثر ہیں۔ وہ تم لوگوں کی شخصی آزادی کی قدر کرتے ہیں۔ میری خاطر ایک بار ان سے مل لو۔'' ایلن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اچھا سوچوں گا۔ فی الحال کوئی اور بات کرو۔'' پالے نے اس کی قربت کی آنچ سے گھبرا کر کہا۔

''کوئی اور بات تو یہی ہے کہ اس روز تم انعام لیے بغیر واپس کیوں آگئے تھے؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''ان سرکاری وظیفوں اور انعامات کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔''

''ہماری چاہت کی ضرورت تو ہے نا پالے؟'' وہ اس کے مزید قریب ہوئی۔

''چاہت درمیان میں کیسے آگئی؟'' پالے نے بے اختیار اس کے کندھے تھام لیے۔

''چاہت تو ہر پل ہمارے درمیان موجود تھی۔ اب یہ نہ کہنا کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ تم جیسے بہادر اور غیرت مندوں کی زبان سے جھوٹ زیب نہیں

دیتے۔'' ایلن نے بھی اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کیں۔

''اس دوستی کو مزید کسی رشتے کا نام مت دو ایلن! یہ آگ ہمیں جلا کر خاک کردے گی۔''

''اسی آگ کی تپش میں انسان ایک نئی معراج پاتا ہے پالے! محبت تو بذاتِ خود جینے کی نئی راہیں سکھاتی ہے۔ مجھ سے جینے کا یہ حق نہ چھینو۔'' وہ اس سے لپٹ گئی۔ پالے کے لیے ضبط ناممکن ہوگیا۔ وہ جذبات کے اس تندرلے سے بچاؤ کے لیے اس کی آنکھوں کے بھنور سے نظریں چرا کر بولا۔

''کہاں ملاقات کرنی ہے میجر بارنس سے؟''

''جہاں تم چاہو گے وہ آجائیں گے۔'' ایلن اٹھلائی۔

''اسی سرحدی چوکی پر جمعے کو میرا انتظار کرنا۔ اکیلے ہی آئیں تو بہتر ہے ورنہ.....''

''فکر نہ کرو۔ وہ ایسی کوئی بھی بے وقوفی نہیں کریں گے۔'' اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ پالے مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ اس کے دل و دماغ میں شدید کشمکش برپا تھی۔

☆☆☆

میجر بارنس سے اس ملاقات کے لیے پالے نے اپنے ساتھیوں کو بھی اعتماد میں لے لیا۔ وہ برطانوی حکومت کے اس اقدام پر حیران ہی نہیں بلکہ کافی تحفظات کا شکار بھی تھے۔ برطانوی افسران کے سابقہ اعمال کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ ایک بھرپور چال بھی ہوسکتی تھی۔ اس لیے انہوں نے پالے کے ساتھ خود بھی جانے کا ارادہ کرلیا۔

جمعے کی صبح طلوع ہوتے ہی سرحدی لیوی پوسٹ پر یونین جیک کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ میجر بارنس اور گلباز خاں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار وہاں پہنچ چکے تھے۔ ان کے عقب میں میجر بارنس کے چند دیگر محافظ بھی تھے۔ مکمل فوجی یونیفارم میں ملبوس بارنس خاصی بے چینی کا شکار تھا۔ وہ بار بار دوربین آنکھوں سے لگا کر سامنے پہاڑیوں کا جائزہ لیتا اور پھر مایوس ہوکر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اسے شدید وہم لاحق ہونے لگا تھا کہ پالے خاں اس سے ملنے کے لیے نہیں آئے گا۔ کچھ وقت مزید بیتا تو یہ وہم یقین میں ڈھلنے لگا۔ ایلن اس کی یہ کیفیت بھانپ گئی تھی۔ اسے باپ کی مایوسی کے ساتھ گلباز کے چہرے پر چھانے والا اطمینان بھی واضح محسوس ہو رہا تھا۔ ہر گزرتا دن گلباز کے لیے اس کی نفرت اور ناپسندیدگی میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے ہم نے یہاں آکر اپنا وقت ہی برباد کیا ہے۔ پالے خاں کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ وہ ہمیں بے وقوف بنا کر ضرور ہماری اس حالت سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔'' بارنس نے اکتا کر کہا۔

''نہیں! وہ ایسا بالکل نہیں ہے پاپا! وہ اپنی زبان کا سچا اور وعدوں کا پکا ہے۔ اس نے اگر ہامی بھری ہے تو وہ یہاں ضرور آئے گا۔''

اسی اثنا میں انہیں سامنے پہاڑی پر چند گھڑسوار نظر آئے۔ ایلن نے ایک ہی نظر میں پالے کو پہچان لیا تھا۔

''اس نے تو اکیلے آنا تھا لیکن یہ اپنے ساتھ پوری برات ہی لے آیا ہے۔'' گلباز نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

''ہم بھی تو اپنے ساتھ محافظوں کا دستہ لائے ہیں۔ احتیاط اور تدبیر ہر انسان کا حق ہوتی ہے کیپٹن! لیکن تمہاری چھوٹی سی عقل میں یہ باتیں کبھی نہیں سمائیں گی۔'' ایلن نے طنز کیا۔

پالے خاں کی جانب سے ٹیلے پر سفید رومال لہرا دیا گیا تھا۔ میجر بارنس نے بھی جوابی طور پر صلح کی یہ نشانی فضا میں لہرائی اور پالے کو بلاخوف و خطر لیوی پوسٹ پر آنے کا مخصوص اشارہ کردیا۔ پالے نے جوابی طور پر دونوں اطراف کے محافظوں کو وہیں رہنے اور تنہا ملاقات کا عندیہ دیا۔ وہ باوقار انداز میں گھوڑا دوڑاتے ہوئے لیوی پوسٹ تک چلا آیا۔

''خوش آمدید پالے خاں!'' بارنس نے اس شخص کا گہری نظروں سے جائزہ لیا جو کسی آسیب کی طرح علاقے کے افسران کی سوچ پر سوار تھا۔

''خوش آمدید'' پالے نے بارنس کا بڑھا ہوا ہاتھ نظر انداز کردیا۔ یہ بارنس کے لیے واضح اشارہ تھا کہ وہ صلح کے مذاکرات سامنے آنے سے پہلے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا۔ پالے کا باوقار اور بے نیاز رویہ بارنس کو اُن چاہے دباؤ میں مبتلا کر رہا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ پتھروں سے تعمیر شدہ ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کمرے کے باہر بغلی کھڑکی کے پاس ایک اشتہار چسپاں تھا جس میں پالے خاں کو زندہ یا مُردہ گرفتار کروانے والے کے لیے دس ہزار روپے انعام کا اعلان تھا۔ پالے نے اشتہار کی جانب نگاہ غلط دوڑائی اور آگے بڑھ گیا۔ میجر بارنس خفت زدہ ہوگیا۔

''انتہائی احمق ہیں میرے آدمی۔ انہیں یہ بھی علم نہیں کہ دوستی کا ہاتھ بڑھانے سے پہلے دشمنی کی ایسی یادگاریں

ختم کرنی پڑتی ہیں۔'' پالے نے اس بات کا جواب متانت بھری خاموشی سے دیا۔

''بے فکر ہو کر اندر چلو خان! چاہو تو اپنی تسلی بھی کرلو۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔'' بارنس نے مسکرا کر کہا۔

''جب ہم اپنے وطن میں گھس بیٹھیوں کے ناک میں دم کر سکتے ہیں تو ایک کمرے میں کسی کی پوشیدگی سے نمٹنا کون سا مشکل کام ہے؟'' پالے نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ بارنس نے مسکراہٹ کا دامن تھاما اور کمرے کے وسط میں رکھی میز کے گرد کرسی کھینچتے ہوئے پالے کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تم ایک بہادر انسان ہو پالے خاں! جرگے میں تمہاری دلیری اور مہارت دیکھ کر میں تم سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ پھر میری بیٹی ایلین کو رہا کر کے تم نے مجھے خرید ہی لیا ہے۔''

''میں انسانوں کی خرید و فروخت نہیں کیا کرتا میجر! وہ احسان بہرحال تم نے میرے ساتھی کو رہا کر کے اتار دیا تھا۔ اب آگے کی بات کرو۔''

''ٹھیک ہے۔ احسان کا ناتا ختم ہوا لیکن تمہاری بہادری اور مہارت کا صلہ تو ابھی باقی ہے۔ بولو! کیا چاہیے تمہیں؟'' وہ فیاضی سے بولا۔

''آزادی کے سوا ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔''

''ہندوستان کو غلام بنانے سے ہمیں بھی کیا فائدہ ہے بھلا؟ ہم تو خود اس خطے کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ باقی ہندوستان میں بہت سے انقلابی اقدامات کیے ہیں۔ ہم اس علاقے کو بھی ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں۔'' وہ فخر سے کہنے لگا۔

''اچھا! اور یہ ترقی کیا ہوتی ہے ویسے؟'' پالے نے طنزاً پوچھا۔ بارنس جوشِ خطابت میں اس کا لہجہ نظر انداز کر گیا۔

''تمہیں علم ہی ہوگا کہ ہمارے آنے سے پہلے ہندوستان کس قدر غریب تھا۔ ڈاک کا نظام اچھا تھا نہ ہی شفاخانے۔ اسکول اور کالجز کا تو کوئی تصور ہی نہ تھا۔ ہندوستانی کچی سڑکوں پر دھول اڑاتے پھرتے تھے۔ اب ہم نے کس قدر سہولیات دے رکھی ہیں یہاں۔ پختہ سڑکیں، ریل گاڑیاں، بہترین اسکول، کالج، شفاخانے یہ سب برطانوی حکومت کی ہی تو مہربانی ہے۔'' بارنس نے فخر سے بتایا۔

''ان مہربانیوں کی وجہ بھی تو بتا دیں۔'' پالے نے ایک بار پھر طنز کیا۔

''ہم تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ اخلاقیات میں ہم سے بڑھ کر کوئی بھی نہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہر انسان کو یکساں حقوق فراہم کریں۔''

''اس سے جوابی طور پر آپ کو کیا ملے گا بھلا؟''

''برطانوی قوم کے وقار میں اضافہ ہوگا۔'' اس نے گردن اکڑائی۔

''بہت خوب! تو بتایئے میرے علاقے کے لیے کیا کرنا چاہتی ہے برطانوی حکومت؟'' اس نے سینے پر ہاتھ باندھے۔

''میں نے دیکھا ہے کہ یہاں لوگ معمولی بیماریوں پر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ ہم اسپتال بنوا کر دیں گے عوام کو۔'' میجر نے پہلا پتا پھینکا۔

''اور؟''

''یہ علاقہ تعلیم یافتہ نہیں ہے۔ جہالت نے انہیں ترقی اور ایجادات کی دوڑ میں پیچھے رکھا ہوا ہے۔ ہم اسکول اور کالج بنوا کر مقامی لوگوں کو ترقی اور خوشحالی دینا چاہتے ہیں۔''

''اچھا اور؟'' پالے نے متاثر ہونے کی اداکاری کی۔

''اس علاقے کے لوگ پہاڑی راستوں پر بڑی مشکل سے سفر کرتے ہیں۔ کئی بار تو حادثات میں جان سے ہاتھ بھی دھو بیٹھتے ہیں۔ ہم یہاں سڑکوں کا جال بچھا کر ذرائع آمد و رفت میں بہتری لائیں گے۔''

''اور؟'' پالے کے تیسری بار بھی اسی انداز و سوال پر بارنس جھنجلا گیا۔

''اور بھی بہت سے کام ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم لوگوں کے سامنے آتے رہیں گے۔''

''اگر برطانوی حکومت ہمارے لیے اتنا کچھ سوچ کر بیٹھی ہوئی ہے تو پھر کام کا آغاز کیوں نہیں کرتی؟ اس بات چیت کا کیا مقصد ہے؟'' پالے نے معصومیت سے پوچھا۔

''مقصد تو بہرحال ہے نا!'' بارنس نے مسکراتے ہوئے سمجھایا۔ ''جب تمہارا تعاون ملے گا تو ہی یہ سلسلہ شروع ہو سکے گا۔ تمہارا گاؤں غیر محفوظ مقام پر ہے۔ پڑوسی ملک یا دیگر علاقوں سے کوئی شرپسند ہم پر حملہ نہ کر دے اس لیے ہم گاؤں کے باہر پہلے ایک چھاؤنی بنائیں گے تاکہ کسی قسم کا کوئی خطرہ نہ رہے۔'' بارنس نے اپنا دوسرا پتا ظاہر کیا۔

''اس کے علاوہ اور کوئی شرط؟'' پالے کی آنکھوں میں سختی ابھرنے لگی۔

''بس ایک چھوٹی سی شرط ہوگی کہ ہماری ان خدمات کے بدلے میں تم لوگوں کو اپنے ہتھیار ہمارے حوالے کرنے ہوں گے تاکہ اگر کوئی ان سہولیات سے انکار بھی کرے تو ہمارے لیے کوئی خطرہ نہ بن سکے۔'' بارنس کے اس جواب

پر پالے کی آنکھوں میں مزید سختی پیدا ہوگئی۔ اس نے لمحاتی توقف کے بعد کمر کی پیٹی میں اڑسا ہوا پستول نکال کر بارنس کے سامنے کردیا۔ ردِعمل کے طور پر بارنس نے بھی گھبرا کر فوراً اپنا پستول نکالا اور پالے پر تان دیا۔

''ارے! آپ گھبرا کیوں رہے ہیں میجر صاحب؟ میں نے تو یہ پستول آپ کے حوالے کرنے کے لیے نکالا ہے۔ لیجیے نا!'' اس نے نرمی سے کہتے ہوئے ہتھیار بارنس کو تھما دیا جو اس لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہوتی صورتِ حال پر اعصابی انتشار کا شکار ہونے لگا تھا۔

''میں پالے خاں ہوں میجر بارنس! آپ کی قوم کے لیے ایک ڈراؤنا خواب۔ میں نے اب تک سیکڑوں انگریزوں کا تنہا مقابلہ کیا ہے۔ جرگے میں ہزاروں لوگوں کے سامنے اپنی بہادری اور ہمت کا لوہا منوایا ہے لیکن اس وقت میں مکمل طور پر آپ کے رحم و کرم پر ہوں، نہتا ہوں۔ آپ چاہیں تو ایک ہی گولی سے میرا کام تمام بھی کرسکتے ہیں۔ اب میں آپ کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھا دینے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کرسکتا۔'' پالے نے دونوں ہاتھ سر کے عقب میں کرلیے۔ میجر بارنس کے لیے اس کی ہر ایک حرکت ناقابلِ فہم تھی۔ اس کا تجربہ اور فراست کہیں ماند پڑ گئے تھے۔ اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل پالے نے ہاتھ عقب سے بلند کیے اور بارنس کے ہاتھوں سے دونوں ہتھیار اچک لیے۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور فوراً ہاتھ اٹھا دیے۔

''یہ دغابازی ہے پالے خاں!''

''نہیں! میں تو صرف یہ سمجھا رہا ہوں کہ نہتا ہونے کا اصل مطلب کیا ہے۔ اب آپ میرے رحم و کرم پر ہیں۔ بتائیے؟ کیا مجھ سے کوئی شرط منوائی جاسکتی ہے؟''

''نہیں!'' وہ بدقت بولا۔

''اور اب اگر میں چاہوں تو آپ سے کچھ بھی منوا سکتا ہوں۔'' اس کے سوال پر میجر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو ہمیں اتنا بے وقوف کیوں سمجھ رکھا ہے میجر صاحب؟ اگر صلح اور مذاکرات کرنے ہیں تو برابری کی سطح پر کرو۔ ہم ہتھیار آپ کے حوالے کرکے سدھائے ہوئے جانور تو کبھی بھی نہیں بنیں گے۔'' پالے نے بارنس کا پستول اسے تھمایا اور اپنا ہتھیار دوبارہ پیٹی میں اڑس لیا۔

''ہم تو تم سے دوستی کا پیغام لے کر آئے تھے پالے! لیکن تم بھروسا کرنے کے لیے تیار ہی نہیں۔'' ہتھیار تھامتے ہی بارنس کا اعتماد دوبارہ بحال ہوگیا تھا۔

''میجر صاحب! ہم اَن پڑھ غریب اور غیر ترقی یافتہ ضرور ہیں لیکن تم لوگوں نے بے وقوفی کی اضافی خوبی شاید اپنی طرف سے خود ہی شامل کرلی ہے۔ کیا ہمیں علم نہیں کہ یہ سڑکیں ہماری بھلائی کے لیے نہیں بلکہ انگریز ملٹری اور توپ خانے کے لیے بنائی جارہی ہیں۔ چھاؤنی قائم کرکے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے جانے کی منصوبہ بندیاں پہلے سے ہی تیار کی جاچکی ہوں گی۔ ہم اپنے ہتھیار تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ شفاخانے اور اسکول بنوانے ہیں تو اگلی بات کرو۔'' پالے نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی تیاری کی۔

''سڑکوں اور چھاؤنی کے بغیر ان کی تعمیر کیسے ہوسکتی ہے بھلا؟'' بارنس نے اکتا کر کہا۔

''تو پھر ہماری ہمدردی اور اپنے قومی وقار کا یہ ڈھونگ بند کرو میجر! ہمت ہے تو صاف کہو کہ چند عیسائی اسکولوں اور شفاخانوں کے بدلے میں ہماری آزادی کا سودا کرنے آئے ہو۔ اتنی ہی سستی سمجھ رکھی ہے کیا آزادی؟'' وہ کرسی گھسیٹ کر جانے کے لیے تیار نظر آرہا تھا۔

''تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' بارنس نے مایوسی سے پوچھا۔ پالے نے اس کی مکار آنکھوں میں جھانکا اور کوئی جواب دینے کے بجائے آگے بڑھ کر زمین پر گرا اشتہار اٹھا کر بغور دیکھنے لگا۔ اس کے بعد دیوار پر اپنے خنجر کا سہارا دیے وہ اشتہار دوبارہ چسپاں کیا اور سر جھری سے بولا۔

''میری زندہ یا مُردہ گرفتاری پر انعام دوگنا کردو میجر! میں اپنی اور قوم کی آزادی چند عمارتوں کے عوض فروخت نہیں کروں گا۔'' پالے کمرے سے باہر آتے ہی عجلت میں اپنے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ اس کے تیور اور میجر بارنس کے چہرے پر چھائی ہیبت نے محافظوں کو ہتھیار اٹھانے پر مجبور کردیا لیکن بارنس نے خفیف اشارے سے انہیں روک دیا۔ پالے کسی کی بھی جانب دیکھے بغیر واپس اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا ہوا پاپا؟ پالے اس طرح واپس کیوں جارہا ہے؟'' ایلن بے تابی سے بولی۔

''ہماری بات نہیں بن سکی۔'' بارنس نے مختصراً جواب دیا۔

''لیکن کیوں پاپا؟ وہ اسی لیے تو آیا تھا یہاں۔'' ایلن اب بھی بے یقین تھی۔

''اس کی بہادری تو جرگے میں دیکھ لی تھی۔ آج یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک چالاک سیاستدان بھی ہے۔ اسے صلح کے لیے ہماری شرائط منظور نہیں ہیں۔''

''مجھے تو پہلے ہی علم تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ وہ کبھی بھی ہمارے راستے پر نہیں آئے گا۔ اسے صرف طاقت کے ذریعے ہی جھکایا جاسکتا ہے۔'' گلباز نے بھی زہر اگلا۔

''اگر ایسا کرنا ہوتا تو میں بہت پہلے یہ سب کر چکا ہوتا۔ میں طاقت سے نہیں دماغ سے یہ کھیل جیتنا چاہتا ہوں۔'' بارنس نے اپنے گھوڑے کا رخ چھاؤنی کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ ایلن گم صم سے انداز میں ٹیلے کی جانب دیکھتی رہی جس کے عقب میں پالے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ غائب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

پالے خاں اور میجر بارنس کے ان نا کام مذاکرات پر ایلن بہت افسردہ تھی۔ وہ ہر لمحے اس بات کے لیے کوشاں رہتی تھی کہ کسی طرح اپنی زندگی کے ان دونوں اہم ترین مردوں کے فاصلے ختم کر دے۔ مشرق اور مغرب کی وسعتوں اور دو متضاد انتہاؤں کو سمیٹ کر وہ اپنی نئی دنیا سجانا چاہتی تھی۔ اس نے ایک خصوصی کارندے کے ذریعے پالے کو ملاقات کا پیغام بھجوا دیا اور آزاد علاقے کی سرحد کے پاس ایک ٹیلے کی اوٹ میں اس کا انتظار کرنے لگی۔ وقت جوں جوں گزرتا گیا ایلن کی بے تابی میں مزید اضافہ ہونے لگا۔ پالے کی آمد شام چھ بجے ممکن ہو سکی۔

''اتنی دیر کیوں کر دی؟ میں تو سمجھی تھی کہ اب تم نہیں آؤ گے۔'' ایلن نے اسے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

''تم نے بلوایا تھا۔ انکار کیسے کرتا بھلا؟'' پالے نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''ویسے اب کیا کہنا چاہتے ہیں تمہارے پاپا؟ کیا کوئی نئی شرائط سامنے لا رہے ہیں؟''

''ضروری تو نہیں پالے کہ میں ایسے ہی کسی کام کے لیے تمہیں پیغام بھجواؤں۔ میرا اپنا بھی تو دل چاہ سکتا ہے تم سے ملنے کے لیے۔''

''دل کو سمجھاؤ ایلن! تمہارے والد اس میل جول کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔'' پالے نے سنبھل کر کہا۔ وہ اس کی آنکھوں کے سحر سے آزاد ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

''وہ مجھے منع کر ہی نہیں سکتے۔ میں اپنے فیصلوں میں آزاد اور خود مختار ہوں۔''

''یہ آزادی اور خود مختاری تمہارے معاشرے اور روایات کا حصہ ضرور ہوں گی لیکن کسی بھی معاشرے میں والدین اپنی اولاد کو دشمن سے ملنے کی اجازت نہیں دیا کرتے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''کس نے کہہ دیا کہ تم دشمن ہو؟ میں تو تمہیں دوست سمجھتی ہوں..... بہت قریبی دوست۔ میرے دل کا ایک خصوصی مکین۔'' ایلن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پالے کو اپنے ساتھیوں اور کچھ روز پہلے کیے گئے احتیاط کے فیصلے ہوا میں اڑتے محسوس ہونے لگے۔ وہ ایک بے اختیاری کے عالم میں اسے ٹیلے سے قدرے فاصلے پر موجود کھنڈر نما عمارت میں لے آیا۔ اس خستہ حال عمارت کی دیواریں اور فرش اتنا وقت گزر جانے کے باوجود بہت خوبصورت اور پُرشکوہ تھے۔

''یہ ضرور کسی ہندوستانی رئیس کا محل ہوگا۔'' ایلن خوابناک انداز میں بولی۔

''ہاں! کسی بڑے خان نے اپنی محبوبہ کے لیے یہاں محل بنوایا تھا۔ اب تو اس بات کو بھی صدیاں بیت چکیں۔'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''ہندوستانی خواتین بہت خوش قسمت ہوتی ہیں۔ انہیں اس قدر ٹوٹ کر چاہا جاتا ہے۔ تاج محل جیسا حسین شاہکار وجود میں آجاتا ہے۔ تاج محل دیکھ کر تو موت بھی حسین لگنے لگتی ہے۔'' ایلن کے انداز میں ایک روایتی مشرقی عورت کی تڑپ پا کر پالے مسکرا اٹھا۔

''تمہاری یہ خواہش تو بہت آرام سے پوری ہو سکتی ہے۔ ایک کیا کئی تاج محل بن سکتے ہیں تمہارے لیے۔''

''میری خواہش پر ہنس رہے ہو نا تم؟'' وہ آزردہ ہوئی۔

''نہیں! تم میجر بارنس جیسے اعلیٰ انگریز افسر کی بیٹی ہو۔ وہ چاہیں تو تمہاری شادی کسی بھی شاہی خاندان میں کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں اب بھی سیکڑوں راجا، مہاراجا اور والیِ ریاست موجود ہیں جو انگریزوں کے ایک اشارے پر اپنی جان دے سکتے ہیں۔ تاج محل جیسی کوئی یادگار بنوانا تو ان کے لیے بہت معمولی بات ہے۔''

''مجھے خوشامدیوں اور منافقوں سے سخت نفرت ہے پالے! میرے وجود کا حقدار وہ شخص ہوگا جو اپنی جانبازی اور دلیری سے مجھے اپنی کنیز بنا لے۔''

''پھر تو تاج محل یا ایسی کوئی بھی عمارت بھول ہی جاؤ! جانباز زلفوں کے قیدی نہیں بنا کرتے۔ ان کے مقصد اور خواب بہر حال کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔'' پالے اس کی گفتگو سے بے خود ہونے لگا۔

''مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سچی، بے لوث اور غیرت مند محبت ہی میرے لیے سب سے قیمتی تحفہ ہوگی۔ میرا محبوب اس دنیا کا منفرد ترین شخص ہے۔ اس کے سامنے دنیا کا ہر رئیس، نواب، راجا یا مہاراجا ہیچ ہے۔ صرف وہی میرے جسم و جاں کا مالک بنے گا۔ میں کسی اور کے نام کے

ساتھ اپنا نام نہیں جوڑوں گی۔'' اس نے واضح اظہارِ محبت کیا۔ پالے کے جذبات بھی مرتعش ہو گئے۔

''سچ کہوں ایلن! میں نے تاج محل تو نہیں دیکھا لیکن ایک بات دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تم سے زیادہ حسین کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے دور جا کر تمہارے پاس آنے کی گھڑیاں گنتا ہوں۔'' وہ بے بسی سے بولا۔ ایلن اس کی کیفیت بھانپ کر خاموشی سے اس سے لپٹ گئی۔ زبان خاموش ہوئی تو لمس چاہت کا اظہار کرنے لگے۔ وہ یک جان دو قالب بن چکے تھے۔ کچھ لمحے سرور و کیف میں بیت گئے پھر پالے نے اسے نرمی سے دور کر دیا۔ ایلن کی نظروں میں تشنگی، طلب اور کئی سوال تھے۔

''یہ راستہ ہمارے لیے نہیں بنا ایلن! اس رشتے اور محبت کا کوئی انجام نہیں ہے۔'' وہ نگاہیں پھیر کر بولا۔

''محبت انجام کی پروا کب کیا کرتی ہے پالے؟ ایسی محبت تو صرف مصلحت ہوتی ہے۔'' اس کی تشنگی تڑپ بننے لگی۔

''میں نے تم سے پہلے اپنے وطن اور مقصد سے بھی عشق کیا ہے۔ یہ رشتہ کہیں مجھے کمزور نہ کر دے۔'' وہ مضطرب تھا۔

''میری محبت اتنی خود غرض نہیں ہے کہ تمہیں کمزور بنا دے۔ میں تمہاری طاقت بنوں گی۔'' وہ اس سے لپٹ گئی۔ لمس ایک بار پھر چاہت اور یقین کا اظہار بن گیا۔

''مجھے ابھی جانا ہوگا ورنہ میرے ساتھی خوامخواہ شکوک میں مبتلا ہوں گے۔'' وہ الجھی ہوئی سانسوں میں بولا۔

''پھر کب ملنے آؤ گے؟ اب تم سے دوری برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔'' ایلن بے بسی سے کہنے لگی۔

''ابھی ایک دو روز تو میں میلے اور خریداری میں مصروف رہوں گا۔ اس کے بعد اگلے جمعے کو یہیں اسی وقت ملیں گے۔''

''میلا تو ہر دفعہ ہی دیکھتے ہو گے خان! اچھا ہے کہ اگر تمہارے ساتھی اس میلے میں مصروف ہوں گے تو تم مجھ سے ملنے چلے آنا۔'' ایلن افسردگی سے بولی۔

''یہ کوئی عام میلا نہیں ہے ایلن! ہم یہاں دو روز میں سال بھر کی خریداری کر لیا کرتے ہیں۔ میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔'' اس نے نرمی سے سمجھایا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ ایلن کے جذبات کی شدت اسے بھی تند ریلے میں بہائے لے جا رہی تھی۔

''اچھا! تو پھر میں بھی ضرور آؤں گی دیکھنے۔'' وہ پُرجوش ہوئی۔

''ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ فرنگی افسر کی بیٹی سمجھ کر کوئی شرپسند تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔'' پالے کو تشویش ہونے لگی۔

''تم ہو گے نا وہاں میری حفاظت کے لیے۔ تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔'' وہ ایک بار پھر اپنی چاہت کا عملی اظہار کرنے لگی۔ خود سپردگی کے ان لمحات میں پالے جیسے بیدار مغز شخص کو بھی یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ گلباز خاں کافی دیر سے ٹیلے کی ایک محفوظ اوٹ میں کھڑا ان کے منصوبوں اور خوابوں کا عینی شاہد بن رہا ہے۔ وہ دونوں بے خبری میں محبت کے کئی مراحل طے کرتے چلے گئے۔

☆☆☆

میلے کی رونقیں اپنے شباب پر تھیں۔ شور ایسا کہ کانوں پڑی آواز بھی سنائی نہ دے رہی تھی۔ اناج، گھی، کپڑے، زیورات کی دکانوں پر بے پناہ چہل پہل تھی۔ دوسرے حصے میں مویشیوں کا بازار سجا تھا۔ صحت مند جانور مختلف علاقوں سے لا کر نمائش اور فروخت کے لیے رکھے گئے تھے۔ میلے میں ترتیب اور تنظیم کا خصوصی بندوبست تھا۔ بھینسیں، بکریاں، بھیڑیں، اونٹ اور گھوڑے مخصوص مقامات پر کھڑے کیے گئے تھے۔ خریداران کے جسم اور دانت ٹٹول کر بڑے سبھاؤ سے مول تول کر رہے تھے۔ گھوڑوں کے ذخیرے میں ایک سیاہ رنگ کا صحت مند گھوڑا اکثریت کا دل جیت چکا تھا لیکن قیمت سن کر خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ پالے بھی یہی جانور خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے معائنے کے لیے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ دوسری جانب سے ایک دودھیا نسوانی ہاتھ اس سے پہلے ہی گھوڑے کی گردن تھپتھپانے لگا۔

''اس جانور پر پہلے میں نے ہاتھ رکھا ہے۔ یہ میرا ہوا۔''

''میں منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں۔'' پالے نے تن کر کہا اور اگلے ہی لمحے سامنے دکھائی دینے والے منظر نے اسے ہکا بکا کر دیا۔ ایلن مقامی لباس اور زیورات میں ملبوس اسی انداز میں بال بنائے اس کے سامنے موجود تھی۔ پالے کی آنکھوں میں حیرت، پہلے ستائش اور پھر نرم گرم جذبوں میں ڈھل گئی۔

''یہ گھوڑا میں ہی خرید کر کسی خاص شخص کو تحفہ پیش کروں گی۔'' ایلن نے فوری طور پر ڈھیروں نوٹ گھوڑے کے مالک کو تھما دیے۔ پالے اس کی ہر ایک ادا پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ گھوڑے کی لگام تھامے اس کے ساتھ چلتی ایلن بہت

پُراعتماد اور سرشار دکھائی دے رہی تھی۔

''تم یہاں کیسے چلی آئیں؟ میجر بارنس نے تمہیں روکا نہیں کیا؟'' پالے حیران تھا۔

''پاپا کسی سرکاری کام کے سلسلے میں کوئٹہ گئے ہیں۔ وہاں سے شاید ہرنائی بھی جائیں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ مصلحت اور احتیاط کے فیصلے ایک بار پھر ہوا ہو گئے تھے۔ پالے حسبِ سابق اسے سامنے دیکھ کر سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ محبت و چاہت کی اس بارش میں بھیگتے ان بے خبروں کو آج بھی گلباز خاں کی کینہ توز نظروں کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

گلباز ان دونوں کے کھیل اور رشتے کی نوعیت سے مکمل طور پر آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ صرف ایک خاص مقصد اور اپنے کسی شبہے کی تصدیق کے لیے انہیں ڈھیل دے رہا تھا۔ ان باتوں سے قطع نظر ان کی باہمی قربت' محبت کے طے شدہ مراحل اور انداز و اطوار اسے سنگا کر خاکستر کر دیتے۔ اس کے دل و دماغ میں بھی صنفِ نازک کے ساتھ اور جسمانی قربت کی طلب چنگھاڑنے لگتی۔ جذبات کے اس مقام پر زلیخا کی یاد شدت سے حملہ آور ہو جاتی۔ سوئے اتفاق زلیخا اس وقت بھی اسی میلے میں موجود بساطن کی ایک دکان پر افسردہ سی صورت بنائے کھڑی تھی۔ اس افسردگی کی وجہ ایک ہار تھا جس کی قیمت دکاندار بیس روپے سے ایک پیسا بھی کم نہیں کر رہا تھا۔ دکھی دل سے ہار واپس کرتی زلیخا کو یکدم ایک آواز نے چونکا دیا۔

''ہار تم سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہے زلیخا! کہو تو تم پر وار کر پھینک دوں؟'' گلباز نے بڑے جذبے سے اسے مخاطب کیا۔ زلیخا کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

''کس خوشی اور کس رشتے سے؟'' وہ تنک گئی۔

''بچپن کا ساتھی سمجھ کر ہی لے لو تحفہ! ایک وہ پالے ہے جس کی محبوبہ نے اسے گھوڑے کا تحفہ دیا ہے اور اس نے ہنسی خوشی قبول بھی کر لیا ہے۔'' گلباز نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''تم نے پھر بے سروپا کہانیاں بنانا شروع کر دی ہیں۔ پالے کی زندگی میں کوئی لڑکی آ ہی نہیں سکتی۔'' وہ پُراعتماد تھی۔

''آ سکتی نہیں..... آ چکی ہے۔ فرنگی لڑکی ایلن سے اس کا رشتہ بہت مضبوط ہو گیا ہے۔ تم تو خوامخواہ اس کی بیمار ماں کی آیا بنی پھر رہی ہو۔ ادھر ایلن نے اسے اپنے دام میں گرفتار کر لیا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ تمہارا جانباز انقلابی جوابی تحفے میں اسے خریداری نہ کروا رہا ہوا تو اس بھرے میلے میں مجھے جتنی چاہے جوتیاں مار لینا۔'' گلباز اسے لیے آگے بڑھا۔ چند قدم دور جاتے ہی زلیخا کو مقامی لباس میں گل رنگ ہوتی ایلن اور اس کے لیے چوڑیاں پسند کرتا پالے نظر آ گیا۔ یہ منظر کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ زلیخا کے دل کو کسی نے بڑی زور سے مٹھی میں بھینچ لیا۔

''کہو! اب بھی یقین آیا کہ نہیں؟ ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو اس سے بھی زیادہ.....''

''مجھے تمہارا تحفہ قبول ہے گلباز!'' زلیخا نے اس کی بات مکمل ہونے ہی نہ دی۔ گلباز پر یہ سنتے ہی شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اسے لیے دوبارہ بساطی کی دکان پر گیا اور ہار خرید لیا۔

''اب تحفہ دے ہی رہے ہو تو پہنا بھی دو مجھے۔'' زلیخا نے مسکرا کر کہا۔ وہ ترچھی نظروں سے پالے اور ایلن کو اسی طرف آتے دیکھ چکی تھی۔ گلباز تذبذب میں آ گیا۔

''زہے نصیب! میں تو جانے کب سے اس موقع کے انتظار میں تھا۔'' اس نے زلیخا کو ہار پہنا دیا۔ مرمریں گردن کا لمس اس کے جذبات میں مزید تپش پیدا کر رہا تھا۔

''یہاں کیا کر رہی ہو تم؟'' زلیخا کی توقع کے عین مطابق پالے وہیں چلا آیا تھا۔ اس نے پالے کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دکاندار سے ایک آئینہ لیا اور اٹھلاتے ہوئے اپنی گردن کا جائزہ لینے لگی۔

''بہت شاندار تحفہ ہے۔ شکریہ گلباز خاناں! دیکھو کتنا جچ رہا ہے مجھ پر۔'' اس کا ہر ایک لفظ پالے کے غضب میں اضافہ کر رہا تھا۔ گلباز کی نظروں میں دکھائی دینے والی غلاظت نے اس کا دماغ الٹا دیا تھا۔ پالے نے ایک جھٹکے سے ہار دبوچا اور اس کی لڑیاں توڑ کر زمین پر پٹخ دیں۔ ایلن بھی اس کے ردِعمل پر حیران تھی۔

''تم واپس جاؤ! مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا ہے۔'' پالے نے ایلن سے کہا اور زلیخا کو کڑی نظروں سے گھورتا ہوا ایک جانب بڑھ گیا۔ ایلن اس کے پیچھے لپکی تھی۔ زلیخا کے لبوں پر کھلی مسکراہٹ بے اختیار قہقہوں میں تبدیل ہو گئی۔ اسے پالے کے اس ردِعمل اور غصے سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ دل میں یکدم ہی آس کی کونپل پھوٹی کہ وہ اس کے آس پاس کسی غیر مرد کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ اسی حسد اور غصے میں اس نے ایلن کو بھی واپس بھیج دیا تھا۔ اس اہمیت پر زلیخا خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

''عجیب جنگلی اور اجڈ ہے پالے! اور تمہارا بھی

جواب نہیں جو اس نقصان پر ہنستی چلی جارہی ہو۔'' گلباز جھنجلا کر بولا اور زمین پر بکھرے موتی چننے لگا۔

''تمہیں یہ بات کبھی سمجھ نہیں آئے گی۔'' زلیخا جھوم کر بولی اور اسے وہیں چھوڑ کر واپس چل دی۔ گلباز کی پُرتپش نگاہیں اس کا دور تک تعاقب کرتی رہیں۔ اس کی برداشت اور ظرف کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ ذہن میں فوری طور پر ایک منصوبہ کلبلانے لگا۔

اس رات زلیخا راجا بی کو کھانا اور دوا پلانے کے بعد گھر لوٹی تو بے حد مطمئن تھی۔ اس نے گھر آتے ہی حسب معمول دوپٹا الگنی پر اتار کر کپڑے تبدیل کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے برق رفتاری سے میز پر رکھی ماچس اٹھا کر لالٹین جلائی اور گلباز کو وہاں موجود پا کر بھڑک اٹھی۔

''تم میری اجازت کے بغیر یہاں کیا کرنے آئے ہو؟'' وہ چلائی۔

''تمہیں یہ تحفہ دینے آیا تھا۔ میلے میں تو اس وحشی انسان نے سب کچھ تلپٹ کر دیا تھا۔'' گلباز نے چاندی کا ایک اور ہار اس کی طرف بڑھایا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے یہ ہار اس کی گردن کی زینت بنانا چاہتا تھا۔

''خبردار جو پالے کے خلاف ایک لفظ بھی بولا۔ اس وقت کی بات اور تھی لیکن اب میں تمہارے اس تحفے پر تھوکوں گی بھی نہیں۔ نکل جاؤ میرے گھر سے!'' اس کی نفرت نے گلباز کو طیش زدہ کر دیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ زلیخا نے اسے پالے کے خلاف استعمال کیا ہے۔ احساسِ توہین اور نفس کی سرکشی سے مغلوب ہو کر وہ اس کی طرف لپکا۔ زلیخا نے بلا تاخیر بستر سے دوسری جانب چھلانگ لگائی اور دیوار پر لٹکی پرانی بندوق اس پر تان لی۔

''میرے گھر سے نکل جا گلباز! ورنہ خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ تیرا قصہ یہیں تمام کر دوں گی۔'' اس کی آواز میں شیرنی جیسی گرج تھی۔ آنکھوں سے نکلتی چنگاریوں نے گلباز کے قدم وہیں روک دیے۔ اس لمحے وہ جان گیا تھا کہ زلیخا گولی چلانے یا اسے شدید نقصان پہنچانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرے گی۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا واپس مڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی زلیخا نے دروازے کا کواڑ بند کیا اور ہانپتے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے یہ سب کچھ ایک خوفناک خواب محسوس ہو رہا تھا۔ احساسِ بے بسی، خوف اور کرب آنسوؤں کی صورت میں آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس لمحے اسے اپنا وجود بے حد تنہا اور کسی تنکے سے بھی ہلکا لگ رہا تھا۔

''کیوں بابا؟ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آخر کس چیز کی کمی تھی ہماری زندگی میں؟ اپنا ایمان اور دوست کی زندگی کا سودا کر کے مجھے بھی تاعمر ایک سزا میں مبتلا کر گئے ہو۔'' وہ زار و قطار رونے لگی۔ راجا بی نے اس کی تنہائی کے پیشِ نظر کئی بار اپنے پاس منتقل ہو جانے کا اصرار بھی کیا تھا لیکن زلیخا کا دل اس بات کے لیے بھی مائل نہ ہوتا۔ اس کی خدمت گزاری کا جذبہ اپنی جگہ بجا لیکن وہ مستقبل میں کسی کو بھی یہ کہنے یا سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ زلیخا کی خدمات اور محبت پالے تک رسائی کا بہانہ تھی۔ اس کے علاوہ شادی سے قبل وہاں منتقلی کا مطلب لوگوں کو اپنے کردار پر انگلیاں اٹھانے کا بھرپور موقع فراہم کرنا تھا۔

''یا اللہ! میں کیا کروں؟ یہ کس آزمائش میں ڈال دیا ہے تُو نے مجھے؟'' وہ بلکنے لگی۔ اس لمحے پالے کا تصور ذہن میں آیا تو وہ اس کے نادیدہ ہیولے سے مخاطب ہو بیٹھی۔

''اپنی اس نفرت کا خاتمہ کر دو پالے خاں! تمہاری یہ بے رخی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھ بے سہارا پر رحم کھا لو۔ مجھے اپنے نام کا تحفظ دے کر معتبر کر دو۔ میں ساری زندگی تم سے کچھ بھی طلب نہیں کروں گی۔ مجھے اپنا لو۔ اپنے نام اور چار دیواری کا تحفظ دے دو۔'' وہ رات بھر آنسو بہاتی یہی التجائیں کرتی رہی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز پر ماحول کافی تناؤ زدہ تھا۔ بارنس اپنے سرکاری معاملات نمٹا کر واپس آچکا تھا۔ اسے ایلین کی ... خودسری اور میلے میں جانے کی اطلاع بھی موصول ہوئی تھی اور اب ناشتے کے لیے آئی ایلین کی کلائی میں چوڑیاں دیکھ کر اس کی پیشانی کے بل مزید گہرے ہو گئے۔

''تم کس کی اجازت سے میلے میں گئی تھیں ایلین؟'' بارنس نے حتی الامکان نرمی سے بات کا آغاز کیا۔

''میں ایک بالغ اور خودمختار لڑکی ہوں پاپا! اب گھر سے آنے جانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں رہی مجھے۔'' اس نے وزیرعلی کے لائے گئے ناشتے سے انصاف کرنا شروع کیا۔ وزیر مؤدبانہ انداز میں ان کے سامنے برتن رکھتا اچٹتی نگاہ سے بارنس کے غصیلے تاثرات دیکھ لیتا۔ ایسے حالات میں وہ اپنا کام جلد از جلد نمٹانے کی کوشش کیا کرتا تھا تاکہ ان افسران کی نجی زندگی کا غبار ملازمین کی کسی معمولی سی غلطی کی جانب بھی منتقل نہ ہو جائے۔

''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے تم نے وہاں جا کر؟'' بارنس کا غصہ دھیرے دھیرے

بڑھ رہا تھا۔

”میری حفاظت مضبوط ہاتھوں میں تھی۔ پالے خاں مجھے کبھی کسی سے بھی نقصان پہنچنے نہیں دے گا۔“ ایلن کے اس جواب اور سرکش تیوروں نے بارنس کی پیشانی شکن آلود کردی۔ اسی لمحے اسے اندازہ ہوا کہ معاملات اس کے تصور سے کہیں زیادہ الجھ چکے ہیں۔ ایلن کی پالے میں دلچسپی انسان دوستی کی حدود سے کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ دوطرفہ خاموشی کا یہ وقفہ کچھ طویل ہوا تو وزیر علی نے کھنکھارتے ہوئے گلباز کی آمد کی اطلاع دی۔

”باہر ہی بٹھاؤ اسے! مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ ایلن نے چڑ کر کہا۔

”کیپٹن کو اندر بلواؤ۔ میں اپنے پیشہ ورانہ معاملات میں آزاد اور خودمختار ہوں۔“ بارنس نے اسی کے الفاظ دہرائے۔ ایلن نے نفرت سے سر جھٹکا اور ناشتا ادھورا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بارنس اس کی ہر ایک حرکت گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل سے مصلحت پسندی کے سارے جذبات ہوا ہو چکے تھے۔ بیٹی کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ روایتی اور جابر افسران جیسی تندی محسوس کرنے لگا تھا۔

”گلباز خاں! تم نے کچھ روز پہلے جس شبہے کا اظہار کیا تھا اس کے بارے میں کوئی معلومات ملی یا نہیں؟“

”میں اس معاملے پر کام کر رہا ہوں۔ نتیجہ مکمل ثبوتوں کے ساتھ آپ کے سامنے ہوگا۔“ گلباز نے معنی خیزی سے کہا۔

”نو! لیکن پالے خاں کو اس کی اوقات یاد دلانے کا وقت آگیا ہے۔ وہ لاتوں کا بھوت ہے باتوں سے نہیں مانے گا۔“

”حضور! میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ اس سے مذاکرات بھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ بچپن سے جانتا ہوں میں اسے۔“ گلباز مکاری سے بولا۔

”مجھے اس علاقے پر کسی بھی قیمت پر قبضہ چاہیے۔ یہ علاقے اب آزاد نہیں رہنے دوں گا میں۔“ بارنس کی زخمی انا اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔

”اس کا بھی ایک حل میرے پاس موجود ہے حضور! گھی سیدھی انگلی سے نکل آئے تو ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت؟“ اس نے خباثت جتائی۔ ”خان قادر خاں کے نام سے تو واقف ہی ہوں گے آپ۔ انگریز سرکار کے احسانوں تلے دبا ہوا ہے۔ اس سارے علاقے کی فصلوں کو سیراب کرنے والا پانی وہی مہیا کرتا ہے۔ فصل ابھی بوئی گئی ہے۔ اگر پانی تباہ کر دیا گیا تو فصل تباہ ہونے سے قحط پڑ جائے گا۔ بھوک سے مرنے کی نوبت آتے ہی انہیں اپنا ایمان اور فرض سب کچھ بھول جائے گا۔ ان حالات میں ہم ان سے زمینیں خریدنے کے لیے آگے بڑھیں گے اور علاقے پر بالآخر برطانوی قبضہ ہوجائے گا۔“ گلباز کی یہ تجویز بارنس کے دل کو لگی۔ اس نے قادر خاں سے بات چیت کی ذمے داری گلباز کو سونپ دی۔ اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو وہ ناقابلِ تسخیر آزاد قبائلی علاقے برطانوی حلقۂ اقتدار میں شامل کر کے اپنی افسرانہ انا کی تسکین کر لیتا۔

آثار یہی بتا رہے تھے کہ گلباز اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ قادر خاں نے انگریز آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے علاقے بھر کا پانی بند کر دیا۔ اس گاؤں میں پانی کی ضروریات کا انحصار پہاڑوں سے نمودار ہوتی ایک نالی پر تھا۔ چارفٹ چوڑی سیمنٹ اور اینٹوں کی بنی اس اونچی نیچی نالی کو خصوصی طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔ پہاڑوں سے نکلتی یہ نالی ژوب ندی تک جاتی۔ کھیتوں کو سیراب کرنے، مویشیوں کو پانی پلانے اور کپڑے برتن دھونے کا مکمل دارومدار .... اسی پر تھا۔ اہلِ علاقہ کے پینے کا پانی بھی ایک مصنوعی جھرنے کے ذریعے اسی نالی سے آتا جس سے زلیخا کی پن چکی چلا کرتی تھی۔

قادر خاں کے پانی روک لینے کے بعد چند ہی گھنٹوں میں نالی سوکھ گئی۔ اہلِ علاقہ اسی گمان میں تھے کہ کہیں نالی کو مرمت کی ضرورت پیش آگئی ہوگی۔ فوری طور پر کچھ آدمیوں کو مسئلے کی تلاش میں دوڑایا گیا تو علم ہوا کہ پورے آزاد علاقے کی سرحد تک نالی بالکل درست حالت میں تھی۔ انہیں گمان ہی نہ تھا کہ یہ رذیل حرکت قادر خاں نے خود کی ہے۔ اس نے مقامی لوگوں کی منت سماجت اور التجائیں یہ کہہ کر رد کر دیں کہ اب ایک چوتھائی فصل کا معاوضہ اس کے اخراجات پورے کرنے کے قابل نہیں۔ یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے پنچایت بلائی گئی۔ قادر خاں کے پاس معززین کے کئی وفد بھیجے گئے لیکن اس کا انکار اقرار میں بدل کے ہی نہ دیا۔ وقت گزرتا رہا۔ بوئی گئی فصل مرجھا کر ختم ہوگئی۔ گزشتہ برس کا محفوظ شدہ اناج استعمال کیا جانے لگا۔ کچھ عرصہ اور گزرا تو گھروں میں اناج کا ایک دانہ بھی [illegible] با۔ اس کے بعد مویشی ذبح کیے جانے لگے۔ چند ماہ بعد یہ آسرا بھی ختم ہوگیا۔ پینے کے لیے پانی کا بندوبست صرف مسجد میں

MARHABA
AMLA
HAIR
مرحبا
SINCE 1975
قدرت کی حکمت
بالوں کو دے قدرتی خوبصورتی
MARHABA
SINCE 1975
MARHABA®
AMLA
HAIR OIL
مرحبا آملہ ہیئر آئل
3 benefits
Stronger
Longer
Thicker Hair
MARHABA
NATURAL PRODUCTS
f /marhabalaboratoriespk
UAN: 111-162-152
www.marhaba.com.pk

ایک پرانے کنوئیں سے ہو رہا تھا۔ اس کنوئیں میں پانی پہلے ہی کم تھا اور استعمال کرنے والے سیکڑوں۔ عالم یہ تھا کہ سارا دن قطار میں لگنے کے بعد صرف ایک گھڑا ہی میسر آپاتا۔ مایوسی، بددلی اور بے بسی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ لوگ اپنے علاقے سے نقل مکانی تک کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

گلباز خاں اور بارنس ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں تھے۔

گلباز فوری طور پر وہاں چلا آیا۔ اس کے ہاتھوں میں نوٹوں سے بھرا تھیلا دیکھ کر فوری طور پر مجمع اکٹھا ہو گیا۔

''میرے ساتھیو! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ آپ لوگ اس علاقے کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں اس دھرتی کا بیٹا ہوں۔ آپ نے مجھے پرایا کر دیا ہے لیکن مجھے تو آپ سب کی مشکلات کا احساس ہے نا!'' وہ دلگیر انداز میں انہیں کہنے لگا۔

''تمہارے والد تو خود تمہیں نافرمان کہتے پھرتے ہیں گلباز! ہم تم سے کیسی مدد لیں پھر؟'' مجمعے سے ایک صدا ابھری۔ گلباز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس نے چند آدمیوں سے پہلے ہی یہ سارا منصوبہ اور مکالمے طے کر لیے تھے۔ اس لیے بے فکری سے کھیل کا آغاز کر دیا تھا ورنہ کوئی دوسرا شخص شہباز خاں کی خفگی کا حوالہ دیتا تو وہ گلباز کو نافرمان کے بجائے غدار کہہ کر مخاطب کرتا۔

''وہ ہم باپ بیٹے کا ذاتی مسئلہ ہے اسماعیل خاں! تم مجھے علاقے کا کوئی ایک ایسا گھر بتا دو جہاں بھائی بھائی، ماں بیٹے یا باپ بیٹے کی کوئی ناراضگی نہ ہوئی ہو لیکن اس وقت ہم ان ذاتی مسئلوں کے لیے نہیں بلکہ گاؤں والوں کی اجتماعی بھلائی کے لیے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اپنے اعلیٰ افسران سے معاملات طے کر لیے ہیں۔ تمہارے سارے مسائل کا ایک آسان ساحل موجود ہے۔''

''اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے چلا جا گلباز! ورنہ میں جانے تیرے ساتھ کیا کر بیٹھوں؟'' شہباز خاں اسی لمحے وہاں آ پہنچا۔

''اس شخص سے اپنی کسی بھلائی کی توقع نہ رکھنا!'' شہباز نے مجمعے کو مخاطب کیا۔ ''یہ ایک غدار ہے۔ انگریزوں کا راتب خور ہے۔''

''امام صاحب! آپ ہمیں اس کی بات سن تو لینے دیں۔'' مجمعے سے ہی گلباز کا ایک اور ساتھی بولا۔

''میرے بھائیو! آپ لوگوں کی زندگی صرف پانی سے بچ سکتی ہے اور میجر بارنس آپ کے لیے ڈوب ندی سے نئی نہر نکال کر گاؤں کو سیراب کروا سکتا ہے۔''

''اچھا! تو اب یہ بھی بتا دو کہ تمہارا میجر مشین اور روپیہ فراہم کرنے کے لیے اپنے کون سے خزانے کا منہ کھولے گا؟'' شہباز نے بھڑک کر پوچھا۔

''خزانہ تو آپ لوگ خود اپنے پاس دبائے بیٹھے ہیں۔ گاؤں کے باہر زمینیں بنجر پڑی ہیں۔ انہیں حکومت کو فروخت کر دیں۔ بدلے میں آپ کو نئی نہر بنوا دی جائے گی۔ فی بیگہ دو ہزار روپیہ بھی فراہم کیا جائے گا۔'' گلباز کی ترغیب پر مقامی افراد میں بے چینی پیدا ہونے لگی۔ بنجر زمینوں کا اس سے بہترین مصرف کوئی اور مل ہی نہیں سکتا تھا۔

''یہ غلطی کبھی نہ کرنا۔ انگریزوں سے بھلائی کی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ ہماری زمینیں خرید کر یہاں فوجی چھاؤنی بنا لیں گے۔ اپنی آزادی کا سودا مت کرو ان سے۔'' شہباز خاں نے ترغیب کا شکار نظر آنے والوں کو تحمل سے سمجھایا۔ گلباز مزید دیر نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے آنکھوں کے خفیف اشارے سے ایک آدمی کو اشارہ کیا جو فوری طور پر آگے بڑھ آیا۔

''میں اپنی دس بیگہ زمین فروخت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اس سودے میں بالکل کھوٹ نظر نہیں آ رہا۔ انگریز ہماری مدد کرنا چاہتا ہے۔'' گلریز نامی اس شخص نے گلباز کو مخاطب کیا۔ گلباز نے اسے بیس ہزار روپے تھمائے اور ایک کاغذ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''انگوٹھا لگا دو یہاں۔''

گلریز نے ابھی کاغذ تھاما ہی تھا کہ کسی سمت سے آنے والی گولی نے اس کا انگوٹھا زخمی کر دیا۔

''یہ گولی اسے مارنے کے بجائے اس بدبخت کے سینے میں اتار دے پالے!'' شہباز خاں نے ایک ٹیلے پر کھڑے پالے کو دیکھ لیا تھا۔ ''ایسی اولاد سے تو اچھا تھا کہ میں لاولد ہی مر جاتا۔''

''مجھے شک تو پہلے ہی تھا لیکن آج یقین ہو گیا کہ قادر خاں کی اس مسلسل ڈھٹائی کے پیچھے تمہارا اور میجر بارنس کا ہاتھ ہے۔'' پالے غرایا۔

''ٹھیک ہے! اگر تم میں ہمت ہے تو ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کر کے دکھاؤ۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ کتنی دیر بٹھا کر کھلا سکتے ہو انہیں۔'' گلباز نے نفرت سے اسے گھورا۔

''کل شام تک میں اناج اور رقم کا کہیں نہ کہیں سے بندوبست کر لوں گا۔'' پالے نے اعتماد سے کہا۔

''اور اگر نہ کر سکو تو انہیں زمین فروخت کرنے سے روک بھی نہ سکو گے۔'' گلباز نے ایک اور داؤ کھیلا۔

''میری ناکامی کی صورت میں یہ سب آزاد ہوں گے۔ میں انہیں روکنے یا سمجھانے کا اختیار کھودوں گا۔'' پالے نے اعلان کیا اور گھوڑے پر سوار ہوکر کسی نامعلوم سمت کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس نے اپنے ذہن میں حکمت عملی تیار کرلی تھی۔ ساتھیوں کو ہمراہ لیے وہ انگریزوں پر ایک قہر بن کر ٹوٹ پڑا۔ پشام تک تین سرحدی چوکیوں کی لوٹ مار کے بعد محافظوں کا خاتمہ کر کے ہتھیاروں اور گولہ بارود پر قبضہ کرلیا گیا۔ دوسرے روز صبح ہی صبح لورالائی سے آنے والی ایک ڈاک گاڑی اور سرکاری خزانے کو لوٹا گیا۔ اسی رات کوئٹہ سے آنے والے ملٹری رسد کے کانوائے کو نشانہ بنایا۔ پالے نے ژوب ندی کا پل بارود سے اڑا دیا۔ ملٹری کی کوئی بھی کمک پہنچنے سے قبل اس نے گاؤں کے توانا افراد کو طلب کر کے تمام رسد کا صفایا کروادیا۔ ملٹری رجمنٹ کی آمد پر وہاں جلے ہوئے ٹرکوں' ڈرائیور اور محافظوں کی بکھری لاشوں کے سوا کچھ بھی موجود نہ تھا۔ برطانوی حکومت ابھی اس صدمے سے سنبھل نہ پائی تھی کہ پالے خاں اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے انگریزی علاقوں میں لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ کلب' ہوٹل' سرکاری دفتر' نجی رہائش گاہیں کچھ بھی ان کی دسترس سے محفوظ نہ تھیں۔ شہر بھر میں ایک دہشت کا راج تھا۔ پالے خاں کا نام کسی ڈراؤنے خواب جیسا بن چکا تھا۔ میجر بارنس کی نفرت اور جھنجلاہٹ کئی گنا بڑھ گئی۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہورہا تھا کہ اپنے پیش روؤں کی طرح وہ بھی آزادی کی یہ تحریک جبر کے ذریعے کچلنے کے درپے ہوگیا ہے۔ علاقے کی صورت حال پر قابو پانے کے لیے انتظامی افسران کا ایک اجلاس بھی منعقد ہوا لیکن پالے کی گرفتاری یا موت کے علاوہ اس قتل وغارت کے خاتمے کی کوئی راہ نظر آتی تھی تو صرف پانی کی بندش کا خاتمہ تھا۔

میجر بارنس دہری اذیت میں گرفتار ہوچکا تھا۔ ان پیشہ ورانہ ناکامیوں کے بعد ایلین بھی اس سے کافی خفا رہنے لگی تھی۔ وہ ہر روز ہی اسے پالے کے حق میں دلائل دے کر اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنے لگتی۔ وہ بارنس کی کسی بھی جوابی دلیل سے متاثر یا قائل ہوکے ہی نہ دیتی۔ اسے یقین تھا کہ برطانوی حکومت کی سرپرستی کے بغیر قادر خاں اتنا شقی القلب ہرگز نہیں بن سکتا تھا کہ اپنی پنچایت اور معززین کی آمد کا بھی پاس نہ رکھے۔ بارنس ہر جانب سے کشمکش کا شکار تھا اور پھر اس اذیت وکشمکش کا خاتمہ ایسے انداز میں ہوا کہ بازی مکمل طور پر ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

☆☆☆

قادر خاں کے شب وروز بہت سرشاری میں بیت رہے تھے۔ وہ فطری طور پر ہی ایک لالچی اور خودغرض انسان تھا۔ اس لیے پانی جیسی قدرتی دولت کے عوض پہلے تو ایک چوتھائی فصل حاصل کرنے میں کوئی اخلاقی قباحت محسوس نہ ہوئی اور پھر انگریز حکومت کی پیشکش قبول کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ اس خودغرضی اور دولت کی ریل پیل نے اسے تعیش پسند بھی بنا رکھا تھا۔ ''ناز قہوہ خانہ'' میں وقت بسری اس کا ایک معمول بن چکا تھا۔ قہوہ خانے کی آڑ میں شراب' قمار اور رقص وسرود کے اس اڈے کو بھی حکومتی سرپرستی حاصل تھی۔ اس روز وہ سرِشام ہی وہاں جا پہنچا۔

قہوہ خانے میں داخل ہوتے ہی اندرونی آرائش وزیبائش مزاج میں فرحت پیدا کردیتی۔ غالیچے اس قدر نرم کہ پاؤں اندر دھنستے محسوس ہوتے۔ رنگ برنگے پردوں کی لڑیاں' پھولوں کی خوشبو اور نیم برہنہ وجود نفس کی تسکین کا خاصا اہتمام تھے۔ گاہکوں کی خدمت پر مامور لڑکیوں کا لباس' گداز جسم اور نازوانداز ہر نووارد کو اپنے سحر میں جکڑ لیا کرتے تھے۔ اس پرمستزاد جب کیفے کی حسین ترین رقاصہ جمیلہ کا رقص شروع ہوتا تو پھر چراغوں میں روشنی ہی باقی نہ رہتی۔ اس کی نیلگوں آنکھیں' گلابی رنگت' سیاہ بال اور سانچے میں ڈھلا جسم دیکھنے والوں کے دلوں پر قیامت ڈھا دیتا۔ قادر خاں بھی اسی شعلہ بدن کے لیے یہاں آیا تھا۔ جوئے کی کئی بازیاں جیت کر وہ ایسی انوکھی ترنگ میں تھا کہ جام در جام لنڈھاتے ہوئے اسے اپنے پاس کسی کی آمد کا علم ہی نہ ہوسکا۔

''یہاں سے چلو لالہ!'' اس نے بازو پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔

''مجھے اس وقت کسی کی بات نہیں سننی ولی خاں! چلے جاؤ یہاں سے۔'' شراب کے نشے میں مخمور قادر نے اپنے بھائی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تمہاری شرم اور غیرت کہاں مرگئی ہے لالہ؟ تمہارے ایک فیصلے نے ہر جگہ تباہی برپا کر رکھی ہے اور تم یہاں عیش وعشرت میں ڈوبے ہو۔ مجھے تو ایسا لگنے لگا ہے کہ تمہارے بارے میں بالکل صحیح افواہیں گردش کررہی ہیں۔ تم یہ سب انہی انگریزوں کے کہنے پر کررہے ہو۔'' ولی خاں

تلخ ہوگیا۔

''ہاں! انہی کے کہنے پر کیا ہے اور آئندہ بھی ان بھوکے ننگوں کو بھی کوئی فائدہ نہیں دوں گا۔ فرنگی کے کہنے پر میں کسی کی بھی گردن کاٹ دوں گا۔ مجھے بس دولت اور طاقت چاہیے اور یہ دونوں چیزیں مجھے صرف انگریز حکومت ہی دے سکتی ہے۔ مجھے کسی بھائی' ماں باپ یا بیوی بچوں کی کوئی بات نہیں سننی۔ میرا سب کچھ اب صرف فرنگی آقا اور دولت ہے۔'' قادر خاں کو اندازہ ہی نہ تھا کہ شراب کے نشے میں وہ اپنے سگے خونی رشتوں اور وطن کے لیے کس قدر غلیظ زبان استعمال کررہا ہے۔ ولی خاں کا دماغ سنسنا گیا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا اور قادر کے سینے میں گھونپ دیا۔

''آج سے بگڈی قبیلے کا سردار میں ہوں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ کسی بھی علاقے کا پانی روکنے والا میرا ذاتی دشمن ہوگا۔'' اس نے بہ آوازِ بلند اعلان کیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔ قہوہ خانے کی گہما گہمی' رقص اور چہل پہل چیخ و پکار میں ڈھل گئی۔ جنگل کی آگ کی طرح گردش کرتی یہ خبر گلباز خاں اور میجر بارنس تک بھی پہنچ گئی۔

''یہ تو ہونا ہی تھا پاپا!'' ایلن نے چمکتی آنکھوں سے تبصرہ کیا۔ ''پالے ایک سچا اور ایماندار انسان ہے۔ اس کے ساتھ قدرت کبھی ناانصافی نہیں ہونے دے گی۔'' بارنس کا چہرہ احساسِ ذلت سے سرخ ہوگیا۔

''ایک بات تو بتایئے مس صاحبہ! آپ کی ہمدردی کس کے ساتھ ہے؟ ہمارے ساتھ یا اس پالے خاں کے ساتھ؟'' گلباز تنک گیا۔

''ایک بات اپنے ذہن میں اچھی طرح بٹھالو کیپٹن گلباز! ہمارے ساتھ شمولیت ظاہر کرنے کے لیے ''ہم'' کا صیغہ استعمال مت کیا کرو۔ تمہاری اوقات کم از کم میری نظر میں کبھی نہیں بدل سکتی۔ اور رہی بات ہمدردی کی تو یہ نکتہ تم نے ٹھیک ہی کہا۔ میری ہمدردیاں برطانوی حکومت کے ساتھ ہی ہیں۔ آزادی کا جذبہ کچلنے کے لیے ان کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد مجھے ان پر ترس کے سوا کچھ محسوس نہیں ہوتا اور باقی رہا پالے خاں! تو اس جیسے سرفروشوں کے لیے میری تمنائیں بہت نیک ہیں۔ وہ حق اور جائز کام کررہے ہیں۔ قدرت انہیں ولی خاں جیسے اور بھی مددگار خود کار انداز میں فراہم کرتی رہے گی۔ اب جاؤ! سنا ہے کہ آج رات تمہارے گاؤں میں جشن ہوگا۔ اگر ہمت ہے تو پالے یا ولی خاں کو وہاں گرفتار کرلینا۔ سب سے پہلے امام صاحب ہی تمہاری تکا بوٹی کردیں گے۔'' ایلن کا ہر ایک لفظ گلباز کو کسی کوڑے کے مانند برستا محسوس ہوا۔

''دیکھ لوں گا میں تمہیں' تمہارے اس عاشق اور سب سہولت کاروں کو۔'' گلباز نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا لیکن بظاہر مسکراہٹ کا پردہ برقرار رکھنا اس کی مجبوری تھی۔ اس کے ذہن میں جشن میں شمولیت کی منصوبہ بندی پہلے سے ہی موجود تھی تاہم مقصد پالے یا کسی کی گرفتاری نہیں بلکہ کچھ ضروری معلومات کا حصول تھا۔ جشن اور رات تو ابھی دور تھی۔ فی الوقت اسے قہوہ خانے کا ایک ہنگامی دورہ کرنا تھا۔ جمیلہ نے اسے خصوصی طور پر بلوایا تھا۔ وہ اسے اہم معلومات فراہم کرنا چاہتی تھی۔ سرکاری مخبری کی آڑ میں اس نے اپنے رقص کا کامیاب بھرم برقرار رکھا ہوا تھا۔ طیش اور اہانت کے جذبات سے سلگتا وہ جمیلہ کے پاس پہنچا تو اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ اتنی بڑی کامیابی اس کی منتظر ہے۔

''زہے نصیب! آپ کے دیدار کے لیے تو آنکھیں ہی ترس جاتی ہیں سرکار! قادر خاں کے قتل کے بعد تو آپ نے درشن ہی نہیں کروائے۔'' جمیلہ ریشہ خطمی ہونے لگی۔

''کام کی بات کرو جمیلہ! کس لیے بلایا ہے مجھے؟'' گلباز نے اس کی پیش قدمی پر بند باندھتے ہوئے کہا۔ ایلن کے ہاتھوں ہونے والی ذلت و توہین کے بعد اسے جمیلہ کی قربت بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

''آپ کی کنیز ہوں گلباز خاں! آپ کے لیے ترپ کا ایک پتا تلاش کیا ہے۔ اسے کیسے اور کس وقت کھیلنا ہے یہ اب آپ ہی جانیں۔'' جمیلہ نے ایک ادا سے کہا اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے پردہ سرکا کر باہر ایک میز کی طرف اشارہ کیا۔ اس میز کے گرد رکھی کرسیوں پر چند جواری بیٹھے تھے۔ بازی اختتامی مراحل میں تھی۔ اس منظر میں بظاہر کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن گلباز نے وہ چہرہ تاڑ لیا تھا جسے دکھانے کے لیے ہی جمیلہ نے اسے یہاں بلوایا تھا۔

''حسن خاں۔'' گلباز چونک گیا۔

''جی ہاں! پالے خاں کا ساتھی حسن ہے یہ۔ یہاں کئی روز سے آرہا ہے اور روزانہ ہی جوئے کی ہر بازی ہار جاتا ہے۔ میں نے آج اپنے آدمیوں سے کہہ دیا ہے کہ اس کو خاصا رگڑا لگانا ہے۔ اب آگے آپ جانیں کہ اسے کیسے اپنے قابو میں کرنا ہے۔'' جمیلہ نے اٹھلاتے ہوئے اپنی کارکردگی بتائی تو گلباز کی ساری کلفت اور مایوسی دور ہوگئی۔ اس کی پیشگوئی کے عین مطابق حسن خاں بازی ہار کر بغلیں جھانک رہا تھا۔ اس کے پاس ادائیگی کے لیے رقم

وجود نہ تھی۔

''اس کنگلے کو آج یہاں سے جانے نہیں دینا۔ یہ ہر روز یونہی بازیاں ہار کر ہمارا نقصان کرتا ہے۔'' اس میز کے گرد بیٹھے ایک شخص نے کہا۔ ذرا سی دیر میں ہی وہاں بات تلخ کلامی سے بڑھ کر ہاتھا پائی اور سر پھٹول تک آ پہنچی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی بڑھ گئی۔ ایک جواری نے چاقو نکال کر حسن پر حملہ کر دیا۔ گلباز موقع غنیمت جان کر باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول بھی موجود تھا۔

''اتنے آدمی مل کر ایک شخص کو مار رہے ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟ اگر اب کسی نے اس پر ہاتھ اٹھایا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔'' اس کی گرج پر سبھی نشے میں دھت جواری خائف ہو کر تتر بتر ہو گئے۔ گلباز نے انہیں بزور اسلحہ قہوہ خانے سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا اور حسن کی جانب متوجہ ہو کر نرمی سے کہنے لگا۔

''ابھی باہر نہ جانا تم! خطرہ ہو سکتا ہے تمہارے لیے۔''

حسن خاموشی سے اس کے پیچھے اسی کمرے میں چلا آیا جہاں کچھ دیر پہلے گلباز شراب نوش کر رہا تھا۔ جمیلہ اس کی آنکھ کا اشارہ بھانپ کر پہلے ہی باہر رک گئی تھی۔ حسن کافی حیرت زدہ تھا۔

''اب اس بات پر حیران ہونا چھوڑ دو حسن کہ میں نے تمہاری جان کیوں بچائی ہے؟'' گلباز نے اپنی بازی کھیلنے کا آغاز کیا۔

''تو اور کیا کروں؟ دشمن ہوں میں تمہارا۔ مجھ سے جان چھڑوانا تو بہت آسان تھا تمہارے لیے۔'' وہ اکھڑے لہجے میں بولا۔

''یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں نے تمہیں کبھی اپنا دشمن سمجھا ہی نہیں۔ تم آج بھی میرے لیے وہی حسن ہو جس کے ساتھ میں گلی کوچوں میں کھیلا کرتا تھا۔ وہ حسن جو میرا دوست تھا۔ آج میں اسے کسی غیر کے سامنے کیسے ذلیل ہونے دیتا۔'' گلباز کے خلوص پر وہ الجھ کر اسے دیکھتا رہا۔

''میں اپنے سامنے بیٹھے اس شخص پر یقین کروں یا پالے اور دیگر لوگوں کی باتوں کا اعتبار کروں؟'' وہ ہنسا۔

''پالے..... اس کی تو بات ہی نہ کرو تم۔'' گلباز اس بازی کا ہر مہرہ مہارت سے چل رہا تھا۔ ''اس کے اور میرے خیالات کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ میں وقت کے تقاضے سمجھنے والوں میں سے ہوں اور اس وقت ہم سب کے لیے اہم یہی ہے کہ انگریزوں کے تجربے و مہارت سے فائدہ اٹھا کر ترقی کی جائے۔ وہ آج نہیں تو کل یہاں سے چلے ہی جائیں گے۔ پھر ہم ان کا فائدہ کیوں نہ اٹھائیں؟ اپنے گاؤں کو جنت کا ایک نمونہ کیوں نہ بنائیں؟ لیکن پالے ایسا نہیں سوچتا۔ اس کے لیے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ زیادہ اہم ہے۔''

''نہیں! وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات دلوانا چاہتا ہے۔'' حسن نے فوراً کہا۔

''انگریزوں کی غلامی سے نجات؟'' گلباز زور سے ہنسا۔ ''ارے میرے بھولے دوست! ایک غلام تمہیں غلامی سے کیا بچائے گا؟ وہ تو خود میجر بارنس کی بیٹی کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا ہے۔'' گلباز نے اطمینان سے چوٹ کی۔ حسن کو بھی یکدم پالے کا وہ تھپڑ اور اس فرنگی حسینہ کی آنکھوں سے چھلکتا تفاخر یاد آ گیا۔

''تو میرا شک ٹھیک تھا۔'' اس نے بے اختیار اپنا گال سہلایا۔

''ہاں! وہ اس سے چھپ کر ملاقاتیں کرتا ہے۔ محبت کا اظہار کر کے کسی نکاح شدہ جوڑے کی طرح وقت گزارتا ہے۔ یہ اچھی دشمنی ہے بھئی!'' گلباز کا ہر ایک داؤ ماہرانہ تھا۔

''یہ سب اس فرنگن کے بے حمیت باپ کو جا کر کیوں نہیں بتاتے تم؟'' حسن نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

''بڑے بھولے ہو بھئی تم۔ اب میں تمہیں کھل کر کیسے بتاؤں کہ اس کھیل میں باپ بھی شریک ہوگا۔ وہ بیٹی کو سیڑھی بنا کر پالے سے سارے راز اگلوانا چاہتا ہوگا۔ کچھ باتیں خود بھی سمجھنے والی ہوتی ہیں میرے دوست!'' گلباز اسے پیشہ ورانہ مجبوریوں کا بھرپور تاثر دے رہا تھا۔

''اگر یہ بات سچ ثابت ہوئی تو میں پالے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کروں گا۔''

''یہ تو تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھو۔ میں تمہارا یا پالے کسی کا بھی دشمن نہیں ہوں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ انگریزوں سے مصالحت کر کے ہتھیار ڈال دیے جائیں، امن و سکون سے زندگی بسر کی جائے۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم بھی اپنے خاندان کے ساتھ رہو۔ بیوی بچوں کا سکھ لو۔ اچھا سا گھر جدید سہولتیں ہوں۔ گاڑی میں گھوما پھرو۔ تمہارے بچے بھی اس گھٹے ہوئے ماحول سے نکل کر اچھے اور بڑے اسکولوں میں پڑھیں، نوکریاں کر کے خوب ترقی کریں۔'' گلباز نے اسے خوابوں کے جگنو تھما دیے۔ حسن کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔ دل و دماغ میں خوابیدہ تشنہ آرزوئیں یکدم عود آئیں۔

''دل تو بہت کرتا ہے یار! کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اتنے سالوں سے ہم یہ ہتھیار اٹھائے باغی بنے انگریزوں کو

نقصان پہنچا رہے ہیں لیکن ہمیں فائدہ تو کوئی بھی نہیں ہو رہا۔ انگریز تو آج بھی مضبوط اور بااختیار ہے اور ہم گھر سے بے گھر مشکلات میں گھرے رہتے ہیں۔'' حسن کی اس بات پر گلباز کی آنکھوں میں گہری چمک بیدار ہوگئی۔ اس نے ایک ملازم کو آواز دے کر شراب اور بھنا ہوا گوشت لانے کا حکم دیا اور جام بنا کر خود حسن کو تھما دیا۔ رسمی سے انکار کے بعد حسن نے ایک ہی سانس میں وہ تلخ سیال حلق سے اتار لیا۔

''تم ہم سب میں اچھے رہ گئے گلباز! نوکری کرتے ہو۔ مزے سے رہتے ہو۔ کبھی کبھی تو میں بھی سوچتا ہوں کہ کوئی نوکری مل جائے تو پالے کا ساتھ چھوڑ دوں۔ میرا دل ٹھیک ہی کہتا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ مخلص نہیں رہا۔'' وہ شراب کے نشے میں مخمور ہونے لگا۔

''اس میں کیا مشکل ہے؟ تم ایک قابل اور بہادر آدمی ہو۔ میں اپنے تعلقات استعمال کر کے تمہیں نوکری دلوا سکتا ہوں بلکہ ایک کام تو ایسا بھی ہے جس سے تمہیں خاصی جاگیر بھی مل سکتی ہے۔'' گلباز نے ایک اور جام اس کی طرف بڑھایا۔

''میں تیار ہوں۔ کیا کرنا ہوگا مجھے؟'' حسن نشے میں دھت ہو چکا تھا۔

''پالے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ ہی رہو اور انہیں اپنے راستے پر لانے کے لیے میرے مشوروں پر عمل کرتے رہنا۔ بس ایک دن سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' گلباز اس کے گرد مکڑی کا جالا بُن چکا تھا۔

''مجھے منظور ہے۔'' حسن خاں نے جام لہرایا۔

''ویسے ایک بات سمجھ نہیں آتی مجھے۔'' گلباز معصومیت سے بولا۔ ''اپنا پالے اس فرنگی لڑکی سے ہر بار بالکل ٹھیک وقت پر ملاقات کرنے کیسے پہنچ جاتا ہے؟ ٹرین میں اسے اغوا کرنے بھی مکمل منصوبہ بندی سے آیا تھا۔ کوئی جادو ٹونے جانتا ہے یا پرانے وقتوں میں بادشاہوں کی طرح کبوتروں کے ذریعے پیغام پہنچاتے ہیں ایک دوسرے تک۔''

''تم بھی نا! بہت ہی بھولے ہو گلباز۔'' حسن نے اسی کے الفاظ لوٹاتے ہوئے لطف لیا۔ ''ہمیں تو یہ بھی پتا ہوتا ہے کہ بڑے صاحب کے گھر میں کون کتنی بار سانس لیتا ہے۔ فرنگن تم سے کتنا چڑتی ہے اور بڑا صاحب بیٹی سے چھپ کر کن عورتوں کے پاس جاتا ہے۔'' گلباز کی حسیات چوکنا ہوگئیں۔ بالآخر وہ لمحہ آ ہی گیا تھا جس کے انتظار میں وہ اب تک پالے اور ایلن کے معاملات کو ڈھیل دیے ہوئے تھا۔

''کون پہنچاتا ہے یہ خبریں تمہیں؟''

''صاحب لوگ تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہم نے ایک پکّا بندوبست کر کے رکھا ہوا ہے۔ وزیر علی خاں ہی وہ کبوتر ہے جو غٹرغوں کرتا ہر راز ادھر سے اُدھر کرتا ہے۔'' حسن کے انکشاف پر گلباز کے جبڑے بھنچ گئے۔ اسے اب بھی یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ وہ معصوم صورت، مسکین انداز و اطوار والا بے نیاز اور خوفزدہ دکھائی دینے والا اردلی اتنے شاطر افسران کی ناک تلے کیسے گل کھلاتا رہا تھا۔

☆☆☆

جشن کی رات سماں بندھ چکا تھا۔ خوشی اور تشکر ہر ایک چہرے سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔ اس خصوصی جشن میں ولی خاں اور اس کے قبیلے سے چند دیگر معززین کو بھی مدعو کیا گیا۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے مسلم دنبے، پلاؤ اور قہوہ تیار کیا جا رہا تھا۔ آج بہت عرصے بعد ایسی محفل سجائی گئی تھی۔ زلیخا بھی خوبصورت لباس میں وہیں موجود تھی۔ وہ پالے کی اس کامیابی پر شکرانہ بجالاتے نہ تھک رہی تھی۔ اسی ہجوم میں گلباز بھی بھیس بدل کر چلا آیا۔ اس کی نظریں ولی خاں اور پالے پر ہی مرکوز تھیں۔

''میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں ولی! تم نے ہمارے لیے ایک بہت بڑی قربانی دی ہے۔'' پالے نے اس کے بھائی کی موت کی طرف اشارہ کیا۔

''بعض اوقات اجتماعی مفاد کے لیے ایسی قربانی دینا لازم ہو جاتا ہے۔ میں تو پہلے بھی لالہ کو منع کرتا تھا کہ معاوضہ لے کر پانی کی ترسیل نہ دیا کرو۔ پانی اور ہوا تو قدرتی نعمتیں ہیں۔ ہم انسان ان کی قیمت لینے والے کون ہوتے ہیں؟ اب بگڈی قبیلے کا سردار میں ہوں اور اعلان کرتا ہوں کہ آج سے پانی بلا معاوضہ فراہم ہوگا۔'' ولی نے آخری فقرہ باقاعدہ اعلان کی صورت میں بہ آواز بلند ادا کیا۔ مجمعے میں خوشی اور جوش کی لہریں انہیں جھومنے اور رقص کرنے پر مجبور کرنے لگیں۔ گلباز کی نظریں ایک لمحے کے لیے بھی اس سے نہ ہٹیں۔ اسی اثنا میں کسی کونے سے وزیر علی نمودار ہوا اور پالے کے کان میں سرگوشی کر کے اسی پل دوبارہ مجمعے میں غائب ہو گیا۔

پالے خاں اب قدرے بے چین دکھائی دینے لگا تھا۔ محتاط نظروں سے قرب و جوار میں دیکھتے ہوئے وہ اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گلباز بھی قدرے فاصلے سے اس کے تعاقب میں تھا۔ گھر پہنچتے ہی صحن میں چارپائی پر بیٹھی ایلن کو دیکھ کر اس کے رگ و پے میں سرشاری بے قابو ہونے لگی۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو؟ اس طرح بلاوجہ خطرہ مول نہ لیا کرو۔'' وہ سنبھل کر بولا۔

''وزیر علی سے جب علم ہوا کہ گاؤں میں جشن ہے تو تجھ سے رہا نہیں گیا۔ تم سے ملاقات کیے بھی تو اتنے دن گزر گئے تھے۔'' ایلن بے باکی سے اس سے لپٹ گئی۔

''یہ سب ٹھیک نہیں ہے ایلن! ہمیں ان ملاقاتوں اور اپنے جذبات پر بند باندھنا ہوگا۔'' پالے نے اسے آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔

''محبت ان ضابطوں کو نہیں مانتی۔ میں اپنے جذبات پر بند باندھ کر گھٹن زدہ زندگی نہیں جی سکتی۔'' اس کی خودسری نے پالے کو خاموش کردیا۔

''ہم دو متضاد انتہاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمہارے یہ جذبات میجر بارنس کو بھی بحیثیت والد بہت تکلیف دیں گے۔ اس کے بعد ہم وطن بھی اس رشتے کے متعلق کبھی مثبت نہیں سوچیں گے۔ میرے ساتھی مجھ پر کبھی اعتبار نہیں کریں گے۔'' وہ اس کی زلفیں سہلانے لگا۔

''میں ایک آزاد اور خودمختار لڑکی ہوں۔ اپنے والد کے سامنے پسند کا اظہار کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔ میں عنقریب انہیں واضح طور پر بتادوں گی کہ میں نے اپنا جیون ساتھی منتخب کرلیا ہے۔ باقی رہی بات تمہارے ساتھیوں کی تو ان کی بے اعتباری بہت زیادتی ہوگی۔ کیا انہیں تمہاری وفاداری اور بہادری پر شک ہے؟ اگر کوئی ایسا سوچے بھی تو سمجھ لینا کہ وہ تم سے کبھی مخلص ہی نہیں تھا۔'' اس کے دلائل اور بے باکی پالے کے ضبط کا امتحان ثابت ہونے لگی۔ نیم تاریکی، ٹھنڈی نم ہوا، اپنے گھر میں من پسند عورت کی موجودگی، اس کا اظہارِ محبت اور ہر ایک انداز سے جھلکتی خود سپردگی ایک بار پھر امتحان میں ناکامی کا باعث بن گئی۔ پالے نے ایلن کے بارگاہِ حسن میں گھٹنے ٹیکے اور دیوانہ وار اسے گرفت میں جکڑ لیا۔ جذبات کی شورش آج ایک نئی انتہا پر تھی۔ اگلے کئی لمحات ہوش وحواس سے بیگانگی میں گزرے۔ آسمان سے پانی کی ٹپکتی بوندوں نے انہیں ہوش کی وادی میں لا پھینکا۔

''واپس چلی جاؤ ایلن! بارش تیز ہوگئی تو ندی میں باڑ آجائے گی۔ تمہارا نکلنا بہت مشکل ہوجائے گا۔'' پالے نے اسے سمجھایا۔

''پھر کب ملوگے مجھ سے؟'' ایلن کی نگاہوں میں تشنگی تھی۔

''کل شام کھنڈر میں آجانا۔'' اس نے جذباتی سرگوشی کی۔

''کھنڈر اور ٹیلوں کی یہ ملاقاتیں بہت جلد ختم ہوجائیں گی۔ پھر میں تمہارے ساتھ یہیں اسی گھر میں رہوں گی۔ اس کے بعد ہمیں کوئی الگ نہیں کرسکے گا۔'' ایلن نے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور لباس سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ الوداعی رومانوی لمحات کے بعد وہ بے نیازی سے باہر چلی آئی۔ اس کے جاتے ہی پالے بھی سرشاری سے ساتھیوں کے پاس روانہ ہوگیا۔ دروازے کی آڑ میں کھڑا گلباز بھسم ہوچکا تھا۔

بارش کی وہ ہلکی بوندیں اب تیز پھوار میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ جشن کے شرکاء نے کھانے کی دیگیں درگاہ کے احاطے میں پہنچا دیں۔ زلیخا دیگر خواتین کے ساتھ مل کر خوانوں میں پلاؤ نکالنے لگی۔ پالے اور دوسرے افراد یہ خوان مہمانوں کے سامنے رکھتے گئے۔ زلیخا کی پُرسوچ مسکراتی ہوئی نگاہیں پالے کے چہرے کا ہی طواف کررہی تھیں۔ اس کے دل میں آج ایک نئی امید کی کونپل پھوٹی تھی جسے وہ نہایت اہتمام اور مسرت سے سینچنا چاہتی تھی۔

''کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہے جیسے تیرا کوئی قرضہ دینا ہے مجھے؟'' پالے نے اس کی چوری پکڑلی۔

''دیکھ رہی ہوں کہ وقت کتنی تیزی سے اپنے رنگ دکھاتا ہے۔ ایک غدار کے بھائی کی اتنی خاطر مدارت کی جارہی ہے۔'' اس نے ولی اور پالے کی گفتگو اور مہمان نوازی کی طرف اشارہ کیا۔

''ولی خاں ہمارا مخلص ساتھی ہے۔ اس کا قادر خاں کی غداری سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر دوبارہ مہمانوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''میں بھی تو تمہاری کنیز ہوں پالے! گل محمد کی غداری سے میرا بھی کوئی تعلق نہ تھا اور اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ میں اپنی وفاداری جلد ہی ثابت کردوں گی۔'' اس کے وجود میں سرشاری ہلکورے لینے لگی۔ اسی لمحے راجابی نے اسے صدا دی۔

''مجھے گھر چھوڑ آئے گی زلیخا! موسم سرد ہورہا ہے۔ مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں جائے گا۔''

''کیوں نہیں خانہ خانم! آیئے میرے ساتھ۔'' وہ دل وجان سے راضی تھی۔

''بس کچھ دیر کی بات ہے۔ میں موقع دیکھتے ہی پالے سے کہوں گی کہ زلیخا اب باقاعدہ ایک رشتے میں بندھ کر ہمارے گھر رہے گی۔'' ان کے یہ الفاظ زلیخا کے لیے امرت تھے۔ وہ شرم سے بل کھا کر رہ گئی۔ آج کا دن امید اور امنگوں کا نیا باب رقم کرنے آیا تھا۔ راجابی کو گھر چھوڑ کر اپنی رہائش گاہ تک آتے ہوئے اس کا لباس بارش سے بری طرح بھیگ چکا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے دوپٹا ایک جانب رکھا اور بھیگی ہوئی قمیص اتار کر دوسری تھامی

ہی تھی کہ ایک جانِ لیوا احساس نے اسے شل کر دیا۔ کمرے میں کوئی دوسرا ذی نفس بھی موجود تھا۔

''اتنی دیر کیوں لگا دی جانِ من! کب سے انتظار کر رہا ہوں میں تمہارا۔'' گلباز کی آواز سے وہ کرنٹ کھا کر پلٹی اور برق رفتاری سے لباس پہننے لگی۔

''خبیث انسان! تمہاری جرأت کیسے ہوئی آج پھر یہاں آنے کی۔'' وہ غرائی۔

''بارش ہو رہی تھی نا باہر۔ اب تمہارے سوا میرا اور کوئی تو ہے نہیں جس کے پاس پناہ لیتا۔'' گلباز نے خود ہی لالٹین جلاتے ہوئے کہا۔ اس کی نظروں اور انداز میں بے پناہ وحشت تھی۔ اس کی پیش قدمی بھانپ کر زلیخا بدک گئی۔

''میرے قریب مت آنا بے غیرت انسان!''

''تم جسے اپنے قریب لانے کا خواب دیکھ رہی ہو احمق! وہ تمہاری پہنچ سے بہت دور ہو چکا ہے۔ ایلن کے ساتھ کسی نکاح شدہ جوڑے کی طرح وقت بسر کرتا ہے۔ ابھی آج جشن سے اٹھ کر وہ اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا کر آیا ہے۔'' گلباز اپنی وحشت سے مغلوب ہو چکا تھا۔

''جھوٹ بول رہے ہو تم! پالے ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔'' زلیخا صدمے سے شل ہو گئی۔ اس کی اسی غفلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے گلباز نے اسے دبوچ لیا۔ زلیخا دیوار پر ٹنگی بندوق پکڑنا چاہتی تھی لیکن وہاں کچھ بھی موجود نہ تھا۔

''مجھے کیا اتنا ہی احمق سمجھ رکھا ہے کہ تیرے انتظار کی سیج سجائے ایسے خطرات یہاں رہنے دوں گا۔'' اس نے زلیخا کو بستر پر پٹخا۔ اس کی منت سماجت، چیخ و پکار بارش اور بجلی کی کڑک میں دب کر رہ گئیں۔ امیدوں، آرزوؤں اور خوابوں کا شیش محل ایک بپھرے ہوئے مرد کی ہوس نے چکنا چور کر دیا۔ اس طوفانی رات میں گل محمد کی غداری کا تاوان زلیخا نے اپنی قیمتی ترین متاع سے محروم ہو کر چکایا۔ ابھی جانے اور کتنے قرض ادا کرنے کو باقی تھے۔

☆☆☆

رات بھر کی بارش کے بعد اگلے روز موسم بے حد نکھرا ہوا تھا۔ پالے کی طبیعت میں سرشاری اور ترنگ تھی۔ وہ ولی خاں کی جانب سے بھیجے گئے چمن کے خصوصی انگوروں کا ٹوکرا اٹھائے ساتھیوں کے پاس چلا آیا۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ حسن خاں نے ایلن اور اس کے تعلقات کی مکمل داستان سب کو سنا دی ہے۔

''کیا بات ہے، اتنے خاموش کیوں ہو؟ کہیں کوئی ساتھی تو انگریزوں کے قبضے میں نہیں چلا گیا؟'' پالے ان کے تیور دیکھ کر حیران تھا۔ ایسی صورتِ حال اور افسردگی کسی ساتھی کی گرفتاری کے بعد ہی پیدا ہوا کرتی تھی۔

''ہاں! ایک بہت قریبی جانباز گرفتار ہو گیا ہے۔ اور یہ گرفتاری بھی ایسی ہے کہ ہم اسے رہائی بھی نہیں دلوا سکتے۔'' جمال نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''کون گرفتار ہوا ہے؟ ہم اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔'' وہ تڑپ گیا۔

''ہمارا سردار! ایک سمجھدار، بہادر، معاملہ فہم اور دور اندیش سردار کی عقل پر جانے گوری چمڑی دیکھ کر کون سے پتھر پڑ گئے ہیں کہ وہ اس سے کھنڈروں میں ملاقاتیں کرتا ہے۔ جشن سے اٹھ کر اس کے بلاوے پر دوڑا جاتا ہے۔ ہمارا غیرت مند سردار اس قدر بدل گیا ہے کہ اسے گناہ و ثواب کا فلسفہ ہی بھول گیا ہے جو ہماری گھٹی میں شامل ہوتا ہے۔ ایسی بھی کیا نفس پرستی سردار پالے خاں! اگر فرض سے زیادہ نفس عزیز ہو گیا ہے تو کسی بھی مقامی لڑکی سے شادی کر لو۔ اس طرح خود کو اخلاقی گراوٹ کا شکار تو نہ بناؤ۔'' جمال نے بلا لحاظ اسے رگید دیا۔ پالے کی سنگتی نظریں حسن پر گڑی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ استہزائیہ تھی۔

''تم لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہو جمال! وہ لڑکی ہمارے ساتھ بہت مخلص ہے۔ ہماری مدد کرنا چاہتی ہے۔'' پالے نے اپنا مقدمہ لڑنے کا آغاز کیا۔

''اب ہمیں اپنی جنگ کے لیے ایک عورت کے سہارے کی ضرورت بھی پیش آیا کرے گی؟'' عبداللہ تلخ ہوا۔ ''کیا ہم بھی فرنگیوں کی طرح عورتوں کو دشمن کے خلاف استعمال کریں گے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب میں نے اپنے سردار کی زبان سے سنا ہے۔''

''تم لوگ میری نیت پر شک کر رہے ہو کیا؟ میں آج بھی اپنے مقصد اور خواب سے مخلص ہوں۔''

''اگر مخلص ہو تو اس کو... کسی دوسری محبت اور بے لگام جذبوں سے آلودہ کیوں کر رہے ہو؟ اگر نفس عزیز ہے تو ہمارا گروہ چھوڑ دو سردار! ہم ایک تقسیم شدہ شخص کی سربراہی قبول نہیں کر سکتے۔ اپنی راہیں خود تلاش کر لینا پھر کہ انگریزوں سے جنگ ان ہتھیاروں سے لڑنی ہے یا ان کی عورتوں سے بستر نشین ہو کر؟'' جمال کا مطالبہ اور الفاظ سن کر وہ ساکت رہ گیا۔ وہ لمحے بہت قاتل تھے۔ پالے کے جذبات میں تلاطم برپا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو سمجھا ہی نہیں سکتا تھا کہ محبت ایک جاودانی جذبہ ہے۔ ایلن سے یہ محبت وطن پرستی اور قومی آزادی سے بڑھ کر نہیں لیکن اپنی جگہ مسلم بھی ہے۔ اس کے

لیے آج بھی ہندوستان کی آزادی اور اپنی سرحدوں کا دفاع بہت اہم تھا۔ محبت نے اس کے دل میں سیندھ لگائی تھی۔ اس کے یہ دیرینہ ساتھی تو اس کی حلاوت سے واقف ہی نہیں تھے۔ وہ کبھی اس کے جذبات نہیں سمجھ سکتے تھے۔

"کیا چاہتے ہو تم لوگ اب؟" وہ اس کشمکش میں اعصابی انتشار کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ لمحہ اور صورتِ حال متوقع ہونے کے باوجود بہت اعصاب شکن اور ناقابلِ برداشت تھی۔

"انتخاب...... تمہیں اس فرنگی لڑکی اور ہم میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ہمیں ایک تقسیم شدہ شخص گوارا نہیں ہے۔" فوری جواب آیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں ایلن سے دوبارہ کبھی نہیں ملوں گا۔ یہ میرا تم لوگوں سے وعدہ ہے۔" وہ بوجھل سانس لے کر اپنا ہتھیار اٹھائے غار کی طرف بڑھ گیا۔ یہ فیصلہ سناتے وقت ایلن کی سوالیہ اور شکوہ کناں نظریں پردۂ تصور سے چپک سی گئی تھیں۔ وہ دلی طور پر اس کے لیے بھی آسانیاں پیدا ہونے کے لیے دعاگو تھا۔

ایلن کے بارے میں پالے کا اندازہ بالکل درست تھا۔ وہ جمعے کو طے شدہ مقام پر پہنچ کر بے تابی سے اس کی منتظر رہی۔ سورج کا نارنجی گولہ مغربی ٹیلوں میں روپوش ہونے اور دودھیا چاندنی میں قرب وجوار کے نہانے تک وہ اسی کھنڈرات اور ٹیلوں میں منڈلاتی رہی۔ اسے پالے کی سلامتی کے متعلق سخت تشویش لاحق ہو چکی تھی۔ دل میں ہزاروں وسوسے لیے وہ گھر روانہ ہو گئی۔ حسبِ سابق وہ گھر سے کافی فاصلے پر ہی گھوڑے سے اتر گئی تھی۔ میری نے کھڑکی نیم وا چھوڑ رکھی تھی۔ وہ کھڑکی پھلانگ کر کمرے میں پہنچی تو بارنس پہلے ہی سے اس کا منتظر تھا۔ ایلن اس اچانک صورتِ حال پر بوکھلا گئی۔

"ہندوستان واقعی ایک پراسرار زمین ہے۔ یہ ایک خاندانی انسان کو کیچڑ میں لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔" بارنس نے بیٹی پر طنز کیا۔

"سب انسان برابر ہیں پاپا! غرور اور تعصب کیچڑ اور عطر کا قدغہ پیدا کیا کرتا ہے۔" وہ سمجھ گئی تھی کہ آج محبت کا مقدمہ لڑنے کا وقت دبے قدموں چلا آیا ہے۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی ایلن! تم نے اپنے باپ کی تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ برطانوی حکومت کے ایک مطلوب ترین شخص سے تعلقات قائم کرتے ہوئے تمہیں ایک بار بھی اپنے قومی وقار کا خیال نہیں آیا۔" بارنس کا ذہن گلباز کے انکشافات اور ثبوتوں کی بنا پر کسی لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔

"میں نے ایک انسان دوست، باظرف اور بہادر شخص سے محبت کی ہے۔ دنیا کی کوئی بھی قوم اور قانون اس بات کو غلط ثابت نہیں کر سکتے اور انگلستان کے آئین وقانون میں کہیں بھی اولاد کی ذاتی پسند ناپسند والدین کی تباہی نہیں بناتی۔ یہ آپ کا اپنا ذہنی غبار ہے۔ آپ چند روز میں ہی جس طرح اپنے سب اصول ونظریات بھول کر جبر واستحصال کی طرف مائل ہوئے ہیں مجھے تو لگتا ہے کہ وہ سب ایک کھوکھلا بھرم تھا۔" وہ بے خوفی سے بولی۔ بارنس اس کی یہ صاف گوئی برداشت نہ کر سکا اور بے اختیار اسے تھپڑ رسید کر دیا۔

"جب دلیل اور منطق ختم ہو جائے تو انسان تشدد ہی کرتا ہے۔ آپ بھی برطانوی حکومت کی طرح ذاتی وقومی سطح پر وہی کر رہے ہیں۔" ایلن کی نگاہوں میں تپش در آئی۔ بارنس تلملاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ شل ہوتے رخسار پر ہاتھ رکھے ایلن پالے کی جانب سے تشویش محسوس کرنے لگی۔ اس نے وزیر علی کے توسط اسے پیغام بھجوانے کا فیصلہ کر لیا لیکن اگلی ہی صبح علم ہوا کہ وہ تو سرکاری تحویل میں غداری کی سزا بھگت رہا ہے۔ ایلن بلاخوف وخطر اس سے ملاقات کے لیے جیل خانے پہنچ گئی جہاں گلباز نے بھرپور خباثت سے اس کا استقبال کیا۔

"آپ کا پیغام رساں تو بہت بری حالت میں ہے مس صاحبہ! اب پالے خان سے کیسے ملاقاتیں کریں گی آپ؟"

"تو میرا اندازہ بالکل درست تھا۔ یہ سارا فساد تم نے ہی پھیلایا ہے۔" وہ سلگ گئی۔

"میں نے تو بس حقِ نمک ادا کیا ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"حقِ نمک ادا کرنے کے قابل ہوتے تو پہلے اپنے گھر والوں سے مخلص ہوتے جنہوں نے تمہیں کھلا پلا کر، پڑھا لکھا کر کسی قابل بنایا۔ جو شخص اپنی قوم کا وفادار نہیں وہ ہم سے کیا وفا نبھائے گا۔ جہاں سے تھوڑا اور راتب ملے گا وہیں دم ہلاتا پہنچ جائے گا۔" ایلن کے الفاظ نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا۔

"اب ہٹو میرے راستے سے۔ مجھے وزیر علی سے ملنا ہے۔" وہ نفرت سے اسے دھکیلتی اندر چلی گئی۔

سلاخوں کے عقب میں وزیر علی کی حالت عبرتناک تھی۔ اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ زخموں سے محفوظ نہ تھا۔

ٹانگوں کی ہڈیاں ٹوٹ کر غیر فطری انداز میں لٹک چکی تھیں۔ لہو آلود چہرے سے نقوش پہچاننے بھی مشکل ہو رہے تھے۔ ایلن کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''پریشان کیوں ہو رہی ہیں مس بارنس! یہ زخم اور لہو تو میرے لیے کسی بھی تمغے سے بڑھ کر ہے۔'' اس کے کٹے پھٹے چہرے پر مسکراہٹ نے چمک دکھائی۔

''تم واقعی ایک عظیم انسان ہو وزیر علی! اپنی قوم اور مقصد کے لیے ایسا جنون مجھے سر جھکانے پر مجبور کر رہا ہے۔'' وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''عظیم نہیں ایک معمولی سا انسان ہوں مس بارنس! گوشت پوست سے بنا انسان۔ ان لوگوں کا تشدد میری ہمت توڑنے لگا ہے۔ وہ مجھ سے پالے خاں اور اس کے گروہ کے پتے ٹھکانے پوچھتے ہیں۔ ابھی تک تو زبان بندی کر رکھی ہے لیکن اب ڈر لگتا ہے کہ کسی کمزور لمحے میں اپنا ضبط نہ کھو دوں۔ میرے ہاتھ اسی لیے اب تک سلامت رکھے گئے ہیں کہ زبان سے نہ سہی تو ہاتھوں سے لکھ کر نقشہ بنا دوں۔''

''میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں تو بتاؤ وزیر علی! اور یہ نہ سوچنا کہ اب تک اپنی مدد کے عوض یہ پیشکش کر رہی ہوں۔ میں دلی طور پر تمہارے کردار اور مقصد کی قدردان ہوں۔'' ایلن نے خلوص سے کہا۔

''مجھے مار دیجیے! میری مشکل آسان کر دیجیے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو کوئی ہتھیار لا دیجیے۔ میں نے عمر بھر ان پہاڑوں کے بیٹوں کی خدمت کی ہے۔ اب اپنی کمزوری کی وجہ سے ان کے لیے مشکل نہیں بن سکتا۔ آزادی کی یہ تحریک بڑی قربانیوں کے بعد ایسے مقام پر آئی ہے کہ ہمیں ایک الگ ملک اور شناخت نظر آنے لگی ہے۔ میں ان خوابوں کا گلشن اجاڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے موت دے دو یا خود ہی میری مشکل آسان کر دو۔'' اس نے زخموں سے چور ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔ ایلن ایک سخت کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ گلباز کی کینہ پروری، بے حسی اور میجر بارنس کی حالیہ منتقم مزاجی دیکھنے کے بعد اسے کوئی شبہ نہیں تھا کہ پالے خاں اور اس کے گروہ کا خاتمہ کرنے کے لیے وزیر علی کے جسم کا ہر ایک ریشہ ادھیڑ دیا جاتا۔ لمحاتی سوچ بچار کے بعد ایلن نے اپنے لباس میں پوشیدہ پستول نکالا اور وزیر علی کے پاس پھینک کر بوجھل قدموں سے باہر چلی آئی۔ کچھ ہی دور گلباز ایک سنتری کے ساتھ کھڑا تمباکو نوشی میں مصروف تھا۔ ایلن پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔ اس مسکراہٹ کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی۔ کوٹھری میں گونجنے والے دھماکے نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ وہ برق رفتاری سے اس جانب لپکا جہاں وزیر علی کی کنپٹی میں ہونے والا سوراخ، بھل بھل بہتا خون، چہرے کا وقار اور لبوں پر کھلی مسکراہٹ اس کی فاش شکست کا عکس تھی۔

☆☆☆

پالے خاں کی زندگی میں انگریز دشمنی کے سوا اب کوئی مقصد و خیال باقی نہیں رہا۔ ایلن کی یادوں کو حتی الامکان پس پشت ڈالے وہ نت نئے منصوبے بنا کر گولہ بارود لوٹنے اور انگریزی منصوبوں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا۔ وزیر علی کی وفات کا صدمہ بھی ان نقصانات کی بہت بڑی تحریک تھا۔ اسی دوران ایک روز انہیں سورج طلوع ہوتے ہی سفید رنگ کی گاڑی پتلی اور ناہموار سڑک پر لہراتی نظر آئی۔ اس وقت وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹیلے پر پیٹ کے بل سڑک کا جائزہ لے رہا تھا۔

''یہ کسی گولہ بارود کی گاڑی تو نہیں۔ موقع اچھا ہے۔ اسے فوراً اپنے قبضے میں لے لو۔'' جمال پُرجوش ہوا۔

''نہیں! مجھے یہ کسی اسپتال کی گاڑی لگتی ہے۔ ریڈ کراس کا نشان بھی بنا ہے اوپر۔'' پالے نے دوربین سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''انگریزوں کی چالاکی کا کیا بھروسا؟ ہو سکتا ہے اس گاڑی میں مریض کے بجائے اسلحہ ہو۔ اسے روک کر ایک بار دیکھو تو سہی۔'' عبداللہ نے تجویز دی۔ پالے نے اثبات میں سر ہلایا اور محتاط نشانہ لگا کر ڈرائیور کو زخمی کر دیا۔ گاڑی رکتے ہی وہ ماہرانہ انداز میں راستہ طے کیے نیچے پہنچ گئے۔ گاڑی کی اگلی جانب سے سرخ و سفید رنگت، سیاہ بالوں اور سنجیدہ، پُرعزم آنکھوں کا مالک ایک شخص ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''کسی بھی جنگ میں اسپتال اور مذہبی عمارتوں کو نشانہ نہیں بنایا جاتا۔ میرے ڈرائیور پر اس طرح حملہ کرنے کی آخر کیا وجہ ہے؟'' اس نے باوقار انداز میں دریافت کیا۔

''ہمیں خدشہ ہے کہ اس گاڑی میں اسلحہ موجود ہے۔'' پالے نے تن کر کہا۔

''کیا تمہارا نام جان سکتا ہوں میں؟'' ڈاکٹر نے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔

''پالے خاں ہوں میں۔ آزاد پہاڑی علاقوں کا سپوت۔''

''بہت نام سن رکھا تھا تمہارا۔ ملنے کی خواہش بھی تھی۔ خیر! میرا نام ڈاکٹر موزمدار ہے۔'' وہ شائستگی سے بولا۔

''اس گاڑی میں چھپا اسلحہ ہمارے حوالے کر دو۔ ہم

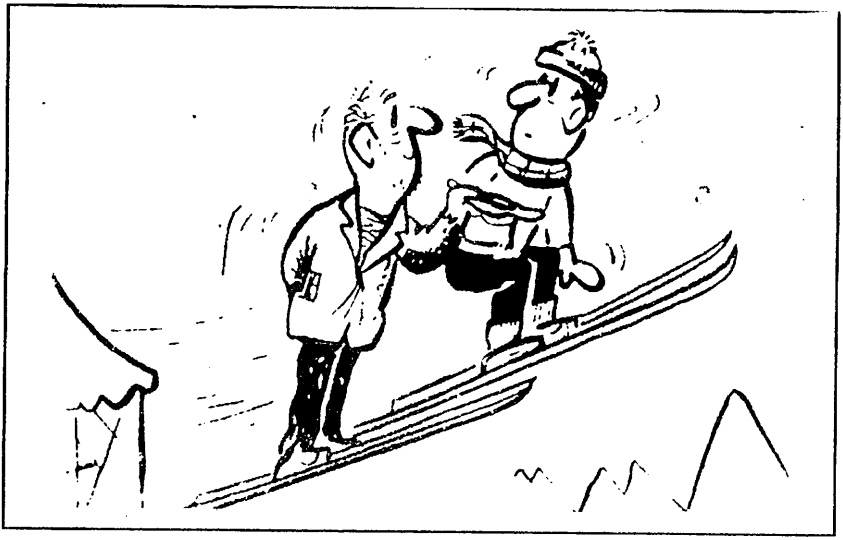

تمہیں جانے سے نہیں روکیں گے۔''

''اس گاڑی میں صرف ایک مریض موجود ہے۔ ہو سکتا ہے وہ تمہارا ہی کوئی دشمن ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اسے جانی نقصان بھی پہنچانا چاہو لیکن میں تمہیں ایسا کچھ نہیں کرنے دوں گا۔ میں نے جس پالے خاں کا نام سن رکھا ہے وہ ایک بہادر اور اعلیٰ ظرف انسان ہے۔ بہادری اور اعلیٰ ظرفی کسی نہتے دشمن کو نشانہ نہیں بنایا کرتی۔ میری زبان پر بھروسا کرو اور ہمیں جانے دو۔ تمہاری تلاشی اور تاخیر ایک مریض کی زندگی کا چراغ بھی گل کر سکتی ہے۔'' موز مدار کا باوقار لہجہ اور شائستہ انداز نظر انداز کیے جانے کے قابل... ہرگز نہ تھے۔ پالے اس کی کشادہ' روشن پیشانی اور شفاف بے ریا آنکھوں سے حسب نسب اور کردار کا اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ ایسا ہی شخص تھا جس پر آنکھیں بند کیے اعتبار کیا جا سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔ میرا کوئی ساتھی تمہیں نہیں روکے گا۔'' پالے نے پل بھر میں ہی فیصلہ کر لیا۔

''شکریہ پالے خاں! ایک ڈاکٹر کی ضرورت تو کبھی کسی کو پیش نہ آئے لیکن پھر بھی زندگی میں کسی مقام پر میری ذاتی یا پیشہ ورانہ مدد درکار ہو تو بلا جھجک چلے آنا۔ مجھے ایک باظرف انسان کے کام آ کر بہت خوشی ہوگی۔'' موز مدار نے وقار سے کہا اور ڈرائیور کی جگہ سنبھال کر گاڑی چلا دی۔ حسن' جمال اور عبداللہ حیرانی اور بے بسی سے پالے کو دیکھنے لگے لیکن وہ کسی بھی جانب توجہ دیے بغیر واپس مڑ گیا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا سردار! اس گاڑی کی تلاشی لینے میں کیا حرج تھا؟'' جمال دبے لفظوں میں بولا۔

''کوئی حرج نہیں تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی غیبی طاقت مجھ سے یہ فیصلہ کروا رہی ہے۔ میں نے یہ معاملہ خدا پر چھوڑا۔'' وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف بڑھ گیا۔ خاموشی' بے نیازی' سنجیدگی اور بے باک دلیری اس کے مزاج پر غالب آتی جا رہی تھی۔ ایلن کی یاد اور محبت دل میں خلش جگاتی تو وہ ولربا کے ساز چھیڑ کر اپنا دل بہلانے لگتا۔ اس وقت بھی طبیعت کی اسی افسردگی کے زیر اثر وہ اپنی انگلیوں کے لمس سے فضا میں خوشگوار سُر بکھیرتے ایلن کے خیال میں کھو گیا۔

پالے خاں کے ان پہاڑوں اور غاروں سے کئی کوس دور ایلن بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ اس کی تشویش اور فکر کا عالم کچھ الگ تھا۔ اسے سب سے بڑی پریشانی یہ لاحق تھی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی پالے کی جانب سے کوئی رابطہ کیوں نہیں کیا گیا؟ اس کی سلامتی اور انگریزوں کے خلاف کارناموں کی دھوم تو بارنس یا کسی نہ کسی افسر کے

توسط سے سن ہی لیتی تھی لیکن اس خاموشی اور غیاب کی کوئی منطق سمجھ آ کے ہی نہ دیتی۔ اسی دوران بارنس ''شین غر'' نامی مقام پر سرکاری دورے پر روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگا۔ باپ بیٹی کے تعلقات اس تھپڑ والے واقعے کے بعد کافی معمول پر آ چکے تھے۔ گلباز کی جانب سے وزیر علی کو خودکشی کے لیے ہتھیار فراہم کرنے کا الزام بھی ایلن نے مہارت اور لاعلمی کی بھرپور اداکاری سے اسی کے گلے میں ڈال دیا۔ بارنس جہاندیدہ انسان تھا۔ اسے بھی علم تھا کہ سختی اور بے جا پابندیاں بیٹی کو مزید باغی کر دیں گی۔ اس نے اپنی حکمت عملی تبدیل کر کے نرمی' توجہ اور محبت سے اسے وقت دینا شروع کر دیا۔ شین غر روانگی کے وقت بھی وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے مصر تھا۔ ایلن ماحول کی تبدیلی اور اپنی سوچوں کی گھٹن سے فرار کے لیے تیار ہو گئی۔

''میری! اگر پالے کا کوئی پیغام آئے تو میری امانت میں خیانت نہ کرنا۔'' اس نے روانگی سے قبل تاکید کی۔

''وہ تمہیں بھول چکا ہے بے بی! اتنا عرصہ ہو گیا کوئی رابطہ نہیں کیا تو اب کیوں کرے گا؟'' میری نے اسے آئینہ دکھایا۔

''وہ کسی وجہ سے مجبور ہے۔ میری محبت اتنی کمزور نہیں ہے کہ وہ اس قدر آسانی سے اس کے اثر سے نکل آئے۔ میری یاد ایسی بے مول بھی نہیں کہ اسے تڑپاتی نہ ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ ہمارا رابطہ ضرور ہو گا۔'' ایلن پُریقین تھی۔ میری اس کے سکون اور ذہنی فتور کے خاتمے کی دعا کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

شین غر پہنچ کر ایک ہموار ٹیلے پر کیمپ لگا لیا گیا۔ میجر بارنس کے ساتھ اس کا ایک نائب اور سپاہیوں کا مکمل رسالہ تھا۔ وہ یہاں ایک خصوصی مقصد کے تحت آیا تھا۔ قادر خاں کی موت سے کچھ روز قبل ہی یہ پہاڑی مقام برطانوی حکومت نے اس سے پچاس سال کے لیے ''لیز'' پر لیا تھا۔ ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ ولی خاں نے سرداری سنبھالتے ہی نفع و نقصان کی پروا کیے بغیر سبھی معاہدے منسوخ کرنے شروع کر دیے تھے۔ اس جگہ کی جانب ولی کی توجہ مبذول ہونے سے پہلے ہی بارنس ایک چوکی قائم کر دینا چاہتا تھا تاکہ فوج تعینات کر کے نشیب میں آزاد علاقے پر نظر رکھی جا سکے۔ اس کے نتیجے میں ہی وہ باغیوں کی سرگرمیوں سے آگاہ ہو کر بروقت کارروائی کرتے ہوئے انہیں کچل سکتے تھے۔ انہی خوابوں کی تعبیر کے لیے انجینئرز کی ٹیم بھی وہیں موجود تھی۔ وہ اس علاقے کا اچھی طرح معائنہ کر رہے تھے۔

ایلن ان سرکاری سرگرمیوں سے بے نیاز علاقے کی خوبصورتی اور قدرتی مناظر کی بہتات سے لطف اٹھایا کرتی۔ اس کا زیادہ تر وقت مصوری' جنگل میں شکار بازی اور گھڑسواری میں گزرتا تھا۔ پالے کی یاد کسی بھی لمحے دل سے جدا ہونے کے لیے تیار ہی نہیں تھی۔ اسے تو یہ بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ ولی خاں کے خصوصی نمائندوں نے فرنگیوں کی ان پراسرار سرگرمیوں کی اطلاع فوری طور پر اسے پہنچا دی تھی جس کے نتیجے میں پالے خاں ولی ہی کی درخواست پر اس علاقے کا جائزہ اور برطانوی افسران کی گوشمالی کرنے یہاں موجود تھا۔

اس روز ایلن گھڑسواری کرتے کافی دور نکل آئی تھے۔ ناہموار ٹیلوں کی سیاحت کرتے گھوڑے کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگ گئی۔ ایلن اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ وہ گھوڑے سے نیچے گری اور ایک ڈھلوان پر پھسلتے ہوئے تیزی سے نشیب میں لڑھکتی چلی گئی۔ پالے اپنے ہتھیار اور دوربین کے ہمراہ وہیں موجود تھا۔ وہ اس بلند سطح سے بارنس کی سرکاری ٹیم کا جائزہ لے رہا تھا۔ گھوڑے پر سوار ایلن کو یقینی موت کی جانب بڑھتے دیکھ کر وہ خود پر ضبط نہ کر سکا اور بجلی کی سی تیزی سے ان ناہموار رستوں کو پھلانگتا ہوا اسے کھائی میں گرنے سے بچا لیا۔ اس ناگہانی آفت پر ایلن کے ہوش و حواس سلب ہو گئے تھے۔

''تھینک یو جنٹلمین!'' وہ اپنا تنفس متوازن کرتے ہوئے بولی۔ خوف سے بند آنکھوں کے باعث وہ پالے کو ابھی تک دیکھ نہیں پائی تھی۔ جانی پہچانی خوشبو اپنے اردگرد چکراتی محسوس ہوئی تو وہ تڑپ کر سیدھی ہو گئی۔

''تم؟ یہاں کیسے؟ میں نے کتنا انتظار کیا تمہارا۔ کوئی ایسے بھی بے رحمی دکھاتا ہے کیا پالے؟''

''میں یہاں کسی ضروری کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ تمہاری جگہ کوئی بھی اس صورت حال میں پھنسا ہوتا تو اسے بچا لیتا۔'' اس نے بقیہ سوال نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بندوق سنبھالی اور واپسی کے لیے رخ موڑ لیا۔

''مجھے کس غلطی کی سزا دے رہے ہو پالے؟'' ایلن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس لمحے اسے پالے خاں خود سے بہت دور اور اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔

''میں کسی بھی جوابدہی کا پابند نہیں ہوں۔ بس اتنا جان لو کہ ہماری راہیں کبھی ایک نہیں ہو سکتیں۔ میرے لیے فرض کی پکار زیادہ ضروری ہے۔ میری زندگی میں آنے والی

پہلی اور آخری عورت تم ہی تھیں۔ اب ایسے کسی رشتے کی گنجائش نہیں.....'' وہ سختی سے کہہ کر اپنی راہ مڑ گیا۔ ششدر اور بے بس ایلن آنسوؤں سے لبریز آنکھوں میں اس کی دھندلائی شبیہہ دیکھتی رہی۔

☆☆☆

ولی خاں کوشین غرمیں ہونے والی سرگرمیوں کی اطلاع دینے کے بعد پالے اپنی والدہ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس بار خلافِ معمول قاسم بھی اس کے ہمراہ تھا۔ والد کی قبر پر فاتحہ کے بعد وہ اپنے گھر پہنچا تو حکیم صاحب کے ہمراہ شہباز خاں کو راجا بی کے پاس دیکھ کر حیران ہوگیا۔ فطری طور پر ہی اسے والدہ کی جانب سے تشویش لاحق ہوئی تھی۔

''بہت اچھے وقت پر آئے ہو پالے! بھابی خانم کو گلی میں ٹھوکر لگنے سے چوٹ لگی ہے۔ ان کی آنکھوں کا علاج نہ کروایا گیا تو بہت سے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔'' شہباز نے اسے بتایا۔

''وہ تنہا گئی ہی کیوں تھیں باہر؟ پہلے تو ہر جگہ زلیخا ان کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔'' پالے کو زلیخا پر ایک بار پھر غصہ آیا۔

''اس کملی کا کچھ نہ پوچھو۔ جانے کیا ہوگیا ہے اسے؟ ہر وقت گھر میں ہی قید رہتی ہے۔ کسی سے بولتی ہے نہ ہی ملتی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس پر کوئی آسیب ہوگیا ہے۔'' شہباز نے بتایا۔

''کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ خوامخواہ نخرے دکھانے کا شوق ہے بس۔'' پالے نے نفرت سے سر جھٹکا۔

''بیٹا! مجھ سے جتنا ممکن ہوا علاج کردیا ہے۔ اب انہیں کسی سرکاری اسپتال میں دکھانا ہوگا ورنہ بینائی مکمل ضائع ہونے کا بھی خدشہ ہے۔'' حکیم صاحب نے حقائق سے آگاہ کیا۔

''اسپتال کیسے جاسکتے ہیں ہم؟ فرنگی تو ایک لمحے میں بھون ڈالیں گے۔'' شہباز پریشانی سے بولا۔ پالے کے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ اسے یکدم ہی ڈاکٹر موز مدار کا خیال آیا تھا۔ پالے نے قاسم کو اس نئے منصوبے سے آگاہ کر کے شہر روانہ کردیا۔ اسے راجا بی کو قائل کرنے کا کٹھن مرحلہ بھی درپیش تھا۔ وہ زلیخا کے بغیر کہیں بھی جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پالے ان کے اصرار اور صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر زلیخا کے گھر جانے پر مجبور ہوگیا۔

زلیخا سے سامنا اور اپنا مدعا بیان کرنا ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ پالے نے زندگی بھر اس لڑکی سے نفرت کی تھی۔ بچپن کی کڑی تپش ایسی طاقتور تھی کہ اس نے بچپن کی سہانی یادوں کو کسی حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ زلیخا نے خلافِ توقع اسے دروازے پر دیکھتے ہی منہ موڑ لیا۔ پالے کے لیے یہ صورتِ حال بہت اہانت آمیز تھی لیکن والدہ کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا۔ انہوں نے واضح لفظوں میں شادی کرنے یا زلیخا کو قائل کرنے کا مطالبہ کردیا تھا۔ شادی کا خیال آتے ہی ایلن سے وابستہ جذبات منتشر کرنے لگے۔ اس نے دل کڑا کر کے زلیخا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آج میں کافی دنوں بعد گاؤں آیا تو علم ہوا کہ میری ماں کی علالت بہت بڑھ گئی ہے۔ انہیں سرکاری اسپتال میں علاج کی ضرورت ہے لیکن وہ تمہارے بنا یہاں سے روانگی کے لیے تیار ہی نہیں۔'' پالے اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اسے یقین تھا کہ زلیخا کوئی نہ کوئی ردِعمل ضرور دے گی لیکن اس کی ویران آنکھوں اور لبوں پر جامد خاموشی پالے کو ایک عجیب اضطراب میں مبتلا کررہی تھیں۔

''مجھے یہ بھی علم ہوا تھا کہ تم کافی دنوں سے وہاں آئی بھی نہیں۔ اگر میری کسی بات نے دکھ دیا ہے تو معذرت چاہتا ہوں۔ تمہاری خالہ خانم تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ ان کے علاج کی کنجی صرف تمہارے پاس ہے۔'' پالے نے نرمی سے کہا۔ زلیخا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے خاموشی سے دروازہ بند کیا اور بے جان سی ہو کر وہیں بیٹھ گئی۔ آنسو چہرے اور گریبان کو بھگو رہے تھے۔ اپنی بے توقیری اور داغدار عصمت کا دکھ اسے کسی سے بھی نظریں ملانے کی ہمت ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے حواس پر آج بھی وہ طوفانی رات سوار تھی۔ اس نے گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ موت کی آرزو کرتی شب و روز آنسو بہاتی زلیخا جینے کی تمنا ہی کھو بیٹھی تھی۔ اپنی بے بسی کا ماتم کرتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ پالے کس وقت مایوس ہو کر دروازے سے لوٹ گیا ہے۔

وہ رات پالے کے لیے بھی کافی کٹھن تھی۔ ماں کی خدمت میں مگن اس کے ذہن میں ڈاکٹر موز مدار کے اقرار یا انکار کی کشمکش ہی جاری تھی۔ اس الجھن کا خاتمہ اگلی صبح ہو گیا۔ قاسم سرکاری اسپتال میں موز مدار سے کامیاب ملاقات کر کے لوٹا تھا۔

''روانگی کی تیاری کرلو سردار! ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کسی طرح مریض کو سرحد تک پہنچا دو۔ باقی معاملات وہ خود سنبھال لے گا۔''

''الٰہی تیرا شکر ہے۔'' پالے کے سر سے بہت بڑا

بوجھ اتر گیا۔ اس نے فوری طور پر سواری کے لیے اونٹ کا بندوبست کروایا۔ راجا بی کا نحیف وجود گھڑسواری کے جھٹکے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق زلیخا بھی اپنے مختصر سامان کی ایک گٹھری بنا کر چلی آئی۔ اس کی متورم آنکھوں کی ویرانی اور خاموشی، اب پالے کو پریشان کرنے لگی تھی۔

''بہت شکریہ زلیخا! مجھے امید تھی کہ تم اسی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کروگی۔'' وہ بے حد ممنون تھا۔

''کاش کوئی اعلیٰ ظرفی تم نے بھی دکھائی ہوتی۔ مجھے ایسے گناہوں کی سزا نہ دی ہوتی جو میں نے کیے ہی نہیں تھے۔'' زلیخا کے زخمی لہجے نے اسے ساکت کردیا۔ وہ اپنی بے گناہی کا تذکرہ تو پہلے بھی کیا کرتی تھی لیکن آج بہت کچھ غیر معمولی تھا۔ اس نے پالے کے جواب کا انتظار کیے بغیر اپنا سامان ساربان کو تھمایا اور راجا بی کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ گاؤں کے ہر فرد نے انہیں ڈھیروں دعاؤں کے سائے تلے رخصت کردیا۔

☆☆☆

قہوہ خانے کی رونق عروج پر تھی۔ قمار بازی میں مصروف افراد کی خدمت کے لیے نیم برہنہ دوشیزائیں مختلف میزوں پر منڈلاتی نظر آرہی تھیں۔ ان کے بدن کے کھلے حصوں پر چٹکیاں بھرتے وہ مخمور افراد جمیلہ کا ہوشربا رقص دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ آج اسے باہر آنے میں کافی تاخیر ہوگئی تھی۔ ان شائقین کی بے تابیوں سے حظ اٹھاتی جمیلہ اس وقت اپنے خصوصی کمرے میں گلباز سے اٹھکیلیوں میں مصروف تھی۔

''اس حسن خاں کا کچھ کیجیے حضور! کئی دن سے آپ سے ملاقات کی ضد لگائے بیٹھا ہے۔'' جمیلہ کو یکدم یاد آیا۔

''کرلیں گے اس کا بھی کچھ نہ کچھ۔ وزیر علی کی نشاندہی کے علاوہ اس نے ابھی تک کیا ہی کیا ہے؟ پالے انگریزوں کو اتنے نقصان پہنچا چکا ہے کہ دل چاہتا ہے اسے اگلا سانس بھی نہ لینے دوں۔'' گلباز نے شراب کا جام لنڈھاتے ہوئے منہ بنایا۔

''وہ کہتا ہے کہ بہت ضروری اطلاع ہے۔ مل لیجیے حضور! میرا تجربہ کہتا ہے کہ اس کی بے تابی بے سبب بھی نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، بھیج دو اسے اندر۔'' گلباز نے بیزاری سے کہا۔ جمیلہ اپنا بکھرا لباس اٹھاتے ہوئے ایک ادا سے اٹھی اور انسانیت کے جامے میں آنے کے بعد حسن کو اندر بلوا لیا جو کافی مضطرب اور منتشر دکھائی دے رہا تھا۔

''کدھر غائب ہوگئے تھے گلباز؟ تم نے جاگیر کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔''

''پالے خاں کے متعلق کوئی مفید اطلاع دوگے تو جاگیر بھی مل جائے گی۔ مفت میں تو کچھ بھی نہیں ملا کرتا میرے دوست!'' گلباز نے جتایا۔

''تو بس پھر سمجھ لو کہ پالے تمہاری مٹھی میں آگیا۔'' حسن نے کمینگی سے کہا۔ ''اس کی والدہ سرکاری اسپتال میں کسی ڈاکٹر موزمدار کے زیر علاج ہے۔ اس ڈاکٹر نے انہیں اپنی والدہ ''لکشمی'' ظاہر کرکے ان کی آنکھوں کا فوری آپریشن کردیا ہے۔ زلیخا بھی اسی کے کوارٹر میں ''رادھا'' نامی بہن بن کر رہ رہی ہے۔ پالے کسی نہ کسی روز ان سے ملاقات کے لیے بھی ضرور جائے گا۔''

''نہ بھی گیا تو میں اسے کسی طرح بل سے نکلنے پر مجبور کردوں گا۔'' گلباز نے ایک اور جام خالی کرتے ہوئے حسن کو کچھ نقدی تھمائی اور وہاں سے اٹھتے ہی میجر بارنس کی رہائش گاہ پہنچ کر اسے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

''یہ تو بہت کام کی خبر سنائی ہے تم نے کیپٹن! اس موذی سانپ کو کچلنے کا بہترین موقع ملا ہے ہمیں۔ تم کسی بھی طرح پالے خاں تک ایک جھوٹی خبر پہنچادو کہ اس کی والدہ کا آخری وقت ہے۔ وہ بیٹے سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تصدیق کے چکر میں نہیں پڑے گا۔ اس کے اسپتال پہنچتے ہی ہم اسے اور غدار ڈاکٹر کو گرفتار کرکے عبرت کا نشان بنادیں گے۔'' بارنس نے گلباز کے دل جذبات کو گویائی دے دی۔ اس متوقع کامیابی کو زور و شور سے عملی جامہ پہنانے کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے انہیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ ایلن نے یہ گفتگو حرف بہ حرف سن لی ہے۔

ہجر اور کرب کی تپش میں جھلستی ایلن سے زندگی کی رعنائیوں نے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ دھیمی آنچ پر ہمہ وقت سلگتی پالے کے سنگ بیتے لمحات اور اس کی باتیں یاد کرتی رہتی۔ اسے پالے کے یکطرفہ فیصلے سے بھی شدید گلے تھے لیکن کوئی بھی جواب تو اس سے ملاقات کی صورت میں ہی مل سکتا تھا۔ ملاقات بھی ممکن نہ ہو پا رہی تھی کیونکہ اس ہرجائی نے خود تک رسائی کا ہر راستہ مسدود کردیا تھا۔ میجر بارنس اور کیپٹن گلباز کی گفتگو سننے کے بعد اسے اپنے قدموں تلے زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی۔ پالے کی گرفتاری کے بعد اسے اذیت ناک موت سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ ایلن نے فوری

طور پر اسپتال روانگی کا فیصلہ کرلیا۔

سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر موز مدار راجابی کی بہترین خدمت اور تیمارداری میں مصروف تھا۔ آپریشن نہایت کامیاب ثابت ہوا تھا۔ پٹی کھلنے میں بھی صرف چند ہی روز باقی تھے۔ راجابی کو اس سادہ طبیعت اور پُرخلوص ڈاکٹر نے اس قدر متاثر کیا کہ اس نے موز مدار کو دلی طور پر اپنا دوسرا بیٹا تسلیم کرلیا۔ والدین کے سائے سے محروم ڈاکٹر موز مدار بھی اس شفیق خاتون کی محبتوں کا قائل ہوکر اسے والدہ ہی کی طرح عزت و توجہ دیتا۔ زلیخا کی خاموشی اور افسردگی البتہ جوں کی توں برقرار تھی۔ اسپتال سے آنے کے بعد وہ موز مدار کے کوارٹر میں صفائی ستھرائی اور کھانا پکانے میں مصروف ہوجاتی۔ اس روز بھی وہ باورچی خانے میں ہی مصروف تھی کہ دروازے پر ہونے والی دستک سے خوفزدہ ہوگئی۔ اپنی شناخت کا بھرم کھل جانے کے خدشات ہمیشہ دامن گیر رہتے تھے۔ وہ اپنے اعصاب پر قابو پاتی ہوئی دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''زلیخا! مجھے علم ہے کہ تم اندر موجود ہو۔ میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ اسپتال جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ دروازہ کھولو۔'' ایلن نے التجا کی۔ زلیخا نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ اس نے جلتی آنکھوں اور پھڑپھڑاتے دل پر قابو پاتے ہوئے اسے اندر بلوالیا۔ ایلن کی دید زخموں کے لیے ٹھیس ثابت ہوئی۔ اسے سامنے پاکر پالے کی نفرت اور گلباز کی ہوس و وحشت نے روح کو ایک بار پھر روند دیا تھا۔

''کہو! کیا کہنے آئی ہو؟'' وہ بے رخی جتائے بغیر نہ رہ سکی۔

''زلیخا! اپنے پسندیدہ مرد کے بارے میں ایک عورت کی نظریں اور حسیات بہت تیز ہوتی ہیں۔ اس کے متعلق کوئی بھی راز خودبخود الہام کی طرح دلوں پر اترتا ہے۔ مجھے علم ہے کہ تم پالے خاں سے بہت محبت کرتی ہو۔ محبت کی یہ جڑیں شاید میرے جذبات سے بھی زیادہ گہری ہیں۔ میں بھی اس ظالم انسان کو بہت چاہتی ہوں۔ مجھے نہیں علم کہ اس نے یکدم ہی اپنی راہیں جدا کرکے مجھے خود سے کیوں دور کردیا ہے۔'' ایلن جذبات کی شدت سے ہانپ رہی تھی۔

''کیا تم نے یہی سب کہنے کے لیے اتنا طویل سفر کیا ہے؟'' زلیخا نے طنز کیا۔

''نہیں میری بہن! میں تو یہ بتانے آئی ہوں کہ سرکاری طور پر پالے کی گرفتاری کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ وہ اسے کسی طرح جھوٹی خبر پہنچا کر اسپتال بلوائیں گے اور گرفتار کرلیں گے۔ میرے پاس وزیرعلی کے بعد پالے تک پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ تم تو انہی پہاڑوں کی بیٹی ہو۔ اسے کسی طرح اطلاع پہنچادو کہ اپنی والدہ کے متعلق کسی بھی خبر پر یقین نہ کرے۔ اس کے لیے جال تیار کیا جارہا ہے۔'' ایلن رونے لگی۔ زلیخا بھی صورتِ حال کی سنگینی محسوس کرکے شل رہ گئی۔

''میں خود اسے یہ اطلاع پہنچانے جاؤں گی۔ پالے کو کچھ نہیں ہوگا۔ اسے کوئی بھی نقصان پہنچنے کا مطلب آزاد قبائلی علاقے میں تحریک آزادی کا جمود ہے۔ میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گی۔'' زلیخا تھراتے ہوئے بولی۔

ڈاکٹر موز مدار کو اس نئی صورتِ حال کے متعلق آگاہ کرکے وہ ایک تیز رفتار گھوڑے پر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ رستے کی مشکلات اور طویل سفر نے اس کے جسم کا جوڑ جوڑ ہلا دیا۔ ہمت ٹوٹنے لگتی تو پالے کی سلامتی کا تصور اسے ایک نئی توانائی فراہم کردیتا۔ نقاہت اور چکراتے سر نے بے طرح نڈھال کردیا تھا۔ وہ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں کی سرحد میں داخلے کے کچھ ہی کوس بعد بے دم ہوکر گر گئی۔ اہلِ علاقہ اسے اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ اس کی بے ہوشی پر فوری طور پر حکیم صاحب کے پاس لے جایا گیا۔ اگلے چند لمحوں بعد حکیم صاحب کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی تھی۔

''کیا بات ہے قبلہ؟ بچی کی حالت زیادہ تشویشناک تو نہیں۔ خدا جانے یہ کس پریشانی میں اس قدر طویل فاصلہ طے کرکے آئی ہے۔'' گاؤں کے ایک معزز شخص نے کہا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ پالے خاں کو بھابی خانم کی طبیعت کے متعلق ہی بتانے آئی ہوگی۔ اطلاع ملی ہے کہ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ پالے تو ان سے ملنے روانہ بھی ہوگیا ہے۔'' شہباز خاں نے قیاس لگایا۔

''ایک کے بعد ایک بری خبروں نے اس علاقے کی راہ ہی دیکھ لی ہے امام صاحب!'' حکیم نے اپنی عرق آلود پیشانی صاف کی۔ ''دعا کیجیے کہ یہ ہوش میں آنے ہی نہ پائے۔ اسی بے ہوشی میں اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔ اس کی دوشیزگی ختم ہوچکی ہے۔ اس کے وجود میں ایک اور زندگی پرورش پارہی ہے۔''

یہ انکشاف کسی دھماکے سے کم نہ تھا۔ شہباز خاں کو اپنے قدموں تلے زمین کھسکتی اور سر پر آسمان ٹوٹتا محسوس ہوا تھا۔ ایک غیر شادی شدہ لڑکی کے اس گناہ پر بطور سرپنچ گناہ گار

... کا تعین کر کے سنگساری کی سزا دینا زندگی میں پہلی بار بہت کٹھن مرحلہ ثابت ہوتا تھا۔

☆☆☆

فورٹ سینڈیمن اسپتال کے سامنے درختوں کے جھنڈ میں کھڑا پالے عقابی نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ایک طویل مسافت کے بعد شدید خطرہ مول لے کر یہاں پہنچا تھا۔ ڈاکٹر موزمدار کی جانب سے ملنے والی اطلاع نے اس کے ہوش وحواس سلب کر لیے تھے۔ گھوڑا ایک درخت سے باندھنے کے بعد وہ محتاط انداز میں ہی آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں یہاں آمد کے بعد کوئی واضح حکمتِ عملی تو موجود نہ تھی البتہ قسمت عروج پر تھی کہ اسپتال کی عمارت سے ایک ڈاکٹر نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک فوری خیال کے تحت پالے خاں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ دبے قدموں اس شخص کے عقب میں پہنچا اور نپے تلے وار سے اسے بے ہوش کر کے جھنڈ تک گھسیٹ لایا۔ اس کا طبی سامان اور لباس قبضے میں لینے کے بعد وہ نہایت اعتماد سے اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ استقبالیہ پر موجود لڑکی سے ڈاکٹر موزمدار کی والدہ کشمی کا کمرا جاننے میں بالکل دقت نہ ہوئی۔ وہ موزمدار کو بھی اس کمرے میں بھیجنے کا کہہ کر بے تابی سے آگے بڑھ گیا۔ تشویش اور پریشانی میں اس کی دھڑکنیں منتشر تھیں۔ وارڈ میں داخل ہوتے ہی راجا بی کو صحیح سلامت اور ہشاش بشاش حالت میں بستر پر لیٹے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اسی اثناء میں ڈاکٹر موزمدار بھی وہیں چلا آیا۔

''میں نے تمہیں پیغام بھجوایا تھا پالے کہ یہاں مت آنا۔ تم نے میری کیوں نہ سنی؟'' وہ جھنجلا کر بولا۔ پالے جیسے شخص سے ایسی حماقت کی توقع نہ تھی۔

''تم نے مجھے یہ پیغام بھیجا تھا کہ میں فوری طور پر یہاں آؤں کیونکہ ماں اپنے آخری وقت میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔'' پالے نے الجھ کر کہا۔ راجا بی بیٹے کی آواز سن کر بے چین ہو گئیں۔

''میرا بیٹا آیا ہے۔ کیسا ہے تو میرے چاند؟''

''یہاں آنے سے پہلے ٹھیک نہیں تھا لیکن اب اپنی صحیح سلامت دیکھ کر پُرسکون ہو گیا ہوں۔'' اس نے والدہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

''مجھے کیا ہونا تھا بھلا؟ میرا یہ دوسرا بیٹا دن رات میری خدمت میں جتا رہتا ہے۔ کچھ ہی دن میں آنکھوں کی پٹی اترے گی تو گھر لوٹ آؤں گی۔'' وہ اس کا چہرہ ٹٹولتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے پالے! میجر بارنس کی بیٹی نے مجھے بتایا ہے کہ انگریز تمہاری گرفتاری کے لیے کوئی جھوٹی خبر پہنچا کر تمہیں گھیرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد میں انہیں تمہارے ہی ایک ساتھی حسن خاں کا تعاون بھی حاصل ہے۔ میں نے فوری طور پر زلیخا کو گاؤں بھیج دیا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس سے پہلے ہی تم یہاں چلے آئے ہو۔ اب وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً لوٹ جاؤ۔ میں ان کی حفاظت کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔'' موزمدار نے راجا بی کی طرف اشارہ کیا۔

حسن خاں کی غداری کا انکشاف پالے کے دل و دماغ میں بھونچال پیدا کر گیا تھا لیکن اس نے کسی بھی بحث یا مزید بات چیت کے بغیر روانگی کا ارادہ کر لیا۔ جھنڈ میں اپنے گھوڑے کے پاس پہنچتے ہی وہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ میجر بارنس اور گلباز خاں کئی درجن سپاہیوں کے ہمراہ اس کی گرفتاری کے لیے وہاں موجود تھے۔ پالے نے اس مضبوط جال سے نکلنے کا رخنہ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن درجنوں بندوقوں میں محفوظ فرار یا مزاحمت کا تصور ہی حماقت تھی۔ اس کے وجود میں پارا مچل رہا تھا۔ حسن خاں اور گلباز کو نیست ونابود کرنے کے لیے انگلیوں کی اینٹھن بڑھنے لگی لیکن پاؤں میں ڈالی جانے والی بیڑیوں، گردن کے طوق اور ہاتھوں میں ہتھکڑیوں نے اسے زندگی میں پہلی بار بے بس کر دیا تھا۔ میجر بارنس نے اسے فوری طور پر خصوصی گاڑی میں منتقل کروا کر جیل خانے بھجوا دیا جہاں جبر وتشدد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

قہوہ خانے کی رونقیں حسبِ معمول عروج پر تھیں۔ شراب نوشی اور قمار بازی کا دور جاری تھا۔ حاضرین کی اکثریت جمیلہ کا رقص دیکھنے کے لیے بے تاب تھی۔ سرشار اور خوشی سے چہکتا ہوا گلباز جمیلہ کے خصوصی کمرے میں داخل ہوا تو گرمجوشی اور خود سپردگی نہ پا کر ٹھٹک گیا۔ آئینے کے سامنے اپنی آرائش وزیبائش میں مشغول جمیلہ کا چہرہ ستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

''کیا بات ہے جانِ من! آج تو بدلے بدلے سے سرکار نظر آتے ہیں۔'' گلباز نے آتے ہی چٹکی بھری۔

''جی ہاں! آپ جو اتنے خوش باش اور مطمئن نظر آ رہے ہیں۔'' وہ پھیکی سی ہنسی سے بولی۔

"میرا کارنامہ سنوگی تو خوشی سے گلے کا ہار بن جاؤ گی۔" گلباز اترایا۔ "میری دن رات کی محنت رنگ لے آئی ہے۔ میں نے پالے خاں کو جیل خانے کی کال کوٹھری میں پہنچا دیا ہے۔ اب اسے انگریز سرکار کے عتاب سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ سسک سسک کر مرے گا وہیں۔"

"پالے کی گرفتاری کا ردعمل بھی جان لینا تھا سرکار۔" جمیلہ نے طنز کیا۔ "حسن خاں کو یہیں خنجروں کے وار سے موت کے گھاٹ اتار گیا کوئی۔ علاقے میں یہ خبر عام ہو چکی ہے کہ وہ سرکاری مخبر بن چکا تھا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" گلباز دنگ رہ گیا۔ اسے حسن کا راز کھل جانے کی ذرّہ بھر بھی توقع نہیں تھی۔

"اتنی بے خبری آپ کے عہدے کے لیے اچھی نہیں سرکار! آپ کو تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ آپ ہی کے علاقے کی ایک لڑکی زلیخا کے لیے بہت جلد پنچایت بلوائی جا رہی ہے، سنا ہے کہ اس کے وجود میں نئی زندگی پرورش پا رہی ہے۔" جمیلہ کے اس انکشاف نے گلباز کی سٹی گم کر دی۔ اسے طوفانی رات میں اپنا ایک گناہ بڑی شدت سے یاد آیا تھا۔ پنچایت بلوا کر گناہ گار کا تعین ہو جاتا تو اس کی سنگساری یقینی تھی۔ گلباز کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے زلیخا سے فوری ملاقات کا فیصلہ کر لیا اور رات کی تاریکی میں چھپتا چھپاتا اس کے گھر پہنچ گیا۔ زلیخا کے شکم پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی حقارت اور کراہت پوشیدہ نہ رکھ سکا۔ زلیخا کی آنکھوں میں طیش کی چنگاریاں دہکنے لگیں۔

"بڑا ہی عجیب دستور ہے اس کائنات کا۔ صدیوں سے عورت ہی مرد کے جبر اور ہوس کا نشانہ بنتی آئی ہے اور پھر ملامت، طعنے، نفرت و حقارت بھی اسی کا نصیب بنتے ہیں۔" زلیخا نے تنفر سے کہا۔

"پنچایت میں اپنی زبان کھولنے سے پہلے ایک بات ذہن میں رکھ لینا۔ پالے کی ماں میرے رحم و کرم پر ہے۔ اس کی زندگی اور سلامتی میرے ہاتھ میں ہے۔" گلباز نے سفاکی سے جھوٹ بولتے ہوئے اسے گھورا اور مزید کوئی بھی بات کیے بغیر محتاط نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے واپس ہو گیا۔ اس کے دل کا چور کسی بھی طور چین نہ لینے دے رہا تھا۔

☆☆☆

پالے خاں کا وجود قیامت خیز تشدد جھیل کر نڈھال ہو چکا تھا۔ میجر بارنس نے اسے اپنے ہم وطنوں کی ہزیمت کے بدلے میں حیوانی تشدد کا نشانہ بنوایا تھا۔ اسے تختۂ مشق بنانے کے ساتھ ڈاکٹر موز مدار کو بھی زندگی سے محروم کر دیا گیا۔ پالے کو اس جواں مرد، بااصول اور اعلیٰ ظرف شخص کی موت کا بہت دکھ تھا۔ اس نے مرنے سے قبل بھی پالے پر ایک احسان کر دیا تھا۔ پالے کے حراست میں آنے اور اپنی گرفتاری کے وقفے میں راجابی کو اپنے ایک بااعتماد شخص کے ساتھ نامعلوم مقام پر بھجوا دیا۔ اس کا ہم پیشہ یہ ساتھی راجابی کی صحت یابی کے بعد اسے گاؤں منتقل کر دیتا۔

اس قید خانے میں دن اور رات کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ جسم کا ہر ایک ریشہ ادھڑا ہوا محسوس ہوتا۔ اسی دوران اسے خصوصی منصوبہ بندی کے تحت ایک ملٹری کانوائے کے ساتھ کوئٹہ روانہ کر دیا گیا۔ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے پالے خاں کو جس ٹرک میں رکھا گیا تھا وہاں چار مسلح فوجی بھی موجود تھے۔ اس ٹرک کے عقب میں بھی ایک حفاظتی گاڑی کا بندوبست کیا گیا۔ برطانوی سرکار کے اس معتوب ترین شخص کے لیے کسی بھی قسم کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔

ٹرک متوازن رفتار سے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔ شام کے سائے سرمئی چادر اوڑھنے لگے۔ اسی اثناء میں اس پتلی سڑک پر بھیڑوں کا ایک ریوڑ خراماں خراماں چلتا ٹرک کے آگے چلا آیا۔ ڈرائیور کے پاس رکنے کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اگلے ہی لمحے عقبی گاڑی اور ٹرک کے درمیان بھی بھیڑوں کا ریوڑ چلا آیا۔ مسلح فوجی اس صورتِ حال سے کوفت زدہ ہو گئے۔ ان نیم باز بھیڑوں کے انداز و اطوار سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اتنی آسانی اور رفتار سے آگے نہیں بڑھیں گی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اس ریوڑ کے ساتھ کوئی چرواہا بھی موجود نہ تھا۔ مجبوراً انہیں ہی باہر آ کر ریوڑ کو ایک جانب ہانکنا پڑا۔ مسلح افراد کے باہر آتے ہی ان پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ سڑک کے کنارے درختوں کی شاخوں میں پوشیدہ پالے خاں کے ساتھیوں نے انہیں بلادریغ بھون دیا۔ انہیں اس قافلے میں مقامی افراد کی موجودگی کی بھی پروا نہ تھی۔ وہ سبھی دلی طور پر ایسے مقامی افراد کو سخت ترین سزا کے لائق سمجھتے تھے جو برطانوی حکومت کے پاس اپنا ایمان اور وفا رہن رکھوا کر ان کی چاکری اختیار کر لیتے۔ چند ہی لمحوں میں صورتِ حال تبدیل ہو چکی تھی۔ درجنوں خونچکاں لاشیں وہیں چھوڑ کر پالے خاں کو آزاد کروا لیا گیا۔ اپنے محفوظ پہاڑی مقام پر پہنچ کر اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی گئی۔

"حسن خاں کی ضمیر فروشی کا مجھے بہت افسوس ہے۔

اس نے ا... خاندان کو ذلیل و رسوا کر کے رکھ دیا۔ وہ تاعمر اس کی غداری کا طوق برداشت کریں گے۔'' پالے نے دکھ سے کہا۔

''ایسا نہ کرو سردار! اس مردود کو غداری کی سزا مل چکی ہے۔'' جمال نے بتایا۔ ''ہمیں اس نیک دل ڈاکٹر کی موت کا افسوس ضرور ہے۔ اس نے حقیقی معنوں میں مسیحائی کا حق ادا کیا۔ بہت دلیر شخص تھا وہ۔''

''ہاں! اس نے زلیخا کے توسط سے مجھے اس سازش سے آگاہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن قسمت میں یہ پھیر لکھا جا چکا تھا۔'' پالے نے تاسف سے کہا۔

''زلیخا کی بھی سمجھ نہیں آتی سردار! ایک جانب تمہاری سلامتی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر رکھے چلی آئی اور دوسری طرف ایسی گناہ گار زندگی۔ مجھے تو اس کے کردار اور فطرت کا یہ تضاد سمجھ ہی نہیں آیا۔'' قاسم نے اضطراب سے ہاتھ مسلتے ہوئے اسے زلیخا کی جسمانی کیفیت اور متوقع پنچایت کے متعلق بتایا۔

''نہیں قاسم! میں یہ بات کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ بچپن سے جانتا ہوں میں اسے۔ اس کا کردار ہمارے پہاڑوں ہی کی طرح بلند ہے۔ وہ رضامندی سے کسی گناہ میں شریک نہیں ہو سکتی۔'' پالے نے بے اختیار جواب دیا۔

''ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ پنچایت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو ہی جائے گا۔'' جمال نے کندھے اچکائے۔ پالے نے اپنی خستہ حالت کے باوجود پنچایت میں جا کر زلیخا سے بات چیت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے روز گاؤں میں رہائشیوں کی کثیر تعداد چوپال میں جمع ہو چکی تھی۔ شہباز خان اور دیگر معززین نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ ان سبھی کی سوالیہ نظریں زلیخا پر گڑی تھیں جو پاؤں کے انگوٹھے سے کچی زمین کی مٹی کرید رہی تھی۔

''زلیخا! پنچایت جاننا چاہتی ہے کہ تمہارے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کا ذمے دار کون ہے؟'' شہباز خان نے نرمی سے پوچھا۔ زلیخا کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ اس کے وجود میں مزاحمت کی ایک بلند لہر اٹھی تھی۔ وہ علاقے بھر کے سامنے گلباز کی قلعی کھول دینا چاہتی تھی لیکن راجا جی کا نحیف اور پٹیوں میں جکڑا وجود آتے ہی یہ مزاحمت بے بسی سے پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ اس نے ہونٹوں پر قفل ڈالے رکھنے میں ہی عافیت سمجھی۔

''زلیخا بنت گل محمد! کیا ہم یہ سمجھیں کہ تم بھی اس گناہ میں متوازی طور پر شریک تھیں؟'' شہباز کے اس سوال پر اس کی نگاہوں میں اپنا مچلتا اور جکڑا ہوا وجود گردش کرنے لگا۔

''ہم آخری بار پوچھ رہے ہیں زلیخا! گناہ گار کا نام بتاؤ ورنہ یہ پنچایت تمہیں قصور وار ٹھہرا کر سنگسار کرنے کا حکم سنا دے گی۔'' شہباز کے انداز اور الفاظ کی سختی پر اس نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ اسے ہر جانب مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ پنچایت نے اسے گناہ گار ٹھہرا کر سزا سنا دی تھی۔ خشونت زدہ تاثرات اور آنکھوں میں نفرت لیے کئی افراد نے ہاتھوں میں پتھر تھام لیے تھے۔ زلیخا کو پیشانی، چہرے... ہاتھوں اور کمر پر شدید درد کا احساس ہوا۔ سزا پر عملدرآمد شروع ہو چکا تھا۔ بقا کے جبلی احساس نے اسے وہاں سے اٹھ کر ایک جانب دوڑ لگانے پر مجبور کر دیا۔ پتھر بردار مجمع اس کے تعاقب میں تھا۔

''رک جاؤ سب! یہ بے قصور ہے۔'' ایک کڑکدار آواز نے انہیں ساکت کر دیا۔ ان کے سامنے پالے خان موجود تھا جو اپنے گھوڑے پر سوار اسی لمحے وہاں آیا تھا۔

''تم یہ دعویٰ کس بنیاد پر کر سکتے ہو پالے؟'' گاؤں کے ایک معمر شخص نے پوچھا۔

''ہم دونوں نے شادی کر رکھی ہے محترم! اسپتال میں آپریشن ہونے سے پہلے ہم نے نکاح کر لیا تھا۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا۔ زلیخا حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔ یہی کیفیت حکیم صاحب کی بھی تھی۔ ان کا تجربہ اور علم شاہد تھا کہ زلیخا کے وجود میں پرورش پانے والی زندگی کو تخلیق ہوئے کافی عرصہ بیت گیا ہے۔ وہ پالے خان کو بغور دیکھنے لگے۔ ان کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ یہ معاملہ بہت ٹیڑھا اور کسی حد تک خطرناک ہے۔ پالے... خوامخواہ اتنا بڑا عذر نہیں تراشے گا۔ شہباز خان نے بھی اس نئی صورت حال کے پیش نظر پنچایت کا وہ اجلاس غیر معینہ مدت تک مؤخر کر دیا۔ اس جانب سے سکون ہوتے ہی پالے زلیخا کو لیے اپنے گھر چلا آیا۔

''تمہیں اپنا کردار مشکوک کرنے کی کیا ضرورت تھی پالے؟ مل جانے دیتے مجھے یہ سزا۔'' وہ کرب سے بولی۔

''مجھے اس مردود کا نام بتاؤ زلیخا! خاموش رہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' پالے نے اس کا بازو سختی سے دبوچا۔ زلیخا کی سماعت میں گلباز کی دھمکی گونجنے لگی۔ وہ سراسیمہ ہو گئی۔

''تمہیں کسی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے نہیں دوں گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہارے مجرم کو عبرتناک سزا دوں گا۔ ماں کی آمد سے پہلے اس مسئلے کا حل نکالنا بہت ضروری ہے۔ اس

کے بعد ہی انہیں بھی پنچایت میں اپنے دعوے کے متعلق اعتماد میں لوں گا۔'' پالے کی اس بات پر زلیخا چونک گئی۔ اس سے تو اندازہ ہو رہا تھا کہ راجابی بحفاظت ہے۔ اس لیے زلیخا کی بصارت سے خوف کے کئی پردے ہٹ گئے۔ اسے آخری ملاقات میں گلباز کی وحشت اور بدحواسی پہلی بار یاد آئی۔ اگر اس کے پاس ترپ کا یہ پتا موجود ہوتا تو وہ لازماً فرعونیت زدہ لہجے میں گفتگو کرتا۔ کسی چور کی طرح خاموشی سے عجلت میں فرار کو کبھی بھی ترجیح نہ دیتا۔

''ہمارا دشمن مشترک ہے پالے! گلباز نامی اس ناگ کو کچلا نہ گیا تو وہ ہمارے علاقے کے لیے دائمی کلنک بن جائے گا۔'' زلیخا کی پامالی کا کرب آنسوؤں کی صورت میں بہنے لگا۔ پالے اس کے مجرم کا نام اور پھر خاموشی کی وجہ جان کر سناٹوں کی زد میں آ گیا۔ اپنے والد کے جاں نثار دوست اور امام صاحب کی اکلوتی اولاد کو اخلاقی گراوٹ کی ایسی سطح پر دیکھنا اس کے لیے ہرگز آسان نہیں تھا۔ پالے نے اس فتنے کے مزید سر اٹھانے سے قبل ہی گلباز کے خاتمے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

تقدیر کی ستم ظریفی نے گلباز خاں کے سبھی خواب تاش کے پتوں کے مانند بکھیر دیے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں پالے خاں سے سب سے زیادہ نفرت کی تھی لیکن اس کے مقام میں رتی بھر بھی کمی نہ کر پایا۔ زلیخا کے ساتھ گناہ آلود لمحات بسر کرنے کے بعد وہ ایک بہت بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وقتی طور پر تو زلیخا کی زبان بندی کروانے کے باوجود یہ خدشہ بہرحال اپنی جگہ برقرار تھا کہ پالے کی والدہ کے گاؤں تک پہنچتے ہی یہ حفاظتی بند بھی ٹوٹ جاتا۔ یہی خدشات کم نہ تھے کہ میجر بارنس کے بدلتے تیوروں نے اسے مزید تشویش زدہ کرنا شروع کر دیا۔ آغاز میں بہت روشن خیال اور غیر روایتی دکھائی دینے والا وہ افسر اپنی قومی روایات سے مغلوب ہو کر تعصب' جبر اور انا پرستی کے خول میں سمٹ آیا۔ ایلن کے دلائل نے اسے اس بارے میں قائل کر لیا تھا کہ پالے کے فرار میں کہیں نہ کہیں گلباز کی معاونت بھی شامل رہی تھی۔ نتیجتاً بارنس اس کے متعلق خاصا مشکوک ہو گیا۔ طاقت اور وسیع تر اختیارات حاصل کرنے کے اس لالچ نے اسے گھر کا چھوڑا نہ ہی گھاٹ کا۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لیے اکثر قہوہ خانہ جا کر جمیلہ کی آغوش میں راہِ فرار تلاش کرنے لگا۔

''اتنا بددل تو آپ کو کبھی بھی نہیں دیکھا حضور! تھوڑا مشکل وقت ہے کٹ ہی جائے گا۔'' جمیلہ نے اسے جام بنا کر دیا۔

''تم میرے علاقے کے لوگوں کو نہیں جانتیں۔ اگر انہیں بھنک بھی پڑ گئی کہ زلیخا کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا مجرم میں ہوں تو وہ مجھے پاتال سے بھی ڈھونڈ کر سنگسار کر دیں گے۔'' گلباز کے اس جواب پر جمیلہ خاموش ہو گئی۔ وہ شراب اور شباب کے ساتھ بیک وقت اس کا دل بہلانے لگی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ قہوہ خانے کے منتظم نے گلباز کو گلریز خاں کی آمد سے مطلع کیا۔ گلباز نے اسے خود ہی تازہ ترین صورت حال سے آگاہی کے لیے بلایا تھا۔

''سرکار! پالے خاں کی ماں گاؤں لوٹ چکی ہے۔ اس کی آنکھیں اب بالکل تندرست ہیں۔'' گلریز نے پہلی اطلاع دی۔

''پنچایت کا کیا فیصلہ ہوا؟'' گلباز نے جام پر گرفت سخت کی۔

''بے نتیجہ رہا۔ پالے نے سب کے سامنے اقرار کر لیا کہ زلیخا اور اس کا نکاح ہوا ہے اور.....'' گلریز نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ گلباز کو لگنے والے اس جھٹکے نے اس کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ اپنی سب سے بڑی مشکل کی ایسی آسانی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

''اور تمہارے سرپنچ صاحب کیسے ہیں؟ کیا انہوں نے اس بات کا یقین کر لیا؟'' گلباز نے حقارت سے اپنے والد کا ذکر کیا۔

''وہ تو بالکل ہی خاموش بلکہ گم صم سے رہنے لگے ہیں۔ نماز کی امامت کے دوران روتے ہوئے ان کی ہچکیاں بندھ جاتی ہیں۔ کہتے ہیں میں ایک ناکام شخص ہوں۔ میں تو امامت کے قابل ہی نہیں۔''

''انہوں نے دین اور آخرت کو اپنے سر پر کچھ زیادہ ہی سوار کر لیا ہے۔ کبھی ترقی کر ہی نہیں سکتے وہ۔'' گلریز کے انکشاف کی گہرائی سمجھے بغیر وہ بیزاری سے بولا۔

''میں جاؤں حضور؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ گلباز نے ایک بڑی مالیت کا نوٹ اسے تھمایا اور جانے کا اشارہ کر دیا۔ اسے اپنے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ ذہنی دباؤ کم ہوا تو نئے خیالات نے یلغار کر دی۔ اسے میجر بارنس اور ایلن سے اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے بہترین طریقہ سوجھا تھا۔ وہ فوری طور پر اٹھا اور اپنا لباس درست کر کے بارنس کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا جہاں باپ بیٹی غالباً لیچے پر ہی شطرنج کی بازی جمائے بیٹھے تھے۔

''آپ کا دھیان کھیل کی طرف نہیں ہے پاپا! کس سوچ میں کھو جاتے ہیں بار بار؟'' ایلن جھنجلا کر بولی۔

''کچھ نہیں! سوچ رہا ہوں کہ اپنے پیش روؤں کی طرح میں بھی اس قبائلی علاقے میں ناکامی کا داغ لگوا کے لوٹوں گا۔ پالے خاں اپنی قوم کا ہیرو بن جائے گا کہ اسے کوئی بھی انگریز افسر زیر نہیں کر سکا۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا سر! آپ تو بہت خوش قسمت افسر رہے ہیں۔ یہ آپ کے مبارک قدم ہی تو تھے کہ پالے خاں کی شخصیت کا تراشا گیا بت اب پاش پاش ہونے کے قریب ہے۔'' گلباز نے خوشامد کی۔

''کہیں اس طرح تم اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش تو نہیں کر رہے کیپٹن؟'' ایلن نے طنز کیا۔

''مجھے ایسا کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں مس صاحبہ! آپ چاہیں تو خود اس بات کی تصدیق کر لیجیے' پالے خاں نے گاؤں بھر کے سامنے پنچایت میں دعویٰ کیا ہے کہ اس نے زلیخا سے نکاح کر لیا ہے لیکن اکثریت کو یہی شک ہے کہ وہ اپنی محبت کی نشانی کے وجود میں آنے پر یہ جھوٹ تراش رہا ہے۔ اس طرح وہ سنگساری سے بچنا چاہتے ہیں۔'' گلباز کے ان الفاظ نے ایلن کے وجود کے پرخچے اڑا دیے۔

''جھوٹ بول رہے ہو تم! پالے زلیخا سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ انگریز دشمنی اسے وراثت میں ملی ہے۔ انگریزوں کو نقصان پہنچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔'' گلباز نے چوٹ کی۔ ایلن کی رنگت میں گھلی زردی اسے دلی طور پر سکون پہنچا رہی تھی۔ وہ نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھتی اندر چلی گئی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں برپا تھیں۔ دل تسلیم کر لینے کے لیے تیار ہی نہ تھا کہ پالے نے اسے کسی مطلب کے لیے سیڑھی بنا کر استعمال کیا ہے۔ بے چینی اور بے بسی ناقابلِ برداشت ہوئی تو اس نے میری کو اعتماد میں لیا اور میلے پر پہنا جانے والا لباس زیب تن کیے انہی جانے پہچانے رستوں پر روانہ ہو گئی۔ اس کے ذہن میں کوئی واضح حکمتِ عملی تو نہیں تھی البتہ وہ اس الجھن کا کوئی سرا ڈھونڈنا چاہتی تھی۔

شام کے سائے گہرے ہوتے ہی وہ پالے کے گھر کی عقبی سمت پہنچ گئی..... وزیر علی کے ساتھ آمد کے بعد اسے یہ راہیں اپنی ہتھیلی کی لکیروں کے مانند ازبر تھیں۔ پہلی بار اس گھر میں گزری رات نے محلِ وقوع بھی فراموش نہ کیا تھا۔

اسے علم تھا کہ راجابی کے کمرے کی کھڑکی کا رخ اسی جانب ہے۔ اس کی چھٹی حس یہ بھی گواہی دے رہی تھی کہ زلیخا کے متعلق کسی نہ کسی قسم کی معلومات ضرور ملے گی۔ اس کا وجدان بالکل درست راہنمائی کر رہا تھا۔ زلیخا اور راجابی کی آوازیں ہوا کے دوش پر لہراتی اس کی سماعت کا حصہ بننے لگیں۔

''کب تک یونہی بھوکی پیاسی رہو گی زلیخا؟ کچھ تو کھالے میری بچی! ایسی حالت میں تجھے زیادہ خوراک کی ضرورت ہے۔ اس ننھی جان کا کیا قصور ہے آخر؟'' راجابی کی بوجھل آواز نے ایلن کا رہا سہا یقین بھی ختم کر دیا۔

''پالے خاں کب آئے گا خالہ خانم؟ میں نے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' زلیخا نے افسردگی سے پوچھا۔

''ہر جمعرات کو وہ لازماً آیا کرتا ہے لیکن پچھلی دفعہ کہہ گیا تھا کہ زلیخا کی طبیعت کے پیش نظر ہفتے میں دو' تین بار چکر لگا لیا کرے گا۔ ہو سکتا ہے کل صبح ہی آ جائے۔'' راجابی کے ان الفاظ نے ایلن کو پل بھر میں ہی ساکت کر دیا۔ اعتبار' مان' خلوص اور چاہ ایک ہی لمحے میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئے تھے۔ وہ لڑکھڑاتی' گرتی' سنبھلتی واپس چلی آئی۔

☆☆☆

رات کافی ڈھل چکی تھی۔ بارنس کو کمرے کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ انداز مانوس تھا۔ اس نے ایلن کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ مقامی لباس پہنے صدیوں کی مریض دکھائی دے رہی تھی۔ بارنس اس کا لباس اور حالت دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ اس وقت کہاں سے آئی ہے۔ بے بسی اور غصے کی کیفیات نے اسے جھنجلا کر رکھ دیا۔ وزارتِ خارجہ کے اس کامیاب افسر نے اب تک بہت سی کامیابیاں سمیٹی تھیں لیکن اپنی بیٹی کو سمجھانے اور قابو میں رکھنے کی ناکامی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔

''میں آپ کے جذبات سمجھ رہی ہوں پاپا! لیکن آج کے بعد آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن بہت جلد آپ کے قدموں میں ہوگا۔ یہ کام برطانوی حکومت کے لیے میں خود کروں گی۔'' ایلن صدمے کی انتہا سے انتقامی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

''تو کیا تمہیں یقین آ گیا کہ میں تمہاری بھلائی ہی چاہتا تھا؟'' بارنس نے شکوہ کیا۔ ایلن نے گہری سانس بھرتے ہوئے سر جھکا دیا۔

''میں لندن کے رائل آرٹ اسکول میں داخلے کے

لیے تیار ہوں لیکن جانے سے پہلے اپنے مجرم کو انجام تک بھی ضرور پہنچاؤں گی۔'' وہ زخم خوردہ ناگن بن چکی تھی۔ بارنس کے لیے اس کی یہ حالت اور فیصلہ بہت مسرور کن تھا۔

ایلن نے اپنے طے شدہ منصوبے کے مطابق اگلی صبح پالے کے مرحوم والد حسن خاں کی قبر کے پاس پتھر تلے ایک رومال رکھ دیا۔ اس رومال میں جذبات اور سسکیوں سے گندھا آخری پیغام موجود تھا۔ ایلن نے لکھا تھا کہ اسے خفیہ طور پر ایک مال گاڑی میں شہر بھیجا رہا ہے جہاں سے بعد ازاں وہ لندن روانہ ہو جائے گی۔ ہندوستانی سرزمین چھوڑنے سے قبل وہ ایک بار پالے سے ملاقات کرنا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ پالے خاں اس سے آخری ملاقات کا فیصلہ کرنے میں پل بھر کی تاخیر بھی نہ کرے گا۔

☆☆☆

مقررہ روز پر مال گاڑی میں بیٹھی ایلن کا دل بے حد بوجھل تھا۔ اسے ان سنگلاخ پہاڑیوں میں ہر سو پالے کی محبت بھری سرگوشیاں اور پھر انہی سرگوشیوں کی موت پر سسکیاں گونجتی سنائی دے رہی تھیں۔ دل بہلانے کے لیے انگریزی ناول کھولتی تو لفظوں کی اوٹ سے پالے کا چہرہ جھانک کر اسے مزید بے تاب کر دیتا۔ نفرت اور شدید ردعمل کے طور پر اس کی گرفتاری کے مکمل انتظام کے باوجود دل کا ایک گوشہ پالے کو بے قصور ہی سمجھ رہا تھا۔ اس کے ڈبے کے دائیں جانب مسلح سپاہی موجود تھے۔ گلباز ضرورت سے زیادہ ہی خود اعتمادی ظاہر کر رہا تھا۔ وہ ایک وائرلیس لیے بائیں ڈبے میں موجود تھا جس کا مائیکروفون ایلن کی نشست کے نیچے تھا۔ سفر کی ہر ایک گھڑی صدیوں سی طویل تھی۔ ایلن کو یقین تھا کہ پالے کسی نہ کسی پہاڑی سے ریل کی چھت پر کود کر یا کسی بھی روپ میں اس سے ملنے ضرور آئے گا۔ اس کا یقین درست ثابت ہوا۔ دروازے پر ہونے والی آہٹ بہت مانوس تھی۔ ایلن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ پالے تشنہ اور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

''میری خواہش مکمل کرنے پر بہت شکریہ۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''محبت میں شکریہ کیسا ایلن؟'' پالے نے افسردگی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ایلن کو اس لمس نے بے طرح جھنجوڑ دیا۔ اس نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ گرفت سے آزاد کروا لیے۔

''کم از کم کسی ایک کی محبت میں تو مخلص ہو جاتے پالے! اپنے کسی مقصد کے لیے مجھے دھوکا دیتے رہے۔ دل میں تو زلیخا ہی بسی تھی۔ آج اس سے معتبر سماجی رشتہ قائم کر کے میری طرف مائل ہو کر اس سے بھی خیانت کر رہے ہو۔ یہ کیسا دہرا معیار ہے تمہارا؟''

''میں تمہاری یہی غلط فہمی دور کرنے آیا ہوں ایلن!'' وہ ضبط سے بولا۔ ''زلیخا سے میری شادی نہیں ہوئی۔''

''اوہ اچھا! تو پھر اس نئی زندگی کی تخلیق تمہارے کسی گناہ کا نتیجہ ہوگی۔'' ایلن نے قطع کلامی کی۔ ''ٹھیک ہی کہہ رہا تھا گلباز کہ تم دونوں سزا سے بچنے کے لیے پنچایت کو گمراہ کر رہے ہو۔''

گلباز کا نام سنتے ہی پالے کا ذہن بھک سے اڑ گیا۔ وہ اس کا کھیل سمجھ گیا تھا۔

''اس دغاباز اور وطن فروش شخص کی باتوں میں کیسے آ گئیں تم؟ اس نے اپنا گناہ اسی طرح چھپانا تھا۔ وہی زلیخا کا مجرم اور اس کی دوشیزگی کا قاتل ہے۔ جشن کی رات اس نے اپنی حیوانیت کا نشانہ بنایا تھا اسے۔'' پالے کے دوٹوک اور مضبوط انداز نے ایلن کو ششدر کر دیا۔ اسی لمحے گلباز بھی نیم وا دروازے سے اندر چلا آیا۔ ایلن نے منصوبے کے مطابق پالے کو الجھا کر دروازہ بند ہی نہیں کیا تھا۔ دوسری جانب گلباز نے مسلح سپاہیوں کو مطلع کرنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ خود غرضی اور لالچ اسے تنہا یہ کام کر کے خان بہادر کا لقب حاصل کرنے کے لیے مجبور کر رہی تھی' وہ اپنے ہاتھ میں پستول لیے پالے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''پیچھے ہٹ جایئے مس صاحبہ! بڑی مدتوں بعد یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے کہ پالے خاں بے بس اور مجبور میرے رحم و کرم پر ہے۔'' وہ لالچ اور ہوس کے جذبات سے مغلوب دکھائی دے رہا تھا۔ پالے نے اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر پستول بردار ہاتھ پر ٹھوکر رسید کر کے اسے نہتا کر دیا۔ زلیخا کی بے بسی' آنسو' اذیت' شہباز خاں کے حقیقت آشنا ہونے پر اذیت و کرب نے اسے مشتعل کر رکھا تھا۔ پستول اچھل کر کافی دور جا گرا۔ ایلن نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا تا کہ دیگر سپاہی اس مزاحمت سے بے خبر ہی رہیں۔ گلباز کی پیشہ ورانہ تربیت پالے کی مہارت' جنون اور وحشت کے سامنے ماند پڑ رہی تھی۔ پالے اور اس کے گروہ کا ہر ساتھی طوفانی طاقت و مہارت کا مالک تھا۔ وہ کسی بھی برطانوی اہلکار سے زیادہ اس مقامی سہولت کار کو موت کے گھاٹ اتارنے پر ترجیح دیا کرتے تھے جو اپنی وفاداری اور غیرت و دولت' طاقت اور اختیارات کے لیے رہن رکھوا

دیتے۔ پالے نے... گلبانو کی ناف تلے گھٹنوں کی مخصوص ضربات لگا کر اسے نڈھال کر دیا۔ گلبانو کی جوابی کارروائیاں بالکل غیر مؤثر رہیں اور ایک بھرپور ٹسل کے بعد پالے نے اس کی سانسوں کی ڈور منقطع کر دی۔ ایلن کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

''افسردہ کیوں ہو رہی ہو ایلن! محبت بہت نازک ہوتی ہے۔ شراکت اور دوغا برداشت کرنا اس کی فطرت ہی نہیں۔'' پالے نے اس کے آنسو صاف کر کے چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''تمہارے لیے یہاں قدم قدم پر جال بچھے ہیں پالے! نکل جاؤ یہاں سے۔'' وہ متوحش تھی۔

''فکر نہ کرو! میرے ساتھی ڈھال بننے کے لیے آس پاس موجود ہیں۔''

''کیا ہماری محبت کا یہی انجام تھا پالے! مشرق اور مغرب کی قسمت میں ملن کیوں ممکن نہیں؟'' ایلن نے ایک گہری سانس بھری۔

''محبت کی قسمت ازل سے یہی لکھی گئی ہے۔ کبھی ذات پات، کبھی مذہب اور کبھی خطے اس کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ انہیں ایسا کرنا ہی ہوتا ہے۔ ہماری صورت میں تو یہ معاملہ اور بھی نازک ہے کہ ہمارا تعلق حاکم و محکوم طبقے سے ہے۔ یہ کم بخت محبت سیندھ ہی وہیں لگاتی ہے جہاں ملن کی راہ میں ایسی ہی رکاوٹیں ہوں۔'' پالے کی آواز میں بھی آنسوؤں کی نمی تھی۔

''اگر تمہارے لوگوں کی خواہش ہو تو میں اپنا مذہب تبدیل کر لوں گی پھر تو وہ مجھے قبول کر لیں گے نا؟'' ایلن سسکی۔

''کسی شخص یا قبیلے کے لیے میرا مذہب اختیار مت کرنا ایلن! لندن لوٹ کر اسلام کا مطالعہ کرنا پھر ہی کوئی حتمی فیصلہ لینا۔''

''تم میرا انتظار کرو گے نا پالے؟'' وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بولی۔

''ہاں! ہندوستان کی آزادی کے بعد ایک یہی خواب میری آنکھوں کا مکین رہے گا۔''

''آزادی تمہارا مقدر ہے پالے! ہندوستان ایک نہ ایک روز ضرور آزاد ہوگا۔'' ایلن نے خلوص سے کہا۔ آنسوؤں کی طغیانی بے قابو تھی۔

''انشاء اللہ..... میری دعا ہے کہ وہ وقت دیکھنے کے لیے زندگی مجھے مہلت ضرور دے تاکہ ہم اپنی آئندہ نسل کو اس آزادی کے لیے بہنے والا ہزاروں لاکھوں شہداء کا لہو دکھا سکیں۔''

''انہیں جانی قربانیوں کے علاوہ ان آرزوؤں اور خواہشات کا مدفن بھی دکھانا پالے! انہیں یہ بھی ضرور بتانا کہ محبت اور وفا کسی ایک خطے کی میراث نہیں ہوتی۔ انہیں اپنے محبت کے ورثے تاج محل پر فخر ہے لیکن ہم بھی ویسے ہی ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور پھر اس محبت میں ٹوٹ کر بکھر بھی جاتے ہیں۔''

''ہاں! ایسے بہت سے قرض ہیں جنہیں بشرطِ زندگی چکاتے رہنا ہے۔'' پالے نیم رضامند تھا۔

''گلبانو کے بچے کو بھی اپنی تربیت دینا پالے! اسے باپ کے کرموں کی سزا نہ دینا۔'' ایلن نے دکھ سے کہا۔

''یہ غلطی میں ایک بار کر چکا ہوں۔ دوبارہ کبھی نہیں کروں گا۔ میں نے زندگی میں کچھ اور نہ سیکھا ہو لیکن اتنا ضرور سیکھا ہے کہ ہماری غلامی اور اس تباہی کی یہی وجہ ہے کہ ہم باہمی نفرتیں اور انتقام پروان چڑھاتے ہیں۔ غیروں کو خود موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ ان کمزوریوں کا فائدہ اٹھا کر ہمیں کچل دیں۔'' ایلن کا دکھ اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی نمی بن کر چھلکنے لگا۔

ٹرین اپنی مخصوص رفتار اور صدائیں بلند کرتی منزل کی طرف بڑھتی رہی۔ بے منزل راہوں کے مسافر الوداعی گھڑیوں کی چاپ سنتے آنسو بہاتے رہے۔

☆☆☆

تاریخ کے چند حوالوں میں یہ بھی درج ہے کہ اس خونریز مسل میں پالے نے گلبانو کو گاڑی سے نیچے دھکیل دیا۔ مسلح سپاہیوں نے اس کی یہ موت دیکھنے کے بعد پالے پر گولیاں چلا دیں۔ ایلن نے یہ گولیاں اپنے جسم پر نہیں۔ پالے اس کا زخمی وجود کندھے پر اٹھا کر گاڑی سے فرار ہوا۔ ایک جنگل میں اسے سپاہیوں نے گھیر کر درجنوں گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اسی جنگل میں ایلن کی روح پرواز کر گئی۔ پالے اپنے بے تحاشا بہتے زخموں کے ساتھ گھوڑے پر سوار گاؤں پہنچنے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن موت کو شکست نہ دے سکا۔ یہ حوالے صحت کے اعتبار سے افسانہ ہی گردانے جاتے ہیں۔ دیگر حوالوں میں یہ درج ہے کہ پالے خاں کی موت آزادیِ ہند کے چار سال بعد ہوئی تھی۔

(ختم شد)

ماخذات: پالے خاں از گلشن ندیم

منصوبہ ساز

شاکر لطیف

دنیا مغرب کی ہو یا مشرق کی... جرم تو جرم ہی کی طرح ہوتا ہے۔ بس ذرا انداز مختلف ہوتے ہیں۔ وہ جو ایک دوسرے کے جیون ساتھی تھے مگر... ان کے جیون اور ساتھی ہونے کے درمیان نفرتوں بھرا فاصلہ حائل ہوچکا تھا... اور اس فاصلے نے انہیں بہترین منصوبہ ساز بنا ڈالا تھا۔ اب یہ بات سوچنے کی تھی کہ کس کا منصوبہ کامیاب اور کس کا ناکام ہونے والا تھا۔

محبت سے ایک ہونے والے جوڑے کی الگ ہونے کی کارروائیوں کا دلچسپ احوال

"مارٹن! میں بازار جارہی ہوں، تمہاری کافی کچن میں رکھی ہے۔ میں دو تین گھنٹوں تک آجاؤں گی، مجھے کچھ سامان خریدنا ہے۔ آج بہت شدید سردی ہے، میرے اونی دستانے بھی نہیں مل رہے نہ جانے کہاں کھو گئے ہیں؟" مارگریٹ نے ٹی وی دیکھنے میں منہمک اپنے شوہر مارٹن کو مخاطب کیا اور پھر گھر کے خارجی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

مارٹن نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ بدستور ٹی وی دیکھنے میں منہمک رہا تاہم ایسا نہیں تھا کہ اس نے اپنی بیوی مارگریٹ کی بات نہیں سنی تھی۔ مارگریٹ کی بات سن کر اس کے چہرے پر نفرت کے تاثرات امڈ آئے تھے۔ اسے اپنی بیوی سے شدید نفرت تھی اور وہ اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا تاہم اس کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا کیونکہ جس گھر میں وہ رہائش پذیر تھے، یہ گھر مارگریٹ کی ملکیت تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ مارٹن کے پاس کوئی جائداد نہیں تھی اور وہ مارگریٹ سے علیحدہ ہو کر گزر بسر نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی ماہانہ آمدن اتنی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ مارگریٹ کے اخراجات

بھی اٹھا رہا تھا۔ اس کا ذاتی اسٹور تھا جو اس نے کرائے پر دے رکھا تھا اور اسے ماہانہ کرائے کی مد میں جتنی رقم حاصل ہوتی تھی اس سے وہ اچھی گزر بسر کر سکتا تھا تاہم وہ مارگریٹ کے اس گھر سے بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اسے اس گھر میں رہتے ہوئے تیس سال کا عرصہ ہو گیا تھا اور اتنا عرصہ گزارنے کے بعد اب اسے اس گھر کے ہر کونے سے انسیت بلکہ ایک طرح کی محبت ہو چکی تھی لہٰذا وہ اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مارگریٹ سے وہ نجات حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس گھر سے دستبردار ہوئے بغیر...... اسی وجہ سے وہ اسے ایک طویل عرصے سے برداشت کر رہا تھا ورنہ وہ شاید اسے کب کا طلاق دے چکا ہوتا۔ اسے یہ سو فیصد اندازہ تو نہیں تھا کہ مارگریٹ کے دلی تاثرات اس کے بارے میں کیا ہیں اور وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ تاہم اس کا خیال یہی تھا کہ مارگریٹ بھی اسے پسند نہیں کرتی تھی، شاید اسی وجہ سے ان کے درمیان اکثر اوقات معمولی باتوں پر بھی اچھی خاصی جھڑپ ہو جاتی تھی تاہم یہ جھڑپ ہمیشہ بد زبانی تک ہی محدود رہتی تھی۔ مارٹن نے کبھی مارگریٹ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ مارگریٹ پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مارگریٹ کا منہ توڑ کر رکھ دیتا مگر وہ جانتا تھا کہ ایسی صورت حال میں معاملہ پولیس تک پہنچ جائے گا اور اس کے ملک میں کسی عورت پر ہاتھ اٹھانا خاصا سنگین جرم تصور کیا جاتا تھا۔ مارٹن اس بڑھاپے میں جیل یاترا نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے جب بھی اس کا اور مارگریٹ کا جھگڑا ہوتا، وہ مارگریٹ کے چیخنے چلانے پر اس پر ہاتھ اٹھانے کی اضطراری خواہش پر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا مگر اب اسے اندازہ ہونے لگا تھا کہ اس طرح مزید نہیں چل سکے گا۔ وہ بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ جب سے مارگریٹ کو اس کے مرض کا....

....علم ہوا تھا، وہ اس سے جان بوجھ کر لڑائی کے بہانے ڈھونڈنے لگی تھی۔ مارٹن کا معالج اسے خبردار کر چکا تھا کہ اگر اس نے اپنے سر پر کسی قسم کی پریشانی سوار کی تو یہ اس کے لیے خطرناک ہوگی۔ مسلسل ہائی بلڈ پریشر اسے کسی بھی وقت فالج کے حملے کی طرف لے جائے گا۔

مارٹن ویسے تو ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دی گئی دوائیں بھی باقاعدگی سے استعمال کرتا تھا مگر مارگریٹ اس کا بلڈ پریشر خوامخواہ ہی ہائی کر دیتی تھی۔ نہ جانے یہ منحوس عورت کب اس دنیا سے رخصت ہوگی؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز سن کر وہ اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ مارگریٹ جا چکی تھی اور ہمیشہ کی طرح اس نے دروازے کو ایک دھماکے سے بند کیا تھا۔ مارٹن جانتا تھا کہ وہ ایسا جان بوجھ کر اسے چڑانے کے لیے کرتی ہے ورنہ دروازے میں ایسی کوئی خرابی نہیں تھی کہ اسے اس طرح بند کیا جاتا۔ مارگریٹ کی واپسی اب دو سے تین گھنٹے کے بعد ہی متوقع تھی اور گھر سے اس کی غیر حاضری کے لمحات مارٹن کے لیے بہت خوشگوار اور... پُرمسرت ہوتے تھے۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اسے مارگریٹ کی غیر حاضری کے یہ لمحات ہمیشہ کے لیے میسر آ جائیں مگر یہ اسی صورت ممکن تھا جب وہ بڑھیا اس دنیا میں نہ رہتی، فی الحال تو وہ خاصی صحت مند اور چاق و چوبند تھی اور اس کی موت کے دور دور تک آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

مارٹن مارگریٹ کے خیالات کو ذہن سے جھٹکتا ہوا صوفے سے اٹھا اور ایک طویل سانس لیتے ہوئے کچن کی جانب بڑھ گیا۔ چند ثانیوں میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں مارگریٹ کا تیار کردہ کافی کا مگ موجود تھا۔ وہ دوبارہ صوفے پر بیٹھ گیا اور گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ایک بار پھر مارگریٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان دنوں وہ بہت سنجیدگی سے اس سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

مارگریٹ سے اس کی شادی تیس برس قبل ہوئی تھی۔ یہ ارینج میرج تھی یا جوان دونوں کے ماں باپ کی رضامندی سے طے ہوئی تھی ورنہ یہ حقیقت تھی کہ اسے مارگریٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ واجبی سے نقوش کی ایک لڑکی تھی اور ان دنوں ایک اسپتال میں نرس تھی کیونکہ مارٹن کی اپنی کوئی ذاتی پسند بھی نہیں تھی اور اس پر شادی کے سلسلے میں اپنے والدین کا دباؤ بھی تھا اس لیے وہ اپنے والدین کے فیصلے پر رضامند ہو گیا اور یوں مارگریٹ اس کی زندگی میں داخل ہو گئی تاہم اسے اتفاق کہیے یا قدرت کی ستم ظریفی کہ تیس برس کا طویل عرصہ ساتھ گزارنے کے بعد بھی وہ اولاد جیسی نعمت سے محروم تھے اور اسی وجہ سے ان کے تعلقات میں بھی سرد مہری آ گئی تھی ورنہ اگر اولاد ہوتی تو شاید وہ اس رشتے کو نبھانے کی کوشش کرتے۔

بہرحال اب تیس سال ساتھ رہنے کے بعد مارٹن کی برداشت جواب دے چکی تھی اور وہ اب ایک عرصے سے مارگریٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی ایسا قابلِ عمل پلان سوچ رہا تھا جس سے سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی

بھی نہ ٹوٹتی مگر اس کے ذہن میں ابھی تک کوئی ایسا قابل عمل اور آسان منصوبہ نہیں آیا تھا جس پر عمل پیرا ہو کر وہ مارگریٹ سے چھٹکارا پا سکتا۔ اس نے کئی بار اسے قتل کرنے کا سوچا مگر پولیس کا خوف ہمیشہ اس پر حاوی ہو جاتا۔ مارگریٹ کو قتل کرنے کی صورت میں اس کے پکڑے جانے کے قوی امکانات تھے۔ آس پاس کے ہمسائے بھی ان دونوں کی آپسی ناچاقی اور لڑائی جھگڑوں سے واقف تھے اس لیے یہ بات یقینی تھی کہ اگر وہ مارگریٹ کو قتل کرتا تو پولیس کا شک سب سے پہلے اسی پر جاتا۔ پولیس کے اسی خوف کی وجہ وہ مارگریٹ کو قتل کرنے کا آج تک صرف سوچتا رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں پنپنے والے کسی منصوبے کو عملی شکل دینے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ اس کے ذہن میں ہر روز مارگریٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے نت نئے منصوبے گردش کرتے رہتے تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ مارگریٹ کو زہر دے دے ..... کبھی سوچتا کہ اس کا گلا گھونٹ دے اور سب کو بتائے کہ مارگریٹ دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے انتقال کر گئی ہے مگر اپنے ذہن میں بننے والے منصوبوں میں سقائم تلاش کر کے وہ خود ہی انہیں مسترد کرتا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زہر یا گلا گھونٹ کر مارنا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں نہیں چھپ سکے گا اور وہ گرفتار ہو جائے گا۔

مارٹن ہر سنڈے کو چرچ ضرور جاتا۔ مارگریٹ بھی اس کے ہمراہ ہوتی' اسے نہیں معلوم تھا کہ مارگریٹ چرچ میں کیا دعا مانگتی ہے تاہم وہ ہمیشہ اس کی موت کی دعا مانگتا تھا تاہم اس کی یہ دعا بھی ابھی تک قبول نہیں ہوئی تھی۔ اب تو اسے لگنے لگا تھا کہ مارگریٹ سے پہلے وہ مر جائے گا۔

چرچ کی آواز سنائی دی تو وہ چونک کر ایک بار پھر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا۔ چرچ کی آواز نہیں باہر سے نہیں بلکہ اس کے سامنے موجود ٹی وی پر چلنے والی فلم سے سنائی دی تھی۔ ٹی وی پر اس وقت ایک دلچسپ فلم چل رہی تھی۔ یہ مووی سسپنس اور تھرل سے بھرپور تھی اور مارٹن کو اس قسم کی مووی بہت پسند تھیں۔ ویسے بھی اس کا زیادہ تر وقت گھر میں ٹی وی کے سامنے اسی قسم کی مووی دیکھتے ہی گزرتا تھا۔ اس کی بیوی مارگریٹ کو ٹی وی یا فلموں وغیرہ سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی تاہم وہ خبریں وغیرہ دیکھنے کے لیے اس کے ساتھ صوفے پر آ کر اکثر اوقات بیٹھ جاتی۔ اگرچہ مارگریٹ خبریں سننے میں بھی زیادہ وقت برباد نہیں کرتی تھی، اس کی دلچسپی بس اہم خبروں تک ہی محدود رہتی تھی۔ اس کے بعد وہ مارٹن کے پاس سے اٹھ جاتی تاہم اس کے ساتھ بیٹھ کر دس پندرہ منٹ تک خبریں دیکھنا بھی مارٹن پر بہت بھاری گزرتا تھا۔ وہ اپنے سونے کے کمرے تو برسوں پہلے الگ کر چکے تھے۔

فلم کافی دلچسپ تھی اور مارٹن مارگریٹ کے جانے سے پہلے بھی اسی مووی کو دیکھنے میں منہمک تھا۔ یہ مووی ایک ایسے سیریل کلر کے بارے میں تھی جو انتہائی مہارت سے قتل کی کئی وارداتوں کو سرانجام دیتا اور پولیس اسے پکڑنے میں آخری وقت تک ناکام رہی تھی..... یعنی ایک ایسے قاتل کی کہانی جو پولیس سے آخری وقت تک دو قدم آگے رہا۔

'کاش کوئی ایسا ہی سیریل کلر میری بیوی مارگریٹ کا بھی کام تمام کر دے۔' اچانک مارٹن کے ذہن میں یہ خیال ابھرا۔ آج سے پہلے بھی اس نے مارگریٹ کو ختم کرنے کا کئی بار سوچا تھا مگر اس انداز میں نہیں جیسا اس مووی کو دیکھنے کے بعد وہ سوچ رہا تھا۔ اگر شہر میں کوئی سیریل کلر سرگرم ہو جائے اور چند افراد کو قتل کر ڈالے اور مارٹن بھی اسی سیریل کلر کے اسٹائل میں مارگریٹ کو قتل کر دے تو پولیس کو کم از کم اس پر شک نہیں ہوگا۔ پولیس کی ساری توجہ اس پراسرار سیریل کلر کی جانب ہو جائے گی۔ مارگریٹ کی موت بھی اسی قاتل کے کھاتے میں چلی جائے گی۔

مگر شہر میں تو کوئی سیریل کلر سرگرم ہی نہیں تھا جس کے بہانے وہ اپنی بیوی کو قتل کر سکتا..... تو پھر کیوں نہ وہ خود ہی ایک سیریل کلر کا روپ دھار لے۔ اگر شہر میں دو تین قتل کی وارداتوں کا بالکل ایک ہی طریقے اور ایک ہی ہتھیار سے ارتکاب کیا جاتا تو یہ بات یقینی تھی کہ پولیس یہی سمجھتی کہ شہر میں کوئی خطرناک اور جنونی قاتل سرگرم ہو گیا ہے۔ رہی سہی کسر میڈیا والے نکال دیتے جو لوگوں کو نت نئی کہانیاں سنا کر مزید پریشان کر دیتے۔ دو تین افراد کو قتل کرنے اور پولیس کی توجہ کسی جنونی قاتل کی طرف متوجہ کروانے کے بعد مارٹن مارگریٹ کو بھی قتل کر ڈالتا تو یہ بات طے تھی کہ پولیس کو اس پر شک نہیں ہوتا۔ سب یہی سمجھتے کہ مارگریٹ بھی شہر میں موجود جنونی قاتل کا نشانہ بن گئی ہے۔

مارٹن نے مارگریٹ کو مارنے کے لیے بڑے منصوبے بنائے تھے مگر وہ کسی منصوبے کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔ مگر آج صورتحال مختلف تھی آج وہ اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بارے میں سوچ رہا تھا وہ مزید گہرائی سے اس منصوبے کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ جیسے جیسے سوچتا گیا اس کے ان خیالات کو تقویت ملتی گئی۔ اسے لگنے لگا کہ اس کا پلان بے داغ اور فول پروف ہے۔ نہ جانے آج

سے پہلے اس کے ذہن میں اتنا شاندار اور بے داغ منصوبہ کیوں نہیں آیا۔ اگر وہ ذرا مناسب طریقے سے اس پلان پر عمل کرتا تو کامیابی یقینی طور پر اس کے قدم چومتی۔

مارٹن کی کافی اور ٹی وی پر چلنے والی مووی دونوں ختم ہو چکے تھے مگر وہ کافی کا خالی مگ ہاتھ میں پکڑے بدستور صوفے پر بیٹھا اپنے پلان کے بارے میں غور کرتا رہا۔ یہ پہلا پلان تھا جس میں اسے کوئی سقم یا جھول محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے مارگریٹ کو راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے اور پولیس سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ بس پہلے ایک حقیقی سیریل کلر کا روپ دھارنا ہوگا۔ دو دن قبل کی واردا تیں سرانجام دینے کے بعد اسی کھاتے میں مارگریٹ کا قصہ بھی آسانی سے تمام کر دے گا۔ پولیس کو اسی طرح ڈاج دینا ممکن تھا مگر کیا وہ اس قابل تھا کہ کسی انسان کی جان لے سکے؟ اس نے آج تک کبھی کسی انسان کی جان نہیں لی تھی اور پھر وہ ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس میں اب جوانوں جیسی طاقت اور پھرتی نہیں رہی تھی۔ اوپر سے بلڈ پریشر کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خود پھنس جائے۔' اس نے سوچا۔

'نہیں، اب مجھے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔'

سوچتے سوچتے اس نے اضطراری طور پر اثبات میں سر ہلانا شروع کر دیا۔ اس کے پاس اگرچہ پستول وغیرہ نہیں تھا اور شاید پسٹل کے بغیر بھی کام چلایا جا سکتا تھا۔ راڈ یا ہتھوڑے کے استعمال سے کسی کو بھی سر پر ضرب لگا کر آسانی سے مارا جا سکتا تھا۔ اس نے کونسا کسی کا گلا گھونٹ کر یا ہاتھوں سے کسی کو قتل کرنا تھا جو بہت طاقت کی ضرورت پڑتی اور ویسے بھی وہ کسی کمزور شکار کا انتخاب کر کے بھی اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا اور پھر آہنی راڈ کے استعمال کے بعد تو ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر کیا صرف مارگریٹ کو راستے سے ہٹانے کے لیے اتنے بے گناہ افراد کو جان سے مار دینا درست تھا؟ اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ شاید یہ اس کے ضمیر کی آواز تھی جو اسے اس طرح کے منصوبے کے بارے میں سوچنے پر کچوکے لگا رہی تھی مگر اس نے جلد ہی اپنے ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مارگریٹ سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے کے لیے تیار تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ مارگریٹ کے بغیر اس کی زندگی کتنی خوبصورت اور خوشگوار ہو جائے گی۔ روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے اب وہ تنگ آ چکا تھا۔ اب اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اس طرح کی زندگی جینے سے بہتر ہے کہ وہ یہ رسک لے لے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک مزید سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنائے گا۔ اب وہ دیر نہیں کرے گا جب دیر نہیں کرنی تو اسے آج سے ہی اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہیے۔ ان دنوں سردیوں کا موسم تھا۔ خشک موسم کی وجہ سے سرِشام ہی خاصی دھند پڑنا شروع ہو جاتی تھی۔ سخت سردی اور دھند کی وجہ سے لوگ شام کے بعد اپنے گھروں سے کم ہی نکلتے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کی آمدورفت بھی بہت کم ہوتی تھی۔ موجودہ موسم اس کے کام کے لیے بہت آئیڈیل اور سازگار تھا۔ اس دھند کی وجہ سے اس کے کسی کی نگاہوں میں آنے کے امکانات بھی نہیں تھے۔ ''مجھے اب مارگریٹ سے نجات حاصل کرنی ہے۔'' وہ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اپنے گھر کے گیراج میں آ گیا۔ اس کے گیراج میں کاٹھ کباڑ کا کافی سامان موجود تھا۔ اس نے اس کباڑ کے سامان کو چیک کرنا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں ایک چھوٹا سا آہنی ہتھوڑا برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ہتھوڑا کافی پرانا اور زنگ آلود تھا اور حجم میں بھی زیادہ بڑا نہیں تھا تاہم اس کا حجم اتنا ضرور تھا کہ اس کی ایک زوردار ضرب سے کسی بھی انسان کی کھوپڑی توڑی جا سکتی تھی۔ اپنے ہتھیار کا انتخاب کرنے کے بعد اس نے ہتھوڑے کو گیراج میں ہی رہنے دیا اور پھر ڈرائنگ روم میں واپس آ گیا۔ صوفے پر بیٹھ کر اس نے اس کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد اب وہ کافی حد تک اطمینان محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب پر چھایا ہوا بوجھ بھی چھٹ سا گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ اسے اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ اس کے ذہن میں آیا منصوبہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے۔

مارگریٹ کی واپسی تقریباً تین گھنٹوں کے بعد ہوئی۔

''مارٹن! تم کیا کھاؤ گے؟ میں آج بیف لے کر آئی ہوں۔'' اس نے آتے ہی مارٹن سے روکھے لہجے میں سوال کیا۔

''تم جانتی ہو کہ بلڈ پریشر کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد ڈاکٹر نے مجھے بیف کھانے سے منع کر رکھا ہے۔ بہرحال آج مجھے اپنے دوست سے ملنے جانا ہے، کھانا بھی اس کے ساتھ ہی کھاؤں گا اس لیے تم اکیلی کھا لینا۔ ممکن ہے مجھے واپسی میں کچھ دیر ہو جائے۔''

''شام ہوتے ہی خاصی دھند پڑنے لگتی ہے، کہیں اپنی گاڑی کا ایکسیڈنٹ نہ کروا لینا۔ بہرحال ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، میں تو آج بیف ہی کھاؤں گی۔'' مارگریٹ نے کندھے اچکائے اور پھر کچن میں گھس گئی۔

'جتنا بیف کھانا ہے کھا لو جلد ہی قبر کے کیڑے تمہارے گوشت کی ضیافت اڑائیں گے۔' مارٹن نے سوچا اور پھر اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے وہ خیال ہی خیال میں مارگریٹ کے جسم کو کیڑوں کی خوراک بنتے دیکھ رہا ہو۔

شام کے چھ بجے مارٹن دوبارہ اپنے گیراج میں آیا۔ اس نے ہتھوڑا گاڑی کی سیٹ پر رکھا اور پھر گاڑی نکال کر گھر سے روانہ ہوگیا۔ سردی..... سے بچنے کے لیے اس نے لمبا رین کوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھوں پر بھی باریک اونی دستانے پہن لیے تھے۔ یہ دستانے سردی کے ساتھ ساتھ... بروقت واردات اس کے فنگر پرنٹس چھپانے میں بھی مددگار ثابت ہونے والے تھے۔ وہ اب تیز رفتاری سے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے خواہاں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اب عملی کام کا وقت ہے ورنہ پلان بناتے اور سوچتے تو اسے برسوں گزر گئے تھے۔

مارگریٹ کو اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے کسی دوست سے ملنے جارہا ہے تاہم اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ آج اپنے پلان کے پہلے حصے پر عمل درآمد کرنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اسے خود پر حیرت بھی ہورہی تھی کہ اس میں اتنی ہمت اور دلیری کیسے آگئی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو راستے سے ہٹانے کے لیے گئی افراد قتل کرنے پر آمادہ ہوچکا تھا۔ صرف اس لیے کہ پولیس کو ڈاج دیا جاسکے۔ شاید مارگریٹ کی نفرت نے اسے اتنا دلیر بنا دیا تھا کہ وہ اسے مارنے کے لیے انسانیت کی تمام حدیں پھلانگنے پر تیار ہوگیا تھا۔ جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اسی وقت اپنے پہلے ٹارگٹ کا انتخاب کرچکا تھا۔

اس کا پہلا ٹارگٹ تھے مسٹر ڈین۔

وہ مسٹر ڈین کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ کسی دور میں وہ مارٹن کے ہمسائے رہ چکے تھے۔ وہ مارٹن سے عمر میں خاصے بڑے تھے اور چلنے کے لیے بھی لاٹھی کا سہارا لیتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ تنہا رہتے تھے۔ ان کی اولاد کافی عرصہ پہلے انہیں چھوڑ کر آسٹریلیا جاچکی تھی۔

مارٹن کی مسٹر ڈین کے ساتھ گہری دوستی تو نہیں تھی تاہم پھر بھی اچھے تعلقات تھے۔ وہ ان سے کبھی کبھی ملنے چلا جاتا تھا اور جب مسٹر ڈین اس..... علاقے کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہوئے تو مارٹن ایک دو بار ان سے ملنے وہاں بھی گیا تھا، اس لیے ان کے گھر کے پتے سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ اگرچہ یہ تین ماہ پرانی بات تھی تاہم اسے یقین تھا کہ مسٹر ڈین آج بھی اسی نئے علاقے والے گھر میں اکیلے رہ رہے ہوں گے اس لحاظ سے وہ اس کے لیے آسان شکار ثابت ہوسکتے تھے۔ ویسے بھی شام کا ملگجا اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا تاہم مارٹن نے کچھ وقت مزید انتظار مناسب سمجھا۔ اس دوران وہ سڑکوں پر بے مقصد گاڑی چلاتا رہا اور پھر جیسے ہی تاریکی اور دھند گہری ہوئی، اس نے اپنی کار کا رخ مسٹر ڈین کے علاقے کی جانب موڑ لیا۔ تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ مسٹر ڈین کی نئی رہائش گاہ کے قریب پہنچ گیا تھا۔

اس نے اپنی کار کو مسٹر ڈین کی رہائش گاہ سے کچھ دوری پر کھڑا کیا۔ ویسے بھی ان کی رہائش گاہ ایک تنگ گلی میں واقع تھی جہاں کار داخل نہیں ہوسکتی تھی اور پھر آج وہ مسٹر ڈین کو قتل کرنے جارہا تھا اس لیے کار کو کچھ دوری پر کھڑا کرنا ہی مناسب تھا۔ کار سے نکلنے سے پہلے اس نے ہتھوڑے کو اپنے رین کوٹ کی اندرونی اور خاصی بڑی جیب میں منتقل کرلیا اور پھر فرنٹ ڈور کھول کر باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ دھند کی وجہ سے آس پاس کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے گاڑی لاک کی اور پھر آگے بڑھ گیا۔ چند چھوٹی چھوٹی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ مسٹر ڈین کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے ایک بار پھر آس پاس کا جائزہ لیا، کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ قسمت اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دے دی۔ مسٹر ڈین کے گھر کی لائٹس آن تھیں جس سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ اپنے گھر پر ہی موجود تھے۔

''کون ہے؟'' چند ثانیوں بعد ہی اندر سے آواز آئی اور مسٹر ڈین کی آواز سنتے ہی مارٹن کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات عود آئے۔ ان کا اس بڑھاپے میں خود دروازے تک چل کر آنا اور یہ پوچھنا کہ باہر کون ہے، اس حقیقت کی غمازی کررہا تھا کہ وہ گھر میں اکیلے ہی ہیں۔ اگر کوئی اور ہوتا تو مسٹر ڈین یقیناً دروازے پر اسے بھیجتے اور شاید پھر مارٹن کو بھی کسی اور شکار کا انتخاب کرنا پڑتا۔

''میں ہوں۔'' مارٹن نے ہلکی سی آواز سے جواب دیا تاہم کیونکہ وہ دروازے کے بالکل قریب کھڑا ہوا تھا اس لیے مسٹر ڈین نے اس کی آواز نہ صرف سن لی بلکہ آواز سے اسے پہچان بھی لیا۔

''ارے مارٹن! تم بڑے عرصے بعد آئے ہو، چلو اچھا ہے گپ شپ ہوجائے گی۔ میں بڑی بوریت محسوس کررہا تھا۔ اکیلا رہنا بسا اوقات بہت مشکل ہوجاتا ہے۔'' اندر

سے مسرت بھرے لہجے میں کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھول دیا گیا۔ اس دوران مارٹن آخری بار اپنے اطراف کا جائزہ لے چکا تھا۔ گلی میں دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ مسٹر ڈین کے دروازہ کھولنے کے دوران ہی مارٹن اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے آہنی ہتھوڑا نکال چکا تھا، وہ وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اس لیے جیسے ہی مسٹر ڈین نے دروازہ کھول کر اپنا سر باہر نکالا، مارٹن نے ہتھوڑے والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پھر پوری قوت سے ہتھوڑا ان کے سر پر دے مارا۔ ضرب اتنی شدید اور زوردار تھی کہ ایک ہی وار سے مسٹر ڈین کی کھوپڑی ٹوٹ گئی اور وہ بغیر کوئی آواز نکالے زمین پر جا گرے۔ یہ تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مارٹن انہیں قتل کرنے آیا ہے اس لیے انہیں چیخنے یا مزاحمت کرنے کا موقع تک نہ ملا تھا۔ مارٹن نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر مزید ضربات رسید کیں اور پھر خون آلود ہتھوڑے کو مسٹر ڈین کے لباس سے صاف کرتے ہوئے اس کو دوبارہ اپنے رین کوٹ کی جیب میں منتقل کرلیا۔ اس کے بعد وہ تیز تیز قدموں سے مسٹر ڈین کے گھر سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس نے مسٹر ڈین کے گھر کا دروازہ بند نہیں کیا تھا اس لیے کہ وہ خود یہ چاہتا تھا کہ جلد ہی ان کے قتل کا عقدہ کھل جائے ورنہ بند دروازے کی وجہ سے جب تک مسٹر ڈین کی لاش سے تعفن نہ پھیلتا، کسی کو ان کے قتل کا پتا ہی نہ چلتا۔ مسٹر ڈین زیادہ افراد سے میل جول پسند نہیں کرتے تھے اور اگر ان کے گھر کوئی نہ آتا تو سردی کی وجہ سے ان کی لاش میں تعفن پھیلنے میں بھی کئی دن لگ جاتے تاہم دروازے کو کچھ کھلا رکھنے کی وجہ سے مارٹن کو یقین تھا کہ ان کی لاش جلد ہی دریافت ہوجائے گی۔

تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ تنگ گلیوں سے نکل کر اپنی گاڑی میں آکر بیٹھا تو اس کے حلق سے اطمینان کی ایک طویل سانس خارج ہوئی، اسے یقین تھا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا یعنی وہ اپنے منصوبے کا پہلا حصہ کامیابی سے طے کرچکا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پھر اپنے گھر روانہ ہوگیا۔

گھر پہنچ کر اس نے گیراج کھولا اور پھر کار گیراج کے اندر لے آیا۔ اسے گھر میں داخل ہونے کے لیے مارگریٹ کو ڈسٹرب کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ گیراج کی چابی اس کے پاس رہتی تھی اور گیراج سے ہی گھر کے اندر جانے کا راستہ بھی موجود تھا۔ وہ جب بھی اپنی کار لے کر جاتا تھا، واپسی پر یہی راستہ اختیار کرتا تھا اس طرح وہ مارگریٹ کے منہ لگنے سے بھی بچ جاتا تھا۔ ویسے مارگریٹ رات کا کھانا جلدی کھاتی تھی اور اس کے بعد اپنے کمرے سے کم ہی باہر نکلتی تھی۔ اکثر اوقات اسے علم بھی نہیں ہوتا تھا کہ مارٹن کی واپسی کس وقت ہوئی ہے۔

مارٹن کی گاڑی میں پانی کی ایک چھوٹی سی بوتل موجود تھی۔ اس نے ہتھوڑے کو گیراج میں رکھنے سے پہلے..... اچھی طرح دھولیا تاکہ خون کا کوئی نشان نہ رہ جائے۔ اس کام کو نمٹا کر وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اگرچہ اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا تاہم اس وقت اسے بھوک محسوس بھی نہیں ہورہی تھی اس لیے اس نے گرم پانی سے شاور لیا اور پھر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔

اس رات مارٹن کافی دیر تک جاگتا رہا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے مسٹر ڈین کا چہرہ گھومتا رہا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھا کہ اس نے مسٹر ڈین کو بے گناہ قتل کیا ہے ورنہ اس کا اصل ٹارگٹ تو اس کی اپنی بیوی مارگریٹ تھی، مسٹر ڈین تو بس ایک سیڑھی تھے جس پر چڑھ کر اسے مارگریٹ کے قتل کے لیے راستہ بنانا تھا۔

مگر وہ کرتا بھی کیا اس کے منصوبے کے مطابق اس طرح کے چند قتل ضروری تھے کیونکہ پولیس کو اسی صورت ڈاج دیا جاسکتا تھا۔

رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے وہ صبح بھی دیر تک سوتا رہا تاہم جب مارگریٹ نے اس کے دروازے پر دستک دی تو مجبوراً اسے اٹھنا پڑا۔

''مارٹن! تمہاری کافی تیار ہے۔ میں نے دوسری بار گرم کی ہے، تیسری بار گرم نہیں کروں گی۔'' مارگریٹ کی جھلائی ہوئی آواز سنائی دی تو وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا کچھ ہی دیر میں منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں موجود کافی اور مارگریٹ کے بنائے ہوئے توس سے لطف اندوز ہونے لگا۔ سامنے ٹی وی آن تھا اور ہیڈ لائنز چل رہی تھیں۔

مارگریٹ بھی کچن سے نکل کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی کہ وہ ہیڈ لائنز دیکھا کرتی۔

ٹی وی پر چند خبروں کے بعد ہی مسٹر ڈین نامی ایک بزرگ شہری کے قتل کی خبر چل پڑی تو مارٹن بھی ٹی وی کی جانب متوجہ ہوگیا۔ میڈیا اینکر بتارہا تھا کہ پولیس کے مطابق مسٹر ڈین کی لاش آدھی رات کو اس وقت دریافت ہوئی جب ان کا ایک ہمسایہ ان کی کوئی کتاب واپس کرنے ان کے گھر گیا تاہم گھر کے دروازے کے قریب آتے ہی اس نے دروازے کے کچھ کھلے ہوئے حصے سے اندر نگاہ ڈالی تو مسٹر ڈین زمین پر گرے نظر آگئے۔ اس نے آگے

بڑھ کر مسٹر ڈین کو چیک کیا تو اس پر یہ انکشاف ہوا کہ مسٹر ڈین کو کسی نے قتل کیا ہے۔ فرش پر موجود خون اور مسٹر ڈین کے سر کا معائنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہ تھا۔

بہرحال مسٹر ڈین کے قتل کے بارے میں معلوم ہوتے ہی اس نے پولیس کو اطلاع کردی جس پر پولیس نے جائے وقوعہ پر پہنچ کر دیگر شواہد اکٹھے کرنے کے ساتھ ساتھ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ ابھی نہیں آئی تھی تاہم پولیس کے مطابق مسٹر ڈین کو سر پر کسی آہنی راڈ کی ضرب لگا کر مارا گیا تھا۔ کوئی ایسا چشم دید گواہ ابھی تک دستیاب نہیں ہوسکا تھا جس نے کسی انجان آدمی کو مسٹر ڈین کے گھر آتے دیکھا ہو۔ پولیس اس بات پر بھی تفتیش کررہی تھی کہ مسٹر ڈین کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں تھی۔ ٹی وی پر اب مقتول مسٹر ڈین کی تصویر بھی دکھائی جارہی تھی۔

''ارے یہ تو وہی مسٹر ڈین ہیں جو کسی دور میں ہمارے ہمسائے رہ چکے ہیں نہ۔'' مارگریٹ نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''ان کو کسی نے قتل کردیا ہے؟''

''خبروں میں تو یہی بتایا جارہا ہے۔'' مارٹن نے اپنے لہجے کو سپاٹ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ویسے ان کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں تھی ممکن ہے کوئی چور یا ڈاکو ہو جس نے انہیں مار دیا ہو۔''

''بیچارے مسٹر ڈین..... یہ تو بہت بوڑھے اور ضعیف العمر تھے۔ تم سے بھی زیادہ۔'' مارگریٹ کا طنزیہ لہجہ سن کر مارٹن نے بے اختیار ہونٹ بھینچ لیے۔

'بات تو ایسے کررہی ہو جیسے خود جوان ہو۔ بہرحال اب تمہارے پاس بھی زیادہ وقت نہیں ہے۔ جلد ہی مسٹر ڈین کی لسٹ میں تمہارا نام بھی شامل ہوگا۔' مارٹن نے دل ہی دل میں سوچا تاہم اپنے خیالات کو زبان پر لانے کی جسارت نہ کرسکا۔

''تم دوپہر کے کھانے پر کیا کھاؤ گے؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مارگریٹ نے سوال کیا۔

''بیف کے علاوہ کچھ بھی پکا لینا بس کھانے میں نمک کا استعمال کم رکھنا۔'' مارٹن نے جواب دیا تو مارگریٹ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کچن کے علاوہ وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتی تھی یا پھر کبھی کبھی اپنی کسی سہیلی سے ملنے چلی جاتی تھی۔

شام ہوتے ہی مارٹن ایک بار پھر اپنی کار پر روانہ... ہوگیا۔ آہنی ہتھوڑا آج اس نے سیٹ کے نیچے چھپا دیا تھا۔ ایسا اس نے اس لیے کیا تھا کہ اگر اتفاق سے پولیس کی کسی پٹرولنگ گاڑی نے اس کی کار کو روک کر چیک کیا تو وہ ہتھوڑا ان کی نگاہوں میں نہ آجائے۔ ویسے تو کسی کار میں ہتھوڑے کی موجودگی پر قانونی طور پر کوئی قدغن نہیں تھی تاہم شہر میں تازہ تازہ قتل کی ایک واردات ہوئی تھی اور پولیس کے مطابق مقتول کو سر پر کسی آہنی شے کا وار کرکے ہی قتل کیا گیا تھا۔ ایسے میں پولیس اس کی کار میں ایک زنگ آلود ہتھوڑے کو دیکھ کر مشکوک ہوسکتی تھی تاہم سیٹ کے نیچے چھپانے کے بعد اب وہ گاڑی کی جامہ تلاشی کے بغیر دریافت نہیں ہوسکتا تھا۔

مارٹن اپنے دوسرے شکار کو بھی چن... چکا تھا۔ یہ ایک فقیر تھا جو وائلن بجا کر بھیک مانگتا تھا اور جس فٹ پاتھ پر بھیک مانگتا تھا، رات کو اسی جگہ سو رہتا تھا۔ مارٹن بھی وہاں سے گزرتے وقت کبھی کبھی اس کی جھولی میں چند سکے پھینک دیا کرتا تھا۔ عام حالات میں کسی فٹ پاتھ پر بیٹھے یا سوئے ہوئے شخص کو قتل کرنا کسی حماقت سے کم نہیں تھا اور کسی کی نگاہوں میں آئے بغیر یہ ممکن بھی نہ تھا مگر ان دنوں سخت سردی اور دھند کی وجہ سے شام کو ہی سڑکیں ویران ہوجاتی تھیں اور دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک دیکھ پانا بھی ممکن نہیں رہتا تھا اس لیے مارٹن کو لگا کہ آج کے شکار کے لیے وہی شخص مناسب تھا۔ سب سے بڑھ کر جہاں وہ شخص بیٹھتا تھا، اس کے ساتھ ہی ایک تنگ گلی موجود تھی اور مارٹن کا پلان یہ تھا کہ وہ اس تنگ گلی کے دوسری جانب اپنی کار کھڑی کرے گا اور پھر گلی کے راستے پیدل چلتا ہوا اپنے ٹارگٹ تک پہنچے گا اور اس کا کام تمام کرنے کے بعد اسی راستے سے واپس نکل آئے گا۔ آج دھند کی شدت بہت زیادہ تھی اس لیے اس کے کسی کی نگاہوں میں آنے کے امکانات نہیں تھے۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ آج کے قتل کے بعد پولیس اور میڈیا کی توجہ کسی سیریل کلر کی جانب مبذول ہوجائے گی اور یہ ہی اس کا مقصد تھا۔ ایک دفعہ پولیس اور میڈیا کو یہ باور ہوجاتا کہ شہر میں کوئی سیریل کلر سرگرم ہے تو اس کے بعد اسی قبیلے میں مارگریٹ کا قصہ بھی آسانی سے پار کیا جاسکتا تھا۔ کل کی بہ نسبت آج اس پر اعصابی دباؤ بھی قدرے کم تھا۔

وہ بہت آہستہ رفتار سے کار چلا رہا تھا کیونکہ آج دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ تقریباً بیس پچیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اس گلی کے پاس پہنچ گیا جس کے دوسری طرف وہ بھکاری بیٹھتا تھا۔ مارٹن کو یقین تھا کہ وہ اس وقت بھی اپنی جگہ پر موجود ہوگا۔ اس نے کار کی سیٹ کے نیچے سے اپنا ہتھوڑا نکالا اور پھر اسے اپنے رین کوٹ کی اندرونی اور بڑی

جیب میں منتقل کرلیا۔ اس کے بعد وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

گاڑی سے باہر نکلتے ہی سرد ہوا کے تھپیڑوں نے اس کا استقبال کیا تو لمحہ بھر کے لیے اس پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ اس نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ دھند کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اب بیس پچیس فٹ سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مارٹن تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی کی جانب بڑھ گیا۔ گلی میں اگرچہ دھند کی شدت خاصی کم تھی تاہم کسی ذی روح کا نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا۔ تقریباً دو تین منٹ تک پیدل چلنے کے بعد وہ گلی سے نکل کر دوسری سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے اپنے شکار کی جانب نگاہیں دوڑائیں۔ وہ بھکاری اپنی جگہ پر موجود تھا۔ فٹ پاتھ کی دیوار سے ٹیک لگائے اس نے اپنا سر اپنے زانو پر رکھا ہوا تھا۔

مارٹن نے فوری طور پر اس کی جانب بڑھنے سے گریز کیا کیونکہ فٹ پاتھ پر منچلے نوجوانوں کا ایک ٹولا اس کے پاس سے ہی گزر رہا تھا۔ مارٹن نے اپنے رین کوٹ کے کالر اوپر کرلیے اور چہرہ گھما کر دوسری طرف کرلیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ قریب آنے پر ان نوجوانوں میں سے کسی کی نگاہ اس کے چہرے پر پڑے۔ نوجوانوں کا ٹولا اس کے قریب سے گزر گیا۔ کسی نے مارٹن کی جانب توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اپنی خوش گپیوں میں مگن تھے۔ چند ثانیوں میں وہ نوجوان دھند میں غائب ہوگئے تاہم مارٹن کو ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان کی مدھم ہوتی آوازوں سے مارٹن کو ان کے دور جانے کا بھی اندازہ ہورہا تھا۔ جب یہ آوازیں معدوم ہوگئیں تو مارٹن نے ایک بار پھر آس پاس کا جائزہ لیا۔ اب اس بھکاری کے علاوہ دوسرا کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ویسے بھی اس روڈ پر اتنی دھند تھی کہ بیس فٹ سے آگے کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا تاہم ماحول پر طاری سکوت سے بھی مارٹن کو اندازہ ہورہا تھا کہ اس وقت اس سے کم از کم سو میٹر دوری پر کوئی نہیں ہے۔ کسی کار کے انجن کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس وقت سڑک پر کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ مارٹن گرد وپیش سے بے خبر بھکاری کی جانب بڑھا جسے شاید قریب آتی موت کا احساس تک نہ تھا۔ مارٹن نے پھرتی سے آخری بار اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے رین کوٹ کی اندرونی جیب سے وہ چھوٹا سا آہنی ہتھوڑا نکال لیا جس سے اس نے مسٹر ڈین کو مارا تھا۔ اب وہ اس بھکاری کے بالکل سر پر جا کھڑا ہوا۔

شاید اس بھکاری کو بھی اپنے اتنے قریب کسی دوسرے کی موجودگی کا اندازہ ہوگیا تھا اس لیے اس نے اس امید پر سر اٹھایا کہ شاید کوئی اسے بھیک دینا چاہتا ہے۔ مارٹن نے اسے اس سے زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے اپنے ہتھوڑے والا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور پھر اسے پوری قوت سے بھکاری کے سر پر دے مارا۔ ضرب اتنی شدید اور زوردار تھی کہ ایک ہی ضرب میں اس بھکاری کا بھیجا باہر آگیا۔ مارٹن نے اس پر دوسرا وار نہیں کیا کیونکہ اسے اپنے پہلے وار پر اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کافی ہے۔ اس نے پھرتی سے ہتھوڑا بھکاری کے لباس سے صاف کیا اور پھر اسے اپنے رین کوٹ کی اندرونی جیب میں منتقل کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔ چند ثانیوں میں ہی وہ گلی میں گھس چکا تھا۔ وہ گلی میں بھی تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہ آج بھی کامیاب رہا تھا۔ سب کچھ چشم زدن میں ہوگیا تھا۔ مارٹن کو یقین تھا کہ اس بار بھی اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ قسمت نے آخری وقت تک اس کا ساتھ دیا تھا۔ گلی میں بھی اس کا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ گلی پار کرتے ہی وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔ جیسے جیسے وہ جائے وقوعہ سے دور ہوتا گیا، ویسے ویسے اس کا اعصابی دباؤ بھی کم ہوتا چلا گیا اور اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات امڈتے چلے گئے۔

گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر ہتھوڑے کو پانی سے دھویا اور پھر اس کو کباڑ کے سامان میں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ مارگریٹ سے آج بھی سامنا نہیں ہوا تھا۔ مارٹن کو اندازہ تھا کہ وہ کمرے میں جا چکی ہوگی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے اپنے رین کوٹ کا بھی جائزہ لیا..... رین کوٹ پر خون کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مطمئن ہوکر وہ باتھ روم میں گھس گیا اور گرم پانی کا شاور لینے کے بعد بستر پر لیٹ گیا تاہم بستر پر لیٹتے ہی ندامت کی ایک تیز لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس نے آج پھر ایک بے گناہ انسان کو قتل کردیا تھا، محض اس لیے کہ وہ اپنی بیوی مارگریٹ سے نجات حاصل کرسکے۔ کچھ دیر تک اپنے ضمیر سے لڑنے کے بعد اس نے اپنے ندامت بھرے خیالات پر قابو پالیا۔ مارگریٹ سے نجات کے لیے ان افراد کی قربانی ضروری تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے مزید ایک قتل اور ضرور کرنا چاہیے تاکہ پولیس کو سو فیصد یقین ہوجائے کہ شہر میں کوئی جنونی سیریل کلر موجود ہے تاہم اس کا فیصلہ کل کی میڈیا رپورٹنگ دیکھ کر بھی کیا جاسکتا تھا کہ ایک اور قتل کی ضرورت تھی یا اب براہِ راست مارگریٹ کا پتا کاٹ دیا جاتا۔

ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس کی بے چینی خاصی کم ہو گئی اور اسے نیند آنے لگی۔

پچھلی رات وہ بہت دیر تک جاگتا رہا تھا شاید اس لیے کہ مسٹر ڈین کا قتل اس کی زندگی کا پہلا قتل تھا اور پھر مسٹر ڈین اس کے دوست بھی تھے مگر اس رات اسے جلدی نیند آ گئی۔ صبح تقریباً نو بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر اپنے کمرے سے باہر نکل کر کچن میں برتنوں کی کھٹکھٹاہٹ سے اسے مارگریٹ کی وہاں موجودگی کا اندازہ ہو گیا اس نے ٹی وی آن کیا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹی وی کی آواز سن کر مارگریٹ کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ ڈرائنگ روم میں موجود ہے۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا کچھ ہی دیر میں مارگریٹ نے اس کے سامنے موجود ٹیبل پر کافی اور اسنیکس وغیرہ رکھ دیے، مارگریٹ کے ہاتھوں میں اپنا کافی کا مگ بھی موجود تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی اور کافی کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ ٹی وی پر خبریں دیکھنے لگی۔

اہم خبروں کے بعد رات شہر میں ہونے والے ایک قتل کی اسٹوری بھی چل پڑی۔ یہ قتل ایک فٹ پاتھ کے بھکاری کا ہوا تھا جو وائلن بجا کر بھیک مانگتا تھا۔ پولیس کے مطابق اس کو بھی بالکل اسی انداز میں قتل کیا گیا تھا جس طرح پرسوں رات مسٹر ڈین نامی شخص کا مرڈر کیا گیا تھا۔ میڈیا کے مطابق کچھ دیر میں شہر کے پولیس چیف بھی اس سلسلے میں میڈیا سے بات کرتے۔ بھکاری کے قتل کے بارے میں رات بارہ بجے اس وقت علم ہوا۔ جب پولیس کی ایک پٹرولنگ پارٹی وہاں سے گزری۔ پولیس کے مطابق پولیس والے اس بھکاری کو پہلے سے جانتے تھے۔ رات کو وہاں سے پولیس کی کار آہستہ رفتار سے فٹ پاتھ کے پاس سے پٹرولنگ کرتے ہوئے گزری تو ایک پولیس والے نے اس بھکاری کو ٹارچ کی روشنی میں چیک کیا۔ وہ دھند کی وجہ سے اسے صاف دکھائی تو نہ دیا تاہم اس نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ وہ بہت عجیب اور ٹیڑھے میڑھے انداز میں زمین پر پڑا تھا۔ سخت سردی کے باوجود اس نے اپنے اوپر کوئی چادر وغیرہ بھی نہیں لے رکھی تھی ورنہ پولیس والے وہاں سے روزانہ گزرتے تھے اور جانتے تھے کہ وہ بھکاری رات کے وقت فٹ پاتھ پر ایک چھوٹا سا خیمہ لگا لیتا تھا اور اس کے اندر سوتا تھا۔ تاہم کل رات کی منفرد صورتِ حال دیکھ کر ایک پولیس والے نے شک ہونے پر گاڑی سے اتر کر بھکاری کو چیک کیا تو اس پر یہ انکشاف ہوا کہ بھکاری کی کھوپڑی ٹوٹی ہوئی ہے اور اس کا سر درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس کا بھیجا تک باہر نکلا ہوا تھا۔ صورتِ حال کی سنگینی کا ادراک ہوتے ہی اس بات کی اطلاع پولیس کے اعلیٰ افسران کو دی گئی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے قبضے میں لے لی گئی۔ پولیس اب اس سلسلے میں تفتیش کر رہی تھی کہ مسٹر ڈین اور اس بھکاری کے قتل میں کیا مماثلت ہے۔ مسٹر ڈین اور اس بھکاری کا آپس میں تو کوئی تعلق ثابت نہیں ہوا تھا تاہم دونوں کے قتل میں یہ مماثلت پائی جاتی تھی کہ ایک تو سر پر آہنی ضرب سے قتل ہوئے تھے اور دوسرا دونوں کا قتل صرف ایک دن کے فرق سے ہوا تھا۔ یکے بعد دیگرے ہونے والے ان مرڈرز کی وجہ سے میڈیا ایکدم اس خدشے کا بھی اظہار کر رہا تھا کہ شاید شہر میں کوئی سیریل کلر سرگرم ہو چکا ہے اس لیے لوگوں کو گھروں سے نکلتے وقت احتیاط کرنی چاہیے۔

''یہ کون ہے جو لوگوں کو اتنی سفاکی سے مار رہا ہے؟ مسٹر ڈین کے بعد اب اس بھکاری کو بھی بڑی بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ لگتا ہے شہر میں واقعی کوئی سیریل اور جنونی قاتل موجود ہے۔'' مارگریٹ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں میڈیا کی رپورٹنگ سے تو ایسا ہی لگتا ہے کہ شہر میں کوئی پاگل قاتل موجود ہے ورنہ ہتھوڑے سے کسی انسان کو بھلا کون مارتا ہے۔'' مارٹن نے بے نیازی سے جواب دیا تاہم وہ دل ہی دل میں مارگریٹ کے خوف سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''مارٹن! تم بھی اکثر دیر سے گھر واپس آتے ہو، ذرا احتیاط کیا کرو شہر میں ایک خطرناک قاتل موجود ہے اور میڈیا میں جو جائے وقوع بتایا جا رہا ہے اس کے مطابق نہ مسٹر ڈین والا علاقہ یہاں سے دور ہے نہ اس بھکاری کے قتل والی جگہ..... یعنی وہ جنونی قاتل ہمارے آس پاس بھی ہو سکتا ہے۔'' مارگریٹ فکرمندانہ لہجے میں بولی۔

''تم فکر مت کرو میں اپنا خیال رکھنا جانتا ہوں۔ ویسے تمہاری دلی خواہش تو یہی ہو گی کہ میں اس قاتل کا نشانہ بن جاؤں؟'' مارٹن مارگریٹ پر طنز کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''ایک تو تمہاری طنز کرنے کی عادت کبھی نہیں بدلے گی۔ تم سے ہمدردی جتلانا بھی فضول ہے۔'' مارگریٹ نے غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر اسی لمحے وہ ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ٹی وی پر اس وقت شہر کے پولیس چیف کا بیان چل رہا تھا جو لوگوں سے اپیل کر رہا تھا کہ شام کے وقت دھند میں گھروں سے باہر نہ نکلیں۔ ہمیں ابھی مسٹر ڈین اور اس بھکاری کے سر کے

ٹیسٹ کی فارنسک رپورٹ ملی ہے ماہرین کا خیال ہے کہ مسٹر ڈین اور کل رات قتل ہونے والے بھکاری کو ایک ہی ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے۔ دونوں کے سروں میں زنگ کی خاصی مقدار موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کو کسی پرانے اور زنگ آلود آہنی ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے اور اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے پولیس اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ شہر میں کوئی جنونی سیریل کلر موجود ہے۔ وہ آپ کو راہ چلتے بھی ہلاک کر سکتا ہے اور آپ کے گھر میں گھس کر بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ ہم ابھی تک اس کے مقاصد سے لاعلم ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قاتل کوئی جنونی شخص نہ ہو بلکہ باقاعدہ پلاننگ کے تحت شہر میں خوف وہراس پھیلانا چاہتا ہو۔ بہرحال پولیس جلد ہی اصل بات کا پتا لگا لے گی۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ قاتل مزید کسی انسان کی جان لے گا یا نہیں مگر پھر بھی سب لوگ احتیاط کریں۔ شام کو دھند میں اکیلے گھر سے نہ نکلیں۔ اگر آپ گھر میں اکیلے ہیں تو کسی انجان آدمی کے لیے دروازہ ہرگز نہ کھولیں، پولیس جلد ہی قاتل کو گرفتار کر لے گی۔''

''مارٹن! مجھے آج اپنی سہیلی الزبتھ کی بیٹی کی شادی پر جانا ہے کیا تم مجھے گاڑی پر ڈراپ کر دو گے؟ شادی بھی ایک قریبی میرج ہال میں ہے۔'' مارگریٹ نے ٹی وی سے توجہ ہٹاتے ہوئے مارٹن سے سوال کیا۔

''میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے۔'' مارٹن نے سرد اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''ویسے جہاں تک میں جانتا ہوں تمہاری سہیلی الزبتھ تو بڑی کٹر مذہبی ہے پھر اس نے چرچ کے بجائے میرج ہال میں اپنی بیٹی کی شادی کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟''

''وہ اتنی کٹر مذہبی بھی نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھتے ہو۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرج ہال میں پادری کا انتظام ہوتا ہے۔'' مارگریٹ نے جواب دیا۔ ''تو کیا تم مجھے چھوڑنے جاؤ گے؟''

''میں کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔'' مارٹن کا لہجہ بدستور سخت اور کھردرا تھا۔

''مارٹن! یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے آپسی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں مگر ہمیں دنیا کے سامنے تماشا نہیں بنانا چاہیے اب دیکھو نا اگر میں میرج ہال میں اکیلی اور پیدل گئی تو کیسا لگے گا۔ سب باتیں بنائیں گے تاہم اگر تم مجھے چھوڑنے جاؤ گے تو لوگ چہ میگوئیاں نہیں کریں گے۔'' مارگریٹ نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''تم کوئی ٹیکسی وغیرہ بھی تو لے سکتی ہو۔ پیدل جانے کی کیا ضرورت ہے؟'' مارٹن نے کہا۔

''ارے خوامخواہ پیسے خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے قریب ہی تو جانا ہے۔'' مارگریٹ نے نرم لہجے میں کہا۔

''کون سے میرج ہال؟'' مارٹن نے سوال کیا تو مارگریٹ نے میرج ہال کا نام بھی بتا دیا۔

''یہ میرج ہال تو ہمارے گھر کے بالکل پاس ہی ہے۔ پچھلی گلی سے گزرتے ہی تم وہاں پہنچ جاؤ... گی۔ وہاں تک تو تم پیدل بھی جا سکتی ہو۔ اتنے سے فاصلے کے لیے بھلا میری گاڑی کی کیا ضرورت ہے؟'' میرج ہال کا نام سن کر مارٹن نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ اس کی حیرت بجا تھی کیونکہ اس میرج ہال اور ان کے گھر کے درمیان صرف تین چار سو میٹر ایک چھوٹی سی گلی ہی پڑتی تھی۔

''مارٹن! تمہیں یہ بات میں زندگی بھر نہیں سمجھا سکی کہ رکھ رکھاؤ بھی کوئی شے ہوتی ہے۔'' مارگریٹ ناصحانہ لہجے میں بولی۔ ''میں پیدل وہاں جاتی اچھی لگوں گی کیا؟ شادی پر جا رہی ہوں مارکیٹ سے سودا خریدنے نہیں۔ میری سہیلی کیا سوچے گی؟ وہ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ میرج ہال کے دروازے پر سب کا استقبال کر رہی ہوگی اگر تم مجھے وہاں گاڑی پر ڈراپ کر دو گے تو ہماری بھی عزت رہ جائے گی۔'' مارگریٹ نے دانستہ میری عزت کے بجائے ہماری عزت کے الفاظ استعمال کیے۔

''او کے ٹھیک ہے میں تمہیں گاڑی پر ڈراپ کر دوں گا۔'' مارٹن پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''اور واپسی پر مجھے فون کر دینا میں اس وقت تمہیں لینے بھی آ جاؤں گا۔''

مارٹن کے جواب پر مارگریٹ نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اسے مارٹن کے رضامند ہونے پر حیرت ہوئی ہو تاہم اس کے چہرے پر ہلکے سے اطمینان کے تاثرات بھی عود آئے تھے۔

مارٹن کا ذہن اس وقت بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ٹی وی پر چلنے والے پولیس چیف کے بیان کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے کسی اور کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ پولیس اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ مسٹر ڈین اور اس بھکاری کو ایک ہی ہتھیار سے مارا گیا ہے اور یہ کام کسی سیریل کلر کا ہے۔ پولیس کو یہ باور کروانا ہی تو مارٹن کا مقصد تھا اور جب مقصد پورا ہو چکا... تو پھر کسی اور کو قتل کرنے کے بجائے اب سیدھا سیدھا مارگریٹ کو ہی ٹھکانے لگا دینا بہتر تھا۔ مارگریٹ کا بھی اسی انداز میں قتل پولیس کے سیریل کلر کے..... انداز کو تقویت بخشنے کے لیے کافی تھا۔

یہی سوچ کر اس نے مارگریٹ کے سامنے ہامی بھری تھی اور کہا تھا کہ وہ اسے واپس بھی لے آئے گا تاہم اس نے اپنے ذہن میں پورا منصوبہ ترتیب دے دیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ مارگریٹ کو چھوڑنے تو جائے گا مگر بہ وقتِ واپسی جب وہ اسے فون کرے گی تو وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنالے گا۔ اس کے بعد مارگریٹ کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ وہ پیدل ہی واپس آئے۔ وہ اپنی کنجوس طبیعت بیوی سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ اتنے تھوڑے سے فاصلے کو طے کرنے کے لیے ٹیکسی ہرگز نہیں لینے والی تھی اور اپنی رکھ رکھاؤ والی طبیعت کی وجہ سے کسی کو گھر ڈراپ کرنے کا بھی نہیں کہنے والی تھی اس لیے اس کے پاس پیدل واپسی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جیسے ہی وہ مارٹن کو فون کرتی، مارٹن اس سے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرتا اور پھر خود اسی گلی میں مارگریٹ کی آمد کا انتظار کرتا جہاں سے اس کی آمد متوقع تھی۔ وہاں اسے آسانی سے ... آہنی ہتھوڑے کی مدد سے ٹھکانے لگایا جاسکتا تھا۔ میرج ہال سے اس کے گھر تک پیدل آنے کے دو راستے تھے۔ ایک وہ گلی اور دوسرا راستہ قبرستان کے اندر سے گزرتا تھا۔ مارگریٹ جیسی ڈرپوک عورت قبرستان سے تو آنہیں سکتی تھی اس لیے اس کی آمد اس گلی سے ہی ہونی تھی... جہاں مارٹن آہنی ہتھوڑے سمیت اس کا منتظر ہوتا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ مارگریٹ کو مارنے کے بعد وہ واپس اپنے گھر آئے گا اور پھر اپنے ہتھوڑے سے بھی نجات حاصل کرلے گا مارگریٹ کو مارنے کے بعد آلۂ قتل کی اس کے گھر میں موجودگی مناسب نہیں تھی۔ اگرچہ اس بات کے امکانات بہت کم تھے کہ پولیس مارگریٹ کے قتل کے سلسلے میں اس پر شک کرتی مگر پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ وہ ایک بہترین منصوبہ ساز تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پلان میں کوئی جھول رہ جائے۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اگرچہ رات کے اس وقت گلی میں کوئی نہیں ہوگا تاہم دس بجے کے بعد گلی کے سیکیورٹی گارڈز کی آمد ہوتی ہے۔ اس کے بعد مارگریٹ کی لاش دریافت ہوجائے گی جس کے بعد پولیس تک معاملہ پہنچ جائے گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ پولیس کو کیا بیان دینا ہے۔ اسے بس پولیس کو یہ کہنا تھا کہ وہ یہ سمجھا تھا کہ مارگریٹ کو میرج ہال میں کچھ دیر ہوگئی ہے۔ اس کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس علاقے کے سبھی افراد اسے اور مارگریٹ کو جانتے تھے اس لیے مارگریٹ کی لاش دریافت ہوتے ہی کسی نہ کسی نے پولیس کو اور اسے مطلع کر ہی دینا تھا۔ مارٹن کے ذہن میں تمام نکات موجود تھے، اسے بس پولیس کے سامنے غمزدہ ہونے کی ایکٹنگ کرنی تھی۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ پولیس والوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آئے گی کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے بلکہ پولیس اسی نتیجے پر پہنچے گی کہ یہ کام بھی اسی جنونی قاتل کا ہے جس نے شہر میں دو دن سے خوف و ہراس کی فضا پیدا کردی ہے۔ کچھ دن گزریں گے تو سب کچھ پھر نارمل ہو جائے گا اور اس کے بعد وہ اپنی زندگی کا وہ سنہرا دور گزارے گا جس میں مارگریٹ نامی کسی منحوس بڑھیا کا نام ونشان تک نہیں ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مارگریٹ کو ڈراپ کرنے کے ساتھ ساتھ پک کرنے کی بھی ہامی بھر لی تھی۔ ورنہ یہ حقیقت تھی کہ عام حالات میں شاید وہ ہامی بھرنے سے صاف انکار کردیتا۔ مارگریٹ کو اسی گلی میں قتل کرنا ضروری تھا۔ اپنے گھر کے اندر اسے مارنے سے اسے پولیس کے بہت سے سوالوں کے جواب دینے پڑ سکتے تھے۔

اب اس کے منصوبے کا فائنل راؤنڈ شروع ہونے والا تھا اسے یقین تھا کہ وہ آج بھی کامیاب رہے گا۔ شادی لیٹ نائٹ ختم ہوگی اور اس وقت اس گلی میں کوئی نہیں ہوگا جہاں سے مارگریٹ نے آنا تھا اور دھند اور سردی اس کا کام مزید آسان کردیں گے۔ گلی کا سیکیورٹی گارڈ رات کو بہت دیر سے آتا تھا اس لیے مارگریٹ کے قتل کے وقت اس کی آمد متوقع نہیں تھی تاہم شاید مارگریٹ کی لاش وہی دریافت کرتا، بہرحال اصل مقصد مارگریٹ کو ختم کرکے اس کا قتل سیریل کلر کے کھاتے میں ڈالنا تھا اس کی لاش جتنے بجے بھی دریافت ہوتی مارٹن کو اس کی پروا نہیں تھی۔ پولیس کے اس سوال کا جواب اس کے پاس تیار تھا کہ مارگریٹ جب رات نہیں آئی تو اس نے اسے تلاش کیوں نہیں کیا۔ وہ کہہ سکتا تھا کہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ مارگریٹ واپس نہیں آئی۔ اسے دوسروں سے اس کے مرڈر کی اطلاع ملی۔ ویسے بھی اسے مارگریٹ کی آمد پر دروازہ نہیں کھولنا تھا۔ مارگریٹ کے پاس گھر کے پچھلے دروازے کی چابی ہمیشہ رہتی ہے۔ مارٹن خود کو مارگریٹ کے قتل اور پولیس کے سوالوں کے جوابات دینے کے لیے پوری طرح تیار کرچکا تھا۔ اب بس مارگریٹ کی روانگی کا انتظار تھا۔

شام چھ بجے کے قریب مارگریٹ نے اس سے کہا کہ وہ اسے میرج ہال تک چھوڑ دے، وہ تیار ہوچکی تھی۔

مارٹن نے اپنی گاڑی نکالی۔ مارگریٹ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ہوگئی۔ مارٹن نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ویسے یہ بس ایک تکلف ہی تھا ورنہ میرج ہال تک رسائی کے لیے گاڑی کی ضرورت ہی نہیں تھی، کچھ ہی دیر میں ان کی

گاڑی میرج ہال کے سامنے پہنچ گئی' ہال کے باہر کچھ افراد موجود تھے جن میں زیادہ تعداد مرد حضرات کی تھی۔ مارٹن کو الزبتھ نامی مارگریٹ کی سہیلی بھی نظر آ گئی۔ وہ استقبالیہ کے لیے کھڑی خواتین میں سب سے آگے موجود تھی۔

''الزبتھ نے ہمیں دیکھ لیا ہے، بس میں یہی چاہتی تھی۔'' مارگریٹ کار سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، بچن میں کافی رکھی ہے جا کر پی لینا۔''

''اوہ شکریہ! مجھے اس وقت کافی کی واقعی طلب ہو رہی تھی۔ میں جا کر گرم کرلوں گا۔'' مارٹن نے نرم لہجے میں کہا۔

''کافی تھرماس میں ہے اس لیے ٹھنڈی نہیں ہوگی کیونکہ تم نے مجھے واپس بھی لینے آنا ہے اس لیے میں نے زیادہ کافی بنا کر تھرماس میں ڈالی تھی تاکہ تم مسلسل کافی پیتے رہو اور تمہیں نیند نہ آئے۔ یاد رکھنا اگر تم نہ آئے تو مجھے پیدل واپس آنا پڑے گا۔ میں کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتی، تم میری عادت سے واقف ہی ہو؟'' مارگریٹ نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میرج ہال..... کی جانب بڑھ گئی جہاں اس کی سہیلی الزبتھ موجود تھی۔

''ہاں، میں تمہاری عادت سے واقف ہوں اور مجھے تمہاری اسی عادت کا تو فائدہ اٹھانا ہے کہ تم خوامخواہ کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتیں تمہاری یہی عادت تمہاری جان لینے والی ہے یہ تم نے سوچا بھی نہ ہوگا۔'' مارٹن ہلکے سے بڑبڑایا اور پھر گاڑی موڑ کر واپس روانہ ہوگیا۔

گاڑی گیراج میں کھڑی کر کے اس نے گیراج سے ہتھوڑا اٹھایا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اب اسے بس دو تین گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ دو سے تین گھنٹے کے اندر اندر مارگریٹ اس کے موبائل فون پر کال کرے گی جس کے بعد وہ اسے اپنے پلان کے مطابق جواب دے گا کہ اس کی طبیعت خراب ہوگئی ہے، وہ نہیں آسکتا اور پھر خود گھر سے نکل کر اس تاریک گلی میں مارگریٹ کا انتظار کرے گا جہاں سے اس کی آمد ہونی تھی اسی لیے وہ گیراج سے آہنی ہتھوڑا ساتھ لے آیا تھا۔ اس نے ہتھوڑا ٹیبل پر رکھا اور پھر اٹھا کر کچن میں آ گیا۔ مارگریٹ نے اس کے لیے کافی کا تھرماس بنا کر رکھا تھا۔ اس نے تھرماس اور ایک خالی مگ اٹھایا اور پھر واپس ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ مگ میں کافی انڈیل کر وہ گرم گرم کافی کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ اپنے منصوبے کے بارے میں سوچنے لگا' اس نے واقعی مارگریٹ کو مارنے کے لیے ایک فول پروف پلان ترتیب دیا تھا۔ پولیس کا سارا شک سیریل کلر پر ہی جاتا۔

مارٹن کو آج اپنی ذہانت پر فخر ہونے لگا تھا۔ اسے اپنے پلان میں ذرا سا بھی جھول محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

کافی ختم کر کے اس نے تھرماس سے دوبارہ کافی انڈیلی اور ایک بار پھر گرما گرم کافی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ آج اپنے پلان کے فائنل راؤنڈ پر عمل کرنے سے پہلے پوری طرح فریش اور چاق و چوبند ہونا چاہتا تھا مگر یہ کیا..... اس کے جسم کو اچانک کیا ہونے لگا تھا؟ کافی کا مگ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ فوری طور پر اسے سمجھ نہیں آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے' اس کا پورا جسم یک بیک مفلوج ہوگیا تھا کہیں اس پر فالج کا حملہ تو نہیں ہو رہا؟ اس نے سوچا مگر پھر اپنے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس نے اب سے تین گھنٹے قبل اپنا بلڈ پریشر چیک کیا تھا۔ اس کا بلڈ پریشر بالکل نارمل تھا تو پھر کیا کافی میں کچھ تھا، کہیں مارگریٹ نے اسے زہر تو نہیں دے دیا؟

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ مارگریٹ ایسی بے وقوفی ہرگز نہیں کرسکتی تھی کیونکہ وہ ایک سابقہ نرس تھی۔ اچھی طرح جانتی تھی کہ زہر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں نہیں چھپ سکے گا اور وہ گرفتار ہوجائے گی۔ تو پھر یہ اس کے ساتھ کیا ہوگیا تھا؟ وہ صوفے پر ایک طرف لڑھک گیا تھا تاہم باوجود سر توڑ کوشش کے اپنے جسم کو معمولی سی حرکت بھی نہیں دے پا رہا تھا۔ اس کا جسم مفلوج ہو چکا تھا اس ناگہانی افتاد پر اس کا ذہن بھک سے اڑ گیا تھا' اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے' اسی لمحے اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ سیل فون اس کے کوٹ کی جیب میں تھا مگر وہ اپنے ہاتھ سے اسے کوٹ کی جیب سے نکالنے سے قاصر تھا۔ اتنی جلدی مارگریٹ کی کال تو نہیں آسکتی تھی نہ جانے کس کا فون تھا۔ فون کرنے والے نے بھی شاید قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک وہ فون نہیں اٹھائے گا وہ فون کرتا رہے گا۔ مارٹن بے بسی سے کئی منٹ تک بیل کی آواز سنتا رہا اور پھر بیل کی آواز بند ہوگئی اور ماحول میں سکوت سا چھا گیا۔ مارٹن کا جسم حرکت کرنا چھوڑ گیا تھا تاہم حواس پوری طرح بیدار تھے سماعت اور بصارت بھی پوری طرح کام کر رہی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا جبکہ مارٹن بے بسی سے اپنی جگہ پڑا رہا پھر اسے گھر کا عقبی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ عقبی دروازے کی چابی مارگریٹ کے پاس ہوتی تھی اس لیے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر مارٹن کو اندازہ ہوگیا کہ وہی آئی ہوگی مگر وہ اتنی جلدی واپس کیوں آ گئی تھی؟ یہ ایک ایسا

سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا چند ثانیوں میں ہی مارگریٹ اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

''مارٹن، مارٹن! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟'' اس نے قریب آکر کہا مارٹن کو جھنجھوڑا تاہم مارٹن اس کی آواز تو سن رہا تھا مگر کوئی جواب دینے سے قاصر تھا۔ اس کے جسم کے ساتھ ساتھ گویا زبان بھی مفلوج ہوگئی تھی۔

مارگریٹ نے ٹیبل پر پڑا کافی کا کپ اٹھا کر دیکھا پھر تھرماس کھول کر چیک کیا۔ اس نے ٹیبل پر پڑے ہتھوڑے کو اٹھا کر دیکھا اور پھر واپس رکھ دیا۔ اب اس کے چہرے پر گہرے اطمینان کے تاثرات عود آئے تھے۔

''مارٹن..... تم نے کافی پی لی ہے تو اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ ویسے بے فکر رہو جو دوا میں نے تمہاری کافی میں ملائی تھی اس سے تمہاری موت واقع نہیں ہوگی یہ دوا... تو بس جسم کو مفلوج کرتی ہے۔ ہاں اس کا ایک اور فائدہ بھی ہے کہ یہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ظاہر نہیں ہوتی۔ سابقہ نرس ہونے کی وجہ سے میں جانتی ہوں کہ اب بارہ گھنٹے تک تمہارا جسم مفلوج ہی رہے گا اور حرکت میں آنے سے پہلے تم دوسری دنیا پہنچ چکے ہوگے۔ اس کے بعد میری پرسکون زندگی کا آغاز ہوگا۔ ایسی زندگی جس میں تمہارا منحوس سایہ تک میرے قریب نہیں پھٹکے گا۔'' یہ کہہ کر مارگریٹ ہذیانی انداز میں ہنسنے لگی۔

مارٹن حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات سے مارگریٹ کو بے بسی سے تک رہا تھا تاہم اسے مارگریٹ کے اس طرح ہنسنے سے خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ مارگریٹ کا چہرہ اس وقت بہت خوفناک لگ رہا تھا۔

اسی لمحے مارگریٹ نے اس کے دونوں پیروں کو پکڑا اور پھر اسے کھینچتے ہوئے صوفے سے نیچے پٹخ دیا۔ نیچے گرنے پر مارٹن کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے سر کے پچھلے حصے میں کافی چوٹ آئی ہے تاہم اسے بہت معمولی سی تکلیف کا احساس ہوا۔ شاید ایسا اس دوا کے اثر کی وجہ سے تھا جو مارگریٹ نے اس کی کافی میں ملائی تھی۔

مارگریٹ نے اس کے دونوں پیروں کو ایک بار پھر پکڑا اور پھر اسے کھینچتی ہوئی گھر کے مین دروازے کے بالکل سامنے لے آئی۔ ایسا کرنے کے بعد وہ کچھ دیر تک ٹھہری ہوکر اپنی بے ترتیب سانسوں کو اعتدال پر لانے لگی۔ اگرچہ مارٹن بہت زیادہ جسامت اور وزن نہیں رکھتا تھا تاہم مارگریٹ بوڑھی عورت تھی اس لیے زور لگنے پر اس کی سانسیں پھول گئی تھیں۔ اپنی سانسوں کو اعتدال پر لانے کے بعد اس نے دروازے کو اندر سے کھول دیا اور پھر مارٹن کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

''مارٹن! تم یقیناً حیران ہو رہے ہوگے کہ میں نے یہ سب کیوں کیا؟ تو آج میں تمہیں بتاتی ہوں۔ میں تم سے شدید نفرت کرتی ہوں..... اتنی شدید نفرت کہ میرے لیے تمہارے ساتھ ایک پل گزارنا بھی بہت مشکل تھا مگر میں تم سے طلاق نہیں لے سکتی تھی۔ اس طرح مجھے تمہارے ذاتی اسٹور کے اس ماہانہ کرائے سے محروم ہونا پڑتا جس کی وجہ سے ہمارے گھر کے اخراجات چل رہے تھے۔ میں اکثر تمہیں راستے سے ہٹانے کے منصوبے سوچا کرتی تھی۔ میں نے تمہیں قتل کرنے کے بہت سے منصوبے بنائے مگر میرے ہر پلان میں کوئی نہ کوئی سقم رہ جاتا تھا۔ میں اپنے ملک کی پولیس سے بخوبی آگاہ ہوں اس لیے تمہیں راستے سے ہٹانے کا کوئی ایسا منصوبہ سوچتی تھی جس پر عمل پیرا ہوکر میں کامیاب رہوں اور پولیس کو مجھ پر شک نہ ہو مگر برسوں تک مجھے تمہیں راستے سے ہٹانے کا کوئی فول پروف پلان سمجھ نہیں آسکا۔ حتیٰ کہ ایک وقت مجھے لگنے لگا کہ اب مجھے تمہارے ساتھ ہی زندگی گزارنی پڑے گی مگر پھر اچانک شہر میں دو افراد کو ایک ہی طریقے سے قتل کردیا گیا اور سچ پولیس چیف کے اس بیان کو سننے کے بعد کہ شہر میں کوئی سیریل کلر موجود ہے..... جو آپ کو روڈ پر بھی مار سکتا ہے اور گھر میں گھس کر بھی مار سکتا ہے تو میرے ذہن میں بھی یہ پلان آیا کہ تمہیں بھی اس سیریل کلر کے کھاتے میں آسانی سے ڈالا جاسکتا ہے، بس مجھے اتنا کرنا ہوگا کہ تمہارے سر پر کسی آہنی شے کی ضرب لگا کر مارنا ہوگا..... بالکل اسی جنونی قاتل کے انداز میں۔ پولیس کے مطابق اس کلر کے فنگر پرنٹس جائے وقوع پر نہیں مل سکے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ربڑ کے دستانے وغیرہ استعمال کرتا ہے اس لیے تمہارے قتل کے بعد بھی انہیں کسی کی انگلیوں کے نشانات نہیں ملیں گے تو بھی ان کا شک اسی قاتل پر جائے گا جس نے شہر میں خوف و ہراس کی فضا قائم رکھی ہے۔ رہ گئی میری بات تو یہ میرا گھر ہے، یہاں میری انگلیوں کے نشانات تو ویسے ہی ہونے چاہئیں اس لیے پولیس کو مجھ پر شک نہیں ہوگا۔ بہرحال پولیس چیف کا بیان سنتے ہی مجھے لگا کہ تمہیں راستے سے ہٹانے کے لیے آج کا دن مناسب ہے۔ آج مجھے ازبتھ کی بیٹی کی شادی پر جانا تھا اس لیے میں نے اپنے منصوبے پر آج ہی عمل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں پولیس چیف کا بیان سننے کے بعد کچھ دیر کے لیے بازار گئی اور میڈیکل اسٹور سے اپنی مطلوبہ دوائیں حاصل کیں ان دواؤں کو آپس میں ایک مخصوص تناسب سے

ملا کر میں نے وہ دوا تیار کی جو تمہاری کافی میں ملائی تھی' اس کے بعد میں نے تمہیں اپنے ساتھ شادی ہال تک چلنے پر آمادہ کیا۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ پولیس جب تمہارے قتل کی تفتیش کرے تو انہیں علم ہو جس دن تم قتل ہوئے اس دن ہمارے آپسی تعلقات بہت اچھے تھے۔ تم مجھے خود میرج ہال تک چھوڑنے آئے تھے۔ بہرحال میرج ہال پہنچ کر میں نے تمہیں مسلسل فون کیے اور جب تم نے فون نہیں اٹھایا تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم نے کافی پی لی ہے۔ تم اپنا سیل فون سوتے میں بھی اپنے پاس رکھتے ہو اس لیے جب تم نے فون نہیں اٹھایا تو اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ تم اس قابل ہی نہیں رہے کہ میرا فون سن سکو۔

''میں میرج ہال میں باتھ روم گئی، وہاں سے عقبی جانب ہال کا ایمرجنسی ڈور ہے۔ میں اس راستے سے نکلی اور پھر پیدل ہی یہاں آ گئی۔ گھر کے عقبی دروازے کی چابی تو میرے پاس موجود ہی رہتی ہے بہرحال تمہیں مارنے کے بعد میں دوبارہ ہال کے اندر اس کے عقبی راستے سے داخل ہو جاؤں گی اور سب کو یہی لگے گا کہ میں شادی کے اختتام تک اسی جگہ موجود رہی تھی۔ واپسی پر میں تمہارے سیل فون پر کال کروں گی تم کیونکہ اس وقت مر چکے ہو گے اس لیے میرا فون تو نہیں اٹھا سکو گے' اس کے بعد میں اپنی عادت کے برعکس کسی سے گھر تک چھوڑنے کی درخواست کروں گی۔ وہاں الزبتھ کے علاوہ میری دوسری سہیلیاں بھی موجود ہوں گی، کوئی نہ کوئی مجھے چھوڑنے آ جائے گی۔ میں اسے باہر سے نہیں جانے دوں گی بلکہ ضد کر کے اسے کافی پلانے گھر کے اندر لاؤں گی۔ میرا مقصد اسے کافی پلانا نہیں بلکہ یہ ہو گا کہ وہ میرے ساتھ تمہاری لاش دریافت کرے اور پولیس کو یہ گواہی دے سکے کہ میں اس کے ساتھ ہی آئی تھی اور جب ہم اندر داخل ہوئے تو دروازہ اندر سے بند نہیں تھا اور اندر تمہاری لاش پڑی تھی۔

''مجھے یقین ہے کہ میرا پلان کامیاب رہے گا۔ پولیس کو مجھ پر شک نہیں ہو گا بلکہ تمہارا قتل بھی اس قاتل کے کھاتے میں چلا جائے گا جس نے مسٹر ڈین اور اس وائلن بجانے والے بھکاری کو قتل کیا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے مگر میں اسے اپنا محسن ضرور مانتی ہوں۔ اسی کی وجہ سے تمہیں راستے سے ہٹانے کا یہ انوکھا منصوبہ میرے ذہن میں آیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب اسے تمہارے قتل کے بارے میں خبر ہو گی تو وہ بھی حیران ہو گا کہ یہ کون ہے جس نے اسی کے انداز میں قتل کر دیا ہے۔

''میں نے فرنٹ دروازہ کھول دیا ہے تو اب پولیس یہ سمجھے گی کہ وہ پراسرار قاتل تمہارے گھر آیا، اس نے دستک یا بیل دی۔ تم نے جواباً یہ پوچھے بغیر کہ باہر کون ہے، دروازہ کھول دیا اور اس کا شکار بن گئے۔ واپسی پر میری جو سہیلی میرے ساتھ آئے گی اس کا بیان بھی.....

اسی جانب متوجہ کروائے گا اور الزبتھ اور میری ساری سہیلیاں یہ بیان بھی دیں گی کہ میں شادی ہال میں ہی موجود رہی تھی۔ عقبی ایمرجنسی ڈور کی جانب کوئی کیمرا بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے پولیس کو میرے خلاف کوئی کلیو نہیں ملے گا۔ تو کیسا لگا میرا منصوبہ؟'' مارگریٹ مارٹن کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی ہنسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولی تاہم مارٹن اس کی کسی بات کا جواب دینے سے قاصر تھا۔ وہ بدستور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے تکے جا رہا تھا۔

''میں نے کچن میں ایک آہنی راڈ رکھا ہوا ہے۔'' چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد مارگریٹ دوبارہ بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ تمہیں اس راڈ سے ہلاک کروں گی مگر میز پر رکھے ہتھوڑے کو دیکھ کر مجھے لگ رہا ہے یہ زیادہ مناسب ہے۔ شاید تم نے کیل وغیرہ ٹھونکنے کے لیے اسے رکھا ہے۔ میں کئی دن سے کہہ رہی تھی کہ ٹیبل کے کیل اکھڑے ہوئے ہیں۔

''چلو اب راڈ کی جگہ اسی ہتھوڑے سے کام چل جائے گا۔ اس کے بعد میں اس ہتھوڑے کو میرج ہال واپس جاتے وقت راستے میں پڑنے والے کسی گٹر کی نذر کر دوں گی۔ مجھے جلد از جلد میرج ہال واپس پہنچنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مارگریٹ نے آگے بڑھ کر ٹیبل پر رکھا وہ ہتھوڑا اٹھا لیا جس سے مارٹن نے اسے ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا تھا مگر آج مارٹن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی اس سے بڑی منصوبہ ساز تھی۔

مارگریٹ ہتھوڑا لے کر اس کے سر کے بالکل پاس بیٹھ گئی تھی، اس نے ہتھوڑے والے ہاتھ کو بلند کر لیا تھا۔

''میں تمہیں مارنے سے پہلے آخری بار اس پراسرار قاتل کو بھی سلام پیش کرتی ہوں جس کی وجہ سے مجھے تمہیں راستے سے ہٹانے کا موقع ملا اور جس کی وجہ سے تمہیں راستے سے ہٹانے کا بے داغ منصوبہ میرے ذہن میں آیا۔

''تو پھر الوداع مارٹن! ہماری تیس سال کی تلخ رفاقت اپنے انجام کو پہنچی۔'' مارگریٹ نے زہریلے لہجے میں کہا اور پھر پوری قوت سے ہتھوڑا مارٹن کے سر پر دے مارا۔ اس کے ساتھ ہی مارٹن کا ذہن موت کی سیاہ تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

⌘⌘⌘

وصیت

تنویر ریاض

اگر طمع کسی کی عادت کا محض حصہ ہو تو پھر بھی زندگی کا گزارا ہوجاتا ہے مگر جب یہ خاصیت کسی کے کاروبار کی بنیاد بن جائے تو جھوٹ کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور نہ ہی جرم کی کوئی حد... زندگی کے اس آخری حصے میں وہ بھی ایسے ہی کاروباری لوگوں کے درمیان پھنس کر رہ گیا تھا پھر اچانک قدرت کو جیسے اس پر رحم آگیا اور ان بیوپاریوں کے ہاتھ سوائے خسارے کے کچھ نہ آیا۔

کسی کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے والے وصیت کے دو حرفوں کا کمال

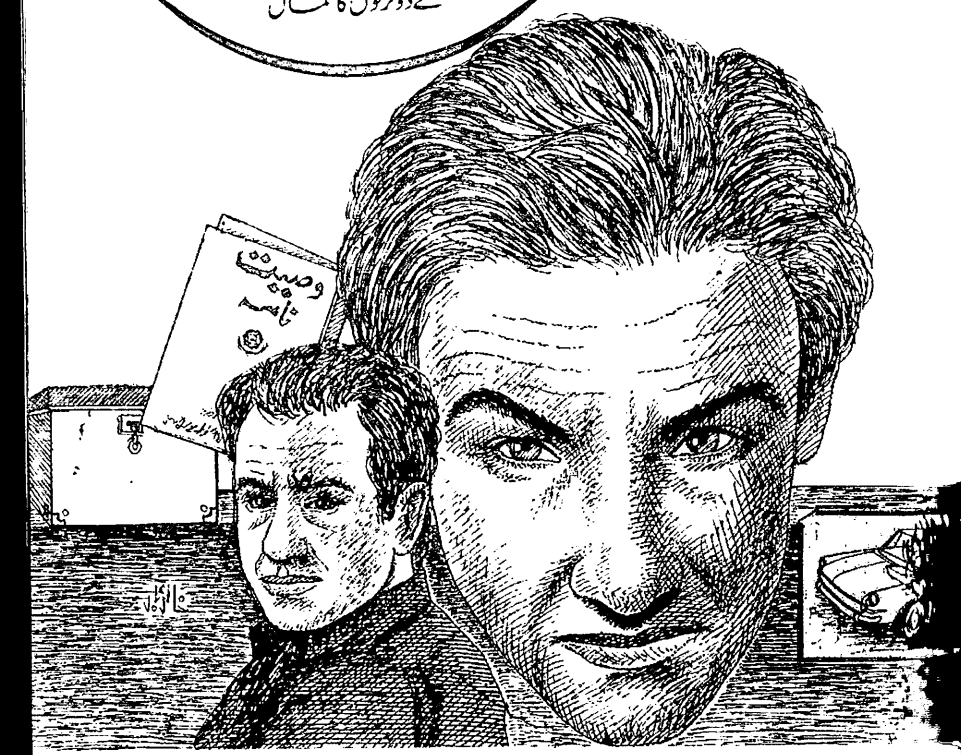

والٹر نے کبھی کوئی وصیت نہیں بنوائی، اس لیے نہیں کہ اس کے پاس اثاثے نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وصیت سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی بہن شرے تین سال پہلے فوت ہو چکی تھی۔ دونوں نے شادی نہیں کی اس لیے ان کا کوئی وارث نہیں تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اپنے مالی اور قانونی معاملات کو حتمی شکل دے دینی چاہیے۔ تمہاری صحت دن بہ دن خراب ہوتی جارہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم زیادہ

عرصہ زندہ نہ رہ سکو گے۔ بہتر ہے کہ تم اپنی وصیت تیار کر لو۔'' ڈاکٹر نے اسے مشورہ دیا۔

گزشتہ روز ڈاکٹر نے فون پر اسے تاکید کی تھی کہ وہ دوسرے دن صبح اس کے کلینک آجائے۔ وہ اس سے حالیہ ٹیسٹوں کی رپورٹ کے بارے میں بالمشافہ گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ والٹر اس کا مطلب سمجھ گیا۔ یقیناً وہ ایک ستتر سالہ بوڑھے شخص کو صحت مند طرزِ زندگی کی مبارک باد نہیں دیتا۔ تاہم والٹر کا خیال تھا کہ وہ اسے کرسمس کی خریداری سے منع کرے گا جس میں دو مہینے باقی تھے۔ چند روز قبل ہی اس نے ڈاکٹر سے اپنا معائنہ کروایا تھا کیونکہ چند ہفتے قبل اس کی کمر کے نچلے حصے میں شروع ہونے والا درد پھیل گیا تھا اور ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹر نے اس کے کچھ ٹیسٹ کروائے تھے جن کی رپورٹیں آگئی تھیں اور وہ اسی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔

والٹر کو وصیت والا مشورہ پسند نہیں آیا۔ اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''میری کوئی وصیت نہیں ہے۔ میرا کوئی رشتے دار نہیں جو اس سے مستفید ہو سکے پھر میں کس کے لیے وصیت تیار کروں؟''

''تم کسی فلاحی تنظیم کے بارے میں بھی غور کر سکتے ہو۔'' ڈاکٹر نے تجویز پیش کی۔ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی تنظیم کا نام بتانے والا ہے۔

والٹر بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ اسے اور بھی کئی کام کرنا تھے۔ وہ اچانک ہی کھڑا ہو گیا۔ ''میں یہ دوائیں منگوا لوں گا۔ تمہارے وقت کا شکریہ۔'' اس نے کہا۔

ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اپنے خلوص کے اظہار کے لیے اپنا دوسرا ہاتھ بھی اس پر رکھ دیا۔ والٹر نے سوچا کہ یہ اتنی ہمدردی کیوں جتا رہا ہے... کیا اس کے پاس بہت فالتو وقت ہے؟

وہ اپنی کار میں گھر واپس آگیا۔ اس کی ساری زندگی اسی مکان میں گزری تھی، سوائے اس عرصے کے جب وہ ویت نام میں فوجی خدمت انجام دینے گیا تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد وہ اور شرے اسی مکان میں رہتے رہے۔ شرے کا منگیتر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسی طرح اس کی منگیتر نے بھی ایک خط بھیج کر اس سے قطع تعلق کر لیا جب وہ فوجی کیمپ کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ شاید وہ اس کی طویل غیر حاضری برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

منگیتر کی بے وفائی سے وہ اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ عورت ذات پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا اور اس نے دوبارہ کسی سے تعلق قائم نہیں کیا۔ گو کہ کئی عورتوں نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہمیشہ ان سے فاصلہ برقرار رکھا اور ہائے ہیلو سے آگے بات نہ بڑھی۔ شرے کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ایک تعلق ختم ہونے کے بعد اس نے کسی مرد کو اپنے قریب آنے دیا ہو اور اگر کوئی اس کی زندگی میں آیا تو کسی کو اس کا علم نہ ہوا کیونکہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بہت محتاط تھی۔

والدین کے ریٹائر ہونے کے بعد دونوں نے ڈرائی کلیننگ کا خاندانی کاروبار مکمل طور پر سنبھال لیا تھا۔ پہلے ان کی ماں سارا حساب کتاب دیکھتی تھی۔ اس کے بعد شرے نے یہ ذمے داری سنبھال لی جبکہ باقی سارا کام اپنے باپ کی طرح والٹر کیا کرتا۔ دونوں نے اپنی محنت سے کاروبار کو آگے بڑھایا اور بہت جلد اس کی مزید تین شاخیں قائم ہو گئیں لیکن شرے کی موت کے بعد والٹر نے یہ کاروبار اپنے پرانے ملازم لوئیس کو فروخت کر دیا کیونکہ وہ تنہا اس کو سنبھالنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی گرتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر ڈاکٹروں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ ویسے بھی اسے کام کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ اس کے پاس اتنی جمع پونجی تھی کہ اس کا گزارہ آرام سے ہو سکتا تھا۔

اب لوئیس کی بیوی ٹینا سارا حساب کتاب دیکھنے لگی۔ شرے نے اسے سب کچھ سکھا دیا تھا۔ لوئیس نے بڑی محنت سے کاروبار کو ترقی دی۔ اس میں پک اپ، ڈیلیوری اور ٹیلرنگ کی سہولتوں کا اضافہ کیا جس کے نتیجے میں تینوں شاخیں انتہائی منافع بخش ہو گئیں۔ والٹر ان دونوں کی کارکردگی سے بہت خوش تھا لیکن اب ایک آخری کام باقی تھا اور اب والٹر کا خیال تھا کہ اسے بھی فوری طور پر نمٹا دینا بہتر ہوگا۔

والٹر نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے پرانے اسٹور کی طرف چل دیا۔ اس وقت دوپہر کے کھانے کا وقفہ تھا اور لوگ زیادہ تر اسی دوران لانڈری کا رخ کرتے ہیں۔ اسٹور صبح سے لے کر رات گئے تک کھلا رہتا تھا تاکہ مین ہٹن سے آنے والے گاہک بھی اس سہولت سے فائدہ اٹھا سکیں۔

والٹر اپنے اسٹور سے چند بلاک کے فاصلے پر ایک ہوٹل میں رک گیا تاکہ اسٹور میں گاہکوں کا رش کچھ کم ہو

جائے۔ ہوٹل کے مالک نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور بولا۔

''تم کہاں غائب ہو؟ ہم تمہیں بہت یاد کررہے تھے۔ تمہارا پسندیدہ کھانا تیار ہے، کہو تو منگواؤں؟''

ان دنوں والٹر کی بھوک بہت کم ہوگئی تھی۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور فوراً ہی سینڈوچ اور فرائی چپس سے بھری پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی گئی۔ اس کا کافی کا کپ پہلے ہی بھر دیا گیا تھا۔ والٹر نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی لیکن کافی کھانا بچ گیا۔

جب اسے یقین ہوگیا کہ گاہکوں کا رش کم ہوگیا ہوگا تو وہ اسٹور کی جانب چل دیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے لوئیس اور ٹینا سے کہا کہ وہ دروازے پر Closed کی تختی لگادیں۔

''تم پریشان مت ہو۔ اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ دراصل مجھے یہ کام بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا۔''

وہ سارا کاروبار پہلے ہی ان کے حوالے کرچکا تھا لیکن یہ عمارت اب بھی اس کی ملکیت تھی۔ اب وہ مخصوص رقم کے عوض ان کی ہونے والی تھی۔ والٹر نے تمام کاغذی کارروائی مکمل کرلی تھی اور اب انہیں صرف ان کاغذات کی تصدیق کروانی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کام آج ہی ہوجائے۔

شرلے کو جیولری بہت پسند تھی اور اس نے مختلف شہروں کے سفر کے دوران بہت سے عمدہ زیورات خریدے تھے۔ اس نے وہ جیولری باکس ٹینا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تم اسے کھولو گی تو ایک ننھی منی رقاصہ موسیقی کی دھن پر رقص کرتی نظر آئے گی۔''

ٹینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لوئیس نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بینک میں ایک تصدیق کرنے والا ہوتا ہے۔ ہمیں پہلے وہاں جانا چاہیے۔''

''نہیں، تم چلے جاؤ۔ میں کچھ تھکاوٹ محسوس کررہا ہوں۔''

اس نے لوئیس اور ٹینا کو اپنی بیماری کے متعلق مختصراً بتایا اور کہا کہ وہ اس بات کو اپنے تک رکھیں، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے پڑوسی اور گاہک اسے دیکھنے آئیں اور اپنے مشوروں سے نوازیں۔ ''مجھے تم سے بہت توقعات ہیں۔ تم اپنا کام جاری رکھو جیسا کہ تم نے ہمیشہ کیا ہے۔ میں کسی جگہ سے تمہاری نگرانی کرتا رہوں گا۔'' اس نے مذاقاً کہا تو لوئیس نے متانت سے سر ہلا دیا۔

والٹر گھر آکر اپنی پسندیدہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ شرلے کو اس کرسی سے نفرت تھی لیکن والٹر کو اسی پر سکون ملتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ اندھیرا ہونے تک سوتا رہا۔

اگلے روز صبح دس بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ والٹر اس وقت کچن میں بیٹھا جوس پینے کے ساتھ مکان کی صفائی اور ترتیب کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شرلے کی موت کے بعد اس نے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ سوچنے لگا کہ کون ہوسکتا ہے۔ اس سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت لوئیس بھی ٹینا کو نہیں آنے دے گا۔ گو کہ والٹر جانتا تھا کہ وہ بھی شرلے کی طرح اس کی دیکھ بھال کرنا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کے گھر کو مریض خانہ قرار دیا تھا لیکن وہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کی عیادت یا دیکھ بھال کے لیے آئے۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ وہ ویت نام کی جنگ کے دوران موت کو بہت قریب سے دیکھ چکا تھا اور اب اپنے انداز میں اس اٹل حقیقت کا انتظار کررہا تھا۔

پہلے تو اس نے گھنٹی کو نظرانداز کیا لیکن وہ مسلسل بجتی رہی چنانچہ اس نے سوچا کہ دروازہ کھول کر ان سے پمفلٹ لے لیا جائے اور ان سے کہے کہ وہ دوگھر چھوڑ کر کوشش کریں۔ اس گھر کے مکین اس طرح کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ ترکیب پہلے بھی کامیاب رہی تھی۔ والٹر جانتا تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی جاب کرتے ہیں۔ اس لیے اس نے اپنے آپ کو قصوروار نہیں سمجھا۔

اس نے پیپ ہول سے دیکھا۔ یہ پیپ ہول اس کی ماں نے ضد کرکے لگوایا تھا کیونکہ ان دنوں برگلر نامی قاتل نے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اسی خطرے کے پیش نظر والٹر اور اس کا باپ مقامی ہارڈ ویئر اسٹور گئے اور فرنٹ ڈور کے علاوہ عقبی دروازے پر بھی پیپ ہول لگوا لیا۔ والٹر نے اس سے جھانک کر دیکھا اور اس وکیل کو پہچان گیا جس نے شرلے کی وصیت لکھی تھی۔ وہ اور اس کی بہن ہر چیز کے مشترکہ مالک تھے لیکن شرلے نے بہت سی جاسوسی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں جن میں سب لوگ ڈرائنگ روم میں جمع ہوتے ہیں اور پرانا خاندانی وکیل وصیت پڑھ کر سناتا ہے۔

والٹر نے دروازہ کھولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر اور مریض کے درمیان رازداری ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''تم اپنے ڈاکٹر کو الزام نہ دو والٹر۔ میری بھتیجی اس کے یہاں استقبالیہ کلرک ہے۔ اسی نے مجھے بتایا کہ تمہاری

طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' والٹر نے بے رخی سے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

اس کے باوجود وکیل اپنی جگہ سے نہیں ہلا اور جیسے ہی والٹر نے دروازہ بند کرنا چاہا، وہ فوراً اندر آیا اور کاؤچ کی طرف جانے لگا۔ والٹر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، جب اس نے دیکھا وہ شخص کاؤچ پر سے اخبارات اور فالتو ڈاک ہٹا کر وہاں بیٹھ گیا۔ اب والٹر کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس وکیل سے چھٹکارا حاصل کرنے کا انتظار کرے جو اس کے لیونگ روم میں زبردستی داخل ہو گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، وکیل بول پڑا۔ ''میں شرے کی موت کے بعد یہاں نہیں آیا۔ وہ بہت ہی ذہین اور شاندار عورت تھی۔'' اس نے گھر کی بے ترتیبی پر نظر ڈالی جو گزشتہ تین سالوں میں بڑھ گئی تھی۔

اس کے بناوٹی رویّے کا والٹر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اپنی خدمات پیش کرنے آئے ہو لیکن میں اپنے تمام معاملات نمٹا چکا ہوں۔ لہٰذا مہربانی کر کے یہاں سے چلے جاؤ۔''

''مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ تم نے میری خدمات حاصل نہیں کیں اور تم نے وصیت تیار کرنے کے لیے بہت جلدی کسی اور کو تلاش کر لیا۔''

والٹر کا غصہ مزید بڑھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ شخص فوراً اس کے گھر سے چلا جائے۔ ''مجھے جو کرنا تھا وہ کر چکا اور میں کوئی وصیت نہیں لکھوا رہا۔ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو گی۔''

''اتنا غصہ ہونے کی ضرورت نہیں والٹر۔ میں تمہارے اثاثوں کے بارے میں جانتا ہوں اور یقیناً تم انہیں کسی کے حوالے کرنا چاہو گے۔''

''اور یقیناً تم اس میں سے اپنی مہنگی فیس کی صورت میں حصہ وصول کرنا چاہو گے۔''

وکیل نے اس کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہم سب جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص وصیت کیے بغیر مر جائے تو کیا ہوتا ہے۔ اس کے تمام اثاثے ریاست کو چلے جاتے ہیں۔ کیا شرے ایسا چاہتی ہو گی؟ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس نے تمہارے کچھ کزنز کا تذکرہ کیا تھا۔ میں انہیں تلاش کر سکتا ہوں۔''

والٹر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میری زندگی کا سفر ختم ہونے کو ہے۔ میرا کوئی رشتے دار زندہ نہیں ہے اور مجھے یقین ہے کہ شرے بھی مجھ سے متفق ہوتی کہ ریاست یہ پیسا استعمال کر سکتی ہے اور اس کی ابتدا ہماری سڑک کے گڑھے بھرنے سے ہونی چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ وکیل نے بھی فرش سے اپنا بریف کیس اٹھایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ اپنا خیال رکھنا والٹر اور اگر.....''

والٹر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

دروازے پر پہنچ کر وکیل رک گیا اور والٹر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنا۔ کیا میں تمہارا باتھ روم استعمال کر سکتا ہوں؟ آج صبح میں نے کچھ زیادہ کافی پی لی تھی۔''

''باتھ روم ہال کے آخر میں ہے۔'' والٹر نے اس جانب اشارہ کیا۔ وہ اپنی کرسی پر واپس جانے کے بجائے دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ اسے امید تھی کہ وکیل جلد ہی واپس آ جائے گا۔

وکیل نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کے جاتے ہی والٹر نے دروازہ بند کیا اور اپنی کرسی کی طرف دیکھا پھر اسے کچن کاؤنٹر پر رکھے ہوئے جوس کے گلاس کا خیال آیا۔ اس نے جوس پیا اور اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور تکیے پر سر رکھتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران والٹر نے اپنی طبیعت میں بہتری محسوس کی۔ اسے اپنی بیماری کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر پہلے ہی یرقان کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنے گھر کے کمپیوٹر پر ان علامات سے آگاہی حاصل کی تو اسے معلوم ہوا کہ مرض کی شدت میں کمی عارضی ہے اور چند ہفتوں بعد موت کی جانب اس کا سفر شروع ہونے والا ہے۔

مہینے کے آخر میں صبح دس بجے ایک بار پھر دروازے کی گھنٹی بجی۔ والٹر نے اسی وقت اپنے ہاتھ سے بنایا ہوا جوس پینا شروع کیا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور دروازے تک گیا۔ پیپ ہول سے دو آدمیوں کو دیکھنا مشکل تھا لیکن اس نے وکیل کا دھاری دار سوٹ پہچان لیا۔ اس نے سردی کے باوجود اوورکوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔

والٹر نے دروازہ کھولا۔ اس کا وزن کافی کم ہو گیا تھا

لیکن وہ کبھی بھاری بھرکم نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں بڑی آسانی سے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ والٹر یہ دیکھ کر چونک گیا کہ ان کے چہروں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ وکیل کے ساتھ آنے والے دوسرے شخص نے عام سا لباس پہن رکھا تھا۔ وکیل نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''والٹر! تمہارے لیے ایک حیرت انگیز انکشاف ہے۔ اس سے ملو، یہ تمہارا کزن ہے۔''

''میرا کوئی کزن نہیں ہے۔'' والٹر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ وہ اس شخص کو گلے لگنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

''اوہ..... لیکن یہ واقعی تمہارا کزن ہے۔ تمہاری بہن نہیں چاہتی تھی کہ تم اس وقت تنہا رہو اور تم بھی دل کی گہرائی سے ایسا ہی محسوس کر رہے تھے۔ اسی لیے میں تمہارا ٹوتھ برش اور کچھ دوسری چیزیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ تم دونوں کا ڈی این اے ایک ہی ہے اور ماں کی طرف سے شجرہ ملتا ہے۔''

وہ کزن آگے بڑھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ والٹر کے گلے لگنا چاہتا ہے یا کم از کم اس سے مصافحہ ہی کر لے۔ والٹر ایک مرتبہ پھر پیچھے ہٹا اور وہ اس شخص کو ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے یقین تھا کہ اس کا کوئی کزن روئے زمین پر موجود ہے۔

وہ سامنے والی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں دل کی گہرائی سے چاہتا ہوں کہ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں اس دنیا میں اکیلا ہوں اور میرا کوئی کزن نہیں۔ تم محض اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔''

جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ وکیل نے اس کے گھر سے کوئی چیز چرائی تھی تو اسے غصہ آنے لگا۔ بے شک وہ ایک پرانا ٹوتھ برش ہی تھا۔ اس نے برش کی غیر موجودگی کا نوٹس لیا تھا لیکن پھر سوچا کہ اس نے خود ہی اسے پھینک دیا ہوگا۔ شرے تمام پرانے برش جمع کرتی اور انہیں بازار میں بیچ دیتی اور اس کے عوض نیا ٹوتھ برش خرید لیتی تھی۔

''میں نے جو غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت کی ہے، اسے میں نظر انداز کر رہا ہوں کیونکہ معاملے کو مزید پیچیدہ نہیں بنانا چاہتا۔ بس تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ اور ہم اسے بھول جائیں گے۔''

وکیل نے اپنے بریف کیس سے ایک لفافہ نکال کر والٹر کے سامنے لہرایا۔ ''اس میں ڈی این اے کے غیر متنازع نتائج ہیں۔'' اس نے عجیب سے انداز میں جسم کو حرکت دی اور بولا۔ ''تمہارے سامنے سب سے قریبی رشتے دار کھڑا ہے۔ تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔''

کزن کے چہرے کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ والٹر کو یہ سب کچھ بہت ناگوار لگ رہا تھا۔ ''میں ایسا کر سکتا ہوں اور کر رہا ہوں۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گھر سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ کوئی وصیت نہیں لکھی اور نہ اب لکھ رہا ہوں۔''

اس کا ٹیلی فون کرسی کے قریب ہی میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں پولیس کو غیر قانونی داخلے کی اطلاع دے رہا ہوں۔''

اس کے ایک منٹ بعد ہی اس نے دروازہ بند ہونے اور کار کے جانے کی آواز سنی۔ وہ اب بھی سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ وکیل کو ایک مرسیڈیز چلاتے ہوئے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

دوسرے دن دوپہر میں کزن اکیلا آیا۔ والٹر نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ اس شخص کو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ یہ ان دونوں کی آخری ملاقات ہے۔ کزن کے ہاتھ میں سموسے جیسی کوئی چیز تھی جو اس نے دکھاوے کے انداز میں کافی کی میز پر رکھ دی۔

''جاتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لے جانا۔ اب میں اس طرح کی چیزیں نہیں کھاتا۔'' اس نے کڑوے لہجے میں کہا۔ والٹر نے اپنے آپ کو کرسی میں گرا لیا اور کمر کو سہارا دینے کے لیے پیچھے تکیہ رکھ لیا۔ اس کی جلد اتنی پتلی ہو گئی تھی کہ کسی چیز سے لگتے ہی اسے تکلیف ہونے لگتی۔ وہ اس آدمی کے جانے کا انتظار کر رہا تھا تاکہ وہ اپنی دوائیں لے سکے۔ اس کے پاس تھوڑی سی مارفین رکھی ہوئی تھی لیکن اس نے اسے آنے والے وقت کے لیے بچایا ہوا تھا۔

کزن نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ یہ اس سے چھوٹا تھا جو گزشتہ روز وکیل نے دکھایا تھا۔ ''یہ رپورٹ کا خلاصہ ہے اور مجھے ایک پرانی تصویر بھی ملی ہے جو میری ماں نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ ہم دونوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔''

والٹر نے دونوں میں سے کوئی چیز نہیں لی اور اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کر لیے۔ کزن نے تصویر والٹر کی گود میں رکھ دی۔ وہ کوئی پرانی تصویر تھی۔ اسے دیکھ کر والٹر کو وہ کارڈ یاد آ گئے جو لوگ اپنے پیاروں کو بھیجا کرتے تھے اور ان پر مشہور شخصیات بالعموم فلمی ستاروں کی تصاویر ہوتی

تھیں۔ اس شخص کے چہرے سے سختی جھلک رہی تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا لیکن اس کی شکل والٹر یا کزن سے بالکل نہیں مل رہی تھی جبکہ کزن بڑے شوق سے کہہ رہا تھا۔

''اس کی ناک دیکھو، اور اس کا ماتھا۔'' پھر اس نے اپنا فون نکالا۔ ''اور اس میں ہم دونوں کی وہ تصویر ہے جو گزشتہ روز وکیل نے کھینچی تھی۔ اس میں ہمارے خدوخال بڑی حد تک مل رہے ہیں۔''

''براہِ کرم، یہ سب چیزیں اٹھاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔ میں بہت بیمار ہوں خدا کے واسطے مجھے پریشان مت کرو۔''

''لیکن میں تمہاری دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں۔ تم میرے رشتے دار ہو۔ واحد رشتے دار۔ میرے والدین فوت ہو چکے ہیں اور میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میرا کوئی چچا، ماموں، خالہ، پھوپی یا کزن حیات نہیں ہیں۔ میں پیسوں کے لیے یہاں نہیں آیا۔ میں صرف ایک اچھے رشتے دار کی طرح تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میری نظر میں پیسے کی کوئی اہمیت نہیں۔''

وہ براہِ راست والٹر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور اسے پہلا جملہ بولنے کے بعد خاموش ہو جانا چاہیے تھا جب والٹر کی ماں زندہ تھی۔ انہوں نے کبھی غلط چیک وصول نہیں کیا۔ وہ سیدھی گاہک کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتی۔ ''کیا یہ صحیح ہے؟'' اگر وہ اپنی نگاہیں پھیرتا تو والٹر کی ماں چیک واپس کر دیتی۔ والٹر جانتا تھا کہ کزن جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ یہ سب کچھ پیسے کے لیے کر رہا تھا۔

''تم فوراً چلے جاؤ۔'' اس نے نرمی سے کہا۔ ''یا میں پولیس کو بلاؤں؟''

والٹر کا خیال تھا کہ ویت نام کی جنگ کے دوران اسے جو بدترین تجربات ہوئے، وہ اس کے لیے ایک ڈراؤنے خواب سے کم نہ تھے لیکن آنے والے چند ہفتوں میں اس پر جو بیتی، اس کے مقابلے میں گزشتہ تجربات محض ایک واہمہ ثابت ہوئے۔ وہ درد دور کرنے والی دوائیں زیادہ مقدار میں لے رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ ان کے ذیلی اثرات ہوں۔ اسے وقت بے وقت اجنبی فون کالز موصول ہوتیں۔ کبھی کوئی عورت کہتی۔ ''میں شرے بول رہی ہوں۔ خون، پانی سے گاڑھا ہوتا ہے والٹر۔''

یہ آواز ہی اسے پریشان نہیں کر رہی تھی بلکہ اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ وہ عورت اسے والٹر، کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ شرے بچپن میں اسے اسی نام سے بلاتی تھی۔ اس عورت کو اس کا نک نیم کیسے معلوم ہوگیا۔ کیا وہ شرے کی روح تھی؟ وہ اس کی آواز سن سکتا تھا۔ ''میرا انتظار کرو والٹر۔''

وہ رات کے سناٹے میں کسی کے قدموں کی آواز سنتا اور یوں لگتا کہ کوئی اپنا چہرہ نقاب میں چھپائے اس پر جھکا ہوا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ چہرہ فضا میں تیر رہا ہے اور اس نے سیاہ چوغہ پہن رکھا ہے۔ کئی بار وہ بستر سے اٹھ کر اسے تلاش کرتا لیکن وہاں کوئی نظر نہ آتا اور جب وہ لیونگ روم میں گیا تو وہاں اسے فرنیچر کی ترتیب بدلی ہوئی نظر آتی اور پھر وہ دوبارہ اپنی جگہ پر آجاتا۔ اس کی ذہنی کیفیت یہ ہوگئی کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ دن ہے یا رات۔ ان لمحات میں اس نے سوچا کہ وہ ڈاکٹر کو فون کر کے نئی دوائیں تجویز کرنے کے لیے کہے لیکن ایک دن جب وہ سو کر اٹھا تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا اور سورج کی روشنی کھڑکی کے راستے کمرے میں آرہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے دماغ پر چھائی دھند چھٹ چکی ہے۔ وہ بستر سے اٹھ کر کچن میں گیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے فریج سے پھلوں کا جوس نکال کر پیا لیکن اسے انڈوں اور نمکین گوشت کی طلب ہو رہی تھی۔ اس کے پاس انڈوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اسے فریج میں رکھا ہوا گوشت کا پیکٹ بھی مل گیا۔ اس نے انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ گوشت کے پارچے تلے اور ڈبل روٹی کے ساتھ کھانے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کافی بنائی اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ ایک بار پھر اسے اپنے مرض کی شدت میں کمی محسوس ہوئی لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے۔

رات میں آنے والی ٹیلی فون کالز کے بارے میں اسے یقین ہوگیا تھا کہ یہ وکیل کی حرکت ہے اور ممکن ہے کہ کزن بھی اس میں ملوث ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب وہ دونوں اس کے گھر آئے تھے اور والٹر نے ان کی جانب اپنی پشت کر لی تھی۔ اس دوران بہ آسانی کافی کی میز سے چابیاں اٹھائی جا سکتی تھیں۔ والٹر نے ڈاکٹر کے یہاں سے واپس آنے کے بعد ان چابیوں کو استعمال نہیں کیا تھا اور وہ اسی جگہ رکھی ہوئی تھیں اور کزن بھی اس کام میں شریک تھا۔ اگلے روز وہ ان چابیوں کی نقل بنوانے کے بعد سموسے دینے کے بہانے دوبارہ آیا اور چابیاں اسی جگہ رکھ دیں۔

والٹر جانتا تھا کہ وہ اپنی کارروائیاں جاری رکھیں گے اور اب اسے فیصلہ کرنا تھا۔ شکست تسلیم کر کے پُرسکون ہو جائے یا اس مشکل اور ناخوشگوار صورتِ حال کا مقابلہ

۔۔۔ اب وہ بہت تیز مسکن دوائیں لے رہا تھا اور اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ انہیں روک سکے۔ ان کے خلاف کسی قانونی کارروائی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی عدالت سے کوئی ایسا حکم حاصل کیا جا سکتا تھا جس میں انہیں والٹر سے دور رہنے کے لیے کہا جائے۔ اس نے اپنی زندگی میں یہی سیکھا تھا کہ بعض لوگ اپنے ذاتی مفاد کے لیے شیطان کا روپ دھارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اب اسے وصیت لکھوانی ہی ہوگی لیکن وہ یہ وصیت اپنی شرائط پر تیار کرے گا۔ اس سے پہلے وہ وکیل اور کزن سے ملنا چاہ رہا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

وکیل اپنے ساتھ دو بریف کیس لے کر آیا۔ ان میں سے ایک اس نے کاؤچ کے ساتھ رکھ دیا جس کے اوپر رسالے اور فالتو ڈاک رکھی ہوئی تھی۔

''مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم نے اپنا ذہن تبدیل کرلیا ہے۔ اب ہم یہ کام تیزی سے کرسکتے ہیں۔ تم صرف یہ بتا دو کہ کیا چاہتے ہو۔ میں اس کے مطابق وصیت تیار کر کے دو گواہوں کے ساتھ کل آجاؤں گا یا تم میرے دفتر آسکتے ہو۔۔۔'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ والٹر کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ چند قدم سے زیادہ چل سکے۔

''بہتر ہے کہ تم آجاؤ۔'' والٹر نے کہا۔ ''لیکن میری ایک شرط ہے۔ میں اصلی وصیت اپنے پاس رکھوں گا جس پر میرے اور گواہوں کے دستخط ہوں گے اور وہی قانونی ہو گی۔ اسے میں اپنے گھر میں رکھوں گا اور جب میرے مرنے کا وقت قریب آئے گا تو تمہیں بتا دوں گا کہ وہ کہاں رکھی ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو والٹر! اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا دفتر محفوظ نہیں ہے تو تم اسے سیف ڈپازٹ لاکر میں رکھ سکتے ہو۔ اس مرحلے پر یہ کہنا خطرناک ہے اگر تمہیں مجھے بتانے کا موقع نہ ملا تو پھر کیا ہوگا؟ تم یقیناً نہیں چاہو گے کہ ہم اس وصیت کو تلاش کرنے کے لیے تمہارے مکان کی توڑ پھوڑ کریں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شاید وہ وصیت ہمیں بھی نہ ملے۔ کیا یہ تمہارے کزن کے ساتھ انصاف ہوگا؟''

کزن کا نام سن کر والٹر کو تھوڑی سی وحشت ہونے لگی۔ اس نے سختی سے کہا۔ ''نہیں، یہ معاملہ اسی طرح طے ہوگا۔ پچھلے دنوں میں ٹھیک سے نہیں سو سکا۔ اس وصیت کو یہاں رکھنے سے مجھے سکون اور اطمینان ہو جائے گا۔ اگر مزید کوئی خلل اندازی ہوئی تو میں اسے ضائع کر دوں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

سرما کی ابتدائی نرمیاں
اکتوبر کی خمار آلود کہانیاں

اولین صفحات
پیمانۂ محبت کے جام میں ڈوبی کہانی کے نشیب و فراز۔۔۔ بہکتے قدموں، لرزتے ہاتھوں زندگی کو تمام کر دینے والے کرداروں کی داستان عشق۔۔۔
زوبیا اعجاز کے قلم سے

انا گیر
سنہری ریت کے سرابوں میں بھٹکتے خوابوں کے سوداگر کی دل نگار داستان امجد جاوید
کے زور آور قلم کا امتحان

الاؤ
مسیحاؤں کے بھیس میں شاطر مجرموں کا کھیل۔۔۔ زندہ انسانوں کے لیے دہکتے الاؤ کی صورت موت تیار کی جا رہی تھی۔۔۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
کے قلم سے نیا سنسنی خیز سلسلہ

سرورق کے رنگ
پہلا رنگ
ساز پر خوشی کے نغمے گونجتے ہیں۔۔۔ مگر وہ ساز مرگ تھا۔۔۔ چشم تر میں بھیگی کہانی
دوسرا رنگ
اغوا ہو جانے والے خاندان کی سنسنی خیز کہانی کے حیرت انگیز موڑ

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے۔۔۔ مشورے۔۔۔ محبتیں۔۔۔ شکایتیں۔۔۔ اور نئی دلچسپ باتیں۔۔۔ کتھائیں

گا، اس طرح سب کچھ ریاست کے پاس چلا جائے گا۔''

وکیل احتجاج کرنے والا تھا لیکن اس کے بجائے وہ بولا۔ ''اگر تم یہی چاہتے ہو تو میں کل صبح آجاؤں گا اور ہم تمہارے کہنے کے مطابق اس کام کو مکمل کر لیں گے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ اس کی الیکٹرانک کاپی اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟''

''بالکل، لیکن اس پر میرے دستخط نہیں ہوں گے۔''

اس کے بعد مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وکیل کے جانے کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا۔ وہ اب بہتر محسوس کر رہا تھا اور اسے بھوک لگ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے پاس لوبیا اور بیکن سوپ رکھا کرتا تھا۔ وہ کچن کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی نظر وکیل کے بریف کیس پر پڑی جو وہ بے دھیانی میں چھوڑ گیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جلد ہی واپس آئے گا۔ والٹر نے بیٹھ کر وہ بریف کیس کھولا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔ وہ اس چھوٹے بریف کیس سے بڑا تھا جو وکیل نے وصیت کی تیاری کے لیے کھولا تھا۔

اس بریف کیس میں کئی فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پر والٹر کا نام لکھا ہوا تھا۔ اس فائل کے اندر ڈی این اے ٹیسٹنگ فرم کا لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس تصویر کا پرنٹ بھی تھا جو وکیل نے اپنے فون سے کھینچی تھی اور وہ پرانی تصویر بھی تھی جو کزن کے بقول اس کی ماں نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اس فائل میں شرے کی وصیت کی ایک کاپی بھی تھی جس میں ان کے مشترکہ اثاثوں کے علاوہ والٹر کے موجودہ اثاثوں کی فہرست بھی تھی۔ والٹر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وکیل نے یہ کیسے حاصل کی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس وکیل نے والٹر کے دوسرے رشتے داروں کو تلاش کیا لیکن اسے کوئی نہیں ملا۔ اس کے بعد ہی اس نے باتھ روم سے پرانا ٹوتھ برش چرایا۔

والٹر کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وکیل نے اس کی مکمل جاسوسی کی تھی۔ اس نے اپنے کان دروازے پر لگا رکھے تھے۔ وہ کسی وقت بھی اپنا یہ بریف کیس لینے واپس آسکتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کچھ اور فائلیں دیکھیں۔ وہ سب اس کی طرح کے لوگ تھے جنہوں نے کوئی وصیت نہیں لکھی اور نہ ہی ان کا کوئی رشتے دار تھا۔ ہر فائل میں اسے وہی پرانی تصویر اور مختلف بوڑھوں کے ساتھ اسی کزن کی تصویر ملی۔ ان میں سے کچھ بوڑھے مسکرا رہے تھے۔ شاید انہیں اپنا وارث مل جانے کی خوشی تھی۔ ہر فائل میں کزن کا ایک ہی نام تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی اس کا اصل نام بھی ہوگا۔ اسی طرح ہر فائل میں اسی کمپنی کا ویسا ہی لفافہ موجود تھا جو والٹر کی فائل میں لگا ہوا تھا۔ والٹر نے جلدی جلدی کمپنی اور ان لوگوں کے نام ذہن نشین کر لیے۔ اس کے بعد اس نے بریف کیس بند کر کے اپنی جگہ رکھا اور سوپ گرم کرنے چلا گیا۔

وہ کھانا شروع کرنے ہی والا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ لاک کرنے کی زحمت نہیں کی تھی اسی لیے وکیل اندر چلا آیا۔ ''معاف کرنا، میں نے تمہیں پریشان کیا۔'' اس نے بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے یہاں بھول گیا تھا۔ تم سے کل ملاقات ہو گی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

والٹر نے سوپ ختم کیا اور پیالی دھونے لگا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ٹیلی فون پر شرے کی روح نہیں بول رہی تھی لیکن وہ اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے گھر کی ہر چیز صاف ستھری رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر وہ کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔ جیسا کہ اسے توقع تھی اس نام کی کوئی ڈی این اے فرم یا سائٹ موجود نہیں تھی۔ اس نے اسے چیلنج کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ وہ ہمیشہ سے ہی سمجھ دار اور تیز فہم تھا۔ اسے یقین تھا کہ دوسرے لوگوں نے بھی اسے چیک نہیں کیا ہو گا۔ ان دنوں ڈی این اے ٹیسٹ ایک عام بات تھی اور لوگ اس کے نتائج کو قبول کر لیتے تھے اور ان میں سے کئی ایک کو اس رشتے دار کے ملنے کی خوشی ہوگی جو عمر کے آخری حصے میں ان سے ملنے آیا۔ اگر اس کا کوئی قریبی دوست ہوتا تو اس کی مدد سے وہ اس فراڈ کو بے نقاب کر سکتا تھا پھر وکیل اور کزن خاموشی سے پیچھے ہٹ جاتے۔

اس کے باوجود اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اگلے روز یہ وصیت تیار کروائے گا اور وہ قانونی ہو گی۔ اس کے بعد وہ کتنا عرصہ زندہ رہتا..... ایک یا دو ہفتے؟

اگلے روز وکیل صبح دس بجے دو گواہوں کے ساتھ آ گیا۔ وہ دونوں اس کے دفتر کے اسٹاف میں سے تھے۔ ساری کارروائی بڑی تیزی سے ہوئی۔ کزن چونکہ خود اس سے مستفید ہو رہا تھا، اس لیے وہ گواہ نہیں بن سکتا تھا۔ والٹر نے اس کی یہ درخواست مسترد کر دی کہ وہ اسے مہمان کے طور پر آنے کی اجازت دے دے۔

اس کے بعد وہ شرے کے بیڈ روم میں گیا اور تھوڑی سی کوشش کر کے بستر کے نیچے سے اپنا پرانا فوجی

صندوق کھینچ لیا۔ شرے اس میں کمبل اور بعض اوقات ضروری دستاویزات جیسے مکان کے کاغذات اور ان کے پاسپورٹ رکھا کرتی تھی۔ والٹر نے اس کی وفات کے بعد اس صندوق کو نہیں کھولا تھا۔ اس میں سے بو آرہی تھی۔ والٹر نے دونوں کے پاسپورٹ دیکھے۔ ان کی مدت ختم ہو چکی تھی۔

اس نے وصیت کو بڑی احتیاط سے سب سے اوپر رکھا اور صندوق بند کر کے دوبارہ بستر کے نیچے دھکیل دیا۔ یہ اطمینان کرنے کے لیے کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا، وہ ان تینوں کو کار میں بیٹھتے اور وہاں سے روانہ ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گو کہ ٹرنک ایک خفیہ جگہ رکھا ہوا تھا لیکن وہ ہر طرح سے اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

اب اسے کچھ لوگوں کو فون کرنا تھے اور ایک آن لائن آرڈر دینا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کمپیوٹر بھی کتنے کام کی چیز ہے۔

برف باری صبح سے ہی شروع ہو گئی تھی اور والٹر نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس دنیا میں اس کا آخری دن خوب صورت ہوگا۔ بچپن میں وہ اور شرے ہمیشہ سے پہلی برف باری کو پسند کرتے تھے۔ وہ برف کے مکان بناتے اور لکڑی کی گاڑی میں بیٹھ کر اس ڈھلوان پر پھسلتے جو ان کے مکان کے عقب میں ندی تک جارہی تھی۔ اس نے اپنی ضرورت کی تمام چیزیں رکھ لی تھیں۔ بچی ہوئی مارفین، سیل فون اور ایک چھوٹا بریف کیس جس میں دو اہم چیزیں تھیں۔ اس نے موسم کی مناسبت سے لباس پہنا۔ اوور کوٹ اور گردن میں مفلر جو شرے نے اس کے لیے بُنا تھا پھر وہ کار کی جانب بڑھا۔ اس نے دونوں دروازے لاک نہیں کیے۔

اس کی کار گزشتہ تین ہفتوں سے گیراج کے باہر ڈرائیوے میں کھڑی ہوئی تھی، جب وکیل اس کے گھر آیا تھا۔ والٹر نے اسے اسٹارٹ کیا۔ وہ ہر چار سال بعد فورڈ سیڈان کا نیا ماڈل خریدتا تھا۔ اس نے کبھی مکان کی صفائی اور ترتیب پر توجہ نہیں دی لیکن وہ اپنی کار کا بہت خیال رکھتا تھا اور وہ دیکھنے میں بالکل نئی لگتی تھی۔

اس نے کار کا ہیٹر آن کر کے لوئیس کو فون کیا۔ ''وہ وقت آ گیا ہے میرے دوست۔ میں نے جو نمبر تمہیں دیا تھا، اسے فون کرو لیکن یہ اطمینان کر لینا کہ یہ وہی شخص ہے جس کے نام کا لفافہ تمہیں دیا تھا اور اسے وہ پڑھ کر سنا دینا جو لفافے کے اندر کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ اس میں اپنی طرف سے کوئی اضافہ مت کرنا۔ اسے فون کرنے کے بعد مجھے کال کرنا تاکہ معلوم ہو جائے کہ کام ہو گیا ہے۔''

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس کا درد بڑھتا جارہا تھا لیکن وہ ابھی مارفین لینا نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ قبل از وقت ہوتا۔ اس نے اپنی توجہ دوسرے خیالات پر مرکوز کی۔ اس نے ایک اچھی اننگ کھیلی تھی اور وہ اس سے مطمئن تھا۔

فون کی آواز سن کر وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آ گیا۔ یہ لوئیس کا فون تھا لیکن وہ اتنی جلدی کال نہیں کر سکتا۔ کیا واقعی سب کچھ ٹھیک تھا؟

اس کا درد اب ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ اس نے مارفین نکالی۔ اسی وقت اسے کسی کار کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنی نشست پر مزید نیچے ہو گیا لیکن وہ جس بات کی توقع کر رہا تھا، اسے عقبی آئینے میں نہ دیکھ سکا۔ کار کے دروازے بند ہونے کی آواز آئی۔ وہ دونوں ہی ایک ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے کسی کو بھی دوسرے پر بھروسا نہیں تھا۔

انہیں بیڈ روم تک پہنچنے اور صندوق تلاش کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے، اس نے اپنے طور پر گنتی شروع کر دی پھر اس نے نئی وصیت نکالی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس نے مستقبل میں سرمایہ کاری کی ہے۔ اس سے اچھی کیا بات ہوگی کہ لوئیس اور ٹینا کا بیٹا ایک اچھا ڈاکٹر بن جائے۔ ممکن ہے کہ وہ علم سرطان میں اسپیشلائز کرے۔

اس نے اپنا کوٹ کھول کر قمیص کے نیچے رکھی ہوئی پٹیوں کو دبایا۔ پھر بوتل میں باقی ماندہ دوا حلق میں انڈیل لی۔ یہ ایک بڑی خوراک تھی جو یقیناً اپنا اثر دکھاتی پھر اس نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے چاکلیٹ سیرپ لیا۔ اسے اس کی مٹھاس اچھی لگی اور اس نے مزید چند گھونٹ لیے اور اسے بہت کچھ یاد آ گیا۔

وہ چشم تصور سے وکیل اور جعلی کزن کی بے بسی اور جھلاہٹ دیکھ رہا تھا جنہوں نے وصیت کی تلاش میں پورا صندوق کھنگال ڈالا۔ والٹر کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

پھر اچانک ہی کار میں ایک دھماکا ہوا۔ والٹر کی اسٹیئرنگ پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور کار آگے پیچھے، دائیں بائیں ڈولتی ہوئی کسی چیز سے ٹکرا گئی۔ اس نے آئینے میں دیکھا، وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

⌘⌘⌘

شہ زور

اسما قادری

قسط :8

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جو المیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی تحیر انگیز داستان

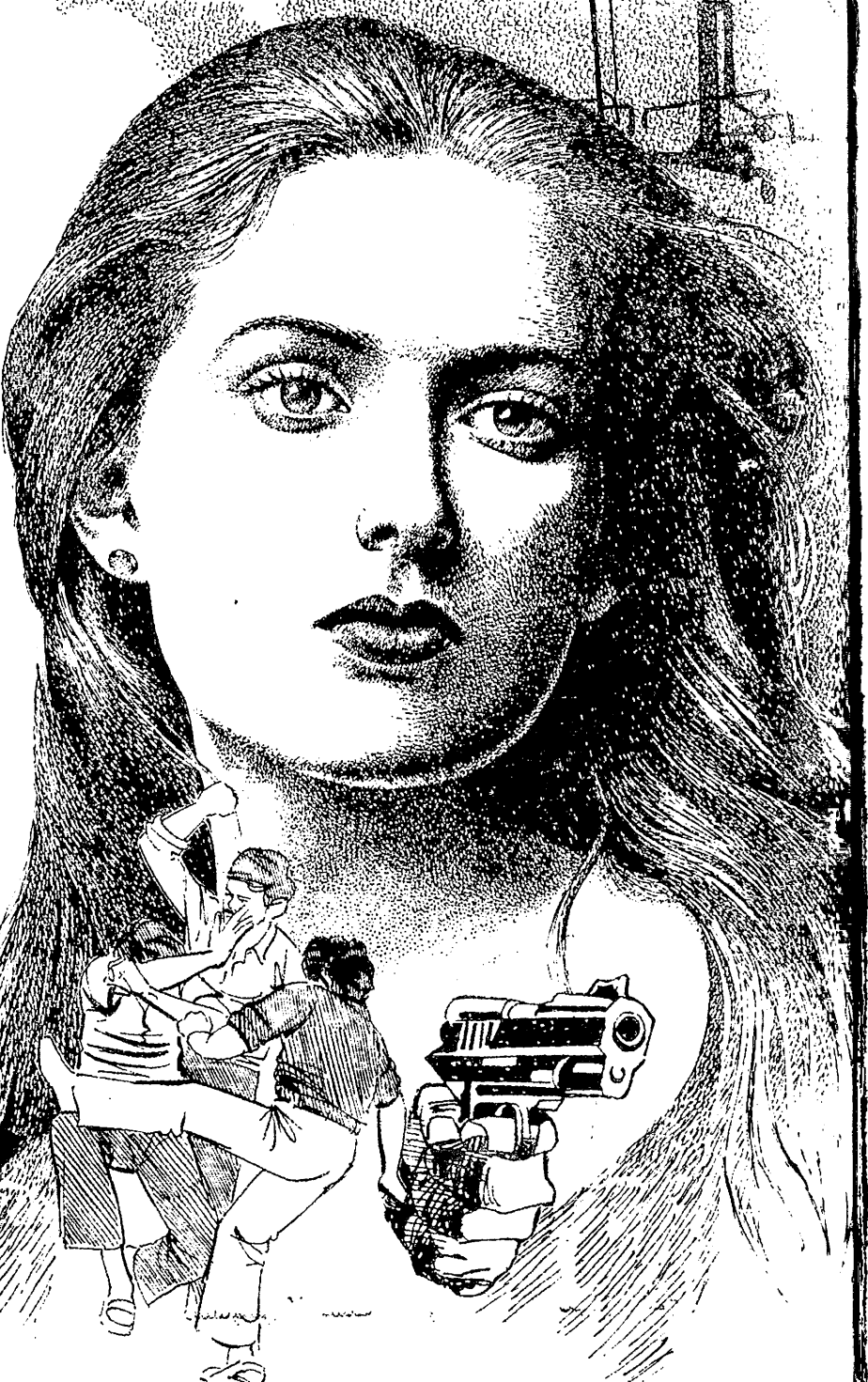

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ ٹسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیر تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹو گرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہوجانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جاسکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب رول نکلوا کر تصویریں دھلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہیں اور حق گوئی اس کے خون میں شامل ہے۔ اس انکشاف کے بعد وہ خاموش بیٹھنے کے بجائے فوراً کیس کے انویسٹی گیشن افسر سے رابطہ کر کے اپنے شک کا اظہار کرتی ہے اور اس واقعے سے بھی آگاہ کرتی ہے جو معاذ اور کامران کے درمیان دشمنی کا باعث بنا۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ بشریٰ کو بہت مایوسی ہوتی ہے لیکن وہ اپنے طور پر جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کرتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم دوسرے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ ڈی این اے رپورٹ سے باذل کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ ادھر معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کرلیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

موت اور زیست کی جنگ میں موت کو شکست دے کر عالم شاہ ہوش میں آیا تو سب سے پہلا چہرہ اس کے سامنے تھا، وہ اس کے باپ صداقت شاہ کا تھا لیکن یہ چہرہ جو وہ چہرہ نہیں تھا جو وہ بچپن سے اب تک دیکھتا آیا تھا۔ اس چہرے کا سارا رعب، دبدبہ، وقار گم ہوگیا تھا اور صرف ایک ایسے باپ کا چہرہ باقی رہ گیا تھا جو اپنے اکلوتے بیٹے کو موت وحیات کے درمیان لٹکا دیکھ کر خود بھی پل پل مرتا رہا تھا اور خود اس کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

''بابا.....'' خشک لبوں سے باپ کو پکارتے ہوئے

عالم شاہ کو یاد بھی نہیں تھا کہ باپ نے اسے تھپڑ مارا تھا اور وہ ناراضی کے عالم میں حویلی سے نکلا تھا۔

''میرا پٹ! اب کیسی طبیعت ہے تیری؟'' صداقت شاہ اس کی پکار پر ایسے ہی جذبات سے دوچار ہوئے جیسے جذبات انہوں نے پہلی بار اس کے بابا پکارنے پر محسوس کیے تھے بلکہ جذبات کی شدت اس وقت سے بھی زیادہ ہی تھی کہ اس وقت ملنے والی خوشی کسی آزمائش سے گزر کر نہیں ملی تھی جبکہ اس وقت انہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش سے گزر کر یہ لفظ سننے کو ملا تھا۔

''ٹھیک ہوں۔'' عالم شاہ نے ان کی آنکھوں کی نمی دیکھی اور جسم میں اٹھتی ٹیسوں کو نظر انداز کر کے مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔

''رب سائیں کا مجھ پر احسان ہے کہ اس نے مجھے میرا بیٹا واپس لوٹا دیا اور آج میں اپنے کانوں سے اپنے بیٹے کو باتیں کرتا ہوا سن رہا ہوں۔ ورنہ تم تو بس ذرا دیر کے لیے ہی ہوش میں آتے تھے اور اجنبی نظروں سے ہم سب کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتے تھے۔'' صداقت شاہ نے دھیرے سے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے اسے بتایا تو اس کو وہ جانکاہ وار یاد آ گیا جو اس پر پشت سے کیا گیا تھا اور جسے سہنے کے بعد وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکا تھا۔ ایک یاد کا در کھلا تو پھر سارے در کھلتے چلے گئے اور ہر بات یاد آ گئی۔ یہاں تک کہ باپ کی خود پر بے اعتباری بھی۔ اس نے اپنے اعصاب تنتے ہوئے محسوس کیے۔

''تم بے ہوش تھے تو لگتا تھا میرے تن سے جان نکل گئی ہے۔ تمہیں یوں زندگی اور موت کے بیچ لٹکے دیکھ کر میں خود نہ جانے کتنی بار مر کر جیا ہوں اور مجھے احساس ہوا ہے کہ میرے لیے تم سے بڑھ کر کچھ اہم نہیں۔'' محبت وہ اس سے ہمیشہ ہی بے تحاشا کرتے تھے لیکن یوں کھل کر اظہار شاید پہلی بار کر رہے تھے۔

''مجھے آپ کی محبت پر اعتبار ہے بابا سائیں، لیکن آپ کی بے اعتباری کا گھاؤ بہت گہرا ہے۔'' عالم شاہ خود کو شکوہ کرنے سے نہ روک سکا۔

''بعض دفعہ حالات بندے کو مجبور کر دیتے ہیں پٹ! تمہاری شکایت اپنی جگہ لیکن خود کو میری جگہ رکھ کر دیکھو تو تمہیں میری پوزیشن سمجھ میں آئے گی۔ اس روز جو کچھ نظر آ رہا تھا، سب تمہارے خلاف تھا اور میں شدید دکھ اور صدمے سے دوچار ہو گیا تھا کہ میرا پٹ، میرا خون ایسی گھٹیا حرکت میں ملوث ہے۔'' صداقت شاہ نے جیسے اپنی صفائی پیش کی۔

''پھپھا سائیں ٹھیک کہہ رہے ہیں عالم شاہ! ان کا ری ایکشن سچویشن کے عین مطابق تھا۔ جو کچھ ہوا اس نے ہم سب کو بڑی مشکلات میں ڈال دیا ہے اور اب بھی حالات ہمارے خلاف ہی ہیں۔'' باپ بیٹے کے درمیان شکوے شکایت کا سلسلہ دراز ہوتا، اس سے قبل معظم شاہ اندر داخل ہوا اور ان کی گفتگو میں حصہ لیا۔

''کیا مطلب؟'' عالم شاہ نے تحیر سے بہنوئی کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اور سجل اغوا کاروں سے بچ نکلے ہیں، اس لیے معظم شاہ کی موجودگی کے بجائے صرف اس کے الفاظ پر حیران تھا۔

''منشی عبدالحق کا پورا خاندان آسیہ سمیت غائب ہے۔ ہمیں کہیں سے ان کا کوئی کھوج نہیں مل سکا ہے اور الٹا گاؤں میں یہ سرگوشیاں گردش کر رہی ہیں کہ سائیں قربان شاہ نے اپنے بھانجے کو بچانے کے لیے وفادار منشی اور اس کے کنبے کو غائب کروا دیا ہے۔'' معظم شاہ نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔

''یہ سب کیا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' عالم شاہ نے گویا تکیے پر سر پٹخا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر معظم شاہ کے ساتھ ہی آنے والی سجل شاہ جو چند قدم پیچھے کھڑی تھی، تیزی سے آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''آپ کو کسی بات کی کوئی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے ادا! معاملات کو دیکھنے اور سلجھانے کے لیے بہت لوگ موجود ہیں۔ سب کچھ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہمارے لیے اس وقت سب سے اہم آپ کی صحت اور زندگی ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے آپ کو دوبارہ زندگی کی طرف لوٹا دیا اور آج اتنے دنوں بعد آپ ہم سے اپنے ہوش و حواس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس موقع پر ایسی گفتگو چھڑنا ہی نہیں چاہیے تھی جو آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنی۔'' سجل کے لہجے میں جو تنبیہ تھی، اسے صداقت شاہ اور معظم دونوں ہی نے محسوس کیا۔ واقعی ابھی اس قسم کی باتیں کرنا عالم شاہ کے لیے مناسب نہیں تھا۔

''تمہاری بہن تمہارے لیے بہت فکر مند تھی عالم! صدقہ، خیرات، نوافل کسی چیز کی کسر نہیں چھوڑی اس

نے۔ موبل اور تمہاری ماں تک تو خیر ہم نے پوری خبر پہنچے ہی نہیں دی لیکن یہ معظم کے ساتھ یہاں شہر میں ہونے کی وجہ سے واقف ہو گئی تھی۔'' صداقت شاہ نے بیٹی کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے اسے بتایا۔ بے شک وہ بیٹے کو بے تحاشا چاہتے تھے لیکن ان روایتی زمینداروں یا جاگیرداروں میں سے نہیں تھے جنہیں بیٹی کا وجود گراں گزرتا ہے اور جو بیٹی جیسی رحمت کو اپنی محبت سے محروم رکھتے ہیں۔

''مجھے یقین ہے کہ میری زندگی میری بہن کی دعاؤں کے سبب ہی بچی ہے۔'' عالم شاہ نے لیٹے لیٹے ہی اپنا دایاں ہاتھ سجل شاہ کے سر پر رکھنے کی کوشش کی۔ بھائی کی کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے اس نے فوراً ہی اپنا سر جھکا دیا۔

''آپ ان دونوں بہن بھائی کو آپس میں باتیں کرنے دیں پھپھا سائیں اور میرے ساتھ گھر چلیں۔ اتنے دنوں سے آپ اسپتال میں ہیں اور بھرپور نیند نہیں لی ہے۔ اب عالم مکمل ہوش میں ہے اور اس کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں ہے اس لیے آپ کو تھوڑا اپنا خیال بھی کرنا چاہیے۔'' معظم شاہ نے صداقت شاہ کو مشورہ دیا تو سجل نے فوراً اس کی تائید کی۔

''جی بابا سائیں! یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں ہوں ادا کے ساتھ۔ باہر اور لوگ بھی ہیں اس لیے آپ کو اطمینان سے گھر چلے جانا چاہیے۔''

''لیکن تم.....!'' صداقت شاہ نے دو لفظ کہہ کر ہی اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن معظم سمجھ گیا کہ وہ سجل کی حالت کی وجہ سے اسے یہاں چھوڑ کر جانے میں متامل ہیں، اس لیے نرمی سے بولا۔

''آپ پریشان نہ ہوں پھپھا سائیں! سجل ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس گھر چلی جائے گی اور میں اپنا ایک کام نمٹا کر یہاں آجاؤں گا۔'' صداقت شاہ کے پاس اس کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہی اور وہ داماد کے ساتھ روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر معائنے کے لیے آگیا۔ اس نے عالم شاہ کی طرف سے خاصے اطمینان کا اظہار کیا۔ نرس نے اس کی ہدایت کے مطابق عالم شاہ کو ایک انجکشن لگایا اور نوٹ کرنے لگی کہ اسے کس وقت کیسی غذا دی جائے گی اور دواؤں کی ترتیب کیا ہوگی۔ ان لوگوں کے رخصت ہو جانے کے بعد عالم شاہ دوبارہ سجل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسے اپنی دونوں بہنوں سے پیار تھا لیکن سجل کا نمبر چونکہ اس کے بعد تھا اس لیے اس سے دوستی اور قربت زیادہ تھی۔ اس کے اغوا کی خبر سن کر وہ دکھ اور غصے سے بے حال ہو گیا تھا اور اب وہ سامنے بیٹھی تھی تو جیسے دل پر ٹھنڈی پھوار سی برس رہی تھی۔ وہ سجل سے اس کے اغوا کی تفصیل پوچھنے لگا۔ بھائی کی دلچسپی محسوس کر کے اس نے شروع سے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی اور آخر میں بولی۔

''ہمارے لیے تو وہ شخص رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ اگر وہ غیر معمولی جرأت اور بہادری سے کام نہ لیتا تو ان لوگوں کے نرغے سے نکلنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کا ایثار مجھے بھولتا نہیں ہے کہ سواری میسر آنے پر اس نے مجھے اور معظم کو وہاں سے فرار کروانے کو ترجیح دی اور خود وہیں رکا رہا۔ مجھے بار بار اس بے چارے کا خیال آتا ہے کہ پتا نہیں وہ وہاں سے نکل بھی سکا تھا یا نہیں۔ پولیس نے جب تک وہاں ریڈ کیا، اس وقت تک تو سب ختم ہو چکا تھا۔ کچھ پتا نہیں چلا کہ وہاں کون لوگ رہ رہے تھے۔ ہمارے مددگار کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا حالانکہ معظم اس کو تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں افسوس ہے کہ جب وہ ہمارے ساتھ تھا تو انہوں نے اس کے ساتھ اچھا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اصل میں وہ ہمیں اتنے مشکوک حالات میں ٹکرایا تھا کہ ہم اسے اغوا کاروں کا ساتھی ہی سمجھتے رہے تھے اور اب اسے تلاش کرنے کے لیے ہمارے پاس اس کے نام کے سوا کچھ موجود نہیں ہے۔'' سجل شاہ کے لہجے میں تاسف تھا۔

''کیا نام تھا اس شخص کا؟'' عالم شاہ نے یونہی اس سے پوچھ ڈالا۔

''معاذ..... معاذ نام بتایا تھا اس نے اپنا۔'' سجل نے بتایا۔

''معاذ.....!'' عالم شاہ چونکا۔

''جی! یہی نام تھا اس کا۔'' سجل نے تصدیق کی۔

''اور وہ تمہیں کیرتھر کے آس پاس ملا تھا؟'' عالم شاہ نے پوچھا۔

''جی۔'' سجل نے بھائی کے دبے دبے جوش کو محسوس کر کے قدرے حیرت سے تصدیق کی۔

''تم مجھے اس کا حلیہ بتا سکتی ہو سجل؟'' عالم شاہ کی بے چینی اب بالکل واضح تھی۔

''کوشش کرسکتی ہوں۔ اصل میں جب وہ ہمیں ملا تو بہت بُرے حال میں تھا۔ ڈاکوؤں کے ٹھکانے پر اس نے مار کھا لیا تھا تو اس کا حلیہ قدرے بہتر ہوگیا تھا لیکن بڑھے ہوئے بالوں اور شیو میں یقیناً اس کی اصل شخصیت دب گئی تھی۔ اس کی جسمانی حالت بھی ایسی تھی کہ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کئی دن سے کڑی مشقت سہہ رہا ہے اس لیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں اس کا درست حلیہ بیان کرسکوں گی۔'' سجل جھجک اور تذبذب کا شکار تھی۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔ معاذ جتنے طویل عرصے سے غائب ہے، اس کی شخصیت میں تبدیلیاں رونما ہونا میرے لیے اچنبھے کی بات نہیں ہوگی لیکن انسان کتنا ہی تبدیل ہوجائے، اس کی شخصیت کی بنیادی خصوصیات تو بہرحال وہی رہتی ہیں نا۔ تم مجھے اس کے بارے میں ایسی ہی باتیں بتاؤ۔''

''وہ دراز قد تھا، لگ بھگ آپ جتنا۔ آپ سے شاید ایک آدھ انچ چھوٹا قد ہو۔ بال سیاہ اور چمکیلے تھے۔ سب سے خاص اس کی آنکھیں تھیں۔ بہت سیاہ، بہت گہری اور چمکیلی۔'' بولتے بولتے سجل شاہ اس لمحے میں پہنچ گئی جب تہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا توازن بگڑا تھا اور معاذ نے اس کے گرنے سے قبل ہی اسے اپنی بانہوں میں تھام لیا تھا۔ اس لمحے اس کی نظریں معاذ کی نظروں سے ملی تھیں اور اسے اپنا آپ کسی بھنور میں اترتا محسوس ہوا تھا۔ وہ ایک بپا ہتا تھی۔ اس کا شوہر معظم ایک اچھا اور مہذب انسان تھا اور سب سے بڑھ کر اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا اس لیے ہر مشرقی عورت کی طرح وہ اس کی وفادار تھی اور اپنے تئیں اس سے محبت بھی کرتی تھی لیکن معاذ کی نظروں سے پل بھر کے اس ملاپ نے اس کے وجود میں جو سنسناہٹ پیدا کی تھی، اسے وہ ابھی تک فراموش نہیں کرسکی تھی اور ہر بار اس لمحے کا خیال آنے پر اپنی جگہ لرز سی جاتی تھی۔ اس پل اس کے ساتھ کیا گزر رہی تھی، وہ نہ تو سمجھ سکی تھی اور نہ سمجھنا چاہتی تھی لیکن اس پل، اس لمحے کو فراموش بھی نہیں کرسکی تھی۔ اس ایک پل نے اسے ایسے اپنے حصار میں لیا تھا کہ وہ خود کو کسی سحر میں جکڑا محسوس کرتی تھی۔

''وہ معاذ ہی تھا۔ میرا دوست معاذ، جسے مجھ سمیت اس کے سارے قریبی دوست اور گھر والے اتنے عرصے سے تلاش کررہے تھے۔ آہ..... یہ کیا ہوا۔ اس کے زندہ ہونے کی خبر ملی بھی تو ایسے کہ وہ ایک بار پھر غیر یقینی حالات میں منظر سے غائب ہوچکا ہے۔'' عالم شاہ کی پُرجوش اور بلند آواز اسے سحر سے کھینچ کر لے آئی لیکن عالم شاہ کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے میں اسے تھوڑا سا وقت لگا۔

''میں نے موبل کی زبانی سنا تھا کہ آپ اپنے کسی دوست کی بازیابی کے لیے حد سے زیادہ ایکٹو تھے لیکن پھر بابا کو کچھ دھمکیاں ملیں تو وہ زبردستی آپ کو شہر سے واپس گاؤں لے گئے۔ کیا یہ آپ کا وہی دوست ہے؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ وہی ہے؟'' سجل مضطرب تھی۔

''ہنڈرڈ پرسنٹ یقین ہے۔ اس کا قد کاٹھ، سحر انگیز آنکھیں اور سب سے بڑھ کر جرأت مندی گواہ ہے کہ وہ معاذ ہی تھا۔ وہ کیرتھر کے ٹرپ کے دوران غائب ہوا تھا اور تم لوگوں کو کیرتھر کے قریب ہی ملا تھا، اس لیے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرا دوست معاذ ہی تھا۔'' عالم شاہ نے اپنے موقف پر اصرار کیا۔

''وہ جو بھی تھا، اصل بات تو یہ ہے کہ ہم اسے کھو چکے ہیں اور ہمارے پاس اس تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔'' اس بار سجل شاہ بولی تو خود کو سنبھال چکی تھی اور اس کے لہجے میں وہی وقار تھا جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔

''ایکسکیوزمی میم! مجھے آپ سے کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا لیکن ڈاکٹر کی ایڈوائز ہے کہ پیشنٹ کو زیادہ سے زیادہ آرام کروایا جائے۔ میں اتنی دیر سے اس لیے انٹرپ (مداخلت) نہیں کررہی تھی کہ فیملی کو بہت دنوں بعد ان سے بات کرنے کا موقع ملا ہے لیکن اب بہت زیادہ ٹائم ہوگیا ہے اور یہ پیشنٹ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔'' دروازے پر دستک دے کر اندر آنے والی نرس کی مداخلت نے انہیں گفتگو کا سلسلہ روکنے پر مجبور کردیا۔ نرس اتنی دیر سے شاید اس لیے خاموش تھی کہ ایک بارسوخ خاندان کے فرد کو روکنا ٹوکنا اس کے لیے مشکل امر تھا لیکن بہرحال اسے اپنی ڈیوٹی ادا کرنی تھی اور وہ بہت مہذب لہجے میں سجل شاہ سے مخاطب تھی۔

''اوکے سسٹر! میں اب ان سے کوئی بات نہیں کروں گی۔'' سجل نے فوراً اس کی بات مان لی۔

''آپ کو وزیٹر روم میں جانا ہوگا۔ ہمیں ان کی بینڈیج چینج کرنی ہے۔ اس کے بعد غذا اور میڈیسن دے کر انہیں آرام کروایا جائے گا۔'' نرس نے اسے ہری جھنڈی دکھائی تو ناچار سجل کو باہر جانے کے لیے اٹھنا پڑا۔ عالم شاہ خاموشی سے اسے باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اسے موقع نہیں ملا تھا کہ آسیہ کے کردار کے بارے میں کسی کو کچھ بتاتا۔ کسی نے اس حوالے سے اس سے کچھ خاص کہا بھی نہیں تھا لیکن

وہ جانتا تھا کہ اس کے دامن پر تہمت لگی ہے اور تہمت کا داغ اتنی آسانی سے نہیں مٹتا۔

☆☆☆

وقاص صبح فلیٹ سے جلد روانہ ہوگیا تھا۔ روانگی کے وقت معاذ سو رہا تھا اس لیے اس سے کوئی بات نہیں ہوسکی تھی۔ اسے مومی کے پاس اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے معاذ کے جاگنے کا انتظار کیے بغیر ہی نکل پڑا تھا اور اب اسپتال کے کمرے میں نیلی کے روبرو موجود تھا۔

”کیسا ہے اپنا ہیرو؟“ اس نے بستر پر سوئے ہوئے مومی پر ایک نظر ڈالی اور ہلکے پھلکے انداز میں نیلی سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

”بس ٹھیک ہے۔ درد سے بچانے کے لیے ڈاکٹرز ایسی دوائیں دے رہے ہیں کہ سارا ٹائم سوتا ہی رہا ہے۔“ نیلی نے بجھے ہوئے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

”وہ سوتا رہا ہے اور تو رات بھر جاگ کر اپنی جان آدھی کرتی رہی ہے۔“ وقاص نے نیلی کی سرخ آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر اندازہ لگایا۔

”مومی کو اس حال میں دیکھ کر بھلا مجھے کیسے نیند آسکتی تھی؟“ نیلی نے گویا اعتراف کیا۔

”فکر نہیں کر۔ اپنا مومی شیر ہے۔ دیکھنا تھوڑے دنوں میں ہی بستر چھوڑ کر فارم میں آجائے گا۔“ وقاص نے اسے تسلی دی۔

”مجھے لگتا ہے کہ مومی کے لیے دوبارہ سرکس میں کام کرنا بہت مشکل ہوگا۔“ نیلی کی نظریں مومی کی پلاستر چڑھی ٹانگ پر جمی تھیں۔

”ابھی اس بات کو چھوڑ دے۔ ابھی تو اس کی جان بچ جانا ہی کافی ہے۔ بندہ سرکس میں کام کرے بغیر بھی جی سکتا ہے۔“

”مومی کے لیے جینا مشکل ہوگا۔ مومی کے لیے اپنا پروفیشن صرف پیٹ پالنے کا ایک ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اپنے کام سے محبت کرتا ہے۔ موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلانا اسے کیسی خوشی دیتا ہے، یہ میں جانتی ہوں۔ پتا ہے مجھ سے کیا کہتا تھا۔ کہتا تھا، نیلی! تجھے اپنے پیچھے بٹھا کر موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتا ہوں تو لگتا ہے ہواؤں میں اڑتا پھر رہا ہوں۔ میرا کام اور تیرا ساتھ میرے لیے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشیاں ہیں۔“ نیلی کی پلکیں بھیگنے لگیں۔

”حوصلے سے کام لے نیلی۔ تو ہمت چھوڑ دے گی تو اسے کون سنبھالے گا۔ تیرا حوصلہ اور ساتھ ہی اسے اس دکھ کو جھیلنے کی ہمت دے سکتا ہے۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ مومی ہمیشہ کے لیے اپنے کام سے دور نہیں رہے گا۔ میں اس کا بہترین علاج کرواؤں گا اور انشاء اللہ تیرے ساتھ اور اپنی ہمت کے بل بوتے پر یہ جلد اپنی جگہ پر موجود ہوگا۔“ وقاص نیلی کے ساتھ ساتھ خود کو بھی یقین دلا رہا تھا۔

”اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے۔“ نیلی نے فوراً کہا۔

”تو نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا ایسے ہی بھوکی پیاسی بیٹھی فکر میں گھل رہی ہے؟“ وقاص نے یک دم اس سے پوچھا تو وہ ٹپٹا گئی اور کھسیا کر بولی۔

”بھوک ہی نہیں لگی۔“

”بھوک تو تو نے فکر کر کر کے خود ہی اڑا دی ہے۔ چل میں تجھے ناشتا کرواتا ہوں۔“ وقاص نے پیار بھرے رعب سے کہا۔

”لیکن مومی......“ نیلی وہاں سے ہٹنے میں متذبذب تھی۔

”مومی کا خیال رکھنے کو اسپتال کا اسٹاف موجود ہے۔ تیرے بھوکے پیاسے یہاں بیٹھ کر اس کو تکتے رہنے سے یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا لیکن تو بیمار پڑ جائے گی۔ مومی کو سنبھالنا ہے تو تجھے خود کو فٹ رکھنا ہوگا اور فٹ رہنے کے لیے اچھی خوراک اور آرام کی کیا اہمیت ہے، تو خود جانتی ہے۔“ وقاص نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ نیلی مزید انکار نہیں کرسکی اور اس کے ساتھ اسپتال کی کینٹین میں پہنچ گئی۔ وقاص نے اس کے لیے بھرپور ناشتا منگوایا لیکن چونکہ خود ناشتا کر کے چلا تھا اس لیے اپنے لیے صرف چائے کے ایک کپ پر اکتفا کیا۔ نیلی جو پہلے بالکل بھی بھوک محسوس نہیں کر رہی تھی، اس کے بے حد اصرار پر کھانا شروع ہوئی تو آہستہ آہستہ کافی کچھ کھاتی چلی گئی۔ ڈبل روٹی کے سلائس اور آملیٹ ختم کرنے کے بعد اس نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا تو کچھ یاد آجانے کے انداز میں چونکتے ہوئے بولی۔

”میں آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی وکی بھائی!“

”وہ کیا؟“ وقاص فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”رات ڈاکٹر کے وزٹ کے وقت جب مجھے مومی کے کمرے سے باہر بھیج دیا گیا تھا، میں ایسے ہی ٹہلنے کے لیے ریسیپشن ایریا کی طرف چلی گئی تھی، وہاں میں نے ریسیپشنسٹ لڑکی سے ایک آدمی کو بات کرتے ہوئے سنا۔ وہ مومی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کل

ہائی وے کے قریب ایکسیڈنٹ ہونے پر جولڑکا اسپتال میں لایا گیا ہے، اس کا کیا حال ہے اور وہ کس روم میں ہے؟ میں سمجھی کہ وہ آپ کا کوئی ساتھی ہے اور مومی کی خیریت معلوم کرنے آیا ہے لیکن پھر بہت عجیب بات ہوئی۔ بجائے یہ کہ وہ مومی کو دیکھنے جانے کی بات کرتا، اس نے لڑکی سے کہا کہ وہ ریکارڈ میں سے مومی کا ایڈریس وغیرہ نکال کر دے دے۔ اس کام کے لیے اس نے لڑکی کو پیسے بھی دیے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیا چکر تھا۔'' نیلی نے اس سے اپنی الجھن بیان کی تو وہ چونک گیا اور دھیان فوراً ان ہجیرو والوں کی طرف چلا گیا جنہوں نے اعجاز کو قتل کیا تھا اور جنہوں نے مومی کو اپنے تعاقب میں پا کر اسے سائڈ مار کر حادثے سے دوچار کر دیا تھا۔ یقیناً اب وہ جاننا چاہتے تھے کہ جائے واردات سے ان کا تعاقب کرنے والا شخص کون تھا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مومی بھی خطرے میں تھا۔

''تجھے مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا نیلی! میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ کسی بھی ضرورت کا خیال رکھنے کے لیے ایک بندہ باہر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تو مجھے بتاتی تو میں اپنے بندے کو بولتا کہ اس آدمی کو چیک کرے۔''

''بس خیال ہی نہیں آیا اور وہ آدمی واپس بھی چلا گیا۔ کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟'' نیلی تشویش میں مبتلا ہوئی۔

''تجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو بھی معاملہ ہوگا میں خود دیکھ لوں گا۔'' وقاص نے اسے تسلی دی، پھر گفتگو کا موضوع بدل کر مومی کی صحت یابی کے حوالے سے بات کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نیلی کو دوبارہ مومی کے کمرے میں چھوڑ کر باہر نکلا تو اس کے ماتھے پر شکنیں تھیں۔ باہر موجود آدمی کو اس نے واقعے سے آگاہ کیا تو وہ گھبرا گیا اور اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے میری بس یہ ڈیوٹی لگائی تھی کہ مومی بھائی کے لیے کوئی بھی ضرورت پڑے، اس کا خیال رکھوں۔ کسی خطرے کا ذکر ہوتا تو میں اور طرح سے ادھر کا دھیان رکھتا۔''

''ہمارے جیسوں کو ہمیشہ، ہر جگہ اور ہر حالت میں اپنی آنکھیں کھلی رکھنی ہوتی ہیں سرور! دھیان چوکا اور مات ہوئی۔ بہرحال ابھی جو ہوا سو ہوا۔ اپنے ساتھ ایک بندہ اور لگا لو اور پوری طرح آنکھیں کھول کر ادھر کا دھیان رکھو۔ مومی کا بال بھی بیکا ہوا نا تو میں تم لوگوں کی کھال گرادوں گا۔'' اس کے لہجے میں در آنے والی سختی نے مقابل کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا دی۔ وہ کم عمر تھا لیکن اپنی صلاحیتوں اور لالہ عیسیٰ کی خصوصی توجہ کی وجہ سے سب پر حکمرانی کرتا تھا اور سب اسے چھوٹا ہوتے ہوئے بھی اپنا بڑا ماننے پر مجبور تھے۔

''آپ کو اب کوئی شکایت نہیں ہوگی وکی بھائی!'' وہ فوراً ہی یقین دہانی کروانے لگا لیکن وقاص اب اس کے بجائے اپنے سیل فون پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ سیل پر اسے جو اطلاع دی گئی اسے سن کر وہ چیخ پڑا۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ ایسا کیسے ہو گیا؟'' جواب میں دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔

''میں خود وہاں آ رہا ہوں۔'' اس نے کہا اور سرور کی طرف توجہ دیے بغیر تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ بائیک برق رفتاری سے چلاتے ہوئے اس کا رخ اس بلڈنگ کی طرف تھا جس کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ معاذ کو سویا ہوا چھوڑ کر رخصت ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ میں قدم رکھتے ہی اس کے پیچھے وہ گارڈ بھی چلا آیا جس کی کال پر وہ یہاں آیا تھا۔

''کیسے ہوا یہ سب کچھ؟'' اس نے سخت لہجے میں گارڈ سے دریافت کیا۔

''میں اپنی ڈیوٹی پر تھا سر! گیسٹ نے انٹرکام پر مجھے کال کیا کہ انہیں کوئی کام ہے اس لیے اوپر آ جاؤں۔ میں اوپر آیا تو انہوں نے مجھے اپارٹمنٹ کے اندر بلا لیا اور پھر اچانک ہی میری ناک پر اتنی زور کا مکا مارا کہ میرا سر چکرا گیا۔ میں سنبھل بھی نہیں سکا تھا کہ انہوں نے دوسرا مکا میری کنپٹی پر رسید کیا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد وہ چپکے سے یہاں سے نکل گئے۔ نیچے والا گارڈ کافی دیر تک میرے واپس نہ آنے پر اوپر آیا اور مجھے ہوش میں لا کر ساری بات پوچھی۔ ہم نے کیمرے کی ریکارڈنگ دیکھی تو پتا چلا کہ گیسٹ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں کے ذریعے یہاں سے گیا ہے۔ انہوں نے سر پر پی کیپ جھکا کر پہنی ہوئی تھی اس لیے نیچے والا گارڈ پہچان نہیں سکا اور وہ آسانی سے یہاں سے نکل گئے۔'' گارڈ نے ایک ہی سانس میں پوری کتھا سنا ڈالی۔ وقاص دیکھ سکتا تھا کہ اس کی ناک سرخ اور سوجی ہوئی ہے اور کنپٹی پر بھی نیل کا نشان نظر آ رہا ہے۔ معاذ کے بہترین فائٹر ہونے کا اندازہ اسے پہلی ملاقات میں ہی ہو گیا تھا اس لیے گارڈ کے بیان پر تو کوئی بے اعتباری نہیں تھی لیکن حیرت ضرور ہو رہی تھی کہ معاذ نے ایسا کیوں کیا؟ اس کے حساب سے تو معاذ اس کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد مطمئن ہو چکا تھا اور اس کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا پھر یہ اچانک کیا ہو گیا تھا۔

''یہ کارکردگی ہے تم لوگوں کی۔ ایک زخمی بندے نے دوکلوں میں تمہیں لمبا لٹا دیا اور تمہاری ناک کے نیچے سے اتنی آرام سے نکل کر چلا گیا۔'' جھنجلاہٹ اور الجھن کے عالم میں اس نے گارڈ کو طعنہ دیا تو اس کی سرخ ناک مزید سرخ ہوگئی اور شرمندہ سے انداز میں بولا۔

''میں اعتبار میں دھوکا کھا گیا، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں اتنا تر نوالہ نہیں ہوں کہ کوئی بھی مجھے آسانی سے خاک چٹا جائے۔''

''بات یہی ہے کہ وہ کوئی بھی نہیں ہے۔ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم ہوشیار بھی ہوتے تو تمہارے لیے انہیں کنٹرول کرنا مشکل ہوتا۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ میرے لیے اصل پرابلم یہ ہے کہ وہ اس طرح سے اچانک کہاں اور کیوں چلے گئے؟'' وقاص واقعی بہت زیادہ الجھن کا شکار تھا۔

''وہ آپ کے لیے ایک نوٹ چھوڑ کر گئے ہیں۔'' گارڈ نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا ایک پرچہ باہر نکالا۔ وقاص نے پرچے کی تہ کھول کر اس پر لکھی تحریر پڑھی، لکھا تھا۔

''وقاص! تمہارے خلوص پر شک نہیں لیکن میں اپنے بھائی کی خاطر یہاں سے جانے پر مجبور ہوں۔'' اس مختصر سے پیغام نے وقاص کو مزید الجھا دیا پھر اس کے اندر خطرے کا کوئی الارم سا بجا۔ اس نے موبائل نکال کر ایک نمبر ملایا اور کال ریسیو ہوتے ہی بولا۔

''معلوم کرو معاذ کی فیملی اسپیشلی چھوٹے بھائی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''میرے لیے کیا حکم ہے، وکی بھائی؟'' اس کے کال ختم کرتے ہی گارڈ نے اس سے دریافت کیا۔

''فی الحال کوئی نہیں۔ تم جا کر آرام کرو۔'' وقاص نے اسے فارغ کر دیا اور خود اپارٹمنٹ میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ معاذ یہاں بغیر سامان کے آیا تھا اس لیے اس کا کوئی ذاتی سامان تو تھا نہیں جسے وہ ساتھ لے جاتا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ جو دوائیں استعمال کر رہا تھا، وہ بھی وہیں موجود تھیں۔ دواؤں کی موجودگی وقاص کے دل میں اندیشہ پیدا کر رہی تھی کہ وہ کسی ایسی جگہ گیا ہے جہاں اسے ان دواؤں کے استعمال کی امید نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ کسی ایسی جگہ نہیں گیا تھا جہاں اس کا اپنوں اور دوستوں سے واسطہ پڑتا۔ وہ کسی خطرے کی سمت گیا تھا۔ کچھ دیر قبل کی جانے والی کال کا جواب آیا تو اس کے اندیشے کی تصدیق ہوگئی۔

''معاذ کے بھائی سعد کو آج صبح اسپتال سے میڈیکل کالج جاتے ہوئے اغوا کر لیا گیا ہے۔ واقعے کی خبر صبح ہی ٹیلی ویژن پر آگئی تھی۔ اب بھی ہر نیوز بلیٹن میں اس خبر کو پیش کیا جا رہا ہے۔ لاہور میں مقیم معاذ کی فیملی کاری ایکشن بھی سامنے آگیا ہے۔ وہ لوگ صاحب اقتدار و اختیار سے اپیل کر رہے ہیں کہ معاذ اور سعد دونوں کی بازیابی کے سلسلے میں اقدامات کیے جائیں۔''

اسے جو رپورٹ پیش کی گئی، وہ تشویش ناک تھی۔ وہ صبح اسپتال میں مصروف ہونے کی وجہ سے خبروں پر توجہ نہیں دے سکا تھا اور اس کے آدمیوں نے بھی شاید دھیان نہیں دیا تھا، اس لیے اتنی دیر سے خبر ہوئی تھی۔ اپنے آدمی کی رپورٹ سننے کے بعد اس نے اپنے اسمارٹ فون پر اس خبر کو تلاش کیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ جلد ہی سعد کی موٹر سائیکل کے آئینے پر لکھی تحریر والی خبر اس کے سامنے آگئی۔ اس نے توجہ سے وہ تین لفظی تحریر پڑھی۔ ..... ''معاذ! کم بیک!''..... اور گویا بہت کچھ اس کی سمجھ میں آگیا۔ کوئی اور اس تحریر کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن وہ سمجھ سکتا تھا کہ یہ معاذ کے لیے ایک پیغام تھا اور ان ہی لوگوں نے دیا تھا جن کی قید سے وہ معاذ کو نکال لایا تھا۔ معاذ کی تلاش میں ناکامی کے بعد انہوں نے یہ اوچھا ہتھکنڈا استعمال کیا تھا کہ اس کے بھائی کو اغوا کر کے اسے جذباتی بلیک میلنگ کے ذریعے اپنے پاس واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وقاص کو افسوس ہونے لگا کہ صبح سے اس نے خبروں کی طرف توجہ کیوں نہیں دی۔ اگر وہ خبریں دیکھ لیتا تو لازماً ایسا بندوبست کر دیتا کہ معاذ یہاں سے نکل نہیں پاتا لیکن اب سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اسے اندازہ تھا کہ معاذ کے گھر والوں کی طرح یہ جاننے کے باوجود کہ اس سب کے پیچھے کون لوگ ہیں، وہ قانونی طور پر ان کے خلاف کوئی مؤثر کارروائی نہیں کر سکے گا۔ خبروں کے اسی سلسلے کے آگے بڑھنے پر اس نے معاذ کے فیملی ممبرز کو تازہ پیش آنے والے واقعے پر احتجاج اور اپیل کرتے ہوئے دیکھا۔ ان افراد میں معاذ کے والد، پھپھو، میڈیکل کی طالبہ حسین و جمیل کزن اور چھوٹی بہن شامل تھے۔ وہ سب بے حد افسردہ تھے اور ایک اور نہایت افسوسناک خبر سامنے آنی تھی کہ معاذ کی والدہ جو پہلے ہی اس کے غیاب پر صدمے کے باعث مستقل بیمار رہتی تھیں، اس تازہ واقعے کے بعد ہارٹ اٹیک کا شکار ہوگئی تھیں۔ نیوز چینل اس اسپتال سے ہی فیملی ممبرز کے تاثرات ریکارڈ کر کے نشر کر رہا تھا جہاں

معاذ کی والدہ سعیدہ بیگم کو بغرض علاج لایا گیا تھا۔ سعیدہ بیگم کی حالت ہنوز تشویشناک بتائی جارہی تھی۔ ان کی حالت کے بارے میں بتاتے ہوئے معاذ کی چھوٹی بہن علینہ ہچکیوں سے رو پڑی تھی اور اس کے رونے سے وقاص کے دل کو تکلیف ہورہی تھی۔ وقاص نے معاذ کو اس کا ساتھ دینے اور اس سے ہمدردی کرنے کی جو بھی وجوہات بتائی تھیں، وہ اپنی جگہ درست تھیں لیکن جو سب سے بڑی اور مضبوط وجہ تھی اسے وہ معاذ کے سامنے بیان کرنے کی جرأت نہیں کرسکا تھا۔

معاذ کی تلاش کے سلسلے میں چلائی جانے والی کمپین کے دوران اس نے معاذ کی چھوٹی بہن علینہ کو دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی اس کے آگے دل ہار گیا تھا۔ دل ہارنے کا یہ قصہ بھی عجیب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ رہتا ہے اور جن کا ایک حصہ بن چکا ہے، اس کے بعد وہ کسی شریف گھرانے کی لڑکی کے لیے ڈیزرو نہیں کرتا لیکن دل کی اپنی بے اختیاری تھی اور اس بے اختیاری نے ہی اسے مجبور کررکھا تھا کہ وہ معاذ کی فیملی کے معاملات سے باخبر رہے۔ صرف آج ہی وہ اپنے عزیز از جان دوست موی کی وجہ سے ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر جاننے میں اتنی تاخیر کا شکار ہوگیا تھا اور یہ تاخیر اس کے لیے بہت بڑی آزمائش بن گئی تھی۔ علینہ کے آنسو اس سے شکایت کررہے تھے کہ وہ کیوں چوک گیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ لڑکی اس سے واقف بھی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی ان کی روبرو ملاقات ہوئی تھی، پھر بھی اس نے اپنے دل میں اس کے نام کا ایک جہان آباد کرلیا تھا اور خود ہی اپنے آپ کو اس کے سامنے جوابدہ محسوس کرتا تھا۔ اب بھی وہ افسردہ تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود علینہ کو اس کا بھائی واپس نہیں لوٹا سکا تھا اور وہ دوسرے بھائی کے اغوا کے ساتھ ساتھ ماں کی بیماری کا صدمہ بھی سہنے پر مجبور تھی۔ علینہ کا دکھ اس کا دکھ تھا اور وہ اپنے طور پر اس دکھ کے مداوے کی ترکیب سوچنے میں لگا ہوا تھا۔

☆☆☆

دکھ قدرت کی طرف سے ملیں تو انسان مشیت ایزدی جان کر ان پر صبر کرلیتا ہے لیکن جب دکھ کسی کے ظلم کا نتیجہ ہوں تو انسان کے لیے صبر کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے اور اس کے دل میں ہر لمحے انصاف کی خواہش سر اٹھاتی رہتی ہے۔ بشریٰ بھی اپنے ساتھ ہونے والے تمام مظالم کے لیے انصاف چاہتی تھی لیکن یہاں مظلوم کو انصاف دینے کا نظام ہی کہاں قائم تھا۔ وہ مظلوم ہوتے ہوئے بھی تنقید اور تضحیک کا نشانہ بنائی جارہی تھی۔ اس سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ وہ اپنے لگائے گئے الزامات کا ثبوت پیش کرے اور مسئلہ یہ تھا کہ سارے ثبوت غائب تھے۔ اعجاز کا بیگ ہنوز غائب تھا۔ لیب کے ریکارڈ سے بھی ڈی این اے کی رپورٹیں غائب کردی گئی تھیں۔ اعجاز کے ساتھ زخمی ہونے والا اس کا ساتھی کیمرامین بھی دو دن اسپتال میں رہنے کے بعد دم توڑ چکا تھا اور بشریٰ دوبارہ اسی مقام پر آکھڑی ہوئی جہاں اس نے اپنے ماں باپ کے مرنے کے بعد خود کو پایا تھا۔ یہ اعجاز کی پُرخلوص دوستی تھی جو وہ اندھے انتقام کا خیال دل سے نکال کر قانونی جنگ لڑنے کے لیے تیار ہوگئی تھی لیکن اب اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس کے پاس یہ جنگ لڑنے کے لیے کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے۔ ثبوت، گواہ، شہادتیں..... کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس۔ مایوسی اور ناامیدی کی کیفیت میں جو واحد شے اس کے پاس بچی تھی وہ سونیا خان کی آفر تھی اور وہ خود کو اس آفر کو ماننے کے لیے مجبور پارہی تھی۔ سونیا نے اسے سمجھایا تھا کہ طاقتور دشمن سے مقابلے کے لیے اسے کسی دوسرے طاقتور کا ہاتھ تھامنا ہوگا اور آج یہ بات بشریٰ تسلیم کرچکی تھی اس لیے اس کی انگلیوں نے خود ہی سونیا کا نمبر ڈائل کردیا۔

''اوہ، بشریٰ ڈیئر تم! میں تو خود تمہاری کال کا انتظار کررہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد مجھ سے رابطہ ضرور کروگی۔ میں تمہارے سارے حالات سے واقف ہوں لیکن خود سے تمہیں اس لیے کونٹیکٹ نہیں کیا کہ تم اچھی طرح سوچ بچار کر کے خود فیصلہ کرو۔ میرے خیال میں تم فیصلہ کرچکی ہو؟'' سونیا اس کی آواز سنتے ہی بولنا شروع ہوگئی۔

''میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔'' بشریٰ نے اعتراف کیا۔

''ٹھیک ہے لیکن پھر یاد رکھنا کہ تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔'' سونیا نے اسے یاددہانی کروائی۔

''مجھے یاد ہے اور میں ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' بشریٰ نے اسے جواب دیا۔

''گڈ! تو پھر ایسا کرو کہ کسی کو بھی کچھ بتائے بغیر خاموشی سے میرے پاس آجاؤ۔ باقی باتیں ہم آمنے سامنے بیٹھ کر کریں گے۔'' سونیا خان چہکی اور اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دینے لگی۔

''کیا ابھی؟''

''بالکل ابھی۔ جب فیصلہ کرلیا ہے تو عمل میں تاخیر کیوں ہو۔'' سونیا نے جواب دیا تو بشریٰ نے بھی خود کو اس سے متفق پایا اور سلسلہ منقطع کرکے روانگی کی تیاری کرنے لگی۔ وہ اسپتال سے چھٹی لے چکی تھی اور ایک بار پھر میڈم نازلی کے ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔ تیار ہوکر وہ نیچے پہنچی تو میڈم نازلی حسبِ معمول اپنی سیٹ پر موجود تھی۔

''اوہ، بشریٰ ڈارلنگ! کہیں جارہی ہو؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جو ہوا سو ہوا، اب تمہیں خود کو سنبھال کر اس سب سے آگے نکلنا ہوگا۔ وش یو بیسٹ آف لک۔'' سامنا ہوتے ہی میڈم نے بولنا شروع کردیا۔

''تھینکس۔'' بشریٰ نے سپاٹ سے انداز میں اسے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی لیکن اپنے دل میں یہ ضرور سوچا کہ ہر آنے جانے والے پر پوری نظر رکھنے والی میڈم اس رات کیسے چوک گئی تھی جب باذل یہاں آیا تھا اور اس سے اس کی ہستی کا غرور چھین کر لے گیا تھا۔ (ڈی این اے کی رپورٹ کی وجہ سے وہ یقین کرچکی تھی کہ اس رات اس کے کمرے میں آنے والا شخص باذل ہی تھا)۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس روز میڈم نے جان بوجھ کر لاعلمی کا بہانہ کیا تھا اور استقبالیہ کمرے کی ٹیوب لائٹ خراب ہونے کا عذر تراش کر سچ بولنے سے دامن چرا گئی تھی۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر سونیا کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ خوبصورت آرٹسٹک ٹچ رکھنے والے سونیا کے بڑے سے گھر میں گویا اس کا انتظار ہورہا تھا۔ سونیا کے پی اے حامد نے خود اس کا استقبال کیا اور سیدھا سونیا تک پہنچا دیا۔

''ویلکم..... ویلکم، بشریٰ ڈارلنگ!'' سونیا خان نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا اور پُرتپاک انداز میں ہاتھ ملایا۔ بشریٰ کے انداز میں البتہ جوش کے بجائے سنجیدگی تھی۔ وہ شاید ایسی کیفیت سے گزر رہی تھی جس کیفیت سے خودکش بمبار بننے کا فیصلہ کرنے والا شخص گزرتا ہوگا۔ وہ کم عمر تھی لیکن نادان نہیں تھی کہ اس بات کو نہ سمجھ پاتی کہ کوئی بھی قیمت ادا کرنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے لیکن اب وہ اپنے جذبۂ انتقام میں پہلے سے زیادہ شدید ہوچکی تھی اور ''کوئی بھی'' قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔

''تم تو اتنی سنجیدہ لگ رہی ہو جیسے بارود کے ڈھیر پر بیٹھی ہو۔'' سونیا خان نے اس کی کیفیت بھانپ لی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''میں اتنی سنجیدہ ہوں کہ بارود کے ڈھیر پر بھی بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔'' بشریٰ نے مضبوط لہجے میں اسے جواب دیا۔

''گڈ! مجھے تمہاری اسی اسپرٹ کی ضرورت تھی۔'' سونیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کوندی، پھر وہ ایک بار پھر بشریٰ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔

''اب ہم ساتھی ہیں اور تمہیں حق ہے کہ ہمارے رازوں سے آگاہ ہو لیکن یاد رکھنا کہ ہمارا ساتھی بننے کے بعد کسی کے پاس واپسی کی گنجائش بس اتنی ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا سے لوٹ جائے۔'' اس طرح دار اور حسین عورت کی ریشمی آواز میں ایسی سرد مہری تھی کہ اگلے کا پتا پانی ہوجائے۔ بشریٰ نے بھی اپنے سارے وجود میں سنسناہٹ سی محسوس کی لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال گئی اور سونیا خان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اعتماد سے بولی۔

''اپنا انتقام پورا کیے بغیر میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''اچھی بات ہے۔ خطروں کے کھلاڑی کے اندر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے لڑنے کی جرأت ہونی چاہیے لیکن صرف یہ جرأت ہی کافی نہیں، تمہیں ٹریننگ اور سپورٹ کی بھی ضرورت ہے اور یہ دونوں چیزیں ہم تمہیں پرووائڈ کریں گے۔''

''ہم.....؟'' اس نے سونیا کی بات سن کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میں اور میرا شوہر داراب خان! تمہارے لیے شاید یہ ایک دلچسپ خبر ہو کہ میرا شوہر داراب خان ایک اسمگلر ہے اور یزدانی اور عرفان اللہ اس کے کاروباری حریف۔ اب تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں کیوں تمہیں سپورٹ کرنا چاہتی ہوں۔ دشمن کا دشمن دوست بنالینے سے زیادہ اچھا سودا کوئی نہیں ہوسکتا۔'' سونیا خان نے اس پر انکشاف کیا تو لمحہ بھر کے لیے وہ ڈگمگا گئی۔ وہ گلزار عاصم کی بیٹی تھی جنہوں نے ساری زندگی اے حب الوطنی کا درس دیا تھا اور کسی اسمگلر کا ساتھی بننے کا مطلب تھا ملک دشمنوں کا ساتھی بننا لیکن اس نے اپنے اندر اٹھنے والے اس جذباتی ابال پر قابو پالیا۔ اسے اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے طاقت کی ضرورت تھی اور بدقسمتی سے وطنِ عزیز میں طاقتور طبقے کی اکثریت کا تعلق مجرم اور کرپٹ لوگوں سے ہی تھا۔ جیسے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے، ویسے ہی اسے بُروں سے لڑنے کے لیے بُروں کے ساتھ کی ضرورت تھی۔ اس کے نزدیک یہ شر کو خیر سے نہیں بلکہ شر کو شر سے ختم کرنے کا وقت تھا اور اس نے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

☆☆☆

''معاذ کا کچھ پتا چلا، ادا معظم؟'' عالم شاہ نے اپنی مزاج پرسی کے لیے آئے ہوئے معظم شاہ سے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کسی بھی بارے میں معلوم نہیں چل رہا ہے۔ تم نے شک ظاہر کیا تھا کہ اس روز ہماری مدد کرنے والا لڑکا تمہارا دوست معاذ تھا۔ تم نے اپنے موبائل پر اس کی جو تصویریں دکھائی تھیں، اسے دیکھ کر مجھے بھی یہی لگا تھا لیکن ہم اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وہ اپنے گھر بھی واپس نہیں پہنچا ہے بلکہ اس کی فیملی کے حوالے سے ایک اور بری خبر یہ ہے کہ اس کے چھوٹے بھائی کو بھی اغوا کرلیا گیا ہے۔''

''یہ کب اور کیسے ہوا؟'' معظم شاہ کا جواب سن کر عالم شاہ چونکا۔

''صبح کے وقت اس لڑکے کو اسپتال سے کالج جاتے وقت اغوا کیا گیا ہے۔ اس کی فیملی سخت کرائسس میں ہے اور معلوم ہوا ہے کہ والدہ کو صدمے سے ہارٹ اٹیک ہوگیا ہے۔'' معظم شاہ نے اسے معلومات فراہم کیں۔

''ویری سیڈ...... کاش میں ان لوگوں کے لیے کچھ کرپاتا لیکن میں تو خود یہاں معذوروں کی طرح پڑا ہوا ہوں۔'' عالم شاہ نے بے بسی سے ہونٹ کچلے۔

''تم تو اپنی حالت کی وجہ سے مجبور ہو لیکن میں آزاد اور صحت مند ہونے کے باوجود بے بسی محسوس کررہا ہوں۔ منشی عبدالحق اور اس کے خاندان کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا ہے۔ آسیہ حیدرآباد میں جس کالج میں پڑھتی تھی، وہاں سے اس لڑکے ٹونی کے بارے میں بھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دوستی کا اس نے تمہارے سامنے اعتراف کیا تھا لیکن اس نام کے کسی لڑکے کو اس کی کوئی سہیلی یا کالج فیلو نہیں جانتی ہے۔ آسیہ کے افیئر کے بارے میں بھی کسی کو خبر نہیں ہے۔ اب معلوم نہیں کہ آسیہ نے ہی بڑی ہوشیاری سے یہ معاملہ چھپایا ہوا تھا یا اس کی قریبی سہیلیاں دوستی نبھانے کے لیے زبان نہیں کھول رہی ہیں۔ ویسے تو جس طرح وہ لڑکی ہماری ناک کے نیچے ہمیں دھوکا دیتی رہی ہے، اس سے یہی لگتا ہے کہ اس نے اس معاملے میں بھی ہوشیاری سے کام لیا ہوگا۔ منشی عبدالحق کے بیٹی کے ساتھ ملوث ہونے کا تو شک نہیں ہے مجھے لیکن ایک ہلکا سا کلیو ملا ہے جس سے اس کے فرار کی وجہ سمجھ آرہی ہے۔''

''وہ کیا؟'' عالم شاہ نے دلچسپی لی۔

''کھیتوں میں کام کرنے والے ایک لڑکے نے بتایا ہے کہ اس نے منشی کے چھوٹے بیٹے کو خون آلود کلہاڑی نہر میں دھوتے دیکھا تھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون کے چند چھینٹے موجود تھے۔ لڑکے کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دین محمد کی بکریاں آج ایک بار پھر کھیتوں میں گھس کر چرنے لگی تھیں اور اس نے غصے میں ایک بکری پر کلہاڑی سے وار کردیا لیکن معلومات کرنے پر یہ بیان غلط ثابت ہوا ہے اور اس شک کو تقویت مل رہی ہے کہ تم پر پیچھے سے وار کرنے والا آسیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ آسیہ نے کھڑکی سے کود کر تم پر تہمت لگانے کا جو ڈراما رچایا تھا، شاید اس کی وجہ سے وہ جذباتی ہوگیا ہو۔ گمان ہے کہ منشی کے سامنے اس نے اپنی حرکت کا اعتراف کرلیا ہوگا اور منشی نے اس کی جان بچانے کے لیے آناً فاناً غائب ہوجانے کا فیصلہ کرلیا۔ اولاد کی محبت کسی سے وفاداری نبھانے کے مقابلے میں بہرحال زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔'' معظم شاہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ ہوش میں آنے کے اگلے دن عالم شاہ نے آسیہ کے متعلق ہر بات بتادی تھی اور اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ سب ہی نے اس کی بات کو سچ تسلیم کیا تھا اور کسی ایک فرد کی طرف سے بھی یہ شک ظاہر نہیں کیا گیا تھا کہ وہ خود پر سے الزام ہٹانے کے لیے کوئی کہانی گھڑ رہا ہے۔ اپنوں کے اس رویے نے اسے صداقت شاہ کا ابتدائی ردعمل بھلادیا تھا اور اس نے اپنے دل میں تسلیم کرلیا تھا کہ حالات کے مطابق ان کا وہ ردعمل بالکل فطری تھا۔

''آسیہ کے موبائل کا کچھ پتا چلا؟ موبائل مل جاتا تو اس سے کافی مدد مل سکتی تھی۔''

''نہیں۔ موبائل کا بھی کچھ پتا نہیں چلا۔ بہرحال تم فکر نہ کرو، ہماری کوششیں جاری ہیں۔ جلد یا بدیر ہم آسیہ اور دیگر لوگوں تک پہنچ جائیں گے۔'' معظم شاہ نے اسے تسلی دی۔

''بستر پر پڑا ہوا بندہ فکر کرنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے؟ حقیقت میں مجھے اپنے معاملات سے بھی زیادہ معاذ کی فکر ہے۔ اس کا سراغ ملا بھی تو ایسے کہ وہ ایک بار پھر غائب ہوچکا ہے اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ مجھے اس کی خیریت کی طرف سے سخت تشویش ہے۔ آپ بتائیں آشیانۂ آزادی کے مالکان نے کیا بتایا کہ انہوں نے حویلی اور زمین کس کی نگرانی میں دی تھی؟ نگران کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ حویلی میں کون لوگ رہ رہے تھے۔'' وہ ایک بار پھر معاذ کی فکر میں مبتلا ہونے لگا۔

''ان لوگوں سے رابطہ ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ حویلی کو ایک پرانے اور وفادار ملازم کی نگرانی میں چھوڑا گیا تھا۔ وہ ملازم دنیا میں بالکل تنہا تھا اور اس نے خود درخواست

کی تھی کہ جب تک حویلی اور زمین فروخت نہیں ہو جاتی، اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ حویلی کو تو تالا لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور ملازم پچھلے حصے میں ایک چھوٹا سا کوارٹر بنا کر وہاں رہ رہا تھا۔ وہ زمین کے ایک حصے پر سبزیاں وغیرہ اگاتا تھا اور وہاں پہلے سے جو پھل دار درخت لگے تھے، ان کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ ان سبزیوں اور پھلوں وغیرہ کی فروخت پر اس کا گزارہ تھا لیکن اکیلا اور بوڑھا ہونے کی وجہ سے وہ سب کچھ اچھی طرح نہیں سنبھال پا رہا تھا، جب ہی وہاں کی حالت خاصی خراب تھی۔ ملازم کے بارے میں معلوم ہونے پر جب پولیس نے تحقیق کی تو انہیں اسی کے کوارٹر میں اس کی زمین کھود کر دفن کی گئی لاش مل گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ وہاں قابض تھے، انہوں نے پہلے اسے قتل کیا اور پھر دھڑلے سے وہاں رہنے لگے۔'' معظم شاہ نے اسے ایک اور افسوس ناک بات بتائی۔

''ایسی صورت میں مقامی تھانے پر ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ تھانے کے عملے کو علم ہونا چاہیے تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''تھانے والے خود کو بالکل بے قصور ظاہر کر رہے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ ملازم کے بارے میں اطلاع تھی کہ وہ یہ جگہ چھوڑ کر اپنے کچھ عزیزوں کے ہاں منتقل ہونے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے وہ غائب ہوا تو کسی نے تشویش محسوس نہیں کی۔ حویلی میں کسی کے رہائش پذیر ہونے سے پولیس والوں نے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور صرف اتنی بات تسلیم کی ہے کہ انہیں حویلی میں چند بار کچھ لوگوں کی آمد و رفت کا علم ہوا تھا اور تحقیق کرنے پر پتا چلا تھا کہ مالکان حویلی اور ملحقہ زمین بیچنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جائداد کی خریداری کے خواہش مند لوگ اس جگہ کا جائزہ لینے آتے رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بڑے پراپرٹی ڈیلر کا نمائندہ بھی ہوتا تھا لیکن پراپرٹی ڈیلر بالکل انکاری ہے کہ وہ اس پراپرٹی کے معاملے میں انوالو تھا۔ پولیس نے اپنی صرف اتنی غلطی تسلیم کی ہے کہ انہوں نے پراپرٹی ڈیلر سے اس بات کی تصدیق نہیں کی تھی اور خود کو سنائی جانے والی کہانی پر یقین کر لیا تھا۔''

''ہمارے ہاں پولیس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فرائض سے غفلت اور مجرموں کی پشت پناہی ان کا وتیرہ ہے۔'' معظم شاہ کی بات سن کر عالم شاہ نے تبصرہ کیا۔

''تلخ سہی، یہ ایک حقیقت ہے کہ پولیس کے محکمے میں گنتی کے ہی فرض شناس اور ایماندار لوگ موجود ہیں۔'' معظم شاہ نے بھی اس کی تائید کی، پھر موضوعِ گفتگو بدل کر بولا۔

''میری ڈاکٹرز سے بات ہوئی ہے۔ ایک دو دن میں تمہیں ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ میں نے اور پھپھا سائیں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں یہیں شہر والی کوٹھی میں رکھا جائے تاکہ چیک اپ کے لیے اسپتال آنے جانے میں پریشانی نہ ہو۔ سجل تو پہلے ہی یہیں ہے۔ مومل اور پھپھی سائیڑن کو بھی یہیں بلوا لیا جائے گا۔ میں نے سجل کی اسی اسپتال میں رجسٹریشن کروالی ہے۔ میں اسے واپس گاؤں لے جا کر مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہاں خواتین اغوا سے متعلق الٹے سیدھے سوال کر کے اسے ٹینشن میں مبتلا کر دیں گی اور اس حالت میں اس کے لیے مزید اسٹریس ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے پہلے ہی ایک مشکل سچویشن کو بہت بہادری سے فیس کیا ہے۔''

''آپ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ سجل مزاجاً بہادر ہے لیکن ساتھ ہی بے حد حساس بھی ہے۔ اسے ٹینشن سے دور رکھا جائے یہی اس کے لیے بہتر ہوگا۔'' عالم شاہ نے اس کے فیصلے کی تائید کی۔

''اسے یہاں چھوڑ کر میں بے فکری سے گاؤں کے مسائل پر توجہ دے سکوں گا ورنہ بابا سائیں وہاں اکیلے پریشان ہو کر اپنا بی پی ہائی کرتے رہیں گے۔''

''کیا کوئی خاص مسئلہ چل رہا ہے؟'' عالم شاہ اس کی بات پر چونکا۔

''ہاں، مسئلہ تو اہم ہی ہے۔ بابا سائیں نے تاوان کی رقم کی ادائیگی کے لیے لطیف سومرو کو اپنی زمین کا کچھ حصہ فروخت کر دیا تھا۔ لطیف سومرو نے بابا سائیں کو زبان دی تھی کہ وہ چاہیں تو رقم ادا کر کے زمین واپس لے سکتے ہیں لیکن اب وہ اپنی بات سے مکر گیا ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس کی یہ پیشکش صرف تین دن کے لیے تھی۔ اگر تین دن میں بابا سائیں اسے رقم لوٹا دیتے تو وہ زمین واپس کر دیتا لیکن ہم لوگ چونکہ یہاں تمہارے معاملے میں الجھے ہوئے تھے اس لیے تین دن سے زیادہ وقت گزر گیا اور اب لطیف سومرو زمین واپس کرنے پر راضی نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ بابا سائیں کو زمین سے کتنی محبت ہے۔ میری اور سجل کی زندگیوں کی خاطر انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر زمین فروخت کرنا منظور کر لیا تھا لیکن اب وہ دوبارہ اس زمین کے حصول کے لیے بے چین ہیں۔'' معظم شاہ نے اسے حالات سے آگاہ کیا۔

''ماموں سائیں کو لطیف سومرو جیسے گھٹیا اور موقع پرست آدمی سے معاملہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بابا سائیں

نے تو انہیں پیشکش بھی کی تھی کہ جتنی رقم کی ضرورت ہو، وہ ہم سے لے سکتے ہیں۔'' سن کر عالم شاہ نے شکوہ کیا۔

''لطیف سومرو جیسے بندے پر اعتبار کرنے کے مقابلے میں بابا سائیں کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا لیکن تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے بزرگ اپنی روایتوں کے اسیر ہیں۔ بہن کے سسرال یا بہو کے میکے سے قرض لینا شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔'' معظم شاہ خود بیزار محسوس ہو رہا تھا۔

''اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ اصولی طور پر زمین فروخت کرنے کے بعد ماموں سائیں اس کے حق دار نہیں رہے ہیں۔ زور زبردستی کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ معاملات بہت بگڑ جائیں گے۔ نوبت خون خرابے تک بھی پہنچ سکتی ہے۔'' عالم شاہ نے پریشانی کا اظہار کیا۔

''دیکھو کیا ہوتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں ایک بار خود لطیف سومرو سے بات کر کے اسے قائل کرنے کی کوشش کروں۔ ہوسکتا ہے کچھ رقم اوپر دینے کی صورت میں وہ سودا منسوخ کرنے کے لیے تیار ہو جائے ورنہ دوسرا آپشن یہی ہے کہ میں بابا سائیں کو سمجھا بجھا کر زمین پر صبر کر لینے پر آمادہ کرلوں۔ مانا زمین اہم ہے لیکن اس کی خاطر انسانی زندگیوں کو داؤ پر لگانا اور نسلوں کی دشمنی مول لینا میرے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بچہ اس دنیا میں آنکھ کھولے تو اس کے گلے میں دشمنی کا طوق پہلے سے ڈلا ہو۔ وہ خوف کے سائے میں جوان ہو اور سینے میں انتقام کی آگ لے کر جیتا رہے۔ آدمی مرتا ہے تو اسے دو گز سے زیادہ زمین کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم مربعوں کے پیچھے لڑتے پھریں۔'' معظم شاہ پڑھا لکھا جوان تھا اس لیے روشن خیالی کا بھی مالک تھا۔ خاص ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے مزاج میں تھوڑی زمیندارانہ خو تو ضرور تھی لیکن اب جبکہ وہ باپ بننے جا رہا تھا تو سینے میں خود بخود ایک گداز سا پیدا ہو گیا تھا اور ہر اچھے اور سمجھ دار باپ کی طرح وہ اپنے بچے کے لیے دشمنی سے پاک زندگی کا خواہش مند تھا۔

''آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں ادا! واقعی انسانی زندگی باقی ہر شے سے بڑھ کر اہم اور قیمتی ہوتی ہے۔ میرا عزیز دوست لاپتا ہے تو میں خود کو مسلسل اذیت میں محسوس کرتا ہوں۔ خدانخواستہ کسی پیارے کی جان کا نقصان ہو گیا تو پاگل ہی ہو جاؤں گا۔'' عالم شاہ کی معاذ سے دوستی کا دورانیہ طویل نہیں تھا لیکن جذبے میں شدت تھی اس لیے وہ کسی بھی وقت اسے بھول نہیں پاتا تھا۔ اب بھی اسے یاد کر کے اداس ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

☆☆☆

وقاص جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا۔ معاذ ایک بار پھر اپنے دشمنوں کی قید میں پہنچ چکا ہے، یہ احساس اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ فی الحال اسے ایسی کوئی ترکیب بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی کہ معاذ اور اس کے بھائی سعد کو اس قید سے چھڑا لائے۔ وہ پہلے ہی ایک بار شیر کے منہ سے نوالہ چھین کر لانے کی جرأت کر چکا تھا اور اسے معلوم تھا کہ اب اسے یہ موقع نہیں ملے گا۔ پہلی بار وہ لوگ غفلت میں مار کھا گئے تھے لیکن اب وہ ہوشیار تھے اور اس کے پاس معمولی سا بھی کلیو موجود نہیں تھا کہ معاذ اور سعد کو کہاں رکھا گیا ہوگا۔ اس نے اندازہ قائم کرلیا تھا کہ معاذ کو سعد کے حوالے سے بلیک میل کر کے واپس لوٹنے پر مجبور کیا گیا تھا لیکن تشویش ناک بات یہ تھی کہ سعد کی بھی ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ معاذ نے اگر اپنے بھائی کے لیے قربانی دی تھی تو کم از کم اس کے بھائی کو تو اب تک واپس لوٹ آنا چاہیے تھا لیکن وہ بھی ہنوز غائب تھا۔

وقاص کو اس صورتِ حال کی وجہ سے کبھی کبھی معاذ کی جذباتیت پر بھی غصہ آنے لگتا تھا۔ اگر معاذ یوں منہ اٹھا کر چلے جانے کے بجائے اسے اعتماد میں لیتا تو وہ اس معاملے کو کسی اور طریقے سے ہینڈل کرنے کی کوشش کرتا لیکن معاذ نے اسے کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں دیا تھا جس کی وجہ سے وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے کچھ لوگوں کی ڈیوٹی ضرور لگا دی تھی کہ یزدانی اور عرفان اللہ کے خاص خاص لوگوں پر نظر رکھیں لیکن ابھی تک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اسے زیادہ امید بھی نہیں تھی۔ وہ تجربے کار لوگ تھے اور اتنی آسانی سے انہیں ٹریس کرنا ممکن نہیں تھا۔ پہلی بار وہ ان کی غفلت اور اتفاقات کی وجہ سے کامیاب ہو گیا تھا لیکن اب وہ لوگ ہوشیار تھے اور اسے ان کی صفوں میں گھس کر معاذ اور سعد کا پتا لگانا تھا۔ راستہ وہ اب بھی نکال لیتا لیکن اس میں کافی وقت لگ سکتا تھا اور اسے اندازہ نہیں تھا کہ معاذ اور سعد کے لیے خطرے کا تناسب کتنے فیصد ہے اور انہیں کتنے عرصے کے لیے مہلت حاصل ہوگی۔ وہ خود کو اس معاملے سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جب بھی اس نہج پر سوچنے کی کوشش کرتا، دوروئی روئی سی متورم آنکھیں اس کے خیال کے پردے پر لہرا جاتیں اور اس کا دل ان آنکھوں کی نمی دور کرنے کے لیے بے چین ہو جاتا۔

''وکی بھائی! لالہ عیسیٰ کی کال تھی۔ بولتے ہیں آپ کو

کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن آپ کال ہی ریسیو نہیں کر رہے۔'' وہ سوچوں میں گم جانے کتنی دیر تک یونہی ٹہلتا رہتا کہ ایک لڑکے نے آکر اسے اطلاع دی۔

''اوہ! میرا فون شاید سائلنٹ پر ہے۔'' اس نے ایک تپائی پر پڑے اپنے موبائل پر نظر ڈالی اور تیزی سے آگے بڑھ کر موبائل اٹھالیا۔ اس پر لالہ عیسیٰ کی تین مسڈ کالز موجود تھیں۔ اس نے فوراً کال بیک کی۔

''کدھر ہے وکی! میں کب سے تجھے کال کر رہا ہوں۔ تیرے کو فوراً ادھر میرے پاس آنے کا ہے۔''

''ٹھیک ہے لالہ!'' لالہ عیسیٰ کا حکم ملتے ہی اس نے بنا کوئی سوال کیے صاد کیا اور اسی وقت لالہ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر ہی وہ لالہ کے روبرو بیٹھا تھا۔

''تیرا سب سامان ادھر ہی پڑا ہے نا؟ مراد سے بول کر اپنی پیکنگ کروالے۔ تیرے کو آج رات ہی دبئی جانے کا ہے۔ ادھر کچھ لفڑا پڑ گیا ہے۔ تیرے کو ہی جا کر سنبھالنے کا ہے۔'' لالہ کے حکم نے اسے سٹپٹا کر رکھ دیا۔

''آج..... آج رات ہی جانا ہے؟''

''ہاں، بولا نا کہ لفڑا ہے۔ ایمرجنسی میں جانے کا ہے۔ تیرے کو جانے میں کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' لالہ نے اپنی سرخ آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کثرت سے شراب نوشی کرتا تھا لیکن وقاص نے اسے پی کر بہکا ہوا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس اس کی سرخ متورم آنکھیں ہی اس کے نشے میں ہونے کی گواہی دیتی تھیں اور یہ نگاہیں ایسی رعب دار تھیں کہ سامنے والا اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کر پاتا تھا۔ وقاص کے لیے بھی اس کے حکم سے انکار ممکن نہیں تھا، اس لیے آہستہ سے بولا۔

''جانے میں کوئی مسئلہ نہیں ہے پر ادھر تھوڑا سا مسئلہ چل رہا ہے۔ میرا یار موسیٰ اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ تھوڑا سا اس کی سیکیورٹی کا پرابلم ہے۔''

''تیرا یار ہے تو اپنا بھی بچہ ہے۔ جتنے آدمی چاہے لگا دے اس کی سیکیورٹی پر۔ علاج وغیرہ کا بھی جو تو بولے گا سب بندوبست ہوتا رہے گا۔ اس کے علاوہ کوئی بات ہے تو بول۔''

لالہ عیسیٰ نے ایک طرح سے بات ہی ختم کردی۔ لالہ سے معاذ والا مسئلہ اس نے خود ہی نہیں بیان کیا کہ لالہ اس کے خدائی فوجدار بننے کی عادت سے بیزار رہتا تھا اور اسے سمجھاتا رہتا تھا کہ ہم لوگوں کی زندگیاں ویسے ہی ہر وقت خطرے میں رہتی ہیں اور تو اپنی عادت کی وجہ سے اپنے لیے خطرے کو کئی گنا بڑھائے رکھتا ہے۔

''ٹھیک ہے، تو پھر میں تیاری کرتا ہوں لیکن پہلے مجھے یہ تو بتادو کہ مسئلہ کیا ہے؟'' چاروناچار اس نے ہامی بھرلی۔ معاذ والے معاملے میں اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ فوری طور پر معاذ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر ان لوگوں کو معاذ کی جان ہی لینی ہوتی تو اتنے دن اسے اپنے پاس قید میں رکھنے کا رسک نہیں لیتے اور فوری طور پر اس کا کام تمام کردیتے۔ وہ براہِ راست چڑھائی کر کے ان سے معاذ کو نہیں چھڑوا سکتا تھا۔ ان کے پاس لاتعداد ظاہر اور خفیہ ٹھکانے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ معاذ کہاں ہوگا۔ اسے معاذ کا پتا معلوم کرنے کے لیے کوئی ترکیب لڑانی تھی اور ظاہر ہے اس کے لیے وقت درکار تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ معاذ کی کھوج کا کام کسی کے سپرد کر جائے گا اور دبئی والا کام جلد از جلد نمٹا کر معاذ کے معاملے کو پوری توجہ سے دیکھے گا۔ ادھر لالہ عیسیٰ اسے اس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔

''مسئلہ بڑا ہے، پر تیرے لیے مشکل نہیں۔ اپنے کو معلوم ہے تو ہینڈل کرلے گا۔'' لالہ اسے مسئلہ بتا رہا تھا اور وہ ذہن سے ہر پریشانی جھٹک کر پوری توجہ سے اس کی بات سننے میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس کی یہی خوبی اس کی کامیابی کی ضمانت تھی۔

☆☆☆

بستر پر لیٹے معاذ نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور کچھ دیر اپنی جگہ لیٹے لیٹے ہی خالی خالی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ ایک عام سی سجاوٹ والا کمرا تھا جس میں ایک طرف سیاہ رنگ کا ریگزین کا ٹوسیٹر صوفہ پڑا تھا۔ صوفے کے سامنے چھوٹی سی کافی ٹیبل تھی اور مقابل دیوار پر بتیس انچ کا ایل ای ڈی ٹی وی نصب تھا۔ مختصر سے ساز وسامان والے بارہ بائی بارہ کے اس کمرے میں وہ ایک سنگل بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ آنکھ کھلنے کے کچھ دیر بعد اس کی یادداشت نے کام کرنا شروع کیا تو اسے یاد آیا کہ وہ یہاں تک کیسے پہنچا تھا۔ اس نے ٹیلی ویژن پر سعد کے اغوا کی خبر دیکھی تھی اور موٹر سائیکل کے مرر پر لکھے ''معاذ! کم بیک'' کے الفاظ سے جان لیا تھا کہ سعد کا اغوا صرف اور صرف اس کی واپسی کے لیے کیا گیا ہے۔ جب تک وہ اپنے صیاد کے پاس واپس نہیں جائے گا، سعد کی آزادی ممکن نہیں ہوگی اور پھر اس نے اپنے قفس میں واپس لوٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اپنے

آپ کو بچانے کے لیے وہ اپنے بھائی کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ واپسی کے علاوہ کوئی بھی دوسری راہ اختیار کرنے میں سعد کے لیے بہت زیادہ رسک تھا۔ اگر وہ وقاص سے مدد طلب کرتا اور اس کی مدد سے سعد کی بازیابی کے لیے کوشش کرتا تو ضروری نہیں تھا کہ اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو جاتی۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں سے مدد طلب کرنا اس سے بھی بڑی حماقت تھی، چنانچہ اس نے قربانی دینے کا فیصلہ کرلیا اور وقاص کے گارڈز کو چکما دے کر اس کے اپارٹمنٹ سے نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک ٹیکسی رکوائی اور اس میں بیٹھ کر یزدانی بلڈرز کے ایک آفس تک جا پہنچا۔ اس وقت آفس میں یزدانی خود اپنے بیٹے کامران عرف کامی کے ساتھ موجود تھا۔ معاذ کو دیکھ کر باپ بیٹے دونوں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ کامی نے تو فوراً پسٹل نکال کر اس کے اوپر تان لیا۔ اسے دیکھ کر آفس میں موجود گارڈ نے بھی اپنی گن سے اس کا نشانہ لے لیا لیکن اس نے کسی خوف کا مظاہرہ نہیں کیا اور اطمینان سے بولا۔

''میرے پاس رقم موجود نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ پہلے آپ لوگ باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے فارغ کردیں۔ میں خود چل کر یہاں آیا ہوں تو اس کا مطلب ہے میں یہاں سے بھاگنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔'' اس کی بات کو سب سے پہلے یزدانی نے سمجھا اور گارڈ کو بھیج کر ٹیکسی والے کو ادائیگی کروادی۔

''میرا بھائی کہاں ہے؟ تم لوگوں کا پیغام ملتے ہی میں واپس آگیا ہوں۔ اب تم میرے بھائی کو آزاد کردو۔'' گارڈ کے باہر جاتے ہی معاذ نے یزدانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے یہ بات کہی تھی۔

''تمہارے بھائی کو میں نے اغوا نہیں کروایا ہے اور نہ ہی میں نے تم کو کوئی دھمکی آمیز پیغام دیا تھا۔'' یزدانی نے اس کی بات کے جواب میں کہا اور معاذ کے پیچھے کھڑے گارڈ کو کوئی اشارہ کیا۔ اس کا اشارہ پاکر گارڈ نے معاذ کی، جو کہ ابھی تک کھڑا ہوا ہی تھا، جامہ تلاشی لینا شروع کردی۔ معاذ کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ گارڈ کو کچھ نہیں ملا تو اس نے یزدانی کو اس کے کلیئر ہونے کی اطلاع دے دی۔ شاید وہ لوگ ڈر رہے تھے کہ معاذ کے پاس کوئی ہتھیار یا خفیہ آلہ تو موجود نہیں تھا جس کی مدد سے وہ یہاں ہونے والی گفتگو کہیں پہنچا رہا ہو لیکن کچھ ہوتا تو ملتا۔ وہ تو اپنا آپ داؤ پر لگا کر اپنے بھائی کے لیے آزادی لینے آیا تھا اور یہاں یزدانی سرے سے ہر بات سے انکاری تھا۔ جامہ تلاشی مکمل ہونے تک اس نے صبر سے کام لیا، پھر غصے سے چیخ کر بولا۔

''میرے ساتھ کیم نہیں کھیلو، یزدانی! میں صرف اپنے بھائی کی خاطر یہاں آیا ہوں۔ مجھے میرا بھائی نہیں ملا تو تم اور تمہارے بیٹے سمیت میں اس پورے دفتر کو آگ لگادوں گا۔''

''ابھی تو تُو اپنی خیر منا سالے۔ تُو اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں، ہمارے دفتر میں کھڑا ہے اور ہمیں ہی دھمکی دے رہا ہے۔'' ہتھیاروں اور گارڈ کی موجودگی کے باعث کامران یزدانی کو طاقت کا توازن اپنے حق میں محسوس ہو رہا تھا اس لیے اس نے بھڑکنے میں دیر نہیں لگائی۔

''باپ کے چیلوں کے زعم میں اتنا نہ پھڑکو۔ میں دو منٹ کے اندر اندر تمہیں خاک چاٹنے پر مجبور کرسکتا ہوں لیکن میں تم جیسے بندے کے منہ لگنا ہی نہیں چاہتا۔ میں تمہارے باپ سے بات کرنے آیا ہوں۔'' اس نے کامران کی طرف حقارت اور تمسخر کی نظر ڈال کر کہا اور پھر اپنا رخ یزدانی کی طرف کرلیا۔ اس کے الفاظ اور انداز پر کامران کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا تھا لیکن یزدانی کی نظروں میں دلچسپی تھی۔ اس نے زبان کھولی تو لہجے میں ستائش بھی جھلکی۔ مسکرا کر بولا۔

''مان لیا کہ تمہارے اندر دم ہے۔ دم نہ ہوتا تو ہم سے تمہاری زندگی کا سودا ہی کیونکر کیا جاتا۔ بہرحال تم آرام سے بیٹھو۔ میں اس پارٹی کو اطلاع کردیتا ہوں جو تمہارے لیے پاگل ہوئی جارہی ہے۔'' اس نے اپنی میز کے گرد رکھی کرسیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا اور خود اپنے سیل فون پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ کال ریسیو ہوتے ہی چہک کر بولا۔

''آپ کی ترکیب کامیاب رہی میڈم۔ پنچھی لوٹ کر پنجرے میں واپس آگیا ہے۔'' اس کی اس اطلاع کے جواب میں دوسری طرف سے کچھ کہا جانے لگا جسے اس نے غور سے سنا اور پھر فون بند کر کے معاذ سے مخاطب ہوا۔

''تھوڑی دیر میں تمہارے اصل میزبان یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت تک ہمیں خدمت کا موقع دو۔ ایک پیالی چائے پینے میں زیادہ وقت تو نہیں لگتا۔''

''ٹھیک ہے۔'' معاذ اعصابی کشیدگی کا شکار تھا چنانچہ یزدانی کی طنزیہ اور منافقانہ گفتگو کے باوجود اس کی پیشکش قبول کرلی۔ تھوڑی دیر میں ہی چائے آگئی۔ چائے سب کے لیے ہی تھی لیکن تین چوتھائی کپ خالی کرنے کے بعد اسے چکر آنا شروع ہوئے تو اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے لیے کوئی اسپیشل چائے لائی گئی تھی۔ اسپیشل چائے نے اپنا اثر

دکھایا اور تھوڑی دیر میں ہی وہ آنکھیں بند کر کے ہر طرف سے غافل ہو گیا۔ غفلت کی حالت میں کتنی دیر گزری، اسے اندازہ نہیں تھا۔ آنکھ دوبارہ کھلنے کے بعد اس نے خود کو یزدانی کے دفتر کے بجائے اس کمرے میں پایا اور ہر بات یاد آجانے پر اپنی جگہ سے فوراً کھڑا ہو گیا۔ کمرے کے فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ دبیز قالین پر ننگے پیر چلتا ہوا وہ دروازے تک گیا اور اس کے ہینڈل پر دباؤ ڈالا۔ حیرت انگیز طور پر بالکل خلاف توقع دباؤ ڈالنے سے دروازہ کھل گیا۔ دروازے کے یوں کھل جانے سے وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ آیا باہر جائے یا نہیں۔ ایک پل کے تذبذب کے بعد وہ دروازہ بند کر کے واپس پلٹ گیا اور صوفے پر جا بیٹھا۔ باہر نکلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اپنی مرضی سے قید میں آیا تھا اور اسے یہاں سے کہیں نہیں جانا تھا۔ یہ بات اس کا صیاد بھی سمجھتا تھا اس لیے اس کے کمرے کا دروازہ لاک نہیں کیا گیا تھا۔

''گڈ مارننگ معاذ! اٹھ گئے ہو تو فریش ہو جاؤ اور ناشتا وغیرہ کر کے فارغ ہو لو پھر میں تم سے تفصیلی بات کرتی ہوں۔'' اسے صوفے پر بیٹھے ہوئے ایک منٹ ہی گزرا ہو گا کہ کمرے میں وہی نسوانی آواز گونجی جو پہلی بار قید کے دوران بھی وہ سن چکا تھا۔

''میرا بھائی.....'' اس نے ہدایات کو نظر انداز کر کے سعد کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

''حکم ماننے کی عادت ڈالو معاذ! جتنا اتھرا گھوڑا ہو، اسے سدھانے کے لیے اتنی ہی مار لگانی پڑتی ہے۔ مجھے تمہیں تکلیف دیتے ہوئے اچھا نہیں لگتا۔'' نرم لوچ دار نسوانی آواز میں عجیب سی سرد مہری گھل مل گئی۔ معاذ کو مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ حسبِ ہدایت ملحقہ باتھ روم سے فریش ہو کر آیا تو پانچ منٹ میں ہی ایک ملازم صورت شخص ناشتے کے لوازمات سے بھری ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر لے آیا۔ معاذ نے پچھلی صبح ہلکا سا ناشتا لیا تھا اور اس وقت سے اب تک اس کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تھا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے ناشتے کا آغاز کیا تو آہستہ آہستہ کافی کچھ اس کے پیٹ میں منتقل ہو گیا۔ آخر میں اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی ہی تھی کہ اپنے حلیے ہی سے ڈاکٹر نظر آنے والا ایک شخص اندر داخل ہوا۔

''ہیلو مسٹر معاذ! آپ کیسا فیل کر رہے ہیں؟'' ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔ معاذ کوئی جواب دیے بغیر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''آپ کی صحت کا خیال رکھنے کی رسپانسبلٹی اب میرے پاس ہے۔ آپ کی بے ہوشی کے دوران بھی میں آپ کو ٹریٹمنٹ دیتا رہا ہوں۔ زخموں کو سکھانے والی اینٹی بائیوٹکس کے علاوہ میں نے آپ کو ایسے انجکشن بھی لگائے تھے جو خوراک کی کمی کو کور کر سکیں۔ امید ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد آپ کو ویک نیس فیل نہیں ہوئی ہو گی۔'' ڈاکٹر نے دوستانہ انداز میں بتایا تو اسے سمجھ آئی کہ تقریباً بیس بائیس گھنٹے بے ہوش رہنے کے باوجود اسے نقاہت کیوں محسوس نہیں ہو رہی تھی اور پیٹ کے خالی پن کے باوجود وہ خود کو چست محسوس کر رہا تھا۔ زخم بھی پہلے سے بہت اچھی حالت میں تھے۔ یعنی دورانِ بے ہوشی اس کا بھرپور خیال رکھا گیا تھا۔ (قربانی کے اس جانور کی طرح جسے ذبح کرنے سے پہلے مالک پیار سے خوب کھلاتا پلاتا اور خدمت کرتا ہے)۔

''آپ چائے ختم کر لیں تو میں آپ کا چیک اپ کر لیتا ہوں۔'' ڈاکٹر بولتے ہوئے سنگل بیڈ پر ٹک چکا تھا۔ معاذ نے چائے ختم کر کے کپ رکھا تو ملازم ٹرالی لے کر باہر نکل گیا۔ ملازم کے نکلتے ہی ڈاکٹر نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی اور اس کے زخموں کا معائنہ کرنے کے علاوہ بی پی وغیرہ بھی چیک کیا۔

''اب آپ پہلے سے مزید بہتر حالت میں ہیں۔ میں کھانے کے لیے اینٹی بائیوٹکس کے علاوہ فوڈ سپلیمنٹ بھی دے رہا ہوں۔ دو تین دن میں آپ خود کو بالکل فٹ محسوس کریں گے۔'' اس نے اپنے میڈیکل باکس میں سے کچھ دواؤں کے پتے نکال کر اس کے حوالے کیے اور ہدایات دینے کے بعد مصافحہ کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ معاذ نے اس کی حسبِ ہدایات دوائیں بھی حلق سے اتار لیں تو کمرے کے کسی حصے میں موجود اسپیکر جاگ اٹھا۔

''ویٹس لائنگ آگڈ بوائے۔ تم اسی طرح ہماری ہر بات مانتے رہے تو کوئی نقصان نہیں اٹھاؤ گے۔''

''میرا بھائی کہاں ہے؟ میں تم لوگوں کے پاس آ گیا ہوں اس لیے تمہیں چاہیے کہ فوری طور پر اسے چھوڑ دو۔'' معاذ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا اور اس نے ترش لہجے میں مطالبہ کیا۔

''صبر ڈیئر! تھوڑا سا صبر کرو۔ تمہیں یہاں تک لانا ہماری پہلی کامیابی ضرور ہے لیکن ابھی ہمیں تم سے بہت سے کام لینے ہیں اور ان کاموں کے لیے ہمیں تمہاری فرمانبرداری کا یقین ہونا چاہیے۔'' بولنے والی کا انداز معنی

خیز تھا۔

''تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''اپنے آپ کو مکمل طور پر ہماری غلامی میں دینا ہوگا۔'' اس کے سوال کے جواب میں بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا گیا۔

''اگر میں زبان سے ہاں کہہ دوں تو کیا تمہیں یقین آجائے گا؟'' معاذ نے دریافت کیا۔

''ہمیں یقین دلانے کے لیے تمہیں آزمائش سے گزرنا ہوگا۔''

''کیسی آزمائش؟'' اس نے جاننا چاہا۔

''فی الحال تو تم مجھے میرے چند سوالوں کے جوابات دو۔ نمبر ایک، کیرتھر پر تمہاری جان کیسے بچی؟ نمبر دو، ڈاکوؤں کی قید سے نکلنے کے لیے تم نے جو تدبیر اختیار کی اس کے پیچھے کیا راز تھا؟ نمبر تین، تمہیں ہمارے دوستوں کی قید سے فرار کروانے والا کون تھا؟ تم وہاں سے نکلنے کے بعد کہاں اور کس کی پناہ میں رہے؟'' سوالات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں حد درجے سنجیدگی تھی۔ وہ بھی سنجیدگی سے اس کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے بولا۔

''کیرتھر پر مجھے میری خوش قسمتی نے بچایا اور میں ایک قبیلے کے لوگوں کی نظر میں آگیا۔ انہوں نے مجھے اپنے ٹھکانے پر پناہ دی اور میرا علاج کیا۔ واپسی میں قبیلے کے سردار نے مجھے کچھ انوکھے تحائف دے کر رخصت کیا لیکن میں اپنے گھر پہنچنے سے قبل ہی ڈاکوؤں کے ہتھے لگ گیا۔ قید کے دوران اپنی اور اپنے ساتھی قیدیوں کی جان بچانے کے لیے میں نے سردار کے دیے تحائف کو آزمانے کا فیصلہ کیا اور ایک پڑیا میں موجود ایسا سفوف استعمال کرڈالا جس کے استعمال سے آدمی زندہ ہونے کے باوجود مُردہ محسوس ہوتا ہے۔ ڈاکو دھوکے میں مارکھا گئے اور میں اپنے ساتھ موجود قیدی میاں بیوی کو اتفاقاً ناریل توڑنے کے لیے وہاں چلے آنے والے ایک لڑکے کی بائیک پر فرار کروانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے فرار کا کوئی انتظام کرپاتا، ڈاکوؤں کے باقی ساتھی پہنچ گئے اور میں دھرلیا گیا۔ بائیک کا مالک لڑکا تجسس کے باعث وہیں چھپا رہا اور پھر بعد میں اسی نے کوئی ترکیب لڑا کر مجھے قید سے آزاد کروا کر اپنے پاس پناہ دی۔''

''وہ لڑکا کون تھا؟ میں اس لڑکے کے بارے میں تفصیل سے جاننا چاہتی ہوں۔'' اس سے گمبھیر لہجے میں سوال کیا گیا۔

''وہ کوئی اجنبی لڑکا تھا، میں خود بھی اس سے واقف نہیں تھا۔'' معاذ نے اس سوال کے جواب سے پہلو بچانے کی کوشش کی۔ وقاص کا نام لے کر وہ اسے مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

''تمہیں اس لڑکے کے بارے میں بتانا ہوگا معاذ! میں اس بات کو نہیں مان سکتی کہ کوئی اتنے دن تک تمہاری مدد کرتا رہا، تمہارا علاج کرواتا رہا اور تمہارا اس سے تعارف ہی نہیں ہوسکا۔''

''اس نے تعارف کروانے سے انکار کردیا تھا اور میں زیادہ اصرار اس لیے نہیں کرسکتا تھا کہ مجھے مدد کی ضرورت تھی۔'' معاذ نے بہانہ بنایا۔

''اس جگہ کا ایڈریس بتاؤ جہاں تم رہ رہے تھے؟'' اس بار سوال کرتے ہوئے اس کے لہجے میں سختی تھی۔

''ایڈریس مجھے یاد نہیں۔ وہ ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ تھی جہاں مجھے نظر بندی کی سی حالت میں رکھا گیا تھا۔ ٹیلی ویژن پر سعد کے اغوا کی خبر دیکھ کر میں چپکے سے وہاں سے نکلا تھا اور جلدی اور گھبراہٹ میں دھیان نہیں دے سکا تھا کہ وہ کون سی جگہ تھی۔'' اس نے اس بار بھی پہلو بچالیا۔

''تم ہمارے ساتھ تعاون نہیں کررہے ہو معاذ! اور یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہے۔ ہمیں اس شخص کے بارے میں لازمی جاننا ہے۔ بائیک کے ذریعے بھی ہم نے اس کا کھوج لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بائیک ایک پینسٹھ سالہ آدمی کی ملکیت نکلی جس نے دو دن قبل اپنی بائیک کی چوری کی رپورٹ بھی لکھوائی تھی۔ اب صرف تم واحد شخص ہو جو ہمیں اس لڑکے کے بارے میں بتاسکتے ہو جس نے اتنی بڑی کارروائی اتنی آسانی سے کرڈالی۔ یقیناً ایسی کارروائی کرنے والا کوئی عام سا لڑکا نہیں ہوگا۔'' وہ اپنے سوال کے جواب کے لیے بضد تھی۔

''یقیناً ایسا ہی ہوگا لیکن میں بتاچکا ہوں کہ اس نے مجھ سے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا، نہ ہی وہ کوئی مشہور و معروف شخصیت تھا کہ میں پہلے ہی سے اس سے واقف ہوتا۔'' وقاص کا نام لے کر وہ محسن کشی کا مرتکب نہیں ہوسکتا تھا اس لیے اپنی بات پر قائم رہا۔

''ٹھیک ہے معاذ! یہ تمہاری اپنی چوائس ہے کہ ہم تمہاری وفاداری خریدنے کے لیے وہ طریقہ کار اختیار کریں جو یقیناً تمہارے لیے تکلیف دہ ہوگا۔'' نہایت سنگین لہجے میں کہہ کر وہ خاموش ہوگئی تو معاذ نے اپنے اندر بے چینی سی محسوس کی۔

"پلیز میری بات سنو۔ مجھے واقعی نہیں معلوم کہ وہ لڑکا کون تھا؟" بے قراری سے اسے پکارتا وہ اسے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ معاذ نے ایک دو بار اور کوشش کی لیکن دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔ اس خاموشی کا کیا نتیجہ ہوگا، اپنے طور پر اندازے لگانے کی کوشش کرتا ہوا وہ شدید بے قراری اور الجھن کا شکار ہو چکا تھا۔ سعد کے ان لوگوں کی قید میں ہونے کی وجہ سے وہ خود کو بے حد بے بس محسوس کر رہا تھا لیکن اپنے بھائی کی خاطر وقاص کا نام افشا کر دینا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وقاص نے صرف انسانی ہمدردی کے ناتے اس کی اتنی مدد کی تھی۔ وہ اس کا نام افشا کر دیتا تو یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہوتی۔ تذبذب، الجھن، کشمکش اور اندیشوں میں گرفتار وہ چیونٹی کی رفتار سے گزرتے وقت کو بتانے لگا۔ کئی بار پکار کر دیکھا کہ کوئی جواب آجائے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ تین چار بار دروازے تک جا کر واپس لوٹ آیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کی ایک ایک جنبش کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ وہ کوئی بھی غلط قدم اٹھا کر ان لوگوں کو طیش دلانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ سعد کی صورت میں اس کی بہت بڑی کمزوری ان کے ہاتھ میں تھی اور سعد کی خاطر اسے بہت صبر اور ضبط سے کام لینا تھا۔ اللہ اللہ کر کے دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو ملازم ٹرالی سمیت نمودار ہوا۔

"میں تمہاری میڈم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" کھانے کی طرف نظر ڈالے بغیر اس نے ملازم سے مطالبہ کیا۔

"میڈم جب چاہیں گی خود بات کر لیں گی۔ میں طے شدہ شیڈول پر عمل کرنے کے سوا کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔" ملازم نے سپاٹ سے لہجے میں اسے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم یہ کھانا لے جاؤ۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔" معاذ نے بیزاری سے ٹرالی کی طرف اشارہ کیا۔

"کھانے اور دوا سے انکار کو بھی حکم عدولی تصور کیا جائے گا۔" ملازم نے اسے آگاہ کیا تو پہلے اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھا پھر آہستہ آہستہ ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اپنے غصے کا اظہار کرتا۔ حکم کی تعمیل کے طور پر کھانا زہر مار کر کے دوائیں لیں اور کلی کرنے کے خیال سے واش روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو دیوار پر نصب ایل ای ڈی ٹی وی آن تھا۔ اپنی پریشانی میں اسے ایک بار بھی ٹی وی آن کر کے دیکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ ملازم کھانے کی ٹرالی واپس لے جاتے ہوئے شاید اسے آن کر گیا تھا، لیکن کیوں؟ فوراً ہی اس کے ذہن میں سوال ابھرا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ملازم نے اس سے کہا تھا کہ وہ طے شدہ شیڈول پر عمل کرنے کے علاوہ کسی بات کا اختیار نہیں رکھتا۔ ٹی وی آن کیے جانے کی وجہ جاننے کے لیے وہ اسکرین کے سامنے جا بیٹھا۔ اسکرین پر فی الحال کوئی خاص منظر موجود نہیں تھا اور یوں ہی نیلی، پیلی، ہری روشنیوں سے مختلف ڈیزائن بنتے بگڑتے دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک ہی یہ سلسلہ بند ہو گیا اور ایک ایسے کمرے کا منظر دکھائی دینے لگا جو اپنے ساز و سامان سے کسی اسپتال کا آپریشن تھیٹر معلوم ہو رہا تھا۔ سامان پر سے کیمرا گھومتا ہوا آپریشن ٹیبل پر آ کر رکا اور وہاں لیٹا ہوا انسانی وجود دکھائی دینے لگا۔ کیمرے نے صرف دھڑ کو فوکس کیا ہوا تھا اور چہرہ بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا اس لیے وہ صرف یہ اندازہ لگا سکا کہ وہ صاف رنگت کا مالک کوئی مرد ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے منظر میں دو مزید افراد شامل ہو گئے۔ ان دونوں افراد نے آپریشن تھیٹر میں استعمال ہونے والا مخصوص سبز لباس پہن رکھا تھا۔ ان کے سروں پر مخصوص کیپ، ہاتھوں میں دستانے اور چہرے پر ماسک موجود تھے اور وہ قطعی طور پر شناخت نہیں کیے جا سکتے تھے، البتہ حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ وہ پروفیشنل لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک نے آپریشن ٹیبل پر پڑے شخص کے پیٹ پر کوئی جراثیم کش دوا ملی، پھر دوسرا قدرے دراز قد شخص حرکت میں آیا اور تیز دھار آلے سے بے ہوش پڑے شخص کے پیٹ پر کٹ لگایا۔ فوراً ہی خون کا اخراج شروع ہو گیا لیکن دراز قد شخص نے اپنا کام جاری رکھا۔ اس کے ساتھ موجود شخص اس کی معاونت کرتا رہا اور کاٹن گاز کو اس طرح بے ہوش شخص کے پیٹ کے اطراف ترتیب سے رکھ دیا کہ خارج ہونے والا خون اِدھر اُدھر نہ پھیل سکے۔ پیٹ پر بڑا سا عمودی کٹ لگانے والے سرجن نے پیٹ کی جلد کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر اس طرح دائیں بائیں کیا جیسے کسی تکیے کا غلاف اتار رہا ہو۔ جلد کے سمت جانے سے پیٹ میں بڑا سا شگاف بن گیا تھا اور اس میں سے مختلف اعضا دکھائی دے رہے تھے۔

سرجن نے اپنی کارروائی جاری رکھی اور بالکل سامنے نظر آنے والے نظامِ ہاضمہ کے اعضا کو ایک طرف کر کے اپنے آلات کی مدد سے باڈ کر [illegible] کوئی کارروائی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ موجود شخص اس کی بھرپور معاونت کر رہا تھا اور اس کے اشارے پر اسے مختلف آلات پکڑاتا

جارہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس قصائی نما سرجن نے پیٹ کے شگاف میں سے خون میں بھرا ایک لوتھڑا سا باہر آمد کرلیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھتے معاذ کو شناخت کرنے میں دیر نہیں لگی کہ پیٹ چیر کر نکالا گیا وہ عضو ایک انسانی گردہ تھا۔ گردہ کیوں نکالا گیا تھا؟ یہ سوال تو اپنی جگہ تھا لیکن اسے حیرت اس بات پر تھی کہ گردے کے آپریشن کے لیے یہ کون سا طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور اتنے نازک آپریشن کو صرف دو افراد کیوں ہینڈل کررہے تھے؟ سب سے بڑی بات اسے یہ آپریشن کیوں دکھایا جارہا تھا؟ اپنے اس آخری کیوں کا جواب حاصل کرنے کے لیے اسے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔ گردہ نکالے جاتے ہی کیمرا حرکت میں آیا اور پیٹ پر سے ہٹ کر اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ اب اسے بے ہوش شخص کے سینے کے علاوہ دونوں ہاتھ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ہاتھ پر بلڈ پریشر وغیرہ کی مانیٹرنگ کرنے والے آلات نصب تھے جبکہ دوسرے ہاتھ میں پیوست کینولا سے ڈرپ منسلک تھی۔ کینولا والے ہاتھ کو کیمرے نے ذرا قریب سے فوکس کیا تو کلائی سے ذرا اوپر موجود کراس کا گہرا نشان دیکھ کر معاذ بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں ایک بار سعد کے ہاتھ پر بہت گہرا زخم لگ گیا تھا اور ڈاکٹر کو خون روکنے کے لیے اس زخم پر ٹانکے لگانے پڑے تھے۔ ٹانکے کچھ ایسی ترتیب سے لگے تھے کہ سعد کے ہاتھ پر کراس کا انمٹ نشان بن گیا تھا اور اب وہ اسکرین پر نظر آتے تختۂ مشق بنے انسان کے ہاتھ پر بھی وہی نشان دیکھ رہا تھا۔

''سعد.....'' اس کے ہونٹوں نے بے یقینی کے عالم میں سرگوشی سی کی ہی تھی کہ کیمرا ہاتھ پر سے ہٹ کر یکدم چہرے پر پہنچ گیا۔ منہ پر آکسیجن ماسک لگا تھا اور بالوں کو کور کرنے کے لیے لگائی گئی مخصوص کیپ نے ماتھے کا بھی ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا، اس کے باوجود یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے پیارے بھائی سعد کو شناخت نہیں کرپاتا۔ آنکھیں بند کیے دنیا و مافیہا سے بے خبر آپریشن ٹیبل پر لیٹا ہوا وہ شخص اس کا عزیز از جان بھائی سعد تھا۔ یہ جان کر اس کے سینے میں کوئی تیر سا پیوست ہوگیا تھا اور وہ اتنی بری طرح تڑپا تھا کہ اسے لگا تھا اس کے جسم سے جان ہی نکل جائے گی۔

''آرام سے اپنی جگہ بیٹھ جاؤ معاذ! ابھی تم نے جو کچھ دیکھا وہ صرف ایک ٹریلر تھا۔ اس کے آگے تم جو کچھ دیکھو گے، وہ تمہیں تمہارے قدموں پر کھڑا نہیں رہنے دے گا۔'' اچانک ہی اسپیکر سے سرد مہر آواز ابھری اور اسے ہدایت دی۔

''یو..... بچ..... یہ تم میرے بھائی کے ساتھ کیا کررہی ہو؟ یاد رکھو کہ تمہیں اس کا شدید خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔'' آواز سن کر معاذ آپے سے باہر ہوگیا اور زندگی میں پہلی بار کسی عورت کے لیے گالی استعمال کرتے ہوئے بلند آواز میں دہاڑا۔

''زبان کو قابو میں رکھو معاذ! تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں تمہاری پہنچ سے بہت دور ہوں لیکن تمہارا بھائی میرے رحم و کرم پر ہے۔ میرے ایک اشارے پر اس کا ایک ایک عضو اس کے جسم سے الگ کردیا جائے گا۔ صحت مند جوان جسم سے نکلے اعضا کی مارکیٹ میں بڑی مانگ ہے۔ ہم ٹکڑوں میں تمہارا پورا بھائی بیچ ڈالیں گے اور تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے، اس لیے دھمکیاں دینے کے بجائے یہ سوچو کہ تم ہم سے اپنا بھائی صحیح سالم حالت میں کیسے واپس لے سکتے ہو۔ ایک گردے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک گردہ تمہاری اس حماقت کی سزا ہے جو تم نے مجھ سے مسلسل جھوٹ بول کر کی ہے اور یہ ایسی کوئی سخت سزا نہیں ہے۔ ایک گردے کے سہارے بھی تمہارا بھائی زندگی گزار سکتا ہے لیکن یاد رکھو کہ تمہاری ہر حماقت اور سرکشی کی سزا تمہارا بھائی بھگتے گا۔ ہم گھاٹے کا سودا کرنے والے لوگ نہیں ہیں جو کسی بندے کو مارنے کے لیے اپنی ایک بھی گولی ضائع کریں۔ ہم محنت کرتے ہیں تو اس کے دام کھرے کرنا بھی جانتے ہیں۔ تم پر ہم نے جو انویسٹمنٹ کی ہے، وہ تمہارے بھائی کے اعضا بیچ کر ہی وصول کرلیں گے اور تمہارے اعضا کی فروخت ہمارا پرافٹ ہوگا لیکن اس سب کی نوبت ہی کیوں آئے۔ تم سیدھی طرح ہماری بات مان لو تو سارا مسئلہ ہی حل ہوجائے گا۔ تم اور تمہارا بھائی اپنوں کے درمیان واپس جاسکو گے اور وہ بے چارے مسلسل اذیت سے آزاد ہوجائیں گے۔ تمہاری ماں جو زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا اسپتال میں پڑی ہے، اپنے بیٹوں کو پاکر دوبارہ جی اٹھے گی اور تم لوگ ایک بار پھر خوش باش فیملی کی طرح رہنے لگو گے۔'' اب وہ ایسے نرم لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی جیسے اس سے بڑھ کر کوئی ہمدرد اور مہربان ہی نہ ہو۔

''میری ماں کو کیا ہوا ہے؟'' معاذ ماں کے اسپتال میں ہونے کی خبر سن کر بے چین ہوا۔

''ہارٹ اٹیک۔ سعد کے اغوا کی خبر ان کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوئی تھی۔'' اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

''میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے۔ یزدانی اور عرفان اللہ میرے دشمن بنے ہوئے تھے تو اس کی کچھ وجوہات تھیں لیکن تم کیوں اس طرح میرے اور میری فیملی کے پیچھے پڑ گئی ہو؟'' معاذ بے بس اور نڈھال سا صوفے پر گر گیا اور ہارے ہوئے انداز میں پوچھنے لگا۔

''ہمیں تمہاری دوستی کی ضرورت ہے، معاذ! ہمارے دوست بن جاؤ تو سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے اور دوستی کا ثبوت دینے کے لیے تمہیں ہمیں اس شخص کا نام بتانا ہوگا جس نے تمہیں قید سے آزاد کروا کر اپنے پاس پناہ دی تھی۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے تمہارے پاس صرف ایک منٹ باقی ہے۔ سعد کا پیٹ ابھی چاک ہے۔ ایک منٹ بعد میرے حکم پر سرجن اس کا ایک اور عضو نکال لے گا اور تم جتنی دیر کرتے جاؤ گے اس کے اتنے ہی اعضا نکلتے جائیں گے۔ ایسی صورت میں سعد کی زندگی کی کتنی ضمانت دی جاسکتی ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔'' وہ پل پل میں اپنا لہجہ بدل لینے پر قادر تھی اور ایک بار پھر سنگین لہجے میں اسے دھمکا رہی تھی۔ اس کی دھمکی سے زیادہ معاذ کے لیے اسکرین پر دکھائی دینے والا منظر خوفناک تھا۔ کیمرا ایک بار پھر سعد کے چہرے سے ہٹ کر اس کے پیٹ پر فوکس ہو چکا تھا اور سرجن ایک بار پھر اپنے آلات کے ساتھ کچھ کر گزرنے کے لیے تیار نظر آرہا تھا۔

''نہیں۔ پلیز نہیں۔'' معاذ تڑپ اٹھا۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ سعد کے پیٹ کو اس طرح چاک کرنے کا کیا مقصد تھا۔ اس کی طرف سے کسی مزاحمت کی صورت میں وہ لوگ سچ مچ ایک ایک کر کے سعد کے سارے اعضا اس کے جسم سے الگ کر سکتے تھے۔

''ہمیں تمہاری نہیں کی نہیں، ہاں کی ضرورت ہے معاذ! ہری اپ۔ مجھے اس شخص کا نام بتاؤ جو تمہیں سپورٹ کر رہا تھا۔'' اس کے نرم لہجے میں بھی سانپ کی سی پھنکار تھی۔

''وقاص..... وقاص نام ہے اس کا۔ وکی بھائی کے نام سے زیادہ جانا جاتا ہے۔ کسی لالہ عیسیٰ کا خاص آدمی ہے۔'' وہ سعد کے ساتھ مزید برا ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا، چنانچہ ہار مان لی۔

''گڈ! تم نے سمجھداری کا ثبوت دیا۔ اب تمہارے بھائی کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کا بہترین علاج ہوگا اور بہت جلد یہ نارمل زندگی گزارنے کے لائق ہو جائے گا لیکن ہم کچھ عرصے ضمانتاً اسے اپنے پاس رکھیں گے اور جب ہمیں لگے گا کہ تم ہم سے مکمل تعاون کر رہے ہو تو پھر تم دونوں کو آزادی دے دی جائے گی۔'' وہ بول رہی تھی اور معاذ اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سعد کا چاک پیٹ سینے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ کام جدید طریقے سے ہو رہا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ساتھ ہی سینے سے ایک ہوک سی اٹھی۔ بھائی کو بچانے کے لیے وہ اپنے محسن کے ساتھ احسان فراموشی کر چکا تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ اپنے اس عمل کے لیے وہ دل کو ایک چھوٹی سی تسلی یہ دے رہا تھا کہ وقاص کوئی عام لڑکا نہیں تھا۔ لالہ عیسیٰ کے گینگ کا اہم رکن ہونے کی حیثیت سے اسے اپنے بچاؤ کے طریقے آتے تھے اور اس میں معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت بھی تھی اس لیے یہ عین ممکن تھا کہ سعد کے اغوا کے ساتھ ہی اس کے غائب ہوتے ہی وہ یہ بات سمجھ گیا ہو کہ معاذ کہاں گیا ہے اور معاذ کی ان لوگوں کے درمیان موجودگی سے خود اس کے لیے خطرات کتنے بڑھ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنی حفاظت کا انتظام ضرور کرتا۔

''اب تم ریسٹ کرو معاذ! تم سے باقی معاملات بعد میں طے ہوں گے۔'' وہ ایسے لہجے میں بولی جیسے اس سے بڑھ کر معاذ کا کوئی خیر خواہ نہ ہو۔

''بعد میں کیوں، جو چاہتی ہو ابھی بتا دو۔'' اس کے اندر طیش کی لہر اٹھی لیکن دوسری طرف سے اس کی بات کے جواب میں کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ ساتھ ہی اسکرین پر سے آپریشن تھیٹر کا منظر بھی غائب ہو گیا اور پہلے کی طرح نیلی، پیلی، ہری روشنیاں ناچنے لگیں۔ معاذ نے ایک آہ بھر کر سر ہیوا اڑ لیا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہاں اس کے حسبِ خواہش ومنشا کچھ بھی نہیں ہوگا اور خود اسے ہی صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے سپرد کرنا پڑے گا۔

☆☆☆

اسپاٹ لائٹ کے دائرے میں رقص کرتی اس لڑکی کی ایک ایک جنبش سے مہارت کا اظہار ہو رہا تھا اور یہ صرف مہارت ہی نہیں تھی جو اس کے رقص کو خوبصورتی بخش رہی تھی۔ یہ مہارت کے ساتھ دیوانگی کا امتزاج تھا جس نے اس کے رقص میں انوکھی سی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اس پر اس کا حسن سونے پر سہاگا کا کام کر رہا تھا۔ سانچے میں ڈھلا جسم، غیر ملکی نقش و نگار، بے پناہ گوری رنگت اور سرخی مائل کتھئی بالوں والی اس حسینہ کے جسم میں پارہ بھرا تھا یا وہ خود ہی پارہ تھی جو ذرا بھی سانس غیر متوازن ہوئے پورے ردھم

کے ساتھ تھرکتی جارہی تھی۔ دیکھنے والوں کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ دیکھنے والے بھی کتنے..... فقط دو لیکن دونوں ہی کی آنکھوں میں اس کے لیے زبردست ستائش تھی۔ جب وہ ایک ایک زاویے سے اسے جانچ چکے تو عورت نے اپنے ہاتھ کو جنبش دی اور فوراً ہی وہاں بجتا میوزک بند ہوگیا۔ میوزک بند ہوتے ہی رقصاں حسینہ یوں ساکت ہوگئی جیسے کسی چابی کی گڑیا کی چابی ختم ہوگئی ہو۔

''ویری ویلڈن! تم نے تو کمال ہی کردیا بارلی!'' عورت اٹھ کر اس کے قریب گئی اور تعریف کرنے میں پہل کی۔ جواب میں بارلی ڈول پلکیں جھپکا کر دھیرے سے مسکرادی۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ مون لائٹ والوں کے لیے تمہارے سلیکشن کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ تم آج ہی انٹرویو اور ٹرائل کے لیے وہاں پہنچ جاؤ۔ آگے کے سفر میں تمہارے لیے کامیابی ہی کامیابی لکھی ہے۔'' عورت نے پُرجوش انداز میں اس کو مشورہ دیا تو تب بھی وہ زبان سے کچھ نہیں بولی اور محض سر کو اثباتی جنبش دے کر رہ گئی۔

''اتنا کم بولنے والی اتنی خوبصورت عورت میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔'' مرد نے اس پر اپنی ستائشی نظریں جمائے تبصرہ کیا تب بھی وہ ویسے ہی خاموش کھڑی مسکراتی رہی البتہ مرد کی ساتھی عورت نے ایک سریلا سا قہقہہ لگایا اور پھر بارلی کی طرف شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''دیکھ لو مجھ جیسی حسین عورت کا شوہر بھی تم پر لٹو ہوگیا ہے تو پھر باقیوں کا کیا حال ہوگا؟ تم تو اس شہر میں آگ لگادو گی آگ!''

''مجھے آگ ہی لگانی ہے۔ جلا کر بھسم کردینے والی آگ۔'' بارلی نے پہلی بار زبان کھولی اور ان دونوں کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے اندر بھڑکتے ہوئے شعلے جوں کے توں ہیں اور سخت تربیتی مراحل سے گزرتے ہوئے بھی اس نے کچھ نہیں بھلایا ہے۔

''جو چاہے کرو لیکن ذرا سمجھ داری، صبر اور پلاننگ کے ساتھ ورنہ ہماری اور تمہاری اتنے عرصے کی محنت ضائع ہوجائے گی۔'' عورت نے فوراً اسے سمجھایا تو اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''تمہارے دشمن اب پہلے سے بھی زیادہ طاقتور اور مضبوط ہوچکے ہیں۔ بغیر پلاننگ کے کیا تمہارا کوئی بھی وار دشمن سے زیادہ تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ دشمن کے چند مہروں کو شکار کرلینا ایسا ہی ہوگا جیسے کسی مضبوط اور تناور درخت کی شاخیں کاٹنا۔ تمہیں شاخیں نہیں، جڑیں کاٹنی ہیں اور جڑوں تک تم جب ہی پہنچ سکو گی جب ہمارے کہے پر عمل کرو گی کیونکہ جتنا ہم تمہارے دشمنوں سے واقف ہیں، تم اس کا چند فیصد بھی نہیں جانتیں۔'' کئی بار کا پڑھایا سبق ایک بار پھر اسے پڑھایا جانے لگا۔

''میں ان سب باتوں کو سمجھتی ہوں میڈم! آپ اطمینان رکھیں، میں آپ کے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کروں گی۔'' اس نے نپے تلے لہجے میں جواب دیا اور مسکرا کر بولی۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے ابھی کچھ مزید تیاریاں کرنی ہیں۔''

''اوکے۔ وش یو بیسٹ آف لک۔'' اسے مسکرا کر خوشی سے اجازت دے دی گئی۔ اجازت ملتے ہی بارلی ڈول بائیں ایڑی پر گھومی اور دلربا وہوش ربا چال چلتی ہوئی اپنے پیچھے موجود دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ جب تک وہ دروازے کے پیچھے غائب نہیں ہوگئی، عورت کے پیچھے کھڑا اس کا شوہر یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو نچلے ہونٹ پر زبان پھیر کر چٹخارا لینے کے انداز میں بولا۔

''بڑی رس بھری ہے۔''

''مر کیوں رہے ہو۔ وقت آنے پر چکھ لینا۔ تمہیں کون سی کمی پڑی ہے۔ ہر دوسرے دن تو بغل میں نیا پیس لے کر گھوم رہے ہوتے ہو۔'' عورت نے اس کو گھرکا۔

''یہ تو اوپر والے کی دین ہے کہ ایسی بیوی دی جو حسین بھی ہے اور برا ڈمائنڈڈ بھی۔'' مرد نے قہقہہ لگایا۔

''اسے کہتے ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔'' عورت نے بھی اس کے قہقہے کا ساتھ دیا اور دونوں میاں بیوی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس وسیع ہال نما کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ ایک اوڈ کپل تھا اس کے باوجود وہ ایک تھے تو اس کے پیچھے کچھ راز تھے اور ان رازوں سے ایک فریق قطعی بے خبر تھا۔

☆☆☆

لاہور ائرپورٹ پر اتر کر وقاص نے ایک ٹیکسی ہائر کی اور ٹیکسی والے کو اپنا مطلوبہ پتا بتا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گزشتہ رات شہر میں ہلکی بارش ہوئی تھی اور اب بھی آسمان پر سرمئی بادل تیرتے پھر رہے تھے اس لیے مجموعی طور پر فضا بہت نکھری ہوئی اور خوش گوار محسوس ہورہی تھی۔ بارش کے باعث درخت، پودے اور عمارتیں دھل کر صاف ہوگئی تھیں اور ان کے رنگ پہلے سے زیادہ شوخ اور نکھرے ہوئے

محسوس ہو رہے تھے۔ آبی بخارات سے بوجھل ہوا کے نم جھونکے جسم سے ٹکراتے تھے تو ایک سکون کا سا احساس ہوتا تھا لیکن وقاص موسم کی اس خوبصورتی اور خوش گواریت کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی طبیعت پر ایک بوجھل پن سا طاری تھا اور بار بار دل میں ایک لہری اٹھتی تھی۔ کل شام ڈھلے ملنے والی دو بڑی خبروں نے اسے اس کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ پہلی خبر معاذ کی والدہ سعیدہ بیگم کے حوالے سے ملی تھی۔ وہ سعد کے اغوا کے بعد ہونے والے ہارٹ اٹیک کے بعد سے مسلسل اسپتال میں زیر علاج تھیں اور تمام تر طبی سہولتوں کے باوجود ان کی حالت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کی صحت یابی کی راہ میں ان کی جذباتی کیفیت سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ جینے کی امنگ کھو چکی تھیں اور جو خود سے نہ جینا چاہتا ہو، اسے دوائیں اور مشینیں کب تک زندہ رکھ سکتی ہیں۔ سعیدہ بیگم کی زندگی کی کہانی بھی کل شام ختم ہو گئی تھی۔ انہیں اسپتال میں ہی ایک اور زبردست ہارٹ اٹیک پڑا تھا جو جان لیوا ثابت ہوا تھا اور وہ خود غموں سے نجات پا کر پیچھے والوں کو روتا ہوا چھوڑ گئی تھیں۔

لواحقین ابھی اس صدمے سے گنگ ہی تھے کہ صرف دو گھنٹے کے فرق سے انہیں ایک اور عجیب سی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ سر عام اغوا ہو جانے والا سعد بالکل اچانک ہی گھر پہنچ گیا۔ وہ غائب دماغی کی کیفیت میں اپنی پھوپی کے رہائشی علاقے میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا تھا کہ ایک کزن نے اسے دیکھ کر پہچان لیا اور اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ اس کی اس طرح گھر آمد گھر والوں کے لیے ایک جذباتی جھٹکا تھا۔ وہ سعد کے بجائے گویا سعد کے سائے کو دیکھ رہے تھے۔ صحت مند اور گورا چٹا سعد تقریباً ایک ماہ کے عرصے میں سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور اس کی گوری رنگت جل کر سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ وہ گھر والوں کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی کو پہچانتا ہی نہ ہو۔ اعزاء کے مشورے پر اسے فوری طور پر قریبی اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کے مکمل معائنے کے بعد یہ تکلیف دہ خبر سامنے آئی کہ وہ اپنے ایک گردے سے محروم ہو چکا ہے۔ اسے اپنے اغوا کے بعد کی کوئی بات یاد نہیں تھی اور وہ بالکل بھی نہیں بتا سکا تھا کہ وہ اتنے عرصے کہاں اور کن لوگوں کے پاس رہا تھا۔ اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں نے انکشاف کیا تھا کہ اسے اس عرصے میں زیادہ تر بے ہوش اور نیند کی حالت میں رکھا گیا تھا اور زندہ رکھنے کے لیے یقیناً ڈرپس اور غذا کی نلکی کا سہارا لیا جاتا رہا تھا۔ ان دو خبروں کے ملنے کے بعد وقاص کے لیے خود کو لاہور آنے سے روکنا ممکن نہیں رہا تھا۔ حقیقتاً وہ سعیدہ بیگم کی موت کی خبر سن کر ہی لاہور جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کے دل میں خواہش تھی کہ بے شک وہ علینہ کا دکھ بانٹ نہیں سکتا لیکن اس کے غم میں شریک تو ہو جائے۔ وہ سعیدہ بیگم کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور جانے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ سعد کی اس طرح اچانک آمد کی وجہ سے ورثاء کو ان کی تدفین میں قدرے تاخیر کرنا پڑی تھی اور انتقال کے دوسرے دن جنازہ اٹھانے کا اعلان کیا گیا تھا۔

وقاص اسی حساب سے بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچا تھا۔ وہ پندرہ دن دبئی میں رہ کر آیا تھا اور واپس آنے کے بعد بھی اچھا خاصا مصروف رہا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنے لوگوں کے ذریعے معاذ کا کھوج لگانے کی کافی کوشش کی تھی لیکن اس تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اسے جو واحد غیر مصدقہ لیکن اہم اطلاع معاذ کے حوالے سے ملی تھی، وہ یہ تھی کہ معاذ کو ایک دن یزدانی کے آفس میں دیکھا گیا تھا۔ یہ وہی دن تھا جب معاذ اس کے گارڈ کو بے ہوش کر کے اپارٹمنٹ سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ یزدانی اور عرفان اللہ کے کئی ٹھکانوں کا کھوج نکالنے کے باوجود اسے ایسا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ ان میں سے کسی ٹھکانے پر بھی معاذ کو رکھا گیا ہو۔ ہر طرف مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا جو اس کی راہنمائی کرتا۔ یہاں تک کہ اس کے خدشات کے برخلاف اسپتال میں داخل موی کو بھی نہیں چھیڑا گیا تھا۔ اپنے طور پر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ معاذ اپنے دشمنوں کے پاس واپس گیا ہوگا تو انہوں نے اس سے یہ بات اگلوالی ہوگی کہ اسے فرار کروانے اور اپنے پاس پناہ دینے والا کون تھا؟ ایسی صورت میں ان کی طرف سے کوئی منفی ردعمل ظاہر ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا بھی نہیں ہوا تھا اور مکمل خاموشی اختیار کر لی گئی تھی۔ اس خاموشی کی وجہ سے ہی اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا اور اب وہ سعیدہ بیگم کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور آیا تھا۔ خیالات کی یلغار کے دوران ائرپورٹ سے مطلوبہ جگہ تک کا فاصلہ طے ہونے کا دورانیہ اسے محسوس ہی نہیں ہو سکا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے پکار کر پوچھا کہ اسے کہاں اترنا ہے تو چونک کر ماحول میں واپس آیا اور اپنے پاس موجود مکمل پتے کی مدد سے اس کی راہنمائی کی۔ علاقہ کشادہ تھا۔ اپنی مطلوبہ گلی کے باہر سے ہی اس

نے ایک مکان کے سامنے لگا شامیانہ دیکھ لیا۔ ٹیکسی کو نے پر ہی رکوا کر اس نے ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور پیدل اس جانب بڑھ گیا۔ جنازہ اٹھنے میں زیادہ وقت نہیں بچا تھا اس لیے لوگوں کی کافی بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہوگیا۔ وہاں اتنے لوگ تھے کہ کوئی کسی سے پوچھنے والا نہیں تھا کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا رشتہ ہے؟ اس سے بھی کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ وہ بھی معاذ کے غم زدہ ونڈھال والد سے گلے ملا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ اسے بیٹھے ہوئے دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اس نے ایک ایمبولینس کو شامیانے کے باہر آکر رکتا ہوا دیکھا۔ ایمبولینس سے صورت ہی سے بیمار دکھائی دینے والے ایک نوجوان کو سہارا دے کر اتارا گیا۔

''آہ بے چاری سعیدہ! بیٹوں کی جدائی کے غم میں جان سے چلی گئی۔ زندگی میں چند گھنٹے اور مل جاتے تو کم از کم چھوٹے کی صورت تو دیکھ لیتی۔'' وقاص کے قریب بیٹھے بزرگوں میں سے ایک نے ایمبولینس سے اترتے جوان کو دیکھ کر افسوس بھرے لہجے میں تبصرہ کیا۔

''صحیح فرمایا آپ نے۔ اگر سعد پہلے آگیا ہوتا تو باجی سعیدہ ایک بار پھر جی اٹھتیں۔ اپنے گھر اور بچوں میں ہی تو جان تھی ان کی۔ اتنی سلیقہ مند اور ہر دم گھر اور بچوں کی فکر میں مبتلا رہنے والی عورتیں کم ہی ہوتی ہیں۔ انہیں تو اپنے بچوں کی اتنی فکر رہتی تھی کہ اس ڈر سے کہ کہیں بچوں کی صحت خراب نہ ہوجائے، وہ چیزیں بھی گھر پر ہی تیار کرتی تھیں جنہیں عموماً بازار سے تیار حالت میں خریدا جاتا ہے۔ گھر کے تیار کردہ جیم، جیلی، مارملیڈ، اچار، مربے اور پاپڑ ہم نے باجی سعیدہ کے گھر میں ہی دیکھے تھے اور تم دیکھیے کہ اتنی محبت سے بنائے گئے گھر کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔'' تقریباً چالیس سالہ ایک اور صاحب نے بزرگوار کی بات کی تائید میں تبصرہ کیا۔ وقاص کے کان ان تبصروں کو سن رہے تھے اور نظریں سعد پر لگی ہوئی تھیں۔ اسے سہارا دے کر چلانے والے گھر کے گیٹ کے اندر لے جارہے تھے۔ اسے اندر پہنچے چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اندر سے تیز آہ و بکا اور سسکیوں کا شور اٹھا۔ یقیناً سعد کو سامنے پاکر قریبی رشتے دار خواتین کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''میں اندر جاکر سنبھالتا ہوں۔'' بزرگوار شور سن کر بے چین ہوگئے اور اپنی جگہ سے اٹھنے لگے۔ ان کی بات پر جوابی تبصرہ کرنے والے شخص نے سہارا دے کر انہیں اٹھنے میں مدد دی اور گھر کے گیٹ تک لے گیا۔ بزرگوار اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آہ و بکا کا سلسلہ دھیما پڑ گیا۔ ذرا دیر بعد بزرگوار، سعد اور اس کو سہارا دینے والے لوگ باہر آتے ہوئے دکھائی دیے۔ سعد کو ایک کرسی پر بٹھادیا گیا، پھر بزرگوار اعلان کرنے والے انداز میں غم زدہ لہجے میں بولے۔

''جنازہ اٹھانے کا وقت ہورہا ہے۔ جو محرم حضرات میت کا آخری دیدار کرنا چاہتے ہیں وہ اندر چلے جائیں۔ ساتھ ہی جنازہ بھی اٹھالیا جائے۔ ظہر کی اذان بس ہوا ہی چاہتی ہے۔'' اس اعلان کے بعد وقاص نے معاذ کے والد سمیت چند عمر رسیدہ اور جوان حضرات کو گھر کی طرف بڑھتے دیکھا۔ مرد حضرات اندر پہنچے تو ایک بار پھر آہ و بکا کا شور بلند ہوا۔ اس شور میں بھی اسے کلمۂ شہادت پکارنے والے کی آواز سنائی دے گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ جنازہ اٹھایا جارہا ہے۔ دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح اس نے بھی دھیمی آواز میں کلمہ پڑھا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ فطری طور پر اس کی نظریں گھر کے گیٹ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ کلمۂ شہادت کی آوازوں کے ساتھ اس نے مرد حضرات کو کندھوں پر جنازہ اٹھائے گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ جنازے کے پیچھے پیچھے کچھ خواتین بھی گیٹ تک گئی تھیں۔ ان خواتین میں اس نے اسے بھی دیکھا جسے ایک بار ہی دیکھ کر وہ اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ پہلی بار اس نے دیکھا تھا تو وہ پریشان اور اداس ضرور تھی لیکن اس کا حسن کھلے ہوئے سرخ گلاب کی طرح دمک رہا تھا۔ آج اس گلاب کو غم کی مسموم ہوا نے مرجھایا ہوا سا کردیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر تھی۔ سر کے بال بے ترتیب تھے اور کئی لٹیں اس کے زرد رخساروں پر جھول رہی تھیں۔ ملگجے لباس پر اوڑھا گیا ہم رنگ آسمانی دوپٹا ایک شانے پر ٹکا تھا اور نیچے لٹک کر پیروں تک آرہا تھا۔ اس سارے منظر میں وقاص کے لیے سب سے تکلیف دہ شے اس کے رخساروں پر ایک تواتر سے بہتے ہوئے آنسو تھے۔ یہ آنسو شاید کسی پل بھی نہیں رکے تھے اسی لیے اس کی خوبصورت آنکھیں اس حد تک متورم ہورہی تھیں کہ وہ انہیں پوری طرح کھول بھی نہیں پارہی تھی۔ اس کم عمری میں غم و رنج کے سلسلے نے اسے نچوڑ کر رکھ دیا تھا اور ماں کی جدائی کا صدمہ تو یقیناً سب سے بڑھ کر جانکاہ تھا۔ ماں کو ڈولے میں لیٹ کر کندھوں پر سوار جاتے دیکھ کر وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ یہ تڑپ التجا بن کر اس کی پکار میں در آئی۔

''امی.....! مجھے چھوڑ کر مت جائیں امی۔'' یہ پکار

ایسی دلخراش تھی کہ وقاص کو اپنا دل چرتا ہوا محسوس ہوا۔ خواتین نے منہ میں دوپٹے ٹھونس کر اپنی سسکیوں کو روکا۔ معاذ کے والد خاور صاحب جو دائیں جانب سرہانے سے جنازے کو کندھا دیے ہوئے تھے، پہلے سے زیادہ نڈھال اور زرد پڑ گئے اور مردوں میں سے بھی کئی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ اس موقع پر ایک ادھیڑ عمر خاتون اور حسین وجمیل لڑکی نے آگے بڑھ کر علینہ کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ بانہوں کا سہارا پاتے ہی وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہوگئی۔ اسی وقت ایک لڑکے نے کھلے ہوئے گیٹ کو بند کر دیا تو منظر وقاص کی آنکھوں سے پوشیدہ ہوگیا۔ جنازہ اب شامیانے سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ دیگر مرد حضرات کی طرح وقاص بھی جنازے کے پیچھے چل پڑا۔ سعد اب بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور پریشانی کے تاثرات ضرور تھے لیکن آنکھوں میں ایک خالی پن سا تھا جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے۔ وہ جتنے طویل عرصے بے ہوشی اور نیند کی حالت میں رکھا گیا تھا، اس کی یہ حالت قابل فہم تھی۔ اسے مکمل حواسوں میں آنے کے لیے کچھ وقت اور طبی امداد درکار تھی۔

''بہت برا ہوا سعیدہ خالہ کے خاندان کے ساتھ۔ یوں لگتا ہے کسی کی نظر کھا گئی۔'' وقاص کے ساتھ ساتھ چلتے دو لڑکوں میں سے ایک نے دھیمی آواز میں اپنے ساتھی سے کہا۔

''بُرا تو ہوا لیکن جانے کیا چکر ہے جس میں یہ لوگ پھنس گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے معاذ بھائی کسی غلط معاملے میں ملوث ہوگئے تھے جس کی سزا سارا خاندان بھگت رہا ہے۔'' کہتے ہیں نا کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہاں بھی یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ وقاص کو اس لڑکے کا یہ تبصرہ بہت بُرا لگا لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ زندگی نے اسے اپنے بڑے تلخ روپ دکھائے تھے اس لیے وہ ایسی باتوں کو برداشت کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ اب بھی ان لڑکوں سے الجھنے کے بجائے قدموں کی رفتار بڑھا کر ان سے آگے نکل گیا۔ کچھ دیر جنازے کو کندھا دیا تو اپنی ماں یاد آگئی۔ باپ کی تو کبھی اس نے صورت ہی نہیں دیکھی تھی، بس ماں تھی جس کے سائے سے بھی وہ کم عمری میں ہی محروم ہوگیا تھا۔ ماں کی جدائی کا غم کیا ہوتا ہے، وہ اس بات سے آگاہ تھا اور علینہ کے دکھ کو بہت اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ دکھی دل سے قریبی قبرستان تک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ باقی لوگوں سے قدرے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ تدفین کا مرحلہ مکمل ہونے کے بعد جنازے کے ساتھ آنے والے لوگ واپس پلٹنے لگے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ شامل نہیں ہوا اور قبرستان میں ہی رکا رہا۔ سب لوگ واپس چلے گئے تو اس نے گورکن کی جھونپڑی کا رخ کیا اور چند نوٹ اس کے حوالے کر کے بولا۔

''ابھی جس قبر میں تدفین ہوئی ہے، اس کا خیال رکھنا بابا!''

''میرا تو کام ہی یہی ہے بیٹا! اپنی طاقت کے مطابق اپنی ڈیوٹی پوری کرتا ہوں۔'' بوڑھے گورکن نے اسے جواب دیا، پھر افسردہ لہجے میں بولا۔

''میری ان بوڑھی آنکھوں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔ یہاں لائے جانے والوں کے والی وارث کچھ دن تو روتے تڑپتے یہاں آتے ہیں لیکن پھر آہستہ آہستہ یہاں کا راستہ بھولنے لگتا ہے۔ کچھ عید برات پر چکر لگا لیتے ہیں اور کچھ کو اس کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ ایسی قبروں کا پھر نام ونشان ہی مٹ جاتا ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، یہ سچ ہے کہ ایسی قبروں کو ہم خود مسمار کر کے نئے آنے والے مُردوں کے لیے جگہ بناتے ہیں۔'' اپنی رو میں بولتا ہوا بوڑھا کچھ خیال آنے پر چونکا اور اس سے پوچھا۔

''تمہارا میت سے کیا رشتہ ہے؟''

''وہ میری ماں جیسی تھیں۔'' اس نے آہستہ سے گورکن کو جواب دیا اور وہاں سے چل پڑا۔ واپسی کے لیے ایک بار پھر اسے اسی مقام سے گزرنا تھا جہاں سعیدہ بیگم کی قبر بنائی گئی تھی۔ ابھی وہ قبر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اس نے ایک شخص کو وہاں دیکھا۔ وہ موبائل فون ہاتھ میں لیے مختلف زاویوں سے قبر کی تصویریں کھینچ رہا تھا۔ وقاص نے سعیدہ بیگم کی آخری رسومات میں شرکت کے دوران پہلے گھر پر اور بعد میں قبرستان میں دو تین نیوز چینلز کے نمائندوں کو دیکھا تھا لیکن یہ شخص ان لوگوں سے قطعی مختلف تھا۔ ان کا انداز پروفیشنل تھا اور انہوں نے اپنے گلوں میں اپنے چینلز کے کارڈ لٹکا رکھے تھے جبکہ یہ شخص کچھ مشکوک سا لگ رہا تھا جو سب لوگوں کے جانے کے بعد تصویریں بنا رہا تھا۔

''اے! کون ہو تم؟'' وقاص نے دور ہی سے اسے پکارا تو اس نے پہلے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر قبرستان سے باہر جانے والے راستے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

''خبردار! رک جاؤ۔'' وقاص چلایا اور خود بھی اس کے پیچھے بھاگا۔ بھاگنے میں اس کی رفتار جتنی تیز تھی، یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ شخص اس سے بچ نکلتا لیکن قسمت کی خرابی سے

اس کا پیر کسی چیز میں الجھا اور وہ بُری طرح گر گیا۔ اس نے کوشش کی کہ پھرتی سے اٹھ کر اس شخص کے تعاقب میں دوبارہ دوڑ سکے لیکن اس کا پیر بری طرح الجھا ہوا تھا۔ وہ ایک خودرو جنگلی بیل تھی جو اس کے پیاؤں میں لپٹ گئی تھی۔ اس نے جھٹکا دے کر پاؤں کو بیل کی گرفت سے آزاد کروایا اور ایک بار پھر اس شخص کے پیچھے لپکا لیکن اس دوران وہ شخص کافی آگے نکل چکا تھا۔ وقاص نے درمیانی فاصلہ کم کرنے کے لیے اپنی جان لڑادی لیکن ایک بار پھر قسمت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ قبرستان سے نکلتے ہی وہ شخص اچھل کر ایک بائیک پر سوار ہوا اور کک لگا کر وہاں سے ہوا ہوگیا۔ اس کے پاس سواری ہوتی تو وہ بھی اس کے پیچھے جاسکتا تھا۔ فی الحال ہاتھ ملتا رہ گیا۔ وہ مشکوک شخص کون تھا اور یوں قبر کی تصویریں کھینچنے کے پیچھے اس کا کیا مقصد تھا؟ یہ سوالات ایک چبھن کی طرح اس کے ذہن ہی میں رہ گئے۔

☆☆☆

ایک کے بعد ایک چینل بدلتے عالم شاہ کا جب کسی بھی پروگرام میں دل نہ لگا تو اس نے بیزاری کے عالم میں ٹیلی ویژن بند کر کے ریموٹ ایک طرف پھینک دیا۔ پتا نہیں کوئی ڈھنگ کا پروگرام نہیں آرہا تھا یا اس کی اپنی ذہنی قلبی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ کسی چیز میں دل لگ سکتا۔ اسے اسپتال سے گھر منتقل ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ مجموعی طور پر وہ اب تک بہت بہتر حالت میں تھا لیکن اماں سائیں جنہیں شہر آنے کے بعد ہی ساری صورتِ حال کے بارے میں صحیح طرح سے علم ہوا تھا، اسے مستقل طور پر بستر پر لٹائے رکھنے پر مصر تھیں اور ہر وقت اس کو ایسی چیزیں کھلانے پلانے پر کمربستہ رہتی تھیں جن کے استعمال سے خون بنتا اور جسم کو طاقت ملتی۔ ان کی اتنی توجہ کا اس کی صحت پر مثبت اثر پڑ بھی رہا تھا لیکن ذہنی کوفت اور جذباتی الجھنیں اپنی جگہ تھیں۔ آسیہ کا کوئی کھوج نہ لگ سکنے کی وجہ سے وہ ابھی تک بہت سے لوگوں کی نظروں میں مشکوک تھا اور اس کا اثر براہِ راست صداقت شاہ کے ووٹ بینک پر پڑا تھا۔ مخالف گروپ نے اس معاملے میں بہت پروپیگنڈا کیا تھا اور لوگوں کو بدظن کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ نتیجتاً صداقت شاہ پہلی بار اپنی سیٹ ہار گئے تھے۔ ان کی ہار کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی الیکشن کمپین ٹھیک طرح سے نہیں چلا سکے تھے۔ پے در پے پیش آنے والے واقعات نے انہیں نڈھال کر دیا تھا پھر وہ مخالفین کی طرح اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے کے بھی عادی نہیں تھے، سو شکست ان کا نصیب ٹھہری تھی۔ باپ کی شکست پر عالم شاہ نے فطری طور پر دکھ محسوس کیا تھا اور اسے اس بات کا افسوس تھا کہ ہر سال کی طرح اس سال وہ الیکشن کی مصروفیات میں ان کا ساتھ نہیں دے سکا تھا۔ ان کی شکست کے علاوہ اس کے لیے دوسری تکلیف دہ شے معاذ اور اس کی فیملی کے معاملات تھے۔ معاذ ہنوز غائب تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی سعد اغوا کے بعد اپنا ایک گردہ گنوا کر واپس آچکا تھا لیکن اس کے پاس کسی کو بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ معاذ کی والدہ کی وفات نے المیے کی شدت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ صاحبِ فراش ہونے کی وجہ سے وہ ان کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور نہیں جاسکا تھا اور معاذ کے والد سے محض ٹیلی فون پر ہی تعزیت کر کے رہ گیا تھا۔ غم اور پریشانیوں کے مارے اس کے والد نے کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا لیکن عالم شاہ اپنی جگہ شرمسار تھا کہ وہ دوستی کے تعلق کو اس طرح نہیں نبھا سکا تھا جیسا کہ اس رشتے کا حق تھا اور معاذ انجانے میں ہی اس پر ایک احسان کر گیا تھا۔ سجل اور معظم شاہ کی... اغوا کاروں سے نجات معاذ ہی کی مرہونِ منت تھی لیکن معاذ خود کہاں تھا؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

''فون کیوں نہیں اٹھا رہے پٹ؟ کب سے تمہارا فون بج رہا ہے۔'' سوچوں میں گم وہ بہت دور نکل گیا تھا۔ اماں سائیں کی آواز نے اسے چونکایا اور مسلسل بجتے ہوئے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔ اسکرین پر معظم شاہ کا نام جگمگا رہا تھا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم ادا!''

''وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے؟'' معظم شاہ نے اس سے دریافت کیا۔

''اماں سائیں کے رحم و کرم پر ہوں۔'' اس نے سامنے صوفے پر براجمان ہوجانے والی اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر بے چارگی کا اظہار کیا جس پر انہوں نے اسے محبت بھری خفگی سے گھورا۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ یہ مائیں ہی ہوتی ہیں جو سرکش گھوڑے جیسے بیٹوں کو لگامیں ڈال کر رکھتی ہیں۔'' معظم شاہ نے ہنس کر کہا لیکن اس کی ہنسی میں وہ تازگی نہیں تھی جو ایک خوش باش اور مطمئن آدمی کی ہنسی میں ہوتی ہے۔

''آپ شہر کب پہنچ رہے ہیں ادا! اماں سائیں کا خیال ہے کہ اب آپ کو یہاں موجود ہونا چاہیے۔'' ماں کی طرف سے اشارہ ملنے پر اس نے بہنوئی سے پوچھا۔

''مجھے خود بھی اس بات کا احساس ہے لیکن یہاں کے

معاملات ہی میری جان نہیں چھوڑ رہے۔ الیکشن کا ہنگامہ تو جیسے تیسے نمٹ ہی گیا ہے لیکن بابا سائیں کو بالکل چپ لگ گئی ہے۔ ایک تو زمین ہاتھ سے جانے کا غم، دوسرے پھپھا سائیں کی آبائی سیٹ سے شکست..... وہ بالکل ہی بجھ کر رہ گئے ہیں اور جو معاملات پہلے وہ دیکھتے تھے، وہ بھی اب مجھے ہی دیکھنے پڑ رہے ہیں۔'' معظم شاہ نے تھکے تھکے لہجے میں اسے جواب دیا۔

''زمین کے معاملے میں کوئی پیش رفت ہوئی یا نہیں؟'' اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

''پہلے تو لطیف سومرو الیکشن کی مصروفیات کا بہانہ بنا کر ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا لیکن اب میں اس سے ملاقات کا وقت لینے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ آج ہی یہ ملاقات ہونی ہے۔ ملاقات ہوجائے تو میں کل صبح ہی یہاں سے روانہ ہوجاؤں گا۔ سجل کو بھی میں نے یہ بات بتادی ہے۔ وہ سمجھ دار اور بہادر عورت ہے اور اس نے مجھے تسلی دی ہے کہ میں اس کی طرف سے فکرمند نہ ہوں اور اطمینان سے اپنے کام نمٹالوں۔'' معظم شاہ نے اس کے سوال کا مفصل جواب دیا۔

''سجل واقعی عام خواتین کے مقابلے میں بہت بہادر اور معاملہ فہم ہے لیکن ایسی عورتوں کے بھی بہرحال جذبات ہوتے ہیں اور اس وقت آپ سے بڑھ کر کوئی اسے جذباتی سہارا نہیں دے سکتا۔'' اس نے دبے الفاظ میں معظم شاہ کو جتایا۔

''میں نے کہا نا کہ میں صبح روانہ ہوجاؤں گا۔ مجھے خود بھی اس کا احساس ہے۔'' معظم شاہ نے اسے یقین دہانی کروائی اور اِدھر اُدھر کی دو تین مزید باتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا۔

''کل آنے کا کہہ رہے ہیں ادا معظم۔'' عالم شاہ نے اپنی طرف متوجہ ماں کو بتایا۔

''وہ تو روزانہ ہی کل کل کرتا رہتا ہے۔ ہمارے ہاں کی عورتوں کی آدھی زندگی اپنے مردوں کی فرصت کے انتظار میں ہی گزر جاتی ہے۔'' انہوں نے سن کر خفگی کا اظہار کیا۔

''مرد مصروف تو رہتے ہی ہیں۔ آپ اس بات کا شکر ادا کریں کہ ہمارے ہاں کے مردوں کی مصروفیت غلط نوعیت کی نہیں ہے۔ کبھی لطیف سومرو کے خاندان کی عورتوں سے ملاقات ہو تو پوچھیے گا کہ وہ کس حال میں رہتی ہیں۔'' عالم شاہ فوراً اپنی صنف کی حمایت کرنے کھڑا ہوگیا۔

''اللہ سائیں کا کرم ہے ہم جدی پشتی زمیندار لوگ ہیں۔ لطیف سومرو کے خاندان کی طرح نہ تو ہمیں انگریزوں کی غلامی سے زمینیں ملی ہیں، نہ ہم نے لوگوں کو دھوکا دے کر ہتھیائی ہیں اس لیے تم ہمارے خاندان کا اس کے خاندان سے مقابلہ نہ ہی کرو تو بہتر ہے۔'' انہوں نے ذرا سی ناک چڑھا کر بیٹے کو جواب دیا تو وہ ہنس پڑا پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں ذرا تھوڑی دیر کے لیے لان میں جارہا ہوں۔ گھر میں رہ رہ کر طبیعت سست ہوگئی ہے۔ تازہ ہوا میں سانس لے کر شاید کچھ بہتری آجائے۔''

''طبیعت گھر میں رہنے سے نہیں، کمزوری سے سست ہورہی ہے۔ کل ہی گوٹھ سے دیسی مرغی کے چوزے منگواتی ہوں۔ اس کی یخنی پیو گے تو بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے۔'' انہوں نے فکرمندی سے اپنے عزم کا اظہار کیا۔

''مجھے تو لگ رہا ہے کہ میں کھا کھا کر ہی سست پڑتا جارہا ہوں۔'' عالم شاہ نے انہیں چھیڑنے والے انداز میں کہا اور ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس رات وہ کھانا کھا کر سونے لیٹا تب بھی طبیعت کی بے چینی اور اضطراب اپنی جگہ قائم تھا۔ کوشش کے باوجود نیند نہیں آرہی تھی۔ آج سجل بھی رات کے کھانے میں شریک نہیں ہوئی تھی۔ اماں سائیں نے بتایا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ صحیح نہیں ہے اور وہ بے چین سی ہے۔ بے چین وہ بھی تھا اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق جلد سونے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہورہا تھا۔ اس ناکام کوشش کے دوران اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی تو چونک گیا اور فوراً اٹھ کر دروازہ کھولا اور سامنے ماں کو دیکھ کر مزید چونکا۔

''عالم پٹ! سجل کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہہ دیا ہے لیکن گھر کا کوئی مرد بھی ساتھ ہونا چاہیے۔ اس لیے تمہاری نیند خراب کی۔'' اسے دیکھتے ہی انہوں نے پریشانی کے عالم میں بتایا۔

''میں ابھی سویا نہیں تھا، اچھا ہوا آپ نے مجھے اطلاع کردی۔ آپ لوگ سجل کو لے کر آئیں، میں بھی آتا ہوں۔'' اس نے ذمے داری کے گہرے احساس کے ساتھ انہیں جواب دیا اور پھرتی سے شب خوابی کا لباس تبدیل کرکے باہر نکلا۔ اماں اور موبل بھی سجل کو سہارا دیے ہوئے لے آئیں اور گاڑی کی پچھلی نشست پر اسے درمیان میں بٹھا کر خود دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ پریشانی کے باوجود تینوں خواتین مکمل پردے میں تھیں۔ عالم شاہ ڈرائیور کے ساتھ

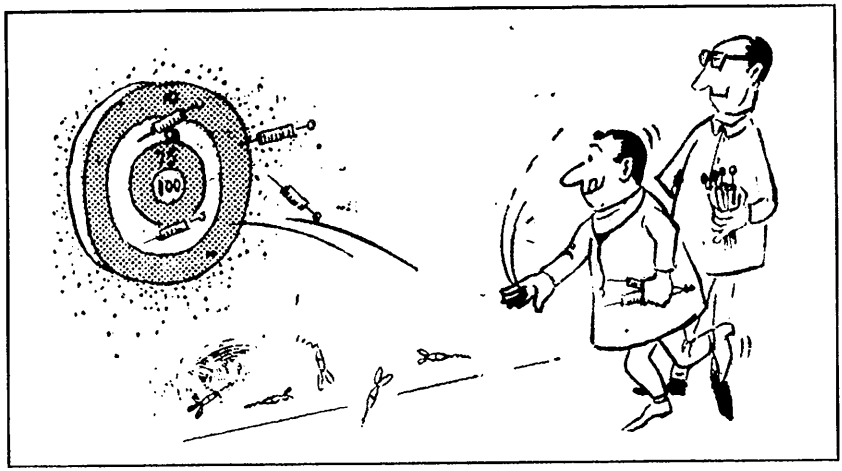

اگلی نشست پر بیٹھا اور اسے گاڑی چلانے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور کوئی اور نہیں، اس کا سب سے وفادار ملازم سرمد تھا جس نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے گاڑی تیز رفتاری سے دوڑا دی۔ لگژری کار تیز رفتاری کے باوجود سڑک پر اتنی سبک دوڑ رہی تھی کہ اس کے سواروں کو جھٹکے نہیں لگ رہے تھے لیکن سجل شاہ جس تکلیف میں مبتلا تھی، وہ اسے دہرا کیے دے رہی تھی۔ عالم شاہ نے ایک بار یونہی پلٹ کر پیچھے دیکھا تو سجل کی پیشانی سے بہہ کر ٹپ ٹپ گرتا پسینا دکھائی دے گیا۔ تکلیف برداشت کرنے کی کوشش میں اس نے اماں سائیں کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیا ہوا تھا جبکہ مومل دھیرے دھیرے اس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ عالم شاہ نے ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بہن اتنی شرم و حیا اور برداشت والی ہے کہ جس تکلیف پر عورتیں واویلا شروع کر دیتی ہیں اسے بھی بغیر آواز نکالے خاموشی سے سہہ جائے گی۔ اسپتال تک کا فاصلہ طے کرنے میں سچ مچ اسے سجل کی معمولی سی سسکی بھی سنائی نہیں دی۔ اسپتال پہنچ کر ارے معاملات وہاں کے عملے نے سنبھال لیے۔ سجل کو لیبر روم میں لے جایا گیا جبکہ اماں سائیں اور مومل کو خواتین کے لیے مخصوص ویٹنگ روم میں بھیج دیا گیا۔ وہ کسی بھی ضرورت کے وقت مومل کو موبائل پر کال کرنے کی ہدایت دے کر خود کوریڈور میں رکھی بینچز میں سے ایک بینچ پر آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بے چینی اور خالی الذہنی کی کیفیت میں بیٹھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ اسے معظم شاہ کو سجل کی اسپتال میں موجودگی کی اطلاع دے دینی چاہیے۔ اطلاع دینے کے لیے اس نے موبائل باہر نکالا ہی تھا کہ موبل کی کال آ گئی۔ وہ خاصی پُرجوش اور جذباتی لگ رہی تھی۔ اس کی ہیلو سنتے ہی چڑھے ہوئے سانس کے ساتھ بولی۔

''مبارک ہو ادا! اللہ سائیں نے ہم دونوں کو بھانجے کی نعمت سے نوازا ہے۔''

''خیر مبارک۔ سجل تو ٹھیک ہے نا؟'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ اسپتال پہنچتے ہی اتنی جلدی خوش خبری ملنے کی اسے امید نہیں تھی۔

''جی۔ مجھے زیادہ نہیں پتا ہے۔ وہ اندر ہی ہیں اور اماں سائیں انہیں دیکھنے گئی ہیں۔'' مومل نے جھجکتے ہوئے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں باہر ہی ہوں۔ خدانخواستہ کوئی مسئلہ ہو تو مجھے کال کر دینا، میں ذرا گاؤں فون کر کے ادا معظم اور دوسرے لوگوں کو خوشخبری سناتا ہوں۔'' اس نے مومل کی کال کاٹی اور معظم کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بیل جاتی رہی پھر کال ریسیو کی گئی۔

''مبارک ہو ادا معظم! اللہ نے اپنا کرم کیا ہے اور آپ کو بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔'' اس نے دوسری طرف سے ہیلو بولے جانے کا بھی انتظار نہیں کیا اور پُرجوش لہجے میں خوشخبری سنائی۔ جواب میں پہلے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی اور پھر کوئی روتی ہوئی آواز میں بولا۔

''غضب ہو گیا سائیں! سائیں معظم شاہ کو گولی لگ گئی ہے۔'' اطلاع تھی کہ اس کے کانوں میں صور پھونکا گیا تھا۔

اسے لگا کہ بینچ پر بیٹھے بیٹھے اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے۔

☆☆☆

''اچھا یار چلتا ہوں۔ تو اپنا خیال رکھنا اور ڈاکٹر کی ہر ہدایت پر عمل کرنا۔ ڈاکٹرز نے مجھے پورا یقین دلایا ہے کہ تیری ٹانگ پھر سے پہلے کی طرح ہوجائے گی۔ فزیو تھراپسٹ سے بھی میں نے تیرے لیے ٹائم لے لیا ہے۔ پندرہ دن بعد تیری فزیو تھراپی شروع ہوجائے گی اور اس کے تھوڑے عرصے بعد تو چنگا بھلا ہوکر چلنے پھرنے لگے گا۔'' وہ بہت دیر سے مومی سے ملنے آیا ہوا تھا۔ اب رخصت ہونے لگا تو ایک بار پھر اس کے سامنے وہی باتیں دہرائیں جو پہلے بھی کر چکا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں وکی! تو میرے لیے اتنی ٹینشن مت لیا کر۔ جو قسمت میں لکھا ہوگا، اسے بھگت لوں گا لیکن تیری یہ اداس شکل مجھے اچھی نہیں لگتی۔'' مومی نے اسے اپنی طرف سے تسلی دیتے ہوئے ٹوکا تو وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ اسے کسی سے اپنے دل کا حال کہنے کی عادت نہیں تھی اس لیے مومی دوست ہوتے ہوئے بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا دوست کہیں دل ہار چکا ہے اور اب کسی کے غم میں خود بھی ہلکان ہوا پھرتا ہے۔

''نیلی آئے تو اسے میری طرف سے پوچھنا۔ کئی دنوں سے اس سے ملاقات نہیں ہو پا رہی ہے۔'' وہ جانے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا اور مومی سے الوداعی باتیں کر رہا تھا۔

''وہ بھی تمہیں یاد کر رہی تھی لیکن آج کل مصروف بہت ہے۔ نئے بندے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے میں اسے مشکل ہو رہی ہے اس لیے ماسٹر اسے زیادہ پریکٹس کروا رہا ہے۔ بیچ میں کسی وقت موقع لگا کر بس تھوڑی دیر کے لیے ہی چکر لگا پاتی ہے۔'' مومی نے اسے بتایا۔

''آئے تو اسے میری طرف سے پوچھنا۔'' اس نے کہا اور پھر مومی سے مصافحہ کرکے باہر نکل گیا۔ ابھی دروازے سے نکلا ہی تھا کہ اس کا موبائل بجنے لگا۔ اس نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا تو لالہ عیسیٰ کا نمبر دیکھ کر چونک گیا۔

''سلام لالہ! کیسے یاد کیا؟'' فوراً ہی کال ریسیو کی اور ادب سے پوچھا۔

''تیرے کو بولنا تھا کہ آج رات نو بجے ڈنر سوٹ پہن کر تیار رہنا۔ تیرے کو اپنے ساتھ ایک جگہ جانے کا ہے۔'' لالہ نے اسے بتایا اور حسب عادت اس کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ لالہ کے حکم سے انکار کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ بس گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور موبائل جیب میں رکھ کر موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا۔

ٹھیک نو بجے حسب ہدایت تیار ہوکر وہ لالہ کے روبرو پہنچ چکا تھا۔ ادھر بھی پورے اہتمام سے تیاری کی گئی تھی۔ سیاہ ڈنر سوٹ میں لالہ بھی بڑا جچ رہا تھا۔ وہ بہت کم اس انداز میں تیار ہوتا تھا اور عموماً رف سے کپڑے ہی پہنتا تھا اس لیے وقاص کو لگا کہ وہ اسے اپنے ساتھ کسی خاص کام سے لے جا رہا ہے۔ لالہ کی آرام دہ ائرکنڈیشنڈ گاڑی میں اس کے ساتھ بیٹھ کر سفر کرتے ہوئے وہ منتظر رہا کہ لالہ اسے بریفنگ دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور لالہ ہلکے پھلکے موضوعات پر تبادلہ خیال کرنے کے علاوہ کچھ نہیں بولا۔ آخرکار ... سفر تمام ہوگیا اور گاڑی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کی پارکنگ میں جا رکی۔ ڈرائیور نے نیچے اتر کر پچھلی جانب کا دروازہ کھولا تو لالہ اسے اپنے ساتھ لیے باوقار انداز میں داخلی دروازے کی طرف بڑھا جہاں باوردی مؤدب دربان نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ اس کے اندازے کے برخلاف لالہ نے ڈائننگ ہال کا رخ نہیں کیا اور سیدھا ریسیپشن کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں چست کوٹ پتلون میں ملبوس دو طرح دار لڑکیاں ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے موجود تھیں۔

''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں سر؟'' لالہ ریسیپشن کے سامنے رکا تو ان میں سے ایک نے مؤدب لہجے میں انگریزی میں دریافت کیا۔ لالہ نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سلور کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھا۔ کارڈ دیکھ کر لڑکی پہلے سے زیادہ چونکی اور مؤدب نظر آنے لگی اور فوراً ہی اپنے سامنے لگے پینل پر موجود ایک بٹن دبایا۔ ردعمل میں ٹو پیس سوٹ میں ملبوس ایک شخص چراغ کے جن کی طرح نمودار ہوگیا۔

''سلور کارڈ گیسٹ۔'' لڑکی نے اس سے صرف دو لفظ کہے اور وہ لالہ کے قدموں میں بچھنے لگا۔ بے پناہ عزت واحترام سے انہیں ایک لفٹ میں سوار کروایا گیا۔ لفٹ نے اوپر کی کسی منزل کی طرف جانے کے بجائے انڈر گراؤنڈ سفر کیا اور چند سیکنڈوں میں ہی رک گئی۔ لفٹ کا دروازہ کھلنے پر وہ باہر نکلے تو ایک نک سک سے تیار حسین و نازک عورت اپنے سے تقریباً تین گنا وزنی مرد کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھی۔

''مسٹر عیسیٰ! موسٹ ویلکم۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ہماری دعوت ضرور قبول کریں گے۔'' عورت نے خوش آمدید کہنے میں پہل کی اور گرم جوشی سے لالہ سے مصافحہ کیا۔

''آپ کی دعوت کو کون کافر رد کرسکتا ہے مسز خان!'' لالہ نے خوش اخلاقی سے اسے جواب دیا اور اس کے شوہر سے ہاتھ ملانے لگا۔ عورت، وقاص کی طرف متوجہ ہوگئی اور مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کی مسکراہٹ اور مصافحے، دونوں میں بے باکی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ مسٹر عیسیٰ کا کوئی بیٹا بھی ہے۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس کی آواز میں بڑا لوچ تھا۔

''میں لالہ کا بیٹا نہیں، رائٹ ہینڈ ہوں۔'' وقاص نے اس کی تصحیح کی۔

''رئیلی۔ دیکھنے میں تو آپ دونوں بالکل باپ بیٹے لگ رہے ہیں۔'' اس نے حیرت کے اظہار کے لیے آنکھیں پھیلائیں۔

''وکی کو آپ میرا بیٹا ہی سمجھیے۔ بہت عزیز ہے یہ مجھے۔'' لالہ نے اس کا تبصرہ سن لیا تھا چنانچہ پلٹ کر بولا۔

''آپ کو عزیز ہے تو سمجھیں ہم بھی انہیں عزیز ہی رکھیں گے۔'' اس نے ایک خاص ادا سے کہا اور جملے کے اختتام پر اپنی مترنم ہنسی کا جادو جگایا۔ اتنی گفتگو کے بعد انہیں ایک بڑے ہال میں ان کے لیے مخصوص میز تک پہنچا دیا گیا۔ ہال میں اور بھی کئی افراد موجود تھے جن میں سے کچھ کے چہرے وقاص کے لیے شناسا تھے اور کچھ کو وہ نہیں جانتا تھا۔ شناسا چہروں میں یزدانی اور عرفان اللہ بھی شامل تھے۔

''داراب خان اور اس کی بیوی سونیا خان سے اپن کی حال ہی میں دوستی ہوئی ہے۔ مطلب کے لوگ لگے، اس لیے دوستی کو گہرا کرنے کا فیصلہ کرلیا اور آج اس کی دعوت پر یہاں چلا آیا۔'' لالہ عیسیٰ نے دھیمی آواز میں اسے بتایا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ لالہ کو اپنا دھندا چلانے کے لیے سرکاری ملازمین، سیاست دانوں اور صنعت کاروں سمیت دیگر بااثر شخصیات سے تعلقات بنا کر رکھنے پڑتے تھے اس لیے وہ ان لوگوں سے ملتا جلتا رہتا تھا۔ ان مواقعوں پر وقاص بھی کبھی کبھار اس کے ساتھ موجود رہتا تھا لیکن سونیا اور داراب خان سے یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے اسپیشل ہال میں دعوت کا اہتمام کرکے ثابت کردیا تھا کہ وہ بہت اونچی پارٹی ہیں۔ انتظامات سے بھی ان کی امارت کا احساس ہو رہا تھا۔ باوردی بیرے بھری ٹرے ہاتھ میں لیے مسلسل اردگرد گردش کر رہے تھے۔ سافٹ ڈرنکس سے زیادہ شراب پی جارہی تھی۔ لالہ عیسیٰ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے لگا۔ دوسری طرف سونیا اور داراب خان اسٹیج پر چڑھ گئے اور مہمانوں کی آمد پر شکریہ ادا کرتے ہوئے بتانے لگے کہ یہ دعوت محض مل بیٹھنے کا ایک بہانہ ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس دعوت میں سارے دوست دل بھر کے انجوائے کرسکیں۔ سارے لوگوں نے تالیاں بجا کر ان میاں بیوی کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کی، پھر گویا باقاعدہ پارٹی شروع ہوگئی۔ میوزک، روشنی، خوشبوئیں، کھنکھناتے قہقہے اور لذت کام و دہن کا بہترین انتظام سب کچھ تھا اس پارٹی میں لیکن وقاص بیزاری محسوس کر رہا تھا۔

''انجوائے کرو ینگ مین! آج کل تم بہت ڈل نظر آرہا تھا اس لیے اپن تجھے لے کر ادھر آیا ہے۔'' لالہ اسے ٹوک کر خود لوگوں سے ملنے کے لیے اٹھ گیا لیکن وہ اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہا۔ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ اس کی زیادہ توجہ یزدانی اور عرفان اللہ پر تھی۔ یہی وہ دو لوگ تھے جن سے وہ معاذ کے بارے میں کچھ جان سکتا تھا لیکن مسئلہ یہی تھا کہ وہ انہیں اس بات پر کیسے آمادہ کرتا کہ وہ اپنی زبان کھول دیں۔ اپنے لوگوں کے ذریعے ان کی کھوج لگانے کی کوئی ترکیب تو ابھی تک کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی اور سیدھے سیدھے ان پر ہاتھ ڈالنے میں لالہ کی ناراضگی کا خدشہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ دو افراد لالہ کے دوستوں کی فہرست میں شامل ہیں۔

''کیا یزدانی صاحب نے آپ کے بیل چرا لیے ہیں جو انہیں یوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں؟'' بہت قریب سے شوخی کے ساتھ کیے گئے اس سوال پر چونک کر اس نے اپنی گردن موڑی تو سونیا خان کو قریب کھڑا پایا۔

''میں تو بس ایسے ہی لوگوں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ شاید یزدانی صاحب پر نظریں زیادہ دیر ٹک گئیں جو آپ نے نوٹس لے لیا۔''

''نوٹس لینا تو بنتا ہے۔ ایک ہینڈسم نوجوان اپنے اردگرد بکھرے حسین و دلربا چہروں کو چھوڑ کر ایک ادھیڑ عمر

حساب

جب گناہوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتیں مسلسل تمہیں ملتی رہیں تو ہوشیار ہوجانا..... کہ تمہارا حساب قریب اور سخت ترین ہے۔

منع ہے

ہمارا ملک واحد ملک ہے جہاں دیوار پر لکھ کر بتانا پڑتا ہے کہ دیوار پر لکھنا سخت منع ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

آدمی کو دیکھنے میں معروف ہو تو یہ تو سیدھی سیدھی حق تلفی ہوئی نا۔'' اس نے گویا شکایت کی۔

''آپ چاہیں تو اسے بدذوقی کا نام بھی دے سکتی ہیں۔'' وقاص نے ترنت جواب دیا۔

''لوگوں کا ذوق بدلنا ہم خوب جانتے ہیں۔ بس ایک منٹ انتظار فرمایئے۔'' وہ بدمزہ ہوئے بغیر شوخی سے بولی اور اس کی طرف لطف لینے والے انداز میں دیکھنے لگی۔ خوبصورت ہونے کے باوجود وہ اس عورت سے الجھن محسوس کررہا تھا لیکن اظہار اس لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ میزبان تھی اور اسے آدابِ مہمانی نبھانے تھے۔ ایک منٹ کا عرصہ گزرا تو ہال کی روشنیاں مدھم پڑگئیں اور ڈانسنگ فلور جگمگانے لگا۔ ساتھ ہی میوزک کی لے بھی بدل گئی۔

''کم آن۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے ڈانسنگ فلور پر لے گئی اور اپنا ایک ہاتھ اس کے سینے پر رکھ کر دوسرا کمر میں حمائل کردیا۔ وقاص کو بھی مجبوراً اس کا ساتھ دینا پڑا۔ شروع میں میوزک ہلکا تھا اور جوڑے دھیرے دھیرے رقص کررہے تھے لیکن آہستہ آہستہ میوزک کا انداز بدلتا چلا گیا اور رقص کرنے والوں کے انداز میں بھی جوش بڑھ گیا۔ سونیا خان بھی بہت پُرجوش رقص کررہی تھی اور وقاص کو اس کا ساتھ دینا پڑرہا تھا۔ سونیا خان کوئی اتنی معمولی عورت نہیں تھی کہ اس کے ساتھ موجود مرد اس سے قطعی اپنا دامن بچالیتا۔ حسن کی دولت سے مالا مال اس عورت کی بانہوں میں بانہیں ڈالنے وقاص کی بھی دھڑکنیں اُچھل پھل تھیں اور رگوں میں دوڑتا خون گرم سے گرم ہوتا جارہا تھا۔ میوزک رکنے تک ہال کے خنک ماحول کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں اور سانس غیر متوازن ہوچکی تھی۔ سونیا خان کا چہرہ بھی ہلکا سا سرخ ہورہا تھا۔

''ابھی بہت ینگ ہو۔ جوانی کو انجوائے کرو۔ جوانی اور زندگانی دونوں لوٹ کر آنے والی چیزیں نہیں ہیں۔'' ڈانسنگ فلور سے اترتے ہوئے سونیا خان نے اس کے کان میں سرگوشی کی اور ہوا کے جھونکے کی طرح اس سے الگ ہوکر آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد رقص کے دور مزید ہوئے۔ سونیا خان تقریباً ہر بار کسی نہ کسی کی بانہوں میں نظر آئی البتہ اس کا موٹا شوہر سستی سے ایک طرف بیٹھا جام لنڈھاتا رہا۔ یزدانی، عرفان اللہ اور لالہ عیسیٰ سمیت ہر اہم شخص سونیا خان کی قربت سے لطف اندوز ہوا۔ پھر رقص کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد درمیان میں تھوڑا سا وقفہ دیا گیا۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ حاضرین کے ذوق کی تسکین کے لیے ایک زبردست آئٹم پیش کیا جارہا ہے۔ پورے ہال کی روشنیاں بجھا کر آئٹم پیش کرنے کے لیے جس شعلہ جوالا کو سامنے لایا گیا، اس نے سب کے ہوش اڑا کر رکھ دیے۔ دیسی لوگ ویسے بھی بدیسی حسن کے دیوانے ہوتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ حسن بے حجاب اور پارے کی طرح متحرک تھا۔ لوگوں نے اپنی اپنی حیثیتیں بھلا کر غل مچا کر رکھ دیا۔ وقاص کو اس سارے ہنگامے سے بیزاری ہونے لگی لیکن وہ لالہ عیسیٰ کی مرضی کے بغیر وہاں سے جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ادھر دیگر لوگ تھے کہ بڑھ چڑھ کر ونس مور کے نعرے لگائے جارہے تھے۔ رقاصہ ناچتے ناچتے نڈھال ہوکر گرنے کے قریب ہوگئی لیکن لوگوں کا جوش و خروش ماند نہ پڑا۔ دو چار تو مست ہوکر سٹرک چھاپ غنڈوں کی طرح اپنی جگہ چھوڑ کر رقاصہ تک پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ اس موقع پر نامعلوم مقامات پر پوشیدہ سیکیورٹی گارڈز حرکت میں آئے اور رقاصہ کو اس طرح اپنے حصار میں لیا کہ کسی بھی فرد کی اس تک رسائی ممکن نہیں رہی۔ وہ لوگ رقاصہ کو اپنے حفاظتی حصار میں لیے خارجی راستے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک گارڈ کے چہرے نے وقاص کو چونکا دیا۔ اس شخص کو کچھ دن قبل ہی اس نے سعیدہ بیگم کی قبر کی تصویریں کھینچتے ہوئے دیکھا تھا اور اب وہ سیکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے دکھائی دے رہا تھا۔ آخر وہ کون تھا؟ وقاص اس کی اصلیت جاننے کے لیے بے چین ہوگیا اور ان لوگوں کے پیچھے خود بھی خارجی راستے کی طرف بڑھا۔ ہال کی روشنیاں ابھی تک گل تھیں اس لیے اسے امید تھی کہ کسی کو اس کے اٹھ کر جانے کی خبر نہیں ہوگی۔ جب تک وہ باہر آیا، وہ لوگ لفٹ میں سوار ہوچکے تھے۔ اس نے پانچ کا روشن ہندسہ دیکھا اور دوسری لفٹ میں گھس کر خود بھی پانچویں منزل کے لیے بٹن دبا دیا۔ چند سیکنڈوں کے فرق سے وہ بھی پانچویں منزل پر موجود تھا۔ وہ لوگ اس سے چند قدم آگے بائیں جانب کے کوریڈور میں مڑ رہے تھے۔ وہ بھی ان کے پیچھے لپکا۔ اس سے قبل کہ وہ ان لوگوں کے پیچھے کوریڈور میں قدم رکھتا، اس کی گردن پر لوہے کا ٹھنڈا لمس جاگا اور ایک سخت اور سرد آواز نے تنبیہی لہجے میں کہا۔

''اسٹاپ۔''

وہ اپنی جگہ پر ساکت ہونے پر مجبور ہوگیا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

پناہ

امجد جاوید

بعض اوقات انسان چھوٹی سی نادانی میں اپنا بہت بڑا نقصان کرلیتا ہے... وہ بھی محض شہرت کی پیاس میں ایک ایسے صحرا میں جانکلی جہاں پہلے ہی پیاس نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ ایسے بھٹکے ہوئے مسافروں کو بے سمت بھٹکنے کا احساس ہوتا ہے نہ ہی کوئی دکھ...

بے نام رشتوں میں پناہ تلاش کرنے والے چند لوگوں کا قصہ

وہ جس کی آواز نے مجھے اب تک اپنے حصار میں لیا ہوا تھا، جب میرے سامنے بیٹھ کر محوِ گفتگو ہوئی تو ساری دل آویزیاں ہمارے درمیان سمٹ آئی تھیں۔ ایک خوبصورت عورت جو آپ کی ہم خیال بھی ہو، سامنے بیٹھی اپنی چاہت کا احساس دلا رہی ہو تو نشہ ہو جانا فطری سی بات ہے۔ وہ تصویر سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ ہم دونوں مہنگے ترین ہوٹل کی لابی میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں پچھلے چار برسوں سے اس کی آواز فون پر سن رہا تھا۔ مختلف جگہوں

پر اس کی تصویریں دیکھی تھیں۔ وہ مجھے اکثر کہا کرتی تھی۔

''جب تم میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرو گے نا، تب میرے ساتھ عشق ہو جائے گا تمہیں۔''

اب مجھے اس سے عشق تو کیا ہونا تھا، ہاں مگر اس کے حسن نے مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔

وہ بس یونہی میری دوست بن گئی تھی۔ حالانکہ کہاں وہ طاقتور اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی اونچے درجے کی آفیسر تھی اور کہاں میں عام سا مڈل کلاس لکھاری۔ اس نے ہی مجھے ایک ادبی کانفرنس میں بلایا تھا۔ یہ ادبی کانفرنس تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصل مقصد تو ملاقات کے ساتھ معاشی فائدہ دینا تھا۔

''نائلہ، بلاشبہ تم حسین ہو۔'' میں نے خمار آلود آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہونے کے بجائے سنجیدگی سے بولی۔

''اچھا ایک بات بتاؤ، لیکن بالکل سچ بتانا، میں نے آج تک تم سے ایسا سوال نہیں کیا۔''

''پوچھو، سچ بتاؤں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟'' اس نے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے دھیمے سے پوچھا۔

''میرے معاشی مسائل، میں اب تک اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکا، اتنا پڑھ لکھ کر بھی کوئی ایسی جاب نہیں پا سکا بس جیسے ہی کوئی اچھی جاب ملی ..... ویسے کیا تمہارا ارادہ ہے میرے ساتھ شادی کرنے کا؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی پھر بولی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میرا ایک شوہر ہے، ایک بیٹا ہے، ایک بیٹی ہے۔ ماشاءاللہ ہماری بہترین زندگی ہے۔''

''تم اگر آفر بھی کرتی نا تو میں انکار کر دیتا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''وہ کیوں .....؟''

''تم دوست اچھی ہو۔ ویسے بھی مجھ سے عمر میں کتنی بڑی ہو، تم بیوی کم اور .....'' میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اچانک ہی وہ سامنے دیکھنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات ابھرے اور پھر مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، سامنے سے ایک عورت آ رہی تھی۔ پہلی نگاہ میں وہ ایک تراشے ہوئے بدن والی حسین عورت دکھائی دیتی تھی۔ پورے لباس میں ہر انگ واضح ہو رہا تھا۔ نائلہ اُس عورت سے گلے ملتے ہوئے پُرجوش انداز میں بولی۔

''ارے ماہین تم یہاں، مجھے یقین نہیں آ رہا، تم مجھے یوں ملو گی۔''

''یقین جانو نائلہ میرا بھی یہی حال ہے۔'' ماہین نے بھی پُرجوش انداز میں کہا۔ دونوں گلے ملنے کے بعد میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ پتا چلا کہ دونوں پرانی کلاس فیلوز ہیں۔ کافی حد تک دوستی بھی تھی۔ میں خاموشی سے چائے پیتا رہا۔

''یہاں کیسے؟'' نائلہ نے حیرت سے پوچھا۔

''یہیں کانفرنس میں آئی ہوں، مشاعرہ پڑھنا ہے۔'' ماہین نے ذرا سے تفاخر اور دھیمی سی مسکان سے کہا۔

''ارے واہ، شاعری کرنے لگی ہو، ویسے کالج میں تم شعر تو خاصے پڑھتی تھیں۔'' نائلہ نے مان لینے والے انداز میں کہا۔

''بس تھوڑا بہت شوق تو مجھے پہلے ہی سے تھا۔'' اس نے اپنے سامنے دھری میز پر سیل فون رکھتے ہوئے کہا تو نائلہ نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اسی دوران میری میزبان نے میرا تعارف بھی کراتے ہوئے کہا۔

''آپ ہیں شعیب رضا.....''

''ارے وہی فکشن رائٹر، نام تو سنا ہے۔'' اس نے پُرشوق نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا تو نائلہ نے بصد شوق کہا۔

''کیا پڑھ رہی ہو ماہین، سناؤ گی کچھ۔''

''ابھی.....'' اس نے پُرشوق لہجے میں حیرت سے پوچھا۔

''ہاں ہاں، سناؤ، یہ بھی سن لیں گے۔'' نائلہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے سیل فون کی اسکرین روشن کی اور ایک غزل کا مطلع کہا۔ پھر وہ شعر کہتی گئی۔ غزل پڑھ چکی تو نائلہ داد دیتے ہوئے واہ واہ کرنے لگی۔ تبھی ان دونوں کو میری خاموشی کا احساس ہوا۔

''رضا، کیسی لگی ماہین کی غزل.....؟'' نائلہ نے پوچھا۔

''دیکھو تم دونوں باتیں کرو، میری رائے مت لو۔'' میں کھردرے سے لہجے میں بولا۔

''نہیں آپ کہہ دیں جو بھی آپ کی رائے ہے۔'' ماہین نے اسی تفاخر بھرے لہجے میں کہا۔

''بس چھوڑیں، آپ باتیں کریں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''بتائیں نا، اگر کوئی سقم ہو گا یا کچھ بھی خامی ہو گی تو دور ہو جائے گی نا۔'' ماہین نے بڑے مان سے کہا تو میں نے ایک نگاہ نائلہ کی طرف دیکھا اور بغیر لگی لپٹی کہا۔

''تک بندی سے ذرا سا اوپر، شاعری کے قریب تر......''

''مطلب، یہ......'' نائلہ نے الجھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ میں نے ذرا سا بھی پاس نہیں کیا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا میری رائے مت لو۔'' میں نے بدمزگی سے کہا۔ اس دوران میں نے ماہین کا چہرہ دیکھا، جس پر دبا دبا غصہ تھا لیکن مجھے ذرا سی بھی پروا نہیں تھی۔ میں نے جو، جیسا تھا، ویسا کہہ دیا۔

''اوکے۔'' نائلہ نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور ماہین کی جانب متوجہ ہو گئی۔ تبھی میں بولا۔

''نائلہ، میں اب آرام کروں گا، آپ کرو باتیں۔''

''ہاں بس میں بھی نکلتی ہوں، رات کافی ہو گئی ہے، ابھی مجھے ایک دو کام بھی دیکھنے ہیں۔'' نائلہ نے کہا تو ماہین اٹھتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے نائلہ، کل ملتے ہیں، میں بھی کافی تھک چکی ہوں۔''

ہم دونوں ہی نائلہ کو خدا حافظ کہہ کر لفٹ میں داخل ہو گئے۔ میں نے اپنے فلور کا بٹن دبا دیا لیکن ماہین نے نہیں دبایا۔ مجھے لگا اس نے بھی اسی فلور پر جانا ہوگا۔ لفٹ چل پڑی تو اس نے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

''میں آپ سے تھوڑی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، کر لیں لیکن میں کوئی معذرت وغیرہ نہیں کروں گا کہ آپ کی......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''نہیں، کوئی ایسی بات نہیں، لیکن میں بات اپنی شاعری کے بارے میں کرنا چاہوں گی۔''

''ہاں، اگر آپ یہ بات کر لیں تو آپ کے لیے بہت بہتر رہے گا۔'' میں نے پورے خلوص سے کہا۔

''اوکے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ لفٹ کا دروازہ کھل گیا۔ ہم دونوں باہر آ گئے۔ وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی کمرے تک آ گئی۔ میں نے کمرا کھولا اور وہ میرے ساتھ ہی کمرے میں آ کر سامنے دھرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سکون سے بولی۔ ''آپ چاہیں تو ایزی ہو جائیں۔ میں انتظار......''

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''آپ کو میری شاعری کیوں......'' اس نے وہی سوال کیا جس کی مجھے توقع تھی۔

''دیکھیں، میرے خیال میں یہ آپ کی شاعری تھوڑی ہے...۔ اس میں کسی دوسرے کی بھی کوشش ہے۔ میرے لیے یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ آپ کو اس مشاعرے میں کیوں اور کیسے بلا لیا گیا۔ یہاں کئی آپ جیسی ہوں گی یا ہوں گے۔ آپ کو داد بھی مل جائے گی اور......''

''اس شاعری میں کیا خرابی ہے؟'' اس نے حتمی لہجے میں پوچھا تو میں نے...... لمحہ بھر سوچا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ کے مشاعرے کی صدارت فہیم نے کرنی ہے نا؟''

''جی انہوں نے ہی کرنی ہے۔'' اس نے اُکتاہٹ سے کہا۔

''تو چلیں ان سے اسی غزل کے بارے میں رائے لیتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو میری رائے پر اعتماد نہ ہو۔ کیا خیال ہے؟'' میں نے اس کی تشنہ سی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ان کی رائے لے لیں۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ میں نے فون نکالا اور اسے غزل نکالنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحوں میں رابطہ ہو گیا تو میں نے اسپیکر آن کر دیا۔

''ارے بھئی، ہم نے سنا ہے، تم آ گئے ہو ہمارے شہر میں لیکن تمہارا دور دور تک پتا نہیں، کہاں غائب ہو میاں؟'' انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ کی رسائی کے تو کیا کہنے استادِ محترم، ابھی شام ہی کے وقت پہنچا ہوں، آرام کرنے کا موقع تک نہیں ملا۔ اگر آپ کے پاس آ جاتا تو کل کچھ بھی نہ کر سکتا۔ ہماری نشست ختم ہو گی تو آپ کا مشاعرہ... شروع ہو گا۔ مجھے فراغت ہو گی تو ملتے ہیں کل مشاعرے کے بعد۔'' میں نے خوشگوار انداز میں کہا۔

''ہاں یار، وہ بھی بوریت کا وقت کاٹنا ہے۔ خیر، کٹ جائے گا۔ تین گھنٹے کی بوریت کے عوض اگر تین ماہ کا راشن مل جائے تو کیا برائی ہے۔ یہ سینئر شاعر ہونا بھی عذاب ہو گیا ہے اب تو۔'' ان کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔

''اچھا استادِ محترم، ہم باقی باتیں کل کریں گے ابھی ایک غزل سنیں، لیکن شرط یہ ہے کہ پوری غزل سن لینے کے بعد آپ کو اپنی رائے دینی ہے۔'' میں نے محتاط انداز میں کہا۔

''ہاں ہاں، سناؤ۔'' انہوں نے اشتیاق سے کہا تو میں نے 'غزل' کے ساتوں 'شعر' سنا دیے۔ میں سنا چکا تو وہ

چند لمحے خاموش رہے پھر بڑے مایوسانہ لہجے میں بولے۔

''میاں اگر یہ شعر تمہارے ہیں تو مجھے مایوسی ہوئی اور اگر تم نے کسی کو لکھ کر دیے ہیں تو بہت زیادہ مایوسی ہوئی۔''

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے کچھ بتائے بنا پوچھا تو وہ مخلصانہ انداز میں بولے۔

''یار اس غزل کو ٹھیک کرو۔ کم از کم پوری طرح وزن میں لاؤ۔ خیال کو ٹھیک طرح سے باندھو، محض قافیہ پیمائی نہ کرو نا، کیا تم وزن بھی بھول گئے ہو؟'' انہوں نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے استاد محترم۔ پھر ملتے ہیں کل۔'' میں نے کہا اور چند الوداعی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ میں نے ماہین کو فون واپس کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بولی۔

''استاد محترم نے سچ کہا۔ میں ایک شاعرہ سے اصلاح لے رہی ہوں۔ یہ غزل ان کی دیکھی ہوئی ہے۔ اس میں صرف خیال میرے ہیں۔''

''کسی شاعرہ ہی سے اصلاح لینا کیوں، کسی استاد شاعر سے.....'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''چھوڑیں، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خیر، آپ کی اور استاد محترم کی باتوں سے مجھے یہ پتا چلا کہ آپ بھی شاعر ہیں، فن شاعری سمجھتے ہیں اور غزل لکھ کر بھی دے دیتے ہیں۔''

''آپ نے ٹھیک سمجھا۔ کوئی دور تھا جب مجھے بھی شاعری کا شوق تھا، غزل کہتا تھا مگر اب نہیں... کیونکہ شاعری میرے معاشی مسائل حل نہیں کر سکی۔ ہاں اب غزل تب کہتا ہوں، جب کسی کو چاہیے ہوتی ہے، دے دیتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔

''چلیں، میری یہ تین غزلیں ہیں، انہیں آپ درست کر دیں۔'' اس نے ایک دم سے کاروباری لہجے میں کہا۔

''ابھی لیں گی یا صبح؟'' میں نے بھی ویسا ہی رویہ رکھا۔

''ابھی.....'' اس نے کہا تو میں نے اپنے بیگ سے چند کاغذ نکالے، میں لکھنے والی میز کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ شعر بولتی گئی، میں لکھتا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے وہ غزلیں اسے تھما دیں۔

''کتنے پیسے؟'' اس نے اپنا پرس سیدھا کرتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی جائیں، کل جب آپ یہ مشاعرے میں پڑھیں گی، اس میں جتنی بھی اور جیسی بھی داد ملی، اسی حساب سے مجھے خود ہی طے کر کے ادائیگی کر دیجیے گا۔ اب مجھے سونا ہے۔'' میں نے کہا اور ایزی ہونے کے لیے اٹھ گیا۔ وہ چند لمحے کھڑی سوچتی رہی پھر شب بخیر کہہ کر چلی گئی۔

سارا دن آوارگی کے بعد ہوٹل میں وہ میری دوسری رات تھی۔ اگلے دن شام کے وقت میری فلائٹ تھی اور میں نے صبح سے شام تک کا وقت نائلہ کے ساتھ گزارنا تھا۔ میں کچھ دیر پہلے بستر پر آ کر لیٹا تھا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ جب تک میں دروازے تک پہنچا، دوسری دستک ہو چکی تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ماہین کھڑی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں چمک رہی تھیں، لبوں پر دھیمی دھیمی سلگتی ہوئی سی مسکان اور چہرہ گلاب کے مانند کھلا ہوا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر راستہ دیا تو وہ اندر چلی آئی۔ میں دروازہ بند کر کے پلٹا تو وہ کھڑی تھی۔

''تشریف رکھیں۔'' میں نے کہا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مجھے پہلی بار احساس ہوا، تخلیق کیا ہوتی ہے اور اس پر داد کیسے ملتی ہے۔ میں شکریہ نہیں کہوں گی، بس.....''

''آپ تشریف تو رکھیں۔'' میں نے کہا تو وہ میرا ہاتھ چھوڑے بغیر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں بھی وہیں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مجھے لگا کہ میرا معاوضہ نوٹوں کی صورت میں نہیں ملے گا۔ پھر باہر مشاعرے کی داد کا عوضانہ اس بند کمرے میں سسکیوں کی صورت میں ابھر کر معدوم ہو گیا۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو ماہین جا چکی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر کافی سارے بڑے نوٹوں کے ساتھ ایک کاغذ پر فون نمبر لکھا ہوا ملا۔ میں نے چند لمحے سوچا اور انہیں اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

ایک برس گزر گیا۔

ہوٹل وہی لیکن کمرا کوئی دوسرا تھا۔ میں نے کمرے میں پہنچتے ہی سیل فون سے پیغام بھیج دیا کہ میں پہنچ چکا ہوں جس کے تھوڑی ہی دیر بعد دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ماہین اپنے چہرے پر جولانیاں سجائے میری جانب اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ پورے ایک برس کی شدت کا اندازہ اس کے ملنے سے ہوا۔

''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟'' اس نے مجھ سے الگ ہو کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں۔'' میں نے اطمینان سے کہا اور سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کا جائزہ لیتے ہوئے

پوچھا۔ ''کافی بدل گئی ہو، تھوڑی سی فربہ، ذرا سی سوبر، مطمئن سی، کیا ایسا ہی ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' اس نے شوخ انداز میں کہا پھر لمحہ بھر بعد مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اور اس کے ساتھ کافی سے زیادہ مشہور شاعرہ بھی تو ہوگئی ہوں آپ کی شاعری سے۔''

''ہاں تمہارا مجموعہ دیکھا تھا، بہت خوبصورت اور مہنگا چھپا ہوا ہے۔ اب وہ میری شاعری تو نہیں ہے تم اس کا معاوضہ بروقت بھجواتی رہی ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور آپ نے جو رازداری رکھی، یہاں تک کہ میری بھی کھوج نہیں کی..... میں کون ہوں، کہاں سے ہوں۔''

''مجھے ضرورت نہیں پڑی۔ ہاں مگر وہ سب تو جانتا ہوں جو اخبار، رسالوں وغیرہ میں چھپا۔'' میں نے کہا۔

''میرے بارے میں جاننے کی ضرورت کیوں نہیں پڑی؟'' اس نے اشتیاق بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں اپنی حد میں رہتا ہوں۔ تم نے جو میرے لیے حد رکھی، میرے لیے وہیں تک رہنا مناسب تھا.... بلاضرورت آگہی اکثر مسائل پیدا کر دیتی ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا تو وہ اکتاہٹ سے بولی۔

''اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔ نائلہ آنے والی ہوگی، اس کے ساتھ ڈنر لیں۔ میرے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیجیے گا۔ کمرے میں واپس آتے ہی مجھے بس میسج کر دیں۔ میں بس آج ہی کی رات یہاں ہوں، کل مجھے جانا ہے، سمجھے آپ؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں سر ہلاتے ہوئے اُٹھ گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

☆☆☆

تیسرے برس بھی ہوٹل وہی تھا۔ ماہین لابی میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پہلی بار میں نے اسے جینز اور کھلے سے کرتے میں دیکھا تھا۔ ایک اسکارف اس کے گلے میں تھا، بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ ہلکا ہلکا میک اپ اور ناک میں نازک سی نتھلی تھی۔ میں جیسے ہی قریب پہنچا، اس نے مجھے گلے لگاتے ہوئے ہولے سے پوچھا۔

''اتنی دیر کیوں ہوگئی؟''

''ائرپورٹ سے یہاں تک ٹریفک بہت زیادہ تھا۔'' میں نے اس کے لہجے میں جھلکتے ہوئے اعتماد کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''آئیں چلیں۔'' اس نے بڑھ کر میرا بیگ پکڑ لیا اور ہم لفٹ کی جانب چل دیے۔ اس نے کمرا کھولا اور میرا بیگ رکھ کر بولی۔

''اس بار نائلہ تو ہے نہیں، آپ کو علم ہوگا وہ امریکا شفٹ ہوگئی ہے۔''

''ہاں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ فریش ہو جائیں پھر چلتے ہیں ڈنر کے لیے۔'' اس نے کہا اور کسی اجنبی کے مانند کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

ڈنر کے دوران ادھر اُدھر کی باتوں میں اچانک اس نے کہا۔

''کل شام میں نے واپس چلے جانا ہے۔ آج کی ہماری ملاقات یہیں اس ڈنر تک محدود ہوگی۔''

''مطلب، میں سمجھا نہیں، رات نہیں رہو گی میرے ساتھ؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں، کیونکہ اب میں بیوہ ہوگئی ہوں۔'' اس نے

نیوٹن کے وہ قوانین جو لکھنا بھول گیا

1- جب بھی بھی رانگ نمبر ڈائل ہو جائے تو کبھی بھی مصروف نہیں ملتا، آزمائش شرط ہے۔

2- اگر آپ نے ایک سے زیادہ چیزیں ہاتھ میں اٹھا رکھی ہیں تو ہمیشہ قیمتی اور نازک چیز زمین پر پہلے گرے گی۔

3- کوئی مشین مرمت کرتے ہوئے جب آپ کے ہاتھ تیل یا گریس سے بھر جائیں تو آپ کی ناک پر فوراً کھجلی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

4- دودھ ابالتے وقت آپ چاہے جتنی دیر مرضی کھڑے رہیں دودھ نہیں ابلے گا۔ جیسے ہی ایک منٹ کے لیے اِدھر اُدھر ہوئے، دودھ ابل کر باہر آجائے گا اور چولہے کا ستیاناس ہو جائے گا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

فرنیچر

یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں جس پر لیٹا نہ جا سکے۔

از مشتاق احمد یوسفی۔ مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

سکون سے کہا تو میں نے الجھتے ہوئے پوچھا۔
''بیوہ، مطلب کب.....؟''
''پانچ ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔'' وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔
''خیر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں جبر کا قائل نہیں، تم نے اگر مجھے پہلے نہیں بتایا تو میں اب بھی نہیں پوچھوں گا۔ اگر بس یہی ایک ڈنر تک کی ملاقات تھی تو مجھ پر اتنا خرچ کر کے یہاں کیوں بلوایا؟''
''اس لیے کہ میں نے آپ سے ایک بہت اہم بات کرنا تھی۔'' اس نے پھر اسی اطمینان سے کہا۔
''بات کرنا تھی۔ وہ تم مجھ سے فون.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولی۔
''نہیں، وہ آمنے سامنے بیٹھ کر ہی کی جا سکتی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر بولی۔ ''میرا شوہر اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ یہ بات میرے شوہر کو بھی معلوم تھی۔ مجھے بھی علم تھا۔ میں نے اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا تھا لیکن میں پہلی بار جب آپ سے ملی تو میں امید سے ہو گئی۔''
''تمہارے شوہر کو.....'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔
''اس نے مجھ سے سوال کیا لیکن میں اپنی اولاد کھونا نہیں چاہتی تھی، جس کے لیے میں ترس رہی تھی۔ وہ سوال کرتا رہا، پر میں خاموش رہی، یہاں تک کہ میرا بیٹا پیدا ہو گیا۔''
''مطلب وہ بیٹا میرا ہے؟'' میں نے پوچھا مگر اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بس کہتی چلی گئی۔
''پھر دوسرے برس بھی ایسا ہی ہوا۔ میں امید سے ہوئی اور دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ میرے شوہر کا پھر یہی سوال تھا۔ میں نے اسے باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ تمہارے ہی بچے ہیں لیکن وہ نہیں مانا یہاں تک کہ اس نے بچوں کا اور اپنا ڈی این اے ٹیسٹ کروایا۔ نتیجہ ظاہر ہے، وہ اس کے بچے نہیں تھے۔''
''اس نے تو شور مچا دیا ہو گا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔
''نہیں، بالکل خاموش ہو گیا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس سے کہوں کہ وہ مجھے طلاق دے دے۔'' اس نے کہا تو میں خاموش رہا وہ لمحہ بھر بعد بولی۔ ''میں نے اسے کہا کہ مجھے طلاق دے دو، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بس خاموشی..... سے دنیا سے چلا گیا۔''
''اوہ.....'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
میرے اندر ایک ہیجان اٹھ گیا تھا۔ میں نے اپنے اندر اٹھتے والے ہیجان پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے پوچھا ہے کیا وہ بچے میرے ہیں؟''
''ہاں، وہ آپ کے بچے ہیں۔ چاہیں تو ڈی این اے ٹیسٹ کروا سکتے ہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔
''سچ.....'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ چلنے لگا تھا۔ میری اولاد، میرے بچے، کیسے ہوں گے وہ۔ میں باپ بن گیا ہوں۔ میری اولاد ہے اس دنیا میں.....
''میں اس لیے آپ کے ساتھ رات نہیں رہ سکتی۔ اگر رہی تو پھر میں دنیا کو کیا جواب دے سکوں گی۔'' اس نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔
''جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا، پھر فوراً ہی پوچھا۔ ''اچھا تم نے تو مجھ سے... بات کیا کرنا تھی، جس کے لیے مجھے یہاں بلایا؟'' میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے پوچھا۔
''میں چاہتی ہوں آپ مجھ سے شادی کر لیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ کسی غزل کے بارے میں بات کر رہی ہو۔
''شادی اور میں..... تم جانتی ہو میں مشکل سے اپنا بوجھ خود اٹھا رہا ہوں اور ابھی مجھے کوئی ایسی جاب نہیں.....''
''کیا آپ میرے بارے میں نہیں جانتے؟ میں ایک بزنس ویمن ہوں۔ میرا شوہر اتنا چھوڑ گیا ہے کہ آپ کو کمانے کی ضرورت نہیں ہو گی۔'' اس نے کہا۔
''تم ایسا کیوں چاہتی ہو، تم اپنے طبقے کے کسی بھی امیر آدمی سے شادی کر سکتی ہو؟'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔
''ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی مجھ سے شادی کر لے گا لیکن وہ جو کوئی بھی ہو گا، میرے بچوں کو حقیقی باپ والا پیار کبھی نہیں دے سکتا، جو آپ دے سکتے ہو۔ بے نامی ہی سہی لیکن آپ ان کے حقیقی باپ ہیں۔'' اس نے کہا تو میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ اولاد جسے میں نے دیکھا تک نہیں تھا، جن کے بارے میں مجھے چند منٹ پہلے پتا چلا تھا، اس کے لیے میرے اندر کیا کیا جوار بھاٹا اٹھنے لگا تھا۔ وہ میرے جذبات سے بے نیاز کہہ رہی تھی۔ ''مجھ سے شادی کریں اور میرے ساتھ رہیں۔ ہم اپنی اولاد کی بہترین تربیت کے ساتھ مزید بہت کچھ تخلیق کر سکتے ہیں یا پھر ہماری یہ ملاقات یہیں ڈنر تک ہو گی۔ بولیں..... فیصلہ کریں.....''
میں نے اس اولاد کے لیے بے نام باپ بننا قبول کر لیا، جس پر میں کبھی اپنا حق نہیں جتا سکتا تھا۔

⌘⌘⌘

آتشیں سوال

صبا مغل

دولت کا چکر جب ذہین لوگوں کو چکر میں ڈال دیتا ہے، وہ تو پھر ایک معصوم بچہ تھا... اس کے لاشعور میں بھی بہت سے سوالوں نے شور برپا کیا ہوا تھا جن کے جوابات ڈھونڈتے ہوئے اس کا بچپن بہت بے چینی سے گزر رہا تھا کیونکہ... دولت کا چکر تو اچھے اچھوں کو گھن چکر بنا دیتا ہے۔

غربت میں لمحوں اور سکّوں کی گنتی کرنے والے ایک معصوم کا آتشیں سوال

بلال عرف بیلا آج پھر گاؤں سے ہٹ کر اسی پکی سڑک کے کنارے کھڑا تھا جس سے دوسری طرف نشیب میں امرود کے باغ دور تک پھیلے ہوئے تھے اور حد نگاہ پر ڈوبتے سورج کا منظر تھا۔ یہ وقت ..... ہاں بالکل ہر جمعرات کا یہی وقت ہوتا تھا جب صوبے دار چودھری نظام دین کی ٹویوٹا کرولا سڑک کے کنارے سے فراٹے بھرتی نمودار ہوتی تھی۔ بیلا اس گاڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور چودھری اس چھوٹے سے بچے کی غرض کو۔ آج بھی چودھری نے اس کے سامنے گاڑی روکی تو بیلا فوراً گاڑی سے جا لگا۔ شیشہ نیچے ہوا تو ایک شناسا سی مہک نے اس کو خوش آمدید

کہا۔ اس نے فوراً صاحب کو سلام کیا اور چودھری نے دس روپے کا کڑکڑاتا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بیلا..... چودھری کے بڑی مونچھوں والے بارعب چہرے، پتھر کی انگوٹھیوں والے گورے چٹے ہاتھ اور خاص طور پر اس کی گہرے بھورے رنگ کی لمبی ڈی کی والی گاڑی سے بے حد مرعوب ہوتا تھا۔

چند ہفتوں سے اس کا یہی معمول تھا۔ ہر جمعرات کو وہ چودھری کی خدا ترسی اور فراخ دلی سے مستفید ہو کر بابا شمس کی دکان سے اپنی من پسند مٹھائی خرید کر کھاتا جو اس سے پہلے صرف عیدوں یا بڑے میلے پر ہی اس کو کھانا نصیب ہوتی تھی۔ آج پیسے ملتے ہی اس نے بابا شمس کی دکان کی جانب دوڑ لگا دی۔ مغرب کی اذانیں بس ہونے ہی والی تھیں اور بابا ان سے دس پندرہ منٹ پہلے ہر صورت دکان بند کر دیتا تھا۔ وہ اندھا دھند دوڑے جا رہا تھا۔ بہہ نکلنے والی ناک بھی اس نے آستین سے پونچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ٹوٹی ہوئی جوتی سے اس کے گرد آلود پاؤں پھسل کر آدھے سے زیادہ باہر نکلے ہوئے تھے۔ بھینسوں کے چھپر کے دوسری طرف بابا کی چھوٹی سی دکان کے لکڑی کے کواڑ اسے کھلے دکھائی دیے تو جیسے اس کی سانس میں سانس آئی۔

''پترا! تیری لاہور والی برفی تو پورا ایک روپیا مہنگی ہوگئی ہے۔'' بیلے نے دس کا نوٹ دکان کے چوبی کاؤنٹر پر رکھا تو بابا شمس کی طرف سے مایوس کن خبر اس کی منتظر تھی۔ آنے دو آنے کی بات ہوتی تو بابا شمس، جسے سب لوگ بابا شمو بھی کہتے تھے، اتنے پیسوں میں ہی بیلے کے ہاتھ پر ڈلی رکھ دیتا پر..... پورا ایک روپیا..... ملتانی سوہن حلوے کی طرح یہ برفی بھی ایک چھوٹے سے پیکٹ میں ہوتی تھی اور اب آناً فاناً یہ پیکٹ دس کے بجائے گیارہ روپے کا ہو گیا تھا۔

''کیا کریں پترا..... مہنگائی ہی اتنی ہے۔ ہر چیز کو آگ لگی جا رہی ہے۔'' بابا شمس خجل سی مسکراہٹ لیے شیلفوں پر پڑے ڈبوں پر جھاڑن مارتا رہا۔ بیلے نے نوٹ واپس لیا۔ وہ سر جھکائے بھاری بھاری قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔

بیلا کچن میں بیٹھا چائے میں سنی ہوئی روٹی کے ٹکڑے پیالے سے نکال کر کھا رہا تھا۔ مہینے کی پہلی تاریخیں چل رہی تھیں۔ ایک دو دن میں ابا کے آنے کی پوری امید تھی۔ چھ ماہ قبل تک بیلے کا باپ گاؤں سے قریب ہی ایک پلاسٹک کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ گزر اوقات ہو رہی تھی پھر اچانک فیکٹری کے مالکان نے نچلی سطح پر کم اجرت پر کام کرنے والے قریباً چھ سو کے قریب مزدوروں کو نکال دیا جس میں بیلے کا باپ بھی شامل تھا۔ پھر کچھ دنوں بعد اسے ایک اور فیکٹری میں کم و بیش اتنی ہی اجرت پر کام تو مل گیا مگر فیکٹری گھر سے اتنی دور تھی کہ وہ اپنی کھٹارا سی سائیکل کو تین گھنٹے چلا کر بھی عشا تک گھر نہیں پہنچ سکتا تھا چنانچہ اس نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کھانے اور رہائش کا خرچہ بانٹا اور فیکٹری سے متصل سرونٹ کوارٹر میں رہنے لگا۔ اب پچھلے چھ مہینوں سے وہ ہر مہینے ایک یا دو دفعہ گھر کا چکر لگاتا تھا۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے اس کی گھر والی اور بچوں کو پیسوں کی تنگی کے علاوہ اور بہت سے مسائل کا سامنا تھا۔

بیلے کا ناشتا ختم ہوا تو وہ وہیں بیٹھے بیٹھے انتظار کرنے لگا کہ ماں روزانہ کا خرچہ نکالنے کے لیے آٹے کا چھوٹا سا کنستر کب کھولے گی جس میں مہینے کا خرچہ جو ابا شہر سے بھیجتا تھا، کپڑے کی پوٹلی میں بند کر کے رکھا ہوتا تھا۔ بیلا پکا ارادہ کر کے سویا تھا کہ وہ صبح ماں سے ایک روپیا لے کر مٹھائی خرید لے گا۔ کمرے سے کھنکھناہٹ کی آواز آئی تو بیلا فوراً اندر کی طرف لپکا۔

ماں کنستر نہیں کھول رہی تھی بلکہ اس کے ہاتھ میں غلہ تھا جسے وہ الٹا کر کے ریزگاری نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بیلا دل مسوس کے رہ گیا۔ ماں کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔

''بیلے..... چھوٹی کو پرسوں سے دست لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر کو چیک کروا کر نسخہ تو لکھوا لائی تھی پر..... دوائی تو بہت مہنگی ہے۔ کم از کم پچاس روپے چاہئیں اور پیسے تو ختم ہو گئے.....'' ماں نے ہتھیلی کھولی جس میں چند سکے تھے۔ کچھ سوچ کر وہ بیلے سے کہنے لگی۔

''تو ایسا کر، ان پیسوں سے اماں رکھو سے تھوڑے جامن لے آ۔ ان کو پیس کر کھلاتی ہوں۔ شاید ٹھیک ہو جائے۔'' ماں کے چہرے پر پریشانی اور رت جگے کی تھکن واضح تھی۔ دو سالہ زرینہ تھوڑی دور چارپائی پر نڈھال سی پڑی اونگھ رہی تھی۔ بیلے کے دل پر چوٹ سی لگی۔

''اماں! ایک بات پوچھوں.....؟'' بیلا، ماں کے موڑھے کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

''ہاں بیٹے! بولو'' وہ خالی ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بے بسی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

''چیزیں مہنگی کیوں ہو جاتی ہیں اماں؟'' ماں کچھ دیر خاموش رہی۔ آج اس کے آٹھ سالہ بیٹے نے بڑا مشکل سوال کر ڈالا تھا اس سے۔ وہ اپنے ذہن میں تانا بانا بنتی رہی، پھر گویا ہوئی۔

''بیٹے! اصل میں..... جب انسان سادگی پسند نہیں رہتے، ان کی ضرورتیں بڑھنے لگتی ہیں، رہن سہن اونچا ہونے لگتا ہے تو ویسے ہی مہنگائی بھی بڑھنے لگتی ہے۔ چیزیں مہنگی ہوتی جاتی ہیں۔ پیسے کی قیمت ہی نہیں رہتی۔''

ماں نے غمزدہ نظروں سے کیل کے ساتھ جھولتے ہوئے ڈاکٹری نسخے کو دیکھا۔ دواؤں کے نام اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ بیلا بھی دائیں بائیں نظریں گھمائے جیسے کچھ غور کر رہا تھا۔

''لیکن اماں..... ہماری ضرورتیں تو اتنی ہی ہیں۔ ہم تو ویسے ہی ہیں جیسے ہمیشہ سے تھے۔ وہ دیکھو..... کتنے ہی عرصے سے ہمارا گھڑا اوپر سے ٹوٹا ہوا ہے۔ ہم تو اسی میں پانی ڈالتے ہیں، نیا گھڑا تھوڑی خریدا ہے اور وہ دیکھو ابا کی سائیکل..... میں شاید زرینہ جتنا تھا جب اس کا کیریئر ٹوٹا، پھر اس کی ٹوکری ٹوٹ گئی اور اب تو گدی بھی پھٹ گئی ہے، پر..... ابا تو اب بھی اسی سائیکل پر باہر نکلتا ہے۔ اس نے سائیکل بھی نئی نہیں لی اور ہم سادہ ہی تو ہیں۔ سادہ کھانا کھاتے ہیں اور انڈے ڈبل روٹی کا ناشتا صرف اسی دن کرتے ہیں جس دن ابا گھر آتے ہیں اور پھر.....'' بیلا بول رہا تھا اور ماں کا ذہن گہری سوچوں میں ہلکورے لینے لگا تھا۔ وہ بیلے کو کوئی بھی جواب نہ دے پائی۔

بیلے نے ماں کو جامن لاکر دیے اور یونہی گلیوں میں گھومنے پھرنے کے لیے نکل پڑا۔

ٹیوب ویل پر اٹکھیلیاں کرتے ہوئے اس کی نظر ڈیرے پر کام کرتے چاچا اکرم پر پڑی۔ وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر اندھا دھند ٹوکا چلا رہا تھا۔ چاچے کے متعلق ابا اور اماں کے درمیان ہوئی گفتگو بیلے کے ذہن میں تازہ ہوگئی اور وہ دل مسوس کے رہ گیا۔

چاچا اکرم اور اس کی ماسو (خالہ) نائلہ میں ہمیشہ سے ہی اس کی سمجھ میں نہ آنے والا کوئی تعلق رہا تھا۔ اماں اور ابا کی باتوں میں کبھی کبھار ان دونوں کا اکٹھے ذکر ہوتا تھا مگر اب وہ اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ باتوں سے اصل معاملہ نہ سمجھ پاتا۔ چاچا، ماسو نائلہ سے جو رشتے میں بیلے کی سگی خالہ تھی، شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے، پر جب تک چاچا اپنی رہائش کا الگ سے بندوبست نہ کرلیتا، ماسو بیاہ کر ہمارے گاؤں نہیں آسکتی تھی۔ بیلے کے گھر میں تو ایک ہی کمرا تھا چھوٹا سا، جس میں بیلا اپنے والدین اور چھوٹی بہن کے ساتھ سوتا تھا۔ چاچا تو ہمیشہ باہر چھوٹے سے کچے صحن میں چارپائی ڈال کر سوتا تھا۔ اب دو مرلے کا گھر بنانے کی خاطر کافی عرصے سے چاچا سارا دن ملک شہباز کے کھیتوں میں کام

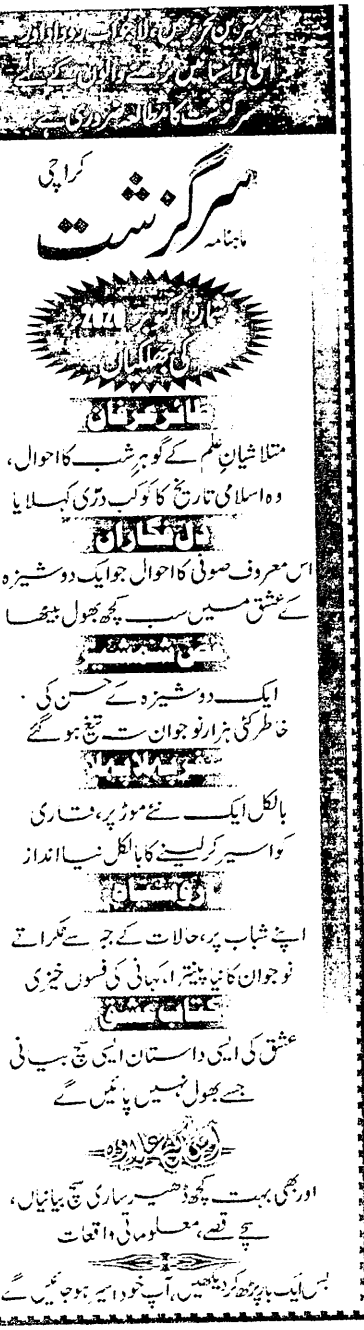

کرنے کے بعد اس وقت چودھری نظام دین کے اس ڈیرے پر ٹو کا چلاتا تھا۔ دوسری کچھ دکانوں کے علاوہ گاؤں کا یہ ڈیرا بھی چودھری نظام دین کی ملکیت میں تھا۔ اس چکر میں چاچے کی دو انگلیاں بھی پچھلے سال ٹوکے میں آ کر کٹ گئی تھیں.....

اس سارے عرصے میں چاچا گاؤں میں چار مرلے زمین لے کر چار دیواری بنانے میں تو کامیاب ہوگیا پر اب سیمنٹ اینٹیں مہنگی ہوجانے کی وجہ سے کئی مہینوں سے پھر کام رکا ہوا تھا۔ ادھر بیلے کے نانا کبھی بھی اس رشتے سے بہت مطمئن نہیں رہے تھے، پر ہمیشہ خاموش رہے اور اب چاچا کے گھر کی تکمیل میں تاخیر، ماسو کی بڑھتی ہوئی عمر اور آئے دن رشتوں سے پریشان ہوکر نانا نے بڑی خاموشی سے ایک انتہائی قدم اٹھالیا اور یہ بات صرف اماں اور ابا ہی جانتے تھے کہ چند دن پہلے نانا نے چپ چاپ ماسو کا نکاح اپنے قصبے میں ہی کسی کھاتے پیتے گھرانے میں کر دیا تھا۔ چاچا اس معاملے میں بہت جذباتی تھا اور اماں اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے لیے ابا کے آنے کا انتظار کر رہی تھی..... ہاں تو چاچا اس وقت بھی کٹی انگلیوں والے ہاتھ سے اندھا دھند ٹوکا چلا رہا تھا۔ بیلے کے دل پر چوٹ سی لگی۔ چاچے نے کئی دفعہ بیلے سے کہا تھا کہ اگر ٹوکے پر آ کر ہاتھ بٹا دیا کرے تو وہ اسے ایک دو روپے انعام میں دیا کرے گا، پر بیلے کے ذہن میں تو جیسے ٹوکے کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ وہ ہاتھ کٹ جانے کے خوف سے کبھی چاچے کی بات پر ہامی نہ بھرتا تھا، پر اب اس نے ٹوکے کی جانب دیکھا، پھر کچھ دور اس پار بابا شمس کی دکان کی طرف، تو لاہوری برفی کا ذائقہ تصور سے نکل کر منہ میں گھلنے لگا اور بیلے کے قدم بے ساختہ ٹوکے کی جانب اٹھنے لگے۔

''چاچا! ایک بات تو بتا.....'' بیلے نے اپنے چھوٹے ہاتھوں میں پٹھوں کا گٹھا حتی الامکان مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

''ہاں بول..... بیلے۔'' چاچے کی ناک کی چونچ سے اس موسم میں بھی پسینے کے قطرے گر کر کچی مٹی میں جذب ہو رہے تھے۔

''یہ مہنگائی کیا ہوتی ہے؟'' تبھی ایک کانٹا بری طرح بیلے کی انگلی میں چبھا۔ اس کی ''سی'' کی آواز نکلی لیکن وہ ضبط کر گیا۔ چاچے کو نہیں بتایا کہ مبادا وہ اسے انعام دینے بغیر ہی واپس بھیج دے۔

''او پتر..... یہ تو سیدھی سی گل ہے۔ چیزیں مہنگی ہوجائیں تو مہنگائی ہوجاتی ہے۔'' چاچے نے بدستور اپنا کام کرتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''پر چاچا! یہ مہنگائی ہوکیوں جاتی ہے؟'' بیلے نے انگلی میں اٹھتا درد ضبط کر کے اپنی بات جاری رکھی۔

چاچا کچھ دیر خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔

''بیلے پتر..... اصل بات یہی ہے کہ جب لوگ شکر نہیں کرتے اور زندگی گزارنے کے لیے ان میں زیادہ سے زیادہ کی منگ بڑھتی جاتی ہے تو مہنگائی بھی ویسے ہی بڑھتی جاتی ہے۔ تو یہ سمجھ جب لوگوں کی ضرورتیں اور ''چا'' بڑھنے لگتے ہیں تو چیزیں مہنگی ہونے لگتی ہیں۔'' چاچے کی زبان سے بھی ویسی ہی باتیں سن کر وہ مایوس ہوا۔

''لیکن چاچا..... ہماری ضرورتیں اور چاؤ تو نہیں بڑھے..... تو ہمیں کیوں چیزیں مہنگی ملتی ہیں۔ دیکھ نا..... سوائے عید اور بڑے میلے کے، میں ہمیشہ تجھے اسی دھوتی کرتے میں دیکھتا ہوں۔ تیرے کون سے چاؤ بڑھ گئے ہیں، چاچا۔'' بیلے نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یہ گل تو ہے..... بڑی سیانی باتیں کر رہا ہے، او خیر تو ہے..... چل تو دعا کرنا کہ چاچے کا گھر جلدی بن جائے، پھر اپنی شادی پر چاچا نیا جوڑا خود بھی سلوائے گا اور تجھے بھی سلوا کر دے گا۔''

بیلے کے دل میں ایک مرتبہ پھر ٹیس اٹھی، پر اماں ابا کے منع کرنے کی وجہ سے وہ اب بھی چاچے کو کچھ بتانے سے باز رہا، پھر ایک اور خیال آتے ہی بول پڑا۔

''اور ہاں چاچا..... کتنے عرصے سے تو کہتا ہے کہ اپنے لیے چھوٹا پنکھا خریدے گا پر ہر گرمی میں پنکھے کے بغیر ہی صحن میں سوتا ہے۔ اب بتانا کہاں ضرورتیں بڑھ رہی ہیں ہماری.....؟'' بیلا زچ ہوتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی سوچوں کی زد سے نکل نہیں پا رہا تھا۔

''او بیلے! اپنے ننھے ذہن پر اتنا زور نہ دے۔ اب دیکھ..... اپنا بیاہ کرنے کے لیے مجھے گھر کی ضرورت ہے نا۔ بس یہی ضرورتوں کا بڑھنا ہوتا ہے۔'' چاچا نے مسکراتے ہوئے کہا اور بیلے کے ہاتھ پر ایک روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ کام ختم ہوگیا تھا۔ سورج ڈھلنے لگا تھا۔ چاچے نے اپنا تھیلا اٹھایا اور گاؤں سے باہر تعمیراتی سامان کی دکان کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ بیلا خالی خالی نظروں سے چاچا کو جاتا دیکھتا رہا۔ وہ اسے یہ نہ کہہ سکا کہ چاچا ایک چھت اور کمرا، جسے تو بڑھتی ہوئی ضرورت کہہ رہا ہے، وہ ضرورت پوری ہونے سے پہلے ہی مہنگائی کی وجہ سے بدقسمتی میں بدل چکی ہے جس کا تجھے ابھی علم ہی نہیں۔

وہ پھر سوچنے لگا، کس کی ضرورتیں بڑھنے سے مہنگائی بڑھتی ہے؟ ہمارے پیسے ہمارے ہاتھوں سے نکل کر

کہاں جاتے ہیں؟ سوچتے سوچتے اچانک اسے چاچے سے ملنے والے ایک روپے کا خیال آیا۔

مغرب کی اذان ہونے میں تھوڑا وقت رہ گیا تھا۔ بیلے نے بابا شمس کی دکان کی جانب دوڑ لگا دی۔ ایک عجیب سی خوشی تھی کہ اس نے اپنے ہاتھ سے پیسے کمائے اور بالآخر آج اس کی پسندیدہ برفی چھوٹے سے پیکٹ میں بند، اس کی ہتھیلی پر تھی۔

کل کے دس روپے کے ساتھ آج کا ایک روپے کا نوٹ ملا کر اس نے چوبی کاؤنٹر پر رکھے تو دیکھا کہ ایک روپے پر عین ہلال کی جگہ خون کا دھبّا تھا۔ بیلے کو اندازہ نہیں ہوا تھا کہ ہاتھ کے زخم سے اب بھی ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ یہ وہی زخم تھا جو ٹوکے پر کام کرتے ہوئے کانٹا چبھنے سے آیا تھا۔ مٹھائی کھاتے ہوئے بیلا یہی سوچتا رہا کہ آئندہ بھی وہ چاچے کا ہاتھ بٹا کر مٹھائی کے پیسے پورے کرلیا کرے گا۔ پھر سوچنے لگا کہ کیا ہی اچھا ہوتا کہ مٹھائی دس روپے کی ہی رہتی اور اسے یہ کشت نہ اٹھانا پڑتا اور نہ ہی ہاتھ زخمی ہونے کا رسک لینا پڑتا اور پھر...... وہی سوچیں اس کے ذہن میں کھلبلی مچانے لگیں۔ یہ چیزیں مہنگی کیوں ہوجاتی ہیں؟ یہ کون سی ضرورتیں اور خواہشات ہیں جو بڑھ رہی ہیں؟ یہ باتیں اس کے ذہن سے نکل نہیں پا رہی تھیں۔ جواب طلب سوالات اسے پریشان کردیتے تھے۔ لوگوں کی وضاحت اسے مطمئن نہیں کرپائی تھی...... اور آج پھر جمعرات کا دن تھا۔ بیلا گاؤں سے دور اسی پکی سڑک کے کنارے کھڑا تھا جس کے دوسری طرف امرود کے باغ تھے اور حد نگاہ پر ڈوبتے سورج کا منظر۔ دوپہر میں ہونے والی بارش کے سبب آج ہوا میں خنکی زیادہ تھی۔ بیلا بازو کی آستین سے بار بار اپنی ناک پونچھ رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی جوتی سے باہر نکلے ہوئے پاؤں اور انگلیاں کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ بیلا سرخ رنگ کی لمبی ڈکی والی گاڑی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد دور سے سیاہ رنگ کی جیپ نما گاڑی اسے فراٹے بھرتی اسی طرف آتی دکھائی دی۔ اٹھتی ہوئی دھول میں بھی اس کا سیاہ رنگ لشکارے مار رہا تھا۔ سیاہ رنگ پر نقرئی رنگ کے راڈوں کا امتزاج شاہانہ لگ رہا تھا۔ بیلا مبہوت سا اس جدید طرز کی سواری کو دیکھتا رہا۔ گاڑی آہستہ ہوتے ہوتے ایک شان کے ساتھ اس کے سامنے رکی۔ سیاہ ٹنٹڈ شیشہ نیچے ہوا تو چودھری کا بارعب سی مسکراہٹ والا چہرہ بیلے کے چہرے پر شناسائی کے رنگ بکھیر گیا۔ بیلا گاڑی کے قریب ہوگیا۔ اندر سے اٹھتی مہک بھی آج پہلے سے زیادہ مسحور کن تھی۔ بیلے نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق گاڑی کی تعریف کی اور چودھری صاحب کو مبارک باد دی تو چودھری نے بھی خوش ہوکر آج پورے گیارہ روپے اس کے ہاتھ پر رکھے۔ بیلا سرشاری کے عالم میں شکر گزار نظروں سے گاڑی کو دھول کے اس پار دور تک دیکھتا رہا۔ بیلے نے مٹھی کھول کر ان پیسوں کو دیکھا۔ ایک دس روپے والا نوٹ اور ایک نوٹ ایک روپے والا۔ وہ چونک گیا۔ ایک روپے والے نوٹ پر عین ہلال کے اوپر خون کا دھبّا تھا......

ذہن میں کہرام سا مچ گیا۔

''اماں! ایک بات تو بتا؟''

''ہاں پوچھو بیٹے......''

''چیزیں مہنگی کیوں ہوجاتی ہیں......؟''

''لوگوں کی ضروریات بڑھ جاتی ہیں۔ رہن سہن اونچا ہوجاتا ہے......''

''پر اماں، ہماری ضروریات تو نہیں بڑھیں۔ ہمارے پاس تو وہی پرانی چیزیں ہیں۔ وہ دیکھو ٹوٹا گھڑا...... اور وہ دیکھو ابا کی پرانی خستہ حال سائیکل......''

''چاچا تو ایک کمرا نہ ڈال سکا۔ تیرے خواب ٹوٹ گئے۔ تُو تو پنکھے کے بغیر گرمی میں ہی سوتا ہے تو بھلا کون سے ''چا'' پورے کرتا ہے اپنے۔ یہ کون سی خواہشات ہیں جو بڑھ رہی ہیں؟ ہماری زندگیوں میں سادگی کے علاوہ تو کچھ ہے ہی نہیں۔''

اس جمعرات کی شام نے ایک بہت بڑی حقیقت اس پر آشکار کردی تھی......

آج چودھری کی شاندار گاڑی کی جگہ مزید شاندار اور قیمتی گاڑی دیکھ کر اور اس کے ہاتھوں سے لہو کے سرخ نشان والا نوٹ وصول کرکے اسے اپنے اہم ترین سوالوں کا جواب مل گیا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ ضرورتیں کیسے بڑھتی ہیں اور یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ مہنگائی میں اضافہ کیوں ہوتا ہے...... اور وہ یہ بھی جان گیا تھا کہ اس جیسے اور اس کے چاچے جیسے غریبوں کے ہاتھوں سے پیسا نکل کر کہاں جاتا ہے؟ اس کا دل بے پناہ اداسی سے بھر گیا۔ اس کے سینے کی گہرائیوں سے دعا نکلی...... ''اے اچھے اللہ میاں! میرے چاچے جیسے سارے لوگوں کو دکھ سہنے کی طاقت اور آگے بڑھنے کی ہمت دینا۔ ان سب لوگوں کی مدد کرنا جو میری ماں اور میرے چاچے کی طرح تنگ دستی اور مہنگائی کے ہاتھوں ہار گئے ہیں۔ اپنی خوشیوں سے محروم ہوگئے ہیں۔''

⌘⌘⌘

غور طلب

ملک صفدر حیات

جانے یہ کون سی ہوس ہے جس کے پیچھے انسان انتہائی پستیوں میں گر کر بھی شرمندگی محسوس نہیں کرتا... کسی کو دولت کی چاہ تو کسی کو سب عیش و آرام میسّر ہونے کے باوجود جنسی بے راہ روی ذلیل و رسوا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب صبر اور اپنی حد انسان بھول جائے تو لامتناہی سفر ہمیشہ منزلوں کو گم کر دیتا ہے۔ دولت اور عزت کی چار دیواری میں زندگی بسر کرنے والے اس خاندان کے درمیان جانے کیسے لالچ اور ہوس نے کچھ یوں جگہ بنالی کہ اس کہانی کے اکثر کرداروں کا انجام تباہ کن ہی ہونا تھا۔

سوتیلے رشتوں کے درمیان جائداد کی تقسیم اور پنپتے جرائم کی داستان

اغوا کی رپورٹ درج کرانے خود لڑکی کا باپ میرے پاس حاضر ہوا تھا اور اس خبر نے پورے باغ پور میں بے چینی اور سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی تھی کیونکہ اغوا شدہ لڑکی کا باپ کوئی معمولی انسان نہیں تھا۔ وہ موضع باغ پور کا سب سے طاقتور شخص چودھری بشارت علی تھا.....!

ان دنوں میری تعیناتی ضلع جھنگ کے ایک دور دراز علاقے میں تھی۔ موضع باغ پور میرے تھانے سے دو میل کے فاصلے پر مغربی سمت میں واقع تھا۔ وہ موسم گرما کی ایک تپتی ہوئی سہ پہر تھی۔ سورج غروب ہونے میں لگ بھگ ایک گھنٹا باقی تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی بھری دوپہر ہو۔

چودھری بشارت علی کے ساتھ تین افراد اور بھی تھے جن میں ایک اس کا بڑا بیٹا امانت علی اور دو گھریلو ملازم تھے۔ میں نے حاشیہ برداروں کو برآمدے میں رکنے کا کہہ کر چودھری اور اس کے بیٹے کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ دونوں بہت زیادہ بوکھلائے ہوئے تھے۔ پریشانی اور فکرمندی ان کے چہروں سے مترشح تھی۔ میں نے انہیں عزت کے ساتھ اپنے سامنے کرسیوں پر بٹھایا اور رسمی علیک سلیک کے بعد باری باری دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''چودھری صاحب! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ بات کہاں سے شروع کروں.....'' چودھری بشارت نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

امانت علی بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اس وقت ہم بڑی مشکل سے گزر رہے ہیں اور ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔''

''میں اس علاقے میں بسنے والے تمام انسانوں کی مدد کرنے کے لیے ہی یہاں بیٹھا ہوا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جہاں تک آپ باپ بیٹے کی مشکل کا تعلق ہے تو وہ آپ دونوں کے چہروں سے ہی جھلک

www.pakistanipoint.com

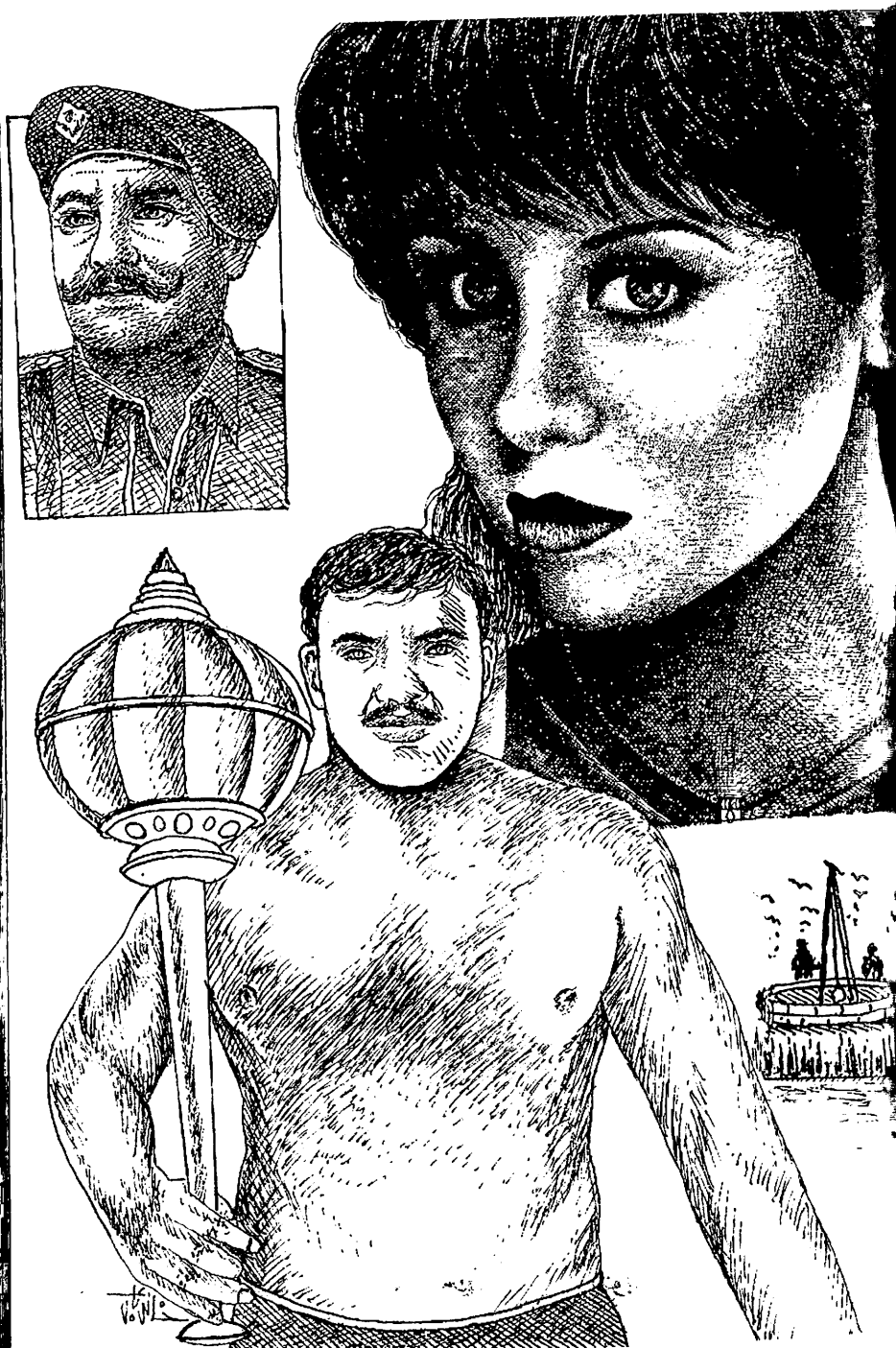

رہی ہے لیکن جب تک آپ لوگ مجھے حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کریں گے، میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔''

''ملک صاحب! میری بیٹی غائب ہوگئی ہے۔''

چودھری بشارت علی نے رنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ''کچھ پتا نہیں چل رہا، وہ کہاں چلی گئی ہے۔ میں رخسانہ کے لیے بے حد پریشان ہوں۔''

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کاغذ قلم سنبھالنے کے بعد چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''رخسانہ کب اور کہاں سے غائب ہوئی ہے.....اس کی عمر کیا ہے؟''

میرے مجموعۂ سوالات کے جواب میں اس نے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

رخسانہ کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ وہ قصبے کے ہائی اسکول میں میٹرک کی طالبہ تھی۔ مذکورہ گورنمنٹ ہائی اسکول میرے تھانے کی بغل میں واقع تھا۔ موضع باغ پور سے اگر میرا تھانہ دو میل کی دوری پر تھا تو کم و بیش اتنا ہی فاصلہ اسکول اور باغ پور کے مابین بھی تھا۔ چودھری بشارت نے رخسانہ کو اسکول پہنچانے اور واپس لانے کے لیے ایک تانگا مخصوص کر رکھا تھا جو جیرا نامی ایک شخص چلاتا تھا۔ جیرا کا اصل نام نذیر تھا مگر وہ ''جیرا'' اور ''گونگا'' کے نام سے مشہور تھا۔ گونگا اس لیے کہ وہ پیدائشی طور پر گونگا تھا۔ اکثر لوگ اسے ''جیرا گونگا'' یا ''گونگا جیرا'' کے نام سے بھی مخاطب کرتے تھے۔ گونگا کی عمر تیس کے قریب تھی اور اس کا اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کی ساری زندگی چودھری بشارت علی کی حویلی میں گزری تھی اور چودھری اسے اپنا نمک حلال وفادار ملازم سمجھتا تھا۔

مذکورہ گورنمنٹ ہائی اسکول کا ٹائم صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک کا تھا۔ باغ پور سے اسکول تک کا فاصلہ لگ بھگ بیس منٹ کا تھا۔ گونگا روزانہ صبح ساڑھے سات بجے رخسانہ کو تانگے میں بٹھا کر اسکول کی جانب چل پڑتا تھا اور اسکول لگنے سے دس منٹ پہلے ہی وہ اپنی مالکن کو اسکول پہنچا دیا کرتا تھا۔ اسی طرح واپسی میں وہ دو بج کر بیس منٹ سے ڈھائی بجے کے درمیان رخسانہ کو لے کر حویلی پہنچ جایا کرتا تھا۔ گونگا کو چودھری بشارت نے یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ جب تک اسکول میں رخسانہ کی پڑھائی چلتی رہے گی، اسے ادھر ہی اسکول کے نزدیک تانگے کے ساتھ موجود رہنا ہے۔ ایک طرح سے گونگا کو رخسانہ کی فل ٹائم خدمات کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

آج گونگا، رخسانہ کو لے کر حویلی نہیں پہنچا تو چودھری کو تشویش ہوئی۔ اس نے ان دونوں کی تلاش میں اپنے بندے دوڑائے۔ باغ پور سے اسکول تک رخسانہ، گونگا اور تانگے کا کوئی سراغ نہ ملا تاہم اسی تلاش کے دوران میں چودھری کے بندوں کو میرے تھانے کے جنوب میں لگ بھگ دو فرلانگ کے فاصلے پر وہ تانگا اپنے گھوڑے کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑا اس طرح مل گیا کہ گھوڑے کی لگام کو ایک درخت کے تنے سے باندھ دیا گیا تھا اور مذکورہ تانگا رخسانہ اور گونگا کے وجود سے خالی تھا۔ اس صورتِ حال میں جب چودھری کی مت ماری گئی اور اس کا دماغ ماؤف ہونے لگا تو وہ اپنی بیٹی کی بازیابی کے لیے میرے پاس چلا آیا تھا۔

میں نے ان باپ بیٹے کی سنائی ہوئی کہانی کو پوری توجہ سے سنا اور اہم نکات کو کاغذ پر نوٹ کرتا چلا گیا۔ جب ان کی بپتا ختم ہوئی تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''چودھری صاحب! آپ اپنی بیٹی کی حفاظت کے لیے کوچوان کے علاوہ اپنے کسی اور بندے کو ساتھ نہیں بھیجتے تھے؟''

''آپ گونگا کو محض ایک کوچوان نہ سمجھیں ملک صاحب!'' چھوٹے چودھری امانت علی نے کہا۔ ''وہ اکیلا دس بندوں پر بھاری ہے۔ گونگا کو آپ ''فخرِ باغ پور'' سمجھ لیں۔ باغ پور اور آلے دوالے کے کسی گاؤں میں اس کے جوڑ کا کوئی پہلوان نہیں ہے۔''

امانت علی کی عمر تئیس سال تھی۔ وہ ایک دراز قامت اور چاق و چوبند نوجوان تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ہوشیاری اور لب و لہجے میں ایک خاص قسم کا جوش نظر آیا۔

''امانت بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ملک صاحب!'' چودھری بشارت اپنے بیٹے کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''گونگا تیس سال کا ہو گیا ہے لیکن ابھی تک اس نے اکھاڑا نہیں چھوڑا۔ وہ روزانہ نہایت ہی پابندی کے ساتھ اکھاڑے میں زور کرنے جاتا ہے۔ وہ لنگوٹ کا بھی مضبوط ہے۔ کبھی اس کی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی۔ سب لوگ اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس علاقے میں جب بھی شہ زوری کے مقابلوں کا انعقاد ہوتا ہے تو دیگر چھوٹے پہلوانوں کے علاوہ باغ پور سے گونگا ضرور اس دنگل میں شرکت کرتا ہے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آج تک کوئی بھی پہلوان گونگا کو شکست نہیں دے سکا اسی لیے میں رخسانہ کی حفاظت

کے حوالے سے ہمیشہ بے فکر رہتا ہوں مگر جو کچھ ہوا ہے، میں اسے سمجھنے سے قاصر ہوں، ملک صاحب.....!''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے وہ خاصا روہانسا ہوگیا تھا۔ چودھری بشارت کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک رعب داب والا دبنگ قسم کا انسان تھا لیکن بیٹی کی گمشدگی نے اسے خاصا افسردہ کردیا تھا۔

''دونوں کا ایک ساتھ غائب ہونا بڑا معنی خیز اور غور طلب ہے چودھری صاحب!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

''آپ نے رخسانہ کے اسکول سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی؟'' میں نے پوچھا۔

''اسکول تین بجے تک مکمل بند ہوجاتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''جب ہم رخسانہ کو ڈھونڈتے ہوئے اسکول تک پہنچے تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ اسکول کے اندر اس وقت کوئی بھی موجود نہیں تھا اور اس کے گیٹ پر تالا لگا ہوا تھا۔ اب وہ اسکول کل صبح سات بجے کے قریب کھلے گا۔''

''ہوں.....!'' میں نے سوچتی ہوئی نظر سے چودھری کو دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''آپ گونگا پر کتنا بھروسا کرتے ہیں چودھری صاحب؟''

''مکمل بھروسا ملک صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''آپ جس انداز میں سوچ رہے ہیں، ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔ گونگا ہمارا برسوں کا آزمایا ہوا ہے۔ اس کے خمیر میں نمک حرامی اور غداری شامل نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں، ان دونوں کو کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت غائب کیا گیا ہے.....''

''میری دعا ہے کہ گونگا کی وفاداری کے حوالے سے آپ کا یقین سچا ثابت ہو۔'' میں نے چودھری بشارت کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرے سوچنے کا انداز آپ سے بہت مختلف ہے۔ آپ ایک گمشدہ لڑکی کے باپ کی حیثیت سے بول رہے ہیں اور میں ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے اور.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے کھوجنے والی نگاہ سے چودھری کو دیکھا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور پونیس کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے چودھری صاحب! اللہ کرے کہ گونگا آپ کی بیٹی کو کہیں بھگا نہ لے گیا ہو مگر میں اس نکتے کو خارج از امکان نہیں سمجھ سکتا۔ بہرحال، اگر میں آپ کی اس بات کو عین بہ عین درست مان لوں کہ کسی نے رخسانہ اور گونگا کو اغوا کرلیا ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اغوا کنندہ آپ سے گہری دشمنی رکھتا ہے اور اس نے کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر یہ کام کیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں چودھری صاحب؟''

''جناب! جہاں انسان کے دس دوست ہوتے ہیں وہاں ایک آدھ دشمن کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور ہم ٹھہرے زمیندار اور چودھری۔ ہمارے دشمنوں کی کمی نہیں ہے لیکن فی الحال میرے دماغ میں ایسے کسی دشمن کا نام نہیں آرہا جو اتنا سنگین قدم اٹھاسکتا ہے۔ آج تک کسی کو ایسی جرأت نہیں ہوئی۔''

''آپ خود چل کر میرے پاس آگئے ہیں تو اب آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''رخسانہ اور گونگا کو بازیاب کرنا میری ذمے داری ہے لیکن اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مجھے قدم قدم پر آپ کے تعاون کی ضرورت پیش آئے گی۔''

''ہم آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں تھانے دار صاحب!'' چودھری کا بیٹا امانت علی بڑے عزم سے بولا۔ ''آپ حکم کریں۔''

آئندہ دس منٹ میں، میں نے چودھری بشارت علی سے اس کے مخالفین کے بارے میں کرید کرید کر کچھ معلومات اکٹھا کرلیں۔ سرِدست ان معلومات کی افادیت کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اگر واقعتاً چودھری بشارت کے کسی دشمن نے یہ گھٹیا کام کیا تھا تو پھر میں ان معلومات کی مدد سے دو افراد کے غیاب کی اس گتھی کو... بہ آسانی سلجھا سکتا تھا۔

''وہ تانگا اب کہاں ہے چودھری صاحب؟'' میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

''جہاں ہم نے دیکھا، وہ ابھی تک وہیں پر ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''امانت نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم تانگے کو اپنے ساتھ لے چلتے ہیں لیکن مجھے یہ مناسب نہیں لگا۔ اگر یہ پولیس کیس ہے تو آپ کو فوراً جاکر اس جگہ کا معائنہ کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے وہاں سے آپ کو کوئی ایسی چیز مل جائے جس کے توسل سے رخسانہ اور گونگا تک پہنچنے میں آسانی ہوجائے۔''

اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک زوردرس ذہن عطا فرمایا ہے۔ میں بہت جلد کسی بھی معاملے کی تہ تک رسائی حاصل کرلیتا ہوں۔ ابھی چودھری نے جس جانب میری توجہ دلائی تھی، اس کے بارے میں، میں کافی دیر پہلے سوچ چکا تھا لہٰذا میں نے اس کی تجویز کے جواب میں کہا۔

''میں ابھی اسی طرف جارہا ہوں۔ آپ نے جائے

وقوعہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کر کے عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اب آپ کو فوری طور پر ایک اور بھی کام کرنا ہے.....''

''وہ کیا ملک صاحب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''سورج غروب ہونے میں پینتیس سے چالیس منٹ باقی ہیں اور اس کے بعد اندھیرا چھانے میں مزید پندرہ سے بیس منٹ لگ جائیں گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ساتھ آئے ہوئے دو بندوں میں سے کسی کو فی الفور باغ پور روانہ کر دیں، اس ہدایت کے ساتھ کہ جتنی جلدی ممکن ہو، وہ رخسانہ اور گونگا کی چپلیں یا کوئی بھی جوتیاں لے کر ادھر تانگے کے پاس پہنچ جائے۔ تاریکی ہونے سے پہلے میں رخسانہ اور گونگا کے کھرے پر کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تانگا وہاں پہنچا ہے تو ظاہر ہے یہ کسی جن، بلا یا بھوت کا کام تو ہو نہیں سکتا۔ یقیناً آپ کی بیٹی اور ملازم ہی اس تانگے میں وہاں پہنچے ہوں گے، چاہے وہ اپنی مرضی سے گئے ہوں یا کسی نے زبردستی انہیں ادھر پہنچایا ہو۔ ہر دو صورت میں اس جگہ پر ان کے قدموں کے نشانات ملنے کا قوی امکان ہے۔ مجھے امید ہے آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے؟''

''ملک صاحب! میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اندھیرا چھانے میں ابھی کم از کم پچاس منٹ باقی ہیں۔ میں احسان کو بھیجتا ہوں۔ وہ آدھے گھنٹے کے اندر یہ کام کر کے واپس آجائے گا۔''

چودھری کے دو بندے جو باہر برآمدے میں بیٹھے تھے، ان میں سے ایک کا نام احسان اور دوسرے کا غفور تھا۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے چودھری صاحب! آپ احسان کو گاؤں روانہ کریں، میں علی مراد کو اپنے پاس بلاتا ہوں۔''

''یہ علی مراد کون ہے؟'' امانت علی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

امانت علی کے باپ نے پوچھا۔ ''کیا یہ علی مراد رخسانہ کا کھرا نکالنے میں آپ کی مدد کرے گا؟''

''ایک حد تک.....'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''علی مراد میرے عملے کا ایک بندہ ہے۔''

پھر میں نے کانسٹیبل علی مراد کو آواز دے کر اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ میرے سامنے باادب کھڑے ہو کر بولا۔ ''حکم ملک صاحب؟''

''علی مراد! کیا بابا جلال ابھی تک تھانے میں موجود ہے یا نکل گیا؟'' میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

جلال دین عرف بابا جلال ایک عمر رسیدہ کھوجی تھا۔ چودھری بشارت علی کی آمد سے تھوڑی دیر پہلے وہ میرے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا تھا کہ دوسرے لوگوں سے بھی سلام دعا کرے گا۔ وہ اکثر و بیشتر مجھ سے ملنے تھانے آتا رہتا تھا اور میں ضرورت پڑنے پر اس کی خدمات سے استفادہ بھی کرتا تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے میں، میں بابا جلال کے لیے کوئی کام نہیں نکال سکا تھا اور جب وہ میرے پاس بیٹھا تھا تو اس نے اپنی ''بے روزگاری'' کا رونا بھی رویا تھا۔ میں نے جب بھی اس سے کوئی چھوٹا بڑا کام لیا تو اس کے بدلے میں، میں نے اس کا ''خاص خیال'' بھی رکھا تھا۔

''اس نے ابھی کہاں جانا ہے ملک صاحب.....'' کانسٹیبل نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ''وہ تو جہاں بھی جاتا ہے، اپنی کہانیاں اور قصے لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس وقت وہ بشیر حسین کا دماغ کھا رہا ہے۔''

بشیر حسین میرے تھانے کا حوالدار تھا۔ بابا جلال کی اس کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

''بابا جلال کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔ اس سے کہو کہ اللہ نے تمہاری سن لی ہے..... اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے، پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے!''

''او کے ملک صاحب!'' وہ مجھے سیلوٹ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

جب میں کانسٹیبل علی مراد کو بابا جلال کے حوالے سے ہدایات دے رہا تھا، اس دوران میں چودھری بشارت علی تو میرے سامنے ہی بیٹھا رہا تھا جبکہ اس کے فرزند ارجمند نے باہر جا کر احسان نامی اپنے ملازم کو گاؤں روانہ کر دیا تھا۔

☆☆☆

میرا تھانہ جس نیم پختہ سڑک کے کنارے پر واقع تھا، وہاں بسوں، ویگنوں، ٹریکٹر ٹرالیوں اور دیگر موٹروں کی آمد و شد و قفے وقفے سے جاری رہتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لاری اڈا میرے تھانے کے بہت نزدیک تھا۔ تھانے سے اگر جنوب کی طرف جائیں تو پہلے تانگا اسٹینڈ اور اس کے بعد بس اسٹینڈ یعنی لاری اڈا آتا تھا جبکہ شمالی سمت میں تھانے کے ساتھ ایک وسیع و عریض فٹ بال گراؤنڈ تھا، اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول اور اس سے آگے سبزی منڈی۔ میں نے جس فٹ بال گراؤنڈ کا ذکر کیا، وہاں ہر سال ایک میلا بھی لگا کرتا تھا جس کا سب سے اہم تفریحی

آئٹم سرکس تھا۔

سورج نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا تاہم اس کی مخصوص غروبی لالی نے مغربی افق کو بڑی دل فریب نارنجی رونق بخش دی تھی۔ ابھی ماحول میں اس قدر اجالا موجود تھا کہ بابا جلال دس پندرہ منٹ تک بہ سہولت اپنے فن کا مظاہرہ کرسکتا تھا۔ چودھری امانت علی کے فرستادہ احسان نامی اس شخص نے ''ہنے گیا تے ہنے آیا'' ایسی کارکردگی کا مظاہرہ کر کے دونوں گمشدہ افراد کے دو، دو جوڑی جوتے لاکر ہمیں دے دیے تھے اور میرے اشارے پر بابا جلال نے فی الفور اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

ہم اس وقت جس مقام پر موجود تھے، وہ میرے تھانے سے لگ بھگ دو فرلانگ (چار سو چالیس گز) کے فاصلے پر جنوب میں، نیم پختہ سڑک کے کنارے پر واقع تھا اور یہ نیم پختہ سڑک اس قصبے سے سیدھی لاہور کو جاتی تھی۔

اس دوران میں بابا جلال اپنا تحقیقاتی کام جاری رکھے ہوئے تھا، میں اور چودھری بشارت علی ایک طرف کھڑے ہو کر پیش آمدہ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ اس وقت میرے سامنے جو سچویشن تھی اس کی روشنی میں مجھے رخسانہ اور گونگا کی گمشدگی کے صرف دو امکانات نظر آرہے تھے۔ نمبر ایک..... گونگا، رخسانہ کو کہیں بھگا لے گیا تھا۔ چودھری بشارت چاہے اس پر کتنا ہی اعتماد کیوں نہ کرتا ہو اور چاہے گونگا کتنا ہی بی بی باوندہ کیوں نہ ہو، انسانی فطرت، جبلت اور نفسیات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نمبر دو..... اگر رخسانہ اپنی مرضی سے گونگا کے ساتھ کہیں نہیں گئی تھی تو پھر یقیناً کسی نے ان دونوں کو اغوا کرلیا تھا اور یہ خاصی تشویش ناک صورتِ حال تھی کیونکہ ایسی گھناؤنی حرکت کا مرتکب شخص کوئی دوست اور خیر خواہ تو ہو نہیں سکتا تھا لہٰذا ان دونوں کی زندگیاں خطرے سے خالی نہیں تھیں۔ اگر یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ تھا تو کل صبح تک اغوا کاروں کی جانب سے کوئی مطالبہ سامنے آجانا چاہیے تھا۔

میں انہی امکانات کو ذہن میں رکھ کر غیر مخصوص انداز میں چودھری بشارت کو گریدرہا تھا کہ بابا جلال نے ''ہینڈز اپ'' ہونے کا اعلان کر دیا۔

''ملک صاحب! میری آنکھوں کی روشنی فضا کی روشنی کے سامنے گھٹنے ٹیک چکی ہے۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''میں کھرے کے کام کو مزید جاری نہیں رکھ سکوں گا۔ باقی کی کھوج کل صبح لگائیں گے۔''

''چاچا! ابھی پندرہ بیس منٹ تک تم نے جو آنکھیں جلائی ہیں اس سے کچھ حاصل بھی ہوا یا نہیں؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ تم نے وقت برباد کیا ہو.....!''

''ملک صاحب!'' وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ''جو لوگ وقت کو برباد کرنے کا سوچتے ہیں، ان کی اس کوشش سے پہلے وقت انہیں برباد کرنے کا منصوبہ بنا چکا ہوتا ہے اور اس جنگ میں جیت بہرحال وقت ہی کی ہوتی ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک بوجھل سانس خارج کی، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس مختصر سے وقت میں جھک نہیں ماری ملک صاحب! لیکن یہ بھی طے ہے کہ میری تحقیق آپ کو بالکل پسند نہیں آئے گی کیونکہ یہاں پر مجھے کافی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے!''

''کیسی گڑبڑ چاچا جلال؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں استفسار کیا۔ ''تم میری پسند و ناپسند کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو اور صرف وہ بتاؤ جو تمہاری پیشہ ورانہ مہارت نے تم تک پہنچایا ہے۔ باقی سب میں خود دیکھ لوں گا.....!''

اس وقت چودھری بشارت علی اور اس کا صاحب زادہ بھی میرے نزدیک موجود تھے۔ وہ دونوں بھی بابا جلال کو تعجب خیز نظروں سے گھور رہے تھے۔

''دیکھیں ملک صاحب.....'' بابا جلال مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر آپ اور چودھری صاحب یہ سمجھ رہے ہیں کہ رخسانہ اور گونگا اس تانگے میں بیٹھ کر یہاں آئے تھے اور تانگے کو ادھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے.....!''

''تو پھر کیسا ہے؟'' کھوجی کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی چودھری بشارت نے سوال داغ دیا۔ ''یہ تانگا یہاں کیسے پہنچا..... کس نے پہنچایا.....؟''

بابا جلال رخسانہ اور گونگا کے جوتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے لمبھیر انداز میں بتانے لگا۔ ''ان دونوں کے پاؤں کے سائز اور ساخت کا کوئی کھرا مجھے تانگے کے آس پاس یا سڑک پر کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ دونوں ادھر آئے ہی نہیں اور اگر آئے ہیں تو پھر انہوں نے زمین پر کہیں بھی قدم نہیں رکھا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی تانگے کو یہاں لاکر درخت سے باندھ کر چلا جائے اور اس زمین پر اس کے پاؤں کے نشانات ثبت نہ ہوں؟'' چودھری بشارت نے حیرت

بھرے لہجے میں کھوجی بابا جلال سے پوچھا۔

''چودھری صاحب! میں نے ان دو افراد کے یہاں نہ آنے کی بات کی ہے۔'' بابا جلال اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ظاہر ہے، یہ تانگا کوئی انسان ہی یہاں لے کر آیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہے، تنہا ہی اس تانگے پر سوار ہو کر یہاں پہنچا تھا اور اس کے پاؤں غیر معمولی بڑے ہیں، یعنی وہ دس نمبر یا اس سے بھی کچھ زیادہ کا جوتا پہنتا ہے......''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اس نامعلوم شخص کی واپسی کا کھرا پکڑ لیا ہے......'' میں نے بابا جلال کی طرف دیکھتے ہوئے سنسنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''اسی لیے تم نیم پختہ سڑک کے ساتھ شمال کی طرف گئے تھے......ہیں نا؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ملک صاحب!'' بابا جلال تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط اور قد کاٹھ والا بندہ ہے جناب عالی! میری تحقیق کے مطابق وہ تانگے کو شمال سے جنوب کی سمت چلاتے ہوئے یہاں تک لایا تھا۔ اس نے تانگے سے اترنے کے بعد گھوڑے کی لگام کو درخت کے ساتھ باندھا اور نیم پختہ سڑک کو عبور کر کے وہ دوسری طرف پہنچ گیا، پھر وہ شمالی سمت میں پیدل ہی چلنے لگا۔ یہ اس کی واپسی کا پیدل سفر تھا مگر سڑک کے دوسرے کنارے پر......''

''وہ کس طرف گیا ہے؟'' چودھری امانت علی نے اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

''اس بارے میں پورے وثوق کے ساتھ میں آپ کو کل ہی بتا پاؤں گا۔'' بابا جلال نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں نے جہاں تک اس کے واپسی کے کھرے کا تعاقب کیا ہے، وہاں تک سڑک کی دونوں جانب کھیت ہیں۔ اگر وہ پچاس گز آگے جا کر سڑک عبور کر کے دائیں جانب گیا ہے تو سمجھیں وہ لاری اڈا پہنچ گیا یا پھر اس کے آگے تانگا اسٹینڈ، تھانہ، فٹ بال گراؤنڈ، اسکول، سبزی منڈی......کہیں بھی جا سکتا ہے اور اگر اس نے سڑک عبور نہیں کی اور وہ سڑک کی بائیں طرف شمال کی سمت میں چلتا رہا تو لگ بھگ ڈیڑھ فرلانگ آگے بائیں جانب جو راستہ مڑتا ہے، وہ اسے سیدھا باغ پور لے جائے گا......''

''بابا جلال! تم نے تو اس سڑک کی دونوں جانب کا لگ بھگ دو فرلانگ کا ایکسرے نکال دیا ہے۔'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں بڑی بے چینی سے صبح کا انتظار کروں گا۔''

''وہ پتھر دیکھ رہے ہیں نا آپ......؟'' وہ انگلی سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

بابا جلال کے اشارے کے تعاقب کے نتیجے میں مجھے سڑک کی بائیں جانب چار پانچ سیر وزن کا ایک پتھر پڑا نظر آیا تھا۔ وہ مذکورہ پتھر کو زیر بحث لاتے ہوئے بولا۔ ''اس پتھر کو میں نے ایک نشانی کے طور پر وہاں رکھا ہے۔ کل صبح میں انشاء اللہ کھرے کا کام یہیں سے شروع کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں اس شخص کی منزل کا پتا چلانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے چاچا جلال! اب تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔'' میں نے کھوجی بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کل صبح تھانے میں حاضری لگانے کی ضرورت نہیں۔ تم گھر سے سیدھا یہاں آؤ اور اپنا کام شروع کر دو۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''بڑی چنگی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب!'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اللہ کرے میری بات آپ کی سمجھ میں آجائے!''

''چاچا جلال! اللہ تعالیٰ نے جب اپنے کسی بندے کو نوازنا ہوتا ہے تو وہ اپنی رحمت کو اس تک پہنچانے کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تم بے فکر ہو کر اپنے گھر جاؤ۔ کل جب تم اپنے کام کی تکمیل پر مجھے کوئی خوشخبری سناؤ گے تو سمجھو تمہارا انعام پکا۔''

''بلکہ ڈبل انعام......'' چودھری بشارت نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی بیٹی کے لیے بے حد پریشان ہوں۔ تم اس تک رسائی کا کوئی راستہ نکالو۔ میں بھی تمہیں خوش کر دوں گا۔''

''شکریہ چودھری صاحب!'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

''لگتا ہے قدرت ''لیٹیں'' نکال رہی ہے چاچا جلال......'' میں نے کھوجی بابا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''دو گھنٹے پہلے تم میرے کمرے میں بیٹھ کر جو رونا رو رہے تھے، وہ سب قدرت تک پہنچ گیا ہے۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ......قدرت کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں!''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

چودھری بشارت نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! کیا میں اپنا تانگا لے جا سکتا ہوں؟''

میں نے بابا جلال سے استفسار کیا۔ ''چاچا! کیا کل صبح تمہیں اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اس تانگے کی ضرورت محسوس ہوگی؟''

''نہیں جناب.....'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تانگے کے پہیوں کے نشانات سڑک کے کنارے کے ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ میں ضرورت پڑنے پر ان سے کام چلالوں گا۔''

''چودھری صاحب! آپ مطمئن ہوکر گھر جائیں۔ آپ کی بیٹی اور گونگا پہلوان کو ڈھونڈ نکالنا اب میری ذمے داری ہے۔'' میں نے تھانے کی جانب واپسی کے سفر میں چودھری بشارت سے کہا۔

''گونگا پہلوان تو اس علاقے میں کافی معروف ہے۔ دنگل کے پوسٹرز پر اس کی تصویر بھی شائع ہوتی ہوگی۔ سب لوگ اسے شکل وصورت سے جانتے اور پہچانتے ہیں لیکن رخسانہ کی تلاش کے لیے مجھے اس کی ایک فوٹو چاہیے ہوگی۔ آپ سمجھ رہے ہیں میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ادھر حویلی میں رخسانہ کی بہت ساری تصویریں رکھی ہیں۔ میں صبح اس کی ایک واضح تصویر آپ تک پہنچادوں گا۔''

''ایک بات اور چودھری صاحب.....'' میں نے ٹھوس انداز میں اسے تنبیہہ کی۔ ''ہم اغوا برائے تاوان کے امکان کو یکسر رد نہیں کرسکتے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اغوا کار آج رات یا کل دن میں کسی وقت آپ سے رابطہ ضرور کرے گا۔ اس سلسلے میں مجھے مکمل باخبر رکھنے ہی میں آپ کی بھلائی اور آپ کی بیٹی کی سلامتی ہے۔''

''میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے آپ کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا ہے تو اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ میں آپ کی مرضی کے خلاف ایک انچ ادھر ادھر نہیں جاؤں گا۔''

''مجھے آپ سے ایسے ہی پُرخلوص اور دوستانہ تعاون کی امید ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے تھانے کے سامنے پہنچ گئے۔ میں نے تانگا رکوایا اور نیچے اتر آیا۔ چودھری بشارت علی تہ دل سے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنے گاؤں جانے والے راستے پر مڑ گیا اور میں نے تھانے کی سمت قدم بڑھادیے۔

میں نے اپنے کوارٹر میں جاکر رات کا کھانا کھایا اور نماز ادا کرنے کے بعد سونے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ ماہ مئی کا وسط تھا۔ دن گرم اور رات حبس زدہ لہٰذا سونے کے لیے کوارٹر کے صحن سے زیادہ اچھی جگہ اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔ میں نے صحن میں چارپائی لگائی۔ چارپائی کے پہلو میں چوبی میز پر ٹیبل فین رکھا اور بستر پر دراز ہوگیا۔ ''بستر'' کا لفظ میں نے بس ایسے ہی استعمال کرلیا ہے ورنہ وہ چارپائی موسم کی مہربانی سے بیڈ شیٹ، گدا اور اسی قسم کی ہر شے سے بے نیاز تھی۔ میرے سر کے نیچے ایک تکیہ تھا اور بس.....!

کھوجی بابا جلال کی تحقیق کے مطابق وہ تانگا شمال سے جنوب کی سمت سفر کرتے ہوئے اس درخت تک پہنچا تھا اور چودھری بشارت نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے گونگا کو اسکول کے نزدیک ہی رہنے کی ہدایت کررکھی تھی۔ جنوبی سمت میں بس اسٹینڈ آخری نمایاں مقام تھا۔ علاوہ ازیں ہر طرف تاحدِ نگاہ کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ ان زمینی حقائق کی روشنی میں یہی کہا اور سمجھا جاسکتا تھا کہ تانگا سبزی منڈی، اسکول، فٹ بال گراؤنڈ یا تھانہ یا تانگا اسٹینڈ یا پھر بس اسٹینڈ المعروف بہ لاری اڈا کی جانب سے چلتے ہوئے مذکورہ درخت تک پہنچا تھا۔ تانگا جہاں سے بھی آیا ہو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اصل مسئلہ اور غور طلب معاملہ تو یہ تھا کہ رخسانہ اور گونگا کہاں ہیں.....؟

بابا جلال نے بڑے دعوے کے ساتھ کہا تھا کہ وہ دونوں اس تانگے میں بیٹھ کر وہاں تک نہیں آئے تھے بلکہ کوئی قوی الجثہ، غیر معمولی ہاتھ پاؤں کا مالک شخص اکیلا تانگے کو چلا کر وہاں لایا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے یہاں تک بھی بتایا تھا کہ مذکورہ بندے کے جوتے کا نمبر دس یا ساڑھے دس ہونا چاہیے۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پاؤں کنگ سائز ہوں وہ دراز قامت اور مضبوط البدن بھی ہوتا ہے۔ ایک نارمل اور صحت مند آدمی کے جوتے کا نمبر سات اور نو کے درمیان رہتا ہے اور آٹھ نمبر کو انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ نمبر مانا جاتا ہے۔

اگر چند منٹ کے لیے بابا جلال کی تھیوری کو نظر انداز کرکے یہ مان لیا جائے کہ رخسانہ، گونگا کے ساتھ اپنی تراضی سے کہیں گئی ہے اور وہ دونوں تانگے میں بیٹھ کر اس درخت تک پہنچے تھے تو پھر یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اس سے آگے وہ کہاں گئے ہوں گے۔ یہ نیم پختہ سڑک تو جنوب میں سیدھی لاہور کی طرف جاتی تھی۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز سوال نے سر اٹھایا۔

''کیا گونگا، رخسانہ کو بھگا کر لا ہور لے گیا ہے.....؟''

حقیقتِ حال جو بھی تھی اس کا فیصلہ کل دوپہر تک ہو جانا تھا۔ مجھے بابا جلال کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ میں نے جب بھی کسی کیس میں اس سے مدد لی، اس بڈھے بابا نے حیرت انگیز کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں آئندہ روز کی مصروفیت کے بارے میں سوچتے ہوئے پتا نہیں کب وادیِ نیند میں اتر گیا۔

☆☆☆

ہر انسان کو اپنی مرضی سے سوچنے کا اختیار حاصل ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جیسا سوچے، ویسا ہو بھی جائے۔ اسی کو تدبیر اور تقدیر کا کھیل کہا جاتا ہے۔ انسان کی تدبیر اگر تقدیر کے اسکرپٹ سے میچ کر جائے تو سمجھو سونے پر سہاگا اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر دھڑن تختہ.....!

رخسانہ اور گونگا کی پراسرار گمشدگی کا کیس سترہ مئی کی سہ پہر میرے پاس آیا تھا اور رات میں اٹھارہ مئی کے حوالے سے جو بھی منصوبہ بندی کر کے سویا تھا، اگلے دن کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی تقدیر کی ایک چھوٹی سی چال نے اس کا دھڑن تختہ کر دیا تھا۔

رات کے آخری پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی تھی اور اس غیر متوقع بیداری کا سبب یکا یک شروع ہو جانے والی بارش تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے ''موسلا دھار'' کا اعزاز حاصل کر چکی تھی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے آناً فاناً میں کوارٹر کے صحن سے برآمدے میں ہجرت کرنا پڑی تھی۔ رات کا باقی حصہ میں نے جاگتے اور یہ سوچتے ہوئے گزار دیا..... ''اس بارش نے بابا جلال کی محنت کو اکارت کر دیا۔ اب صبح نئے سرے سے اس کام کو شروع کرنا پڑے گا۔ کھرا نکالنے والا مشن گویا ٹھپ ہو گیا.....!''

اگلی صبح بابا جلال بارش میں بھیگتا ہوا میرے پاس پہنچ گیا۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا تھا۔ اب تک بارش کا زور تو ٹوٹ چکا تھا تاہم بوندا باندی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا اور پوچھا۔

''چاچا جلال! یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تمہارے لباس کے ایک ایک حصے سے پانی ٹپک رہا ہے۔ اس عمر میں یوں شرابور ہونا ٹھیک نہیں۔ اگر بیمار پڑ گئے تو کئی دن تک بستر سے اٹھ نہیں پاؤ گے۔''

''اگر انسان کی قسمت ہی خراب ہو تو کوئی بھلا کیا کر سکتا ہے۔'' وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ''کتنے دنوں کے بعد کوئی کام ملا تھا۔ اس ناس پٹی بارش نے بیڑا غرق کر دیا۔ اب میں بارش میں بھیگ کر بیمار پڑ جاؤں یا صفحۂ ہستی سے مٹ جاؤں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے ملک صاحب.....!''

''بُری بات چاچا!'' میں نے خفگی بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''بہت ہی بُری بات.....!''

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کیا غلط کہا ہے؟''

''پہلی بات تو یہ کہ بارش اللہ کی رحمت ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لہٰذا اس کے لیے ''ناس پٹی'' جیسے الفاظ استعمال کرنا مناسب نہیں۔ انسان کو اپنی ایسی کسی بھی کوتاہی کے لیے فوراً پروردگار سے توبہ کرنا چاہیے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔''

''لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ اگر بارش نہ ہوتی تو میں آج دوپہر تک کھرے کا کام مکمل کر کے چار پیسے کما لیتا.....!'' وہ احتجاجی انداز میں بولا۔

میں نے اس کے احتجاج کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ کبھی بھی اپنی قسمت کو برا نہیں کہنا چاہیے۔ نصیب لکھنے والے نے کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی کیونکہ وہ اپنی ہر مخلوق سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ جب انسان پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے تو ان کٹھن لمحات میں اسے اپنے اچھے وقت کو یاد کرنا چاہیے جب مالک نے اس پر اپنی عنایات کی بارش کر رکھی تھی اور اس سوچ پر جم کر کھڑے ہو جانا چاہیے کہ یہ افتاد جس نے میری آزمائش کے لیے مجھ پر ڈالی ہے، وہی ذاتِ پاک مجھے اس سے نجات بھی دلائے گی۔''

''میں اپنی لاچاری اور بے بسی کا رونا رو رہا ہوں اور آپ مجھے کسی مولوی کی طرح صبر و برداشت کی تلقین کر رہے ہیں.....؟'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے جیب خاص میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکالا، پھر اسے بابا جلال کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کل سہ پہر میں تمہیں جو ٹاسک دیا تھا یہ اس کا معاوضہ سمجھ کر رکھ لو۔ اس کیس میں اب کھرا نکالنے کی کوئی گنجائش تو نظر نہیں آ رہی لیکن یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ اگر میں چودھری بشارت کی بیٹی کو بازیاب کرنے میں کامیاب ہو گیا تو تمہیں چودھری سے ایک سو روپیہ مزید دلواؤں گا۔''

وہ چند لمحات تک حیرت اور بے یقینی کی کیفیت میں مجھے دیکھتا رہا۔ مجھے اس کی ہیئت کذائی پر ترس آیا اور میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"چاچا! سوچی پیاتے بندہ گیا...... اس سے پہلے کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں، تم یہ پچاس روپے رکھ لو......"

اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ نوٹ لے لیا۔ میں نے یہ رقم دے کر بابا جلال پر کوئی احسان نہیں کیا تھا، نہ ہی اس نے اس مقصد کے لیے میری جانب کوئی کاسہ بڑھایا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بابا جلال نے گزشتہ شام پندرہ بیس منٹ میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا استعمال کر کے مجھ تک جو کارآمد معلومات پہنچائی تھیں، یہ پچاس روپے اس کی محنت کا صلہ تھے۔

بابا جلال کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل اسد علی کو اپنے پاس بلا لیا اور پوچھا۔ "باہر بارش کی کیا پوزیشن ہے؟"

"بس جناب ہلکی پھلکی کنیاں چل رہی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

اسد علی ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی عمر بتیس سال تھی۔ وہ ایک ہوشیار اور سمجھ دار پولیس اہلکار تھا۔ میرے تھانے کے عملے میں ایک بھی ایسا فرد موجود نہیں تھا جس کا تعلق موضع باغ پور سے ہو، تاہم اسد علی اس گاؤں کے بارے میں سب سے زیادہ معلومات رکھنے والا شخص تھا۔ اسی لیے میں نے اسد کو ایک خاص فرض سونپنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں ذرا اسکول کی طرف جا رہا ہوں اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب۔" وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہوں۔"

اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول میرے تھانے سے چند گز کے فاصلے پر واقع تھا۔ اسکول اور تھانے کے درمیان میں ایک کشادہ فٹ بال گراؤنڈ تھا۔ مذکورہ اسکول صبح آٹھ بجے لگتا تھا اور دو بجے چھٹی ہو جاتی تھی، علاوہ جمعہ۔ جمعے کے روز چھٹی کا ٹائم ساڑھے بارہ بجے کا تھا۔ اتوار کے دن اسکول مکمل طور پر بند ہوتا تھا۔ آج جمعہ تھا اور نہ اتوار لہٰذا دو بجے سے پہلے چھٹی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہم دونوں ٹہلتے اور ہلکی پھوار کا مزہ لیتے ہوئے گورنمنٹ ہائی اسکول پہنچ گئے اور سیدھا ہیڈ ماسٹر کے کمرے کا رخ کیا۔ ہم اس وقت یونیفارم میں تھے اور اسکول کا ہیڈ ماسٹر محمد فیض مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔

"آخاہ...... ملک صاحب تشریف لائے ہیں۔" اس نے گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں عزت سے بٹھایا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا۔ "ملک صاحب! آپ کے لیے ٹھنڈا منگواؤں یا گرم؟"

تانگا اسٹینڈ اور بس اسٹینڈ پر چائے، سگریٹ، بسکٹ، شربت، کولڈ ڈرنک، پھل فروٹ اور اسی قسم کی اشیا کی چند دکانیں موجود تھیں جہاں سے ضروریاتِ زندگی کی اکثر چیزیں مل جاتی تھیں۔

"کسی تکلف کی ضرورت نہیں فیض صاحب۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے بھرپور ناشتا کیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اس وقت ایک ضروری کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر آپ تعاون کریں گے تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"آپ کی مدد کر کے مجھے بے حد خوشی ہوگی ملک صاحب۔" وہ پُرخلوص انداز میں بولا۔ "آپ حکم کریں، وہ ضروری کام کیا ہے؟"

"دراصل میں ایک انکوائری کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے دسویں جماعت میں پڑھنے والی ایک لڑکی کے بارے میں تھوڑی پوچھ تاچھ کرنا ہے۔"

ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔ "طالبہ کا نام کیا ہے؟"

"رخسانہ!" میں نے جواب دیا۔ "چودھری بشارت علی کی بیٹی، رخسانہ۔"

"اوہ......" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "آپ رخسانہ کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں؟"

"آپ کو رخسانہ کے حوالے سے تازہ ترین کیا معلوم ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

"یہی کہ...... وہ چودھری صاحب کی صاحب زادی ہے......" وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ "اور وہ میٹرک کی طالبہ ہے......"

"اس کا مطلب ہے آپ رخسانہ کے تازہ ترین حالات سے واقف نہیں ہیں۔" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "آپ کو کچھ خبر نہیں کہ ادھر باغ پور میں کیا ہلچل مچی ہوئی ہے......؟"

وہ یکدم بہت زیادہ پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "واقعی، مجھے ایسی کسی بات کا علم نہیں۔ آپ بتائیں، آخر ہوا کیا ہے؟"

اس کے آخری جملے سے گہری فکرمندی جھلکتی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ رخسانہ کی گمشدگی کی اطلاع ابھی تک اسکول میں نہیں پہنچی تھی اور میرے خیال میں اس کے دو اسباب تھے۔ نمبر ایک، کل

جب رخسانہ کی گمشدگی کا معاملہ گرم ہوا تو اسکول بند ہو چکا تھا۔ نہر دو، آج ابھی اسکول شروع ہوا تھا اور بارش کے باعث بچوں اور بچیوں کی حاضری بھی خاصی کم تھی۔

''فیض صاحب! رخسانہ کل اسکول سے واپسی پر حویلی نہیں پہنچی۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں ہیڈ ماسٹر کو بتایا۔

''اوہ.....'' اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ''یہ..... کیسے ہو.....سکتا ہے.....!'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

''ایسا ہو چکا ہے جناب!'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''چودھری صاحب کل سہ پہر میں اپنی بیٹی کے غیاب کی رپورٹ لکھوانے میرے پاس تھانے آئے تھے۔ یہ ساری قانونی کارروائی اسی سلسلے میں ہے۔''

''رخسانہ روزانہ اپنے تانگے میں اسکول آتی اور واپس حویلی جاتی تھی۔'' وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے تانگے کے کوچوان سے پوچھ تاچھ کی ہے؟''

''رخسانہ کے ساتھ ہی وہ گونگا کوچوان بھی غائب ہے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اب آپ مجھے بتائیں کہ کل چھٹی کے وقت رخسانہ اسکول سے صحیح سلامت روانہ ہوئی تھی یا نہیں.....؟''

''ایک منٹ ملک صاحب.....'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میں عادل کو یہاں بلاتا ہوں پھر سب پتا چل جائے گا۔''

عادل حسین دسویں جماعت کا انچارج تھا۔ اس ہائی اسکول میں لڑکیاں اور لڑکے ایک ساتھ پڑھتے ضرور تھے مگر آپ وہاں کی تعلیم کو مخصوص نوعیت کا ''کو ایجوکیشن سسٹم'' ہرگز خیال نہ کریں کیونکہ اسکول کے اندر طلبہ اور طالبات کے لیے الگ الگ کلاس روم تھے اور ان دونوں اصناف کا آپس میں میل جول نہیں تھا، اسی لیے چودھری بشارت علی نے اپنی بیٹی رخسانہ کو وہاں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ تمام ایک چار دیواری کے اندر تو تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن ان کے پورشنز ایک دوسرے سے ہٹ کر تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں دسویں جماعت کا انچارج، اسکول انچارج محمد فیض کے بلاوے پر تھانہ انچارج ملک صفدر حیات کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

ہیڈ ماسٹر نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں کلاس انچارج کو صورتِ حال سے آگاہ کیا، پھر کہا۔ ''تھانے دار صاحب اسی سلسلے میں انکوائری کرنے یہاں آئے ہیں۔''

''ملک صاحب!'' عادل حسین مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے یہی بتایا ہے نا کہ رخسانہ کل غائب ہوئی ہے.....؟''

''بالکل..... میری معلومات کے مطابق گزشتہ روز سترہ مئی پیر کی صبح ساڑھے سات بجے رخسانہ حویلی سے تانگے پر سوار ہو کر اسکول کے لیے روانہ ہوئی تھی۔ حسبِ معمول تانگا گونگا پہلوان ہی چلا رہا تھا۔'' میں نے کلاس انچارج عادل حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چھٹی کے بعد جب رخسانہ اور گونگا واپس حویلی نہیں پہنچے تو گھر والوں کو تشویش نے آگھیرا اور انہوں نے ان دونوں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ اسی تلاش میں وہ یہاں بھی آئے تھے مگر اس وقت تک اسکول بند ہو چکا تھا۔ بالآخر..... چودھری بشارت نے تھانے آ کر رخسانہ اور گونگا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی۔ اب یہ معاملہ پولیس کے ہاتھ میں ہے اور میں نے تفتیش کا آغاز آپ کے اسکول سے کیا ہے کیونکہ رخسانہ یہیں سے غائب ہوئی ہے.....!''

عادل حسین کی عمر پینتالیس کے قریب ہوگی۔ وہ ایک سلجھا ہوا سنجیدہ اور بردبار انسان تھا۔ اس نے پورے تحمل اور توجہ سے میری بات سنی اور اس بیچ میں وہ منہ سے ایک لفظ نہیں بولا تاہم میں نے نوٹ کیا کہ اس دوران میں اس کی آنکھوں اور چہرے پر حیرت آمیز الجھن ڈوبتی ابھرتی رہی تھی۔ جب میں اپنی بات مکمل کر چکا تو وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! آپ نے جو بتایا، وہ میرے لیے ناقابلِ یقین ہے۔ رخسانہ یا گونگا پہلوان کی گمشدگی کا ہمارے اسکول سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔''

''یہ بات آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ''وہ اسی اسکول میں پڑھتی ہے بلکہ وہ آپ کی کلاس کی اسٹوڈنٹ ہے.....!''

''درست فرمایا آپ نے۔'' وہ رسان بھرے لہجے میں بولا۔ ''بے شک رخسانہ اس اسکول کی طالبہ ہے۔ وہ ہمارے اسکول سے گہرا تعلق رکھتی ہے لیکن اس کی یا گونگا کی گمشدگی کی ذمے داری ہمارے اسکول پر عائد نہیں کی جا سکتی کیونکہ رخسانہ کل اسکول آئی ہی نہیں۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو آپ حاضری رجسٹر چیک کر لیں۔ وہاں پر کل کی تاریخ میں اس کے نام کے سامنے (A) لگا ہوا ہے، یعنی ایبسینٹ!''

عادل حسین کے جواب نے میرا دماغ چکرا کر رکھ

دیا۔ چودھری بشارت کے بیان کے مطابق رخسانہ اور گونگا حسب معمول حویلی سے اسکول جانے کے لیے نکلے تھے۔ اگر عادل حسین صحیح کہہ رہا تھا اور رخسانہ گزشتہ روز اسکول سے غیر حاضر تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ باغ پور اور اسکول کے بیچ کسی مقام پر ان دونوں کو اغوا کرلیا گیا تھا اور یا پھر وہ دونوں اپنی مرضی سے کہیں چلے گئے تھے۔ تانگے کے اسکول سے دو فرلانگ دور اس درخت کے پاس پہنچنے کی مسٹری الگ تھی.....!

''ٹھیک ہے، رخسانہ کل اسکول نہیں آئی اس لیے آپ لوگوں سے اس کی گمشدگی کے حوالے سے پوچھ تاچھ کرنا نہیں بنتا لیکن کیا میں جان سکتا ہوں کہ اسکول کے اسٹاف میں سے کسی کو یہ معلوم کیوں نہیں کہ وہ پراسرار طور پر غائب ہوچکی ہے؟'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔

وہ بہ یک زبان ہوکر بولے۔ ''ہمیں تو ابھی آپ سے پتا چلا ہے ملک صاحب..... اور باقی اسٹاف کا بھی یہی حال ہے۔''

''کل سہ پہر کے بعد سے پورے باغ پور کو رخسانہ اور گونگا پہلوان کی گمشدگی کی خبر ہوگئی تھی۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''کیا آج طلبہ یا طالبات میں سے کسی نے ان کے غائب ہونے کا ذکر نہیں کیا؟ یہ تو آج کی سب سے زیادہ ہنگامہ خیز خبر ہے۔ آپ لوگوں کی لاعلمی پر مجھے بہت حیرت ہورہی ہے۔''

''اس کا بڑا ٹھوس سبب ہے ملک صاحب!'' ہیڈ ماسٹر محمد فیض نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''موضع باغ پور سے صرف ایک اسٹوڈنٹ ہی ہمارے اسکول میں پڑھنے آتی ہے اور وہ ہے چودھری بشارت علی کی بیٹی رخسانہ، لہٰذا ادھر باغ پور میں کیا سنگین واقعہ پیش آیا ہے، اس کی اطلاع ہم تک پہنچنے کا کوئی وسیلہ نہیں ہے۔ دوسرے بارش کی وجہ سے آج بچوں کی حاضری آدھے سے بھی کم ہے۔ شاید اسی لیے بھی اس سانحے کی خبر پوری طرح گردش میں نہیں ہے۔''

ہیڈ ماسٹر محمد فیض اور کلاس انچارج عادل حسین کی فراہم کردہ معلومات نے میرے ذہن کو خاصی الجھن میں ڈال دیا تھا اور ان حالات میں چودھری بشارت علی سے ایک تفصیلی ملاقات بہت ضروری محسوس ہورہی تھی اور وہ بھی فی الفور۔

میں نے ان دونوں صاحبان کا شکریہ ادا کیا اور واپسی کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے تعاون کے لیے میں بے حد ممنون ہوں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں دوبارہ ادھر آؤں گا۔ اس دوران میں اگر آپ کو کوئی اہم بات پتا چلے تو میں امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ فوراً مجھے بتائیں گے۔''

''آپ فکر نہ کریں ملک صاحب.....!'' محمد فیض نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رخسانہ کی تلاش کے سلسلے میں ہم سے جو بھی بن پڑا، ہم ضرور کریں گے۔''

میں انہیں خدا حافظ کہہ کر اسکول سے باہر نکل آیا۔ اب بارش تھم چکی تھی۔ تھانے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

''اسد علی! آج کی تاریخ میں تمہیں دو اہم کام کرنا ہیں اور وہ بھی سول ڈریس میں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟''

''جی ملک صاحب.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تھانے پہنچتے ہی یونیفارم اتار کر عوامی لباس پہن لوں گا۔ آپ حکم کریں، مجھے کون سے دو کام کرنا ہیں؟''

''میں نے باغ پور جاکر چودھری بشارت سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم بھی تانگے میں میرے ساتھ جاؤ گے لیکن میں گاؤں سے چند قدم پہلے ہی تمہیں تانگے سے اتار کر چودھری کی حویلی کی طرف بڑھ جاؤں گا۔ باغ پور کے وسنیکوں بشمول چودھری بشارت، سب پر یہی ظاہر کرنا ہے کہ میں اکیلا ہی چودھری سے ملنے آیا ہوں.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنے طور پر باغ پور میں گھس کر دو چیزوں کا پتا لگانا ہے۔ نمبر ایک، کیا رخسانہ کا گاؤں کے کسی مرد کے ساتھ عشق اور محبت والا کوئی معاملہ تھا؟ نمبر دو، باغ پور میں ایسے کتنے افراد ہوں گے جن کے جوتے کا نمبر دس یا اس سے زیادہ ہو۔ باغ پور میں لگ بھگ دو سو گھر ہیں اور محتاط اندازے کے مطابق اس گاؤں کی آبادی سات سو نفوس کے قریب ہوگی۔ اگر عورتوں اور بچوں کو شمار نہ کریں تو تمہیں کم و بیش دو سو افراد کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا ہوگی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کرلو گے نا.....؟''

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اللہ کے فضل اور آپ کی دعا سے ضرور کرلوں گا لیکن مجھے ایسا محسوس ہورہا

ہے کہ آپ میرے ساتھ باغ پور نہیں جانے والے.....''

''تمہیں کس بنا پر ایسا محسوس ہو رہا ہے؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تھانے کے سامنے چودھری بشارت کا خاص الخاص تانگا کھڑا نظر آ رہا ہے ملک صاحب!'' کانسٹیبل نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''لگتا ہے چودھری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں.....!''

ہم باتیں کرتے ہوئے تھانے کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ اسد علی کی بات کے جواب میں، میں نے نگاہ اٹھا کر تھانے کی جانب دیکھا تو کانسٹیبل کا کہا بالکل درست نظر آیا۔ میں نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''چلو، یہ بھی اچھا ہی ہوا.....!''

☆☆☆

میں اور چودھری بشارت علی، میرے کمرے میں، روبرو بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ اسد علی کو باغ پور روانہ ہونے کی ہدایت دے کر میں نے چودھری کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اضطرار اور چہرے سے فکرمندی جھلکتی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''ملک صاحب! میری رخسانہ کا کچھ پتا چلا.....؟''

''جی چودھری صاحب!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''رخسانہ اور گونگا کی گمشدگی کے حوالے سے مجھے ایک بہت ہی اہم بات پتا چلی ہے لیکن پہلے آپ میرے دو سوالات کے جواب دیں، اس کے بعد میں آپ کو صورتِ حال سے آگاہ کروں گا۔''

کل کی طرح آج بھی چودھری کے ساتھ دو ملازم احسان اور غفور تھانے آئے تھے اور وہ دونوں باہر برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ البتہ چودھری امانت علی نہیں آیا تھا۔ چودھری نے مجھے گمبھیرتا میں دیکھا تو بے چینی سے بولا۔

''جی، آپ سوال کریں۔ میں حاضر ہوں۔''

''کیا اب تک کسی نے آپ سے تاوان وغیرہ کا مطالبہ کیا ہے؟'' میں نے چودھری بشارت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں جناب۔'' وہ نفی میں سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''بالکل نہیں۔''

''رخسانہ اور گونگا کو منظر سے آؤٹ ہوئے ستائیس گھنٹے سے زیادہ گزر چکے ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر یہ اغوا برائے تاوان کا معاملہ ہوتا تو اغوا کاروں کی جانب سے اب تک ایسا کوئی مطالبہ سامنے آ جانا چاہیے تھا۔''

''ملک صاحب.....!'' چودھری بشارت نے حد درجہ اضطرابی لہجے میں کہا۔ ''وہ دونوں کل دو بجے دوپہر کے بعد غائب ہوئے ہیں۔ اس حساب سے ابھی تک لگ بھگ بیس گھنٹے گزر رہے ہیں اور آپ.....''

''چودھری صاحب!'' میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''ابھی آپ صرف میرے سوالات کے جواب دیں۔ باقی گزرے ہوئے وقت کا حساب کتاب ہم بعد میں کر لیں گے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''آپ دوسرا سوال پوچھیں.....!''

''میں نے آپ سے رخسانہ اور گونگا کی تصویریں مانگی تھیں۔'' میں نے استفسار کیا۔ ''ان کا کیا ہوا؟''

''وہ تصویریں میں لے کر آیا ہوں ملک صاحب۔'' وہ معتدل انداز میں گویا ہوا۔ ''وہ احسان کے پاس ہیں۔ میں ابھی آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔'' پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بہ آوازِ بلند پکارا۔

''اوئے احسان! ذرا اندر آ.....''

ان لمحات میں چودھری بشارت جتنا سیدھا اور سعادت مند نظر آ رہا تھا، درحقیقت وہ ایسا تھا نہیں۔ اس کے رعب و دبدبے کی کہانیاں مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں لیکن اس وقت وہ جس نوعیت کے حالات سے گزر رہا تھا، وہ بڑے دل فگار اور ستم شعار تھے۔ جوان بیٹی کی گمشدگی کے کرب اور اذیت کو کماحقہ محسوس کرنے کے لیے بنیادی شرط انسان کا باپ ہونا ضروری ہے۔

احسان نامی ملازم ایک تھیلے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا، پھر وہ چرمی تھیلا چودھری کی جانب بڑھانے کے بعد دست بستہ کھڑا ہو گیا۔

چودھری نے مذکورہ تھیلے کے اندر ہاتھ گھمانے کے بعد کسی دنگل کا ایک پوسٹر اور رخسانہ کی دو واضح تصاویر نکال کر میری سمت بڑھا دیں، پھر چرمی تھیلا احسان کو تھماتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم جا کر باہر بیٹھو۔''

احسان نے فوراً سے پیشتر چودھری کے حکم کی تعمیل کر دی۔

پوسٹر میں گونگا پہلوان کی تصویر ڈھونڈنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ اس پوسٹر میں سب سے نمایاں وہی نظر آرہا تھا اور تصویر کے ساتھ ہی جلی حروف میں اس کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ وہ لنگوٹ پہنے اور گرز اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے بدن پر لنگوٹ کے سوا لباس نام کی کوئی اور شے موجود نہیں تھی۔

میں نے دونوں تصاویر کا بغور جائزہ لینے کے بعد انہیں اپنی میز کی دراز میں ڈالا اور چودھری کی جانب دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔

''یہ تو معلوم ہوگیا کہ ان دونوں کی گمشدگی اغوا کا کیس نہیں ہے۔ آپ نے مجھے جو دو تصاویر مہیا کی ہیں، وہ رخسانہ اور گونگا کی تلاش میں کافی مددگار ثابت ہوں گی۔''

''اور وہ جو آپ نے کہا تھا کہ آپ کو رخسانہ اور گونگا کی گمشدگی کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم بات پتا چلی ہے.....؟'' وہ پُراضطرار لہجے میں بولا۔ ''وہ مجھے بھی تو بتائیں ملک صاحب!''

''ضرور..... کیوں نہیں!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''میں ابھی رخسانہ کے اسکول سے ہوکر آرہا ہوں چودھری صاحب۔ میں وہاں انکوائری کے لیے گیا تھا اور مجھے پتا چلا ہے کہ کل رخسانہ اسکول سے غیر حاضر تھی۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے.....؟'' وہ ایسے اچھلا جیسے اس نے بے دھیانی میں بجلی کے ہائی ٹینشن وائر کو چھولیا ہو۔

''ایسا ہی ہوا ہے چودھری صاحب.....'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور رخسانہ کے کلاس ٹیچر سے تفصیلی ملاقات کی ہے۔ انہیں تو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ رخسانہ کہیں غائب ہوگئی ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ گزشتہ روز رخسانہ اسکول گئی ہی نہیں۔''

''اوہ..... تو اسی لیے..... آپ نے رخسانہ کی گمشدگی کے سلسلے میں ستائیس گھنٹے سے زیادہ وقت کی..... بات کی تھی.....!'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ دونوں حویلی اور اسکول کے درمیان کسی جگہ غائب ہوئے ہیں.....''

''رخسانہ کو اسکول لانے، لے جانے والا تانگا میرے تھانے سے دو فرلانگ کے فاصلے پر جنوبی سمت میں سڑک کے کنارے، ایک درخت کے پاس کھڑا ملا ہے چودھری صاحب!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس صورتِ حال میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ دونوں حویلی اور اس درخت کے بیچ کسی مقام پر گم ہوئے ہیں.....''

''وہ اس وقت کہاں ہوں گے.....؟'' چودھری نے فکرمندی سے لبریز لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ کے سوال کا بالکل درست جواب دینے کے لیے مجھے پورا ایک دن یعنی چوبیس گھنٹے خود کو سرگرم عمل رکھنا ہوگا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''سرِ دست میں یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ آپ کی بیٹی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تو وہ اس وقت جہاں بھی ہے، مکمل خیریت سے ہے اور..... وہ وہاں اپنی مرضی سے گئی ہے۔''

''ملک صاحب! پتا نہیں آپ کس قسم کی خطرناک باتیں کررہے ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا..... میرا سر، درد سے پھٹ رہا ہے۔''

''چودھری صاحب! میں نے آپ سے جو بھی کہا ہے اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ حویلی چلے جائیں اور کل صبح تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ میری محنت ضرور رنگ لائے گی اور میں کل آپ کو کوئی اچھی خبر سناؤں گا..... انشاءاللہ!''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے ملک صاحب.....'' وہ عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ اندازہ نہیں لگاسکتے کہ میں رخسانہ کے لیے کس قدر پریشان ہوں۔''

''میں بخوبی اندازہ لگاسکتا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کیونکہ میں بھی ایک بیٹی کا باپ ہوں۔''

یہ جس زمانے کا واقعہ ہے، تب میری صرف ایک ہی اولاد تھی۔ وہی بیٹی جس کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے۔ میری بات کے جواب میں چودھری بشارت نے کہا۔

''بہت شکریہ ملک صاحب! اگر آپ میری رخسانہ کو بازیاب کرلیں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ رخسانہ کی ماں کا برا حال ہے۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی بے حد پریشان ہیں۔ پوری حویلی کو اداسی اور افسردگی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔''

''میں آپ کی اور آپ کی فیملی کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں چودھری صاحب!'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ حویلی جاکر اپنی اہلیہ اور دیگر افرادِ خانہ کو

سنبھالیں اور رخسانہ کی تلاش والا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں یہ سب اپنا فرض سمجھ کر کر رہا ہوں۔ اس میں آپ پر میرا کوئی احسان نہیں ہے۔''

''آپ چاہے نہ مانیں لیکن میں سمجھ سکتا ہوں ملک صاحب!'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''آپ میری خاطر بہت کچھ کر رہے ہیں۔''

میں نے چودھری کو جذباتی کیفیت سے نکالنے کے لیے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''کیا اس سے پہلے بھی کبھی رخسانہ گم ہوئی ہے؟''

''نہیں جناب.....'' وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میری زندگی میں ایسا واقعہ پہلی بار رونما ہوا ہے۔''

''کیا رخسانہ کے رشتے کی کہیں بات چل رہی تھی؟'' میں نے ذرا آگے کو جھکتے ہوئے رازدارانہ انداز میں سوال کیا۔

''نہ جی..... دور دور تک ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''نہ تو ہم نے ابھی تک اس بارے میں سوچا ہے اور نہ ہی کہیں اور سے رخسانہ کا رشتہ آیا ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ جی جان سے پڑھے۔ میری خواہش ہے کہ وہ ڈاکٹر بنے۔ آگے جو اللہ کی مرضی.....!''

''آپ کا ارادہ نیک اور خواہش قابلِ ستائش ہے چودھری صاحب۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا، پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کا کوئی عزیز، رشتے دار لاہور میں رہتا ہے؟''

''جی..... میرا بڑا سالا اعجاز علی لاہور میں رہتا ہے۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اعجاز علی لوکل گورنمنٹ میں افسر ہے۔''

''آپ کے سالے صاحب لاہور میں کہاں رہائش پذیر ہیں؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''گڑھی شاہو میں۔''

''کیا آپ مجھے اعجاز علی کے گھر اور دفتر کا ایڈریس دے سکتے ہیں.....؟'' میں نے سوالیہ نظر سے چودھری بشارت کی طرف دیکھا۔

''کیوں نہیں..... ضرور۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''لیکن آپ جیسا سوچ رہے ہیں، وہ ممکن نہیں ہے ملک صاحب۔ رخسانہ آج تک اکیلی حویلی سے باہر نہیں نکلی، لاہور تک چلے جانا تو بہت دور کی بات ہے۔''

''میں رخسانہ کے تن تنہا کہیں چلے جانے کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہا چودھری صاحب.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''باقی جہاں تک ممکن اور ناممکن کے بارے میں سوچنے کی بات ہے تو سوچ بچار کے بعد ہی ناممکن کو ممکن میں بدلا جا سکتا ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کو مجھ پر بھروسا تو ہے نا.....؟''

''ان حالات میں مجھے صرف آپ ہی پر بھروسا ہے ملک صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میری ساری امیدیں آپ ہی سے لگی ہوئی ہیں۔''

''تو پھر یقین رکھیں کہ میں آپ کی امید اور بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں جیسا کہتا ہوں، چپ چاپ ویسا کرتے جائیں۔ باقی سب مجھ پر چھوڑ دیں۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، مجھے اپنے لاہوری سالے اعجاز علی کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کیں، پھر میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

چودھری کے جانے کے بعد میں نے تانگا اسٹینڈ اور لاری اڈا جانے کا فیصلہ کیا تاکہ وہاں سے مفید معلومات اکٹھا کر سکوں لیکن قبل اس کے کہ میں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہناتا، بڑے خوفناک انداز میں آسمانی بجلی کڑکی، پھر بادلوں کی گھن گرج سنائی دی۔ اس کے بعد بارش کو جلال آ گیا۔ آسمان سے برشگال اتی تیز رفتاری سے برس رہی تھی کہ چند گز دور کا منظر بھی دھندلا کر رہ گیا تھا۔ ایسے خطرناک موسم میں تھانے سے باہر قدم نکالنے کا فیصلہ کسی بھی طور مناسب اور سودمند نہیں تھا، لہٰذا میں اس معاملے میں ''ہیتڈز اپ'' ہو گیا۔

دن کا باقی حصہ میں نے تھانے کے اندر ہی بیٹھ کر گزارا کیونکہ چھاجوں برستی برکھا نے بیرونِ خانہ زندگی کو ایک مقام پر لا کر ٹھہرا دیا تھا۔ ان لمحات میں مجھے کانسٹیبل اسد علی کی فکر ہو رہی تھی۔ میں نے اسے ایک خاص مقصد سے باغ پور بھیجا تھا۔ میں نے اس کے ذمے جو کام لگایا تھا، اس کا غالب حصہ ''آؤٹ ڈور'' پر مشتمل تھا اور اس طوفانی مینہ نے آؤٹ ڈور کو آؤٹ آف کنٹرول کر کے رکھ دیا تھا.....!

☆☆☆

انیس مئی کی صبح روشن اور چمک دار تھی۔ رات گئے تک بارش کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا تھا لیکن سورج طلوع ہونے تک یہ برساتی معاملہ تھم چکا تھا اور آج سورج بھی ایسا نکلا تھا کہ بقول کسے..... لگ پتا جا رہا تھا!

میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو کانسٹیبل اسد علی میرے پاس آ گیا۔ میں نے گزشتہ روز اسد علی کو موضع باغ پور آیا خاص مشن پر بھیجا تھا۔ رات جب تک میں تھانے میں موجود رہا، اسد علی کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے کراری آواز میں مجھے سلام کیا۔

''السلام علیکم ملک صاحب!''

''وعلیکم السلام.....'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم کب آئے؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ملک صاحب!'' اس نے میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ ''بارش نے کل بہت وقت ضائع کر دیا۔ اگر یہ رکاوٹ نہ ہوتی تو میں رات ہی کو واپس آ جاتا۔ آپ نے مجھے جو مشن سونپا تھا، میں اسے ادھورا چھوڑ کر نہیں آ سکتا تھا لہٰذا رات کو میں باغ پور ہی میں رک گیا تھا۔''

''اس شب باشی سے کچھ حاصل بھی ہوا.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

اس نے بڑے اعتماد سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا رپورٹ ہے؟''

''مشکل اور وقت ہی سے سہی مگر.....'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کے بتائے ہوئے دونوں کام کر دیے ہیں۔''

''تفصیلات کیا ہیں؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''پورے باغ پور میں غیر معمولی بڑے پاؤں والے صرف دو افراد ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ان کے جوتے کے نمبر کو ''دس'' کے آس پاس سمجھا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک کا نام ستار عرف تارا ہے۔ تارا، چودھری بشارت علی کا ملازم ہے اور ڈیرے کے معاملات کو دیکھتا ہے۔ تارا کی عمر تیس سال اور قد چھ فٹ دو انچ ہے۔ تارا کے ساتھ ڈیرے پر ایک دوسرا بندہ منظور عرف جھورا بھی ہوتا ہے۔ جھورا کی عمر چالیس سال ہے۔ وہ مختلف کاموں میں تارا کی مدد کرتا ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ ہے اور جوتے کا نمبر آٹھ ہے.....''

''اور بڑے پاؤں والا دوسرا شخص کون ہے؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال داغ دیا۔

''اس بندے کا نام اویس ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''اویس کی عمر بائیس سال، قد پانچ فٹ گیارہ انچ اور جوتے کا نمبر تقریباً دس ہے۔ اویس کا باپ افضل گاؤں میں کریانے کی ایک دکان چلاتا ہے اور اس کام میں اویس اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اویس کی ماں کا نام شہناز ہے۔ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے جس کا نام انیسہ اور عمر دس سال ہے۔''

''یہ تو ہو گیا ایک کام کا تفصیلی جواب۔'' میں نے کانسٹیبل کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اور دوسرے کام کا کیا ہوا.....؟''

''میں نے جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کی روشنی میں صرف ایک ایسا نام سامنے آیا ہے جو گمشدہ رخسانہ سے محبت کرتا ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''مگر اس کی یہ محبت ون وے ٹریفک ہے۔ ایسا کچھ سننے اور دیکھنے میں نہیں آیا کہ رخسانہ بھی اس بندے میں دلچسپی رکھتی ہو۔''

''یک طرفہ محبت میں مبتلا وہ بندہ ہے کون.....؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ مذکورہ شخص کا نام ہے، اویس.....!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''افضل کریانہ فروش کا اکلوتا بیٹا اویس جو اس وقت باغ پور میں موجود نہیں۔''

''گاؤں میں موجود نہیں تو پھر وہ کہاں ہے؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ اویس سوموار کی صبح لاہور گیا ہے۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''اور اس کی واپسی ایک ہفتے کے بعد ہوگی۔''

''سوموار کی صبح..... یعنی سترہ مئی کے دن.....'' میں چونک اٹھا۔ ''رخسانہ بھی تو سترہ مئی کی صبح ہی سے غائب ہے.....''

''جی ملک صاحب! زمینی حقائق تو یہی بتا رہے ہیں۔'' اسد علی نے کہا۔ ''اور ہم اسے محض اتفاق نہیں سمجھ سکتے۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو اسد.....'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''اویس، رخسانہ سے محبت کرتا ہے۔ بظاہر یہ ایک خفیہ اور یکطرفہ محبت ہے لیکن عین ممکن ہے کہ سچائی اس کے برعکس ہو۔ میرا مطلب ہے ہو سکتا ہے رخسانہ بھی اپنے دل میں اویس کی چاہت رکھتی ہو لیکن اس نے اپنے معاملاتِ عشق کو گاؤں والوں کی نگاہ سے یکسر چھپا کر رکھا ہو۔ ایسا ہو سکتا ہے نا؟''

''بالکل ہو سکتا ہے ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عشق اور محبت کے معاملات

کے حوالے سے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا..... کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

''اگر رخسانہ بھی اویس کی محبت میں مبتلا ہے تو پھر ان کے ایک ساتھ کہیں چلے جانے کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''وہ تانگا جہاں درخت کے ساتھ بندھا ملا ہے وہاں سے سڑک سیدھی لاہور کو جاتی ہے اور تم بتا رہے ہو کہ اویس لاہور گیا ہے۔ ہمیں فوری طور پر یہ پتا چلانا ہوگا کہ اویس لاہور میں کس جگہ گیا ہے؟''

''وہ میں نے سب معلوم کرلیا ہے۔'' اسد علی نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''تو بتاؤ، وہ کہاں گیا ہے؟'' میں نے ترنت پوچھا۔

''اویس کے باپ افضل سے میری بات ہوئی ہے۔'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ ادھر لاہور کے علاقے اچھرہ میں اویس کی بڑی خالہ طاہرہ رہتی ہے۔ اویس اپنی اسی خالہ کے پاس گیا ہے۔ طاہرہ کا گھر اچھرہ میں پاکستان چوک کے نزدیک ''یونانی دواخانہ'' کے پہلو میں ہے۔ یہ دواخانہ اس کے خالو صمد علی کا ہے۔ میں سمجھتا ہوں لاہور میں اویس تک رسائی حاصل کرنے میں ہمیں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ اس کا خالو صمد علی ایک یونانی طبیب ہے، پورا اچھرہ اسے جانتا ہوگا۔''

''تم بالکل منطقی انداز میں سوچ رہے ہو اسد!'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''ہم بہ آسانی اویس کو چھاپ سکتے ہیں اور اگر رخسانہ بھی اویس کے ساتھ ہے تو ہم اسے بھی بازیاب کرلیں گے، بہ شرط یہ کہ وہ دونوں سیدھے صمد علی کے گھر ہی گئے ہوں.....!''

''کہیں نہ کہیں سے تو شروع کرنا ہی ہوگا ملک صاحب!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھ سکتے نا.....''

''اسد علی! اس کام کی شروعات ہوچکی ہے۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''بس اس میں تیزی بھرنے کی ضرورت ہے۔ ہم دونوں تھوڑی دیر میں لاہور کے لیے روانہ ہورہے ہیں۔ رخسانہ کے ساتھ ہی گونگا پہلوان بھی غائب ہوا ہے۔ اگر رخسانہ مل گئی تو گونگا بھی ہمارے ہتھے چڑھے گا۔ میں نے چودھری بشارت سے اس کے سالے کا ایڈریس لے لیا ہے، وہ لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں رہتا ہے۔ رخسانہ کا یہ ماموں اعجاز علی لوکل گورنمنٹ میں کوئی افسر ہے۔ لاہور میں ہماری یہی دو منزلیں ہوں گی۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ اگر گمشدہ رخسانہ اچھرہ یا گڑھی شاہو میں نہ ملی تو پھر سوچیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ فی الحال تم ایک کام کرو.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تم بس اسٹینڈ پر جاؤ اور پتا کرو کہ کوئی بس یا ویگن لاہور کی طرف کتنے بجے جائے گی۔ ہم دونوں اسی کے ذریعے لاہور جائیں گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''سمجھ گیا ملک صاحب.....'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی معلوم کرکے آتا ہوں۔''

کانسٹیبل اسد علی کے جانے کے بعد میں نے حوالدار بشیر حسین کو اپنے پاس بلا لیا۔ بشیر حسین کی عمر کم و بیش چالیس سال تھی۔ وہ ایک فرض شناس حوالدار تھا اور میرے اسٹاف میں سب سے سینئر بھی۔ بشیر حسین میرے کمرے میں آیا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بشیر حسین! چودھری بشارت علی کی بیٹی رخسانہ اور ان کے پہلوان ملازم گونگا کے بارے میں مجھے کچھ اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ میں ان کی تلاش میں لاہور جارہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں تم نے تھانے کے معاملات کو سنبھالنا ہے۔''

''آپ بے فکر ہوکر جائیں ملک صاحب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں کوئی شکایت پیدا نہیں ہونے دوں گا.....'' پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ اکیلے ہی لاہور جائیں گے؟''

''نہیں..... کانسٹیبل اسد علی بھی میرے ساتھ جائے گا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے لاہور جانے والی ٹرانسپورٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بس اسٹینڈ بھیجا ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا بشیر حسین کہ ہمارا ''لاہور مشن'' ٹاپ سیکرٹ ہے۔ کسی کو اس کی ہوا نہیں لگنی چاہیے۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اس دوران میں عین ممکن ہے کہ چودھری بشارت یا اس کا کوئی بندہ مجھ سے ملنے تھانے آئے۔ تم نے انہیں بڑی خوبصورتی سے ہینڈل کرنا ہے۔ کسی کو ہرگز یہ خبر نہیں ہونا چاہیے کہ میں لاہور گیا ہوا ہوں۔ تم حسبِ ضرورت کوئی بھی بہانہ کرسکتے ہو۔''

''یہ رازداری صرف چودھری بشارت علی اور باغ پور کے وسنیکوں تک محدود ہے یا اس حوالے سے ہمارے تھانے کا عملہ بھی شامل ہے؟'' حوالدار نے ایک اہم سوال کیا۔

''جہاں تک بھی ممکن ہو، رازداری برتی جائے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''خصوصاً چودھری اور اس کے اردگرد والے تمام افراد سے......''

''سمجھ گیا جناب!'' اس نے پُراعتماد لہجے میں کہا، پھر پوچھا۔ ''آپ کی واپسی کب تک ہوگی؟''

''میری کوشش ہوگی کہ آج ہی لوٹ آؤں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آگے جو اللہ کو منظور......''

''ٹھیک ہے جناب! انشاء اللہ میں اپنی کارکردگی سے آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔'' حوالدار نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میرے تھانے اور بس اسٹینڈ کے بیچ تانگا اسٹینڈ تھا۔ یعنی تھانے سے بس اسٹینڈ جا کر وہاں سے بس کی معلومات حاصل کر کے واپس آنے میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگ سکتے تھے لیکن جب اسد علی کی واپسی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہوئی تو میں اس پر برس پڑا۔

''تم بس کا ٹائم معلوم کرنے گئے تھے یا لاہور تک بس کا سفر ناپنے......؟'' میں نے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم آٹھ بجے گئے تھے اور اب ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ اتنی دیر کہاں اور کیوں لگی؟''

''اس تاخیر کے لیے میں معذرت خواہ ہوں ملک صاحب!'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نے بس اسٹینڈ پر پہنچتے ہی معلوم کرلیا تھا کہ لاہور جانے والی بس ٹھیک گیارہ بجے اسٹینڈ سے نکلے گی......''

''جب تمہیں بس کی روانگی کا وقت معلوم ہوگیا تھا تو پھر تم بس اسٹینڈ پر کیا کرتے پھر رہے تھے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ میں یہاں کتنا فکرمند ہو رہا تھا......؟''

''میں بے حد معذرت خواہ ہوں ملک صاحب لیکن بس اسٹینڈ پر دو ایسے افراد سے میری ملاقات ہوگئی کہ میں ان سے چند باتیں کرنے کے لیے وہاں رک گیا تھا۔''

''ایسی کون سی خاص باتیں تھیں؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔

''ان باتوں کا تعلق رخسانہ، گونگا اور اس تانگے سے ہے جو تھانے سے دو فرلانگ جنوب میں ایک درخت سے بندھا ہوا ملا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ سن کر حیرت زدہ رہ جائیں گے۔''

''جلدی سناؤ مجھے......'' میں نے کانسٹیبل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کافی دنوں سے حیران نہیں ہوا ہوں۔ تم نے ان دو افراد سے ایسی کون سی خاص باتیں کی ہیں اور اس سے بھی پہلے بتاؤ کہ وہ دونوں ہیں کون......؟''

''ان میں سے ایک کا نام رفیق ہے۔'' کانسٹیبل نے معتدل انداز میں کہا۔ ''رفیق ایک کھیت مزدور ہے جناب۔ اس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے وقوعہ کے روز صبح دس بجے وہ تانگا درخت کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تانگے کو وہاں تک لانے والے بڑے پاؤں کے مالک شخص نے صبح آٹھ اور دس بجے کے درمیان تانگے کو وہاں پہنچایا ہوگا......''

''کیا رفیق نے تانگا وہاں پہنچانے والے بندے کو بھی دیکھا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔ ''آتے یا جاتے یا لگام درخت کے ساتھ باندھتے ہوئے......؟''

''نہیں جناب۔'' کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''رفیق نے بس تانگے کو اس درخت کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا تھا اور اس پر اسے خاصی حیرت بھی ہوئی تھی۔ وہ چودھری بشارت کی حویلی سے تعلق رکھنے والے اس تانگے کو اچھی طرح پہچانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ روزانہ رخسانہ اسی تانگے پر اسکول آتی جاتی ہے۔ بعدازاں جب اسے پتا چلا کہ چودھری صاحب کی بیٹی اور گونگا پہلوان اچانک کہیں غائب ہوگئے ہیں تو اس نے چپ سادھ لی۔ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ اگر اس نے کسی کو تانگے کی وہاں موجودگی کے بارے میں بتایا تو پولیس کہیں شک کی بنیاد پر اسے نہ دھر لے۔ بس اسی لیے وہ دبکا بیٹھا رہا......''

''تو اب بھی وہ چپ ہی بیٹھا رہتا۔'' میں نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ بتا کر اس نے کون سا تیر مار لیا ہے کہ وقوعہ کے روز دس بجے وہ تانگا سڑک کے کنارے ایک درخت سے بندھا ہوا تھا؟''

''اگرچہ رفیق کی گواہی میں کچھ خاص نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس سے رخسانہ اور گونگا کی گمشدگی کے حوالے سے ہمیں ایک اہم اشارہ ملتا ہے۔''

''کیسا اشارہ اسد علی؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''میں نے معلوم کیا ہے کہ اس بس اسٹینڈ سے دن میں صرف دو بسیں لاہور کی طرف جاتی ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک صبح نو بجے اور دوسری دوپہر گیارہ بجے۔ تو ثابت یہ ہوا کہ رخسانہ اور گونگا نے لاہور جانے کے لیے صبح نو بجے والی بس پکڑی ہوگی۔ بعدازاں کسی بڑے پاؤں والے شخص نے ان کا تانگا اس درخت سے باندھ دیا

ہوگا۔

''بڑے سائز کے پاؤں والوں سے تو میں بعد میں نمٹوں گا.....'' میں نے سرسری انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''لیکن تم نے یہ کیسے ثابت کرلیا کہ وقوعہ کے روز رخسانہ اور گونگا صبح نو بجے والی بس میں سوار ہوکر لاہور گئے ہیں؟''

''یہ میں نے نہیں، یعقوب نے ثابت کیا ہے ملک صاحب!'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''اس نے اپنی آنکھوں سے وقوعہ کی صبح نو بجے گونگا پہلوان کو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ لاہور جانے والی بس میں سوار ہوتے دیکھا تھا۔ یعقوب لاری اڈے پر پھل فروٹ بیچتا ہے ملک صاحب۔ میں نے اس کا تفصیلی انٹرویو کیا ہے۔ ہم جان چکے ہیں کہ گونگا کا کوئی عزیز رشتے دار اس دنیا میں موجود نہیں لہٰذا اغلب امکان اسی بات کا ہے کہ اس کے ساتھ وہ برقع پوش عورت رخسانہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی.....!''

''ہوں.....!'' اسد علی کی وضاحت سن کر میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ گزشتہ روز کی بارش نے مجھے جو کام نہیں کرنے دیا تھا، وہ اسد نے... بہ خوبی انجام کو پہنچا دیا تھا۔

''تو ٹھیک ہے۔ ہم دونوں گیارہ بجے والی بس پر سوار ہوکر لاہور جارہے ہیں۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''یہ معلوم کرنے کہ گونگا کے ساتھ بس میں بیٹھنے والی وہ برقع پوش عورت چودھری بشارت علی کی بیٹی رخسانہ ہی تھی یا کوئی اور۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ پتا بھی چلانا ہے کہ افضل کریانہ فروش کا عاشق مزاج لڑکا لاہور اکیلا ہی گیا ہے یا اس کے ساتھ رخسانہ بھی تھی؟ ہمارا اصل ٹارگٹ رخسانہ ہے اور ہم اپنے ٹارگٹ تک پہنچ کر ہی رہیں گے۔ تم ضروری تیاری کرلو۔ بس ہم نکل رہے ہیں.....''

''جو حکم ملک صاحب!'' وہ مستعدی سے بولا۔

☆☆☆

بس نے ظہر کی نماز کے بعد ہمیں بادامی باغ لاہور کے جنرل بس اسٹینڈ پہنچا دیا۔ بادامی باغ سے گڑھی شاہو کا علاقہ اچھرہ کی بہ نسبت کافی نزدیک تھا لہٰذا میں نے اپنی تفتیش کا آغاز گڑھی شاہو سے کرنے کا فیصلہ کیا اور کوئی بھی عملی قدم اٹھانے سے پہلے متعلقہ تھانے جاکر اپنی حاضری لگانی اور مذکورہ تھانے کو اپنی لاہور آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد میں نے چودھری بشارت علی کے سالے اعجاز علی کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔

''ملک صاحب! ابھی دفتری اوقات ختم نہیں

شاہو میں اگر ہمیں کامیابی حاصل نہ ہوئی تو ہم اچھرہ کا رخ کریں گے۔ اس کے بعد چل سو چل..... اگر انسان مسلسل چلتا رہے تو ایک دن ضرور اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے.....''

ہم باتیں کرتے ہوئے اعجاز علی کے گھر پہنچ گئے۔ گڑھی شاہو میں چودھری بشارت علی کے سالے صاحب کی رہائش گاہ دو سنیما ہاؤس کے نزدیک تھی۔ اگر میری یادداشت ساتھ دے رہی ہے تو ان سنیماز کے نام ''تاج'' اور ''کراؤن'' تھے۔ ہم دونوں اس وقت عوامی لباس میں تھے۔

''اسد! تم دروازے پر دستک دو۔'' میں نے کہا۔

''تمہارا نام صابر علی ہے اور میں عارف حسین ہوں۔ ہم موضع باغ پور سے آئے ہیں اور ایک ضروری کام کے سلسلے میں اعجاز علی سے ملنے آئے ہیں۔ اتنا کافی ہے یا.....؟''

''کافی ہے ملک صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

اعجاز علی ایک سرکاری افسر تھا اور اس نے گھر کے بیرونی دروازے پر ڈور بیل نصب کروا رکھی تھی لہٰذا اسد علی کو دستک نہیں دینا پڑی۔ اس نے سیدھا ڈور بیل پر انگلی رکھ دی۔

پندرہ بیس سیکنڈ کے بعد ایک نوجوان دروازے پر نمودار ہوا۔ اس کی عمر بیس کے آس پاس ہوگی۔ وہ ایک خوب رو، دراز قامت اور صحت مند جوان تھا۔ اس نے سوالیہ نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا، پھر پوچھا۔

''جی..... آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''اعجاز علی سے۔'' اسد نے جواب دیا۔

''ابو تو آفس میں ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور آپ کو ابو سے کیا کام ہے؟''

اس نوجوان کے پہلے دو سوالات کا جواب اسد علی نے دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بول اٹھا۔

''برخوردار! ہمیں تمہارے ابو سے کام ہے تو ظاہر ہے بتائیں گے بھی اعجاز علی کو ہی۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟ ہم اعجاز علی کا انتظار کریں گے۔''

''علی! باہر کون ہے؟'' اس نوجوان کے عقب میں گھر کے اندر ایک استفساریہ نسوانی آواز ابھری۔ ''تم کس سے باتیں کر رہے ہو.....؟''

''امی! باغ پور سے دو بندے ابو سے ملنے آئے ہیں۔'' علی کے نام سے پکارے جانے والے اس نوجوان نے اپنی ماں کو بتایا۔ ''میں انہیں پہچانتا نہیں اور یہ گھر کے اندر بیٹھ کر ابو کا انتظار کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے نام عارف حسین اور صابر علی بتائے ہیں.....''

''بہن!'' میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرنے کے بعد بہ آواز بلند کہا۔ ''وہاں باغ پور میں چودھری بشارت علی ایک مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ انہی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ جب تک اعجاز علی آفس سے آتے، ہم آپ سے بات کر لیتے ہیں۔''

میری بات کے جواب میں گھر کے اندر لحاتی سکوت طاری ہوگیا، پھر مسز اعجاز علی نے اپنے بیٹے سے کہا۔

''علی! دونوں مہمانوں کو بیٹھک میں بٹھاؤ۔ میں دس منٹ میں آتی ہوں۔''

اپنی ماں کے احکامات کی تعمیل میں علی نامی اس نوجوان نے ہمیں بصد احترام اپنی بیٹھک میں بٹھا دیا۔ وہ ایک آراستہ و پیراستہ شاندار ڈرائنگ روم تھا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا پورا نام علی رضا تھا اور وہ ایک مقامی کالج میں الیف ایس سی کر رہا تھا۔ مستقبل میں اس کا ارادہ انجینئر بننے کا تھا۔

چند منٹ بعد ایک باپردہ خاتون ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوئی۔ اس نے دوپٹے کو اس طرح پہن رکھا تھا کہ صرف اس کے دونوں ہاتھ اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ ٹرے کے اندر شربت سے بھرا ہوا ایک جگ اور دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس خاتون نے مذکورہ ٹرے کو میز پر رکھا، پھر ہمارے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔

''علی! مہمانوں کو شربت پیش کرو۔''

علی نے ایک بار پھر اپنی ماں کے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں اور اسد ٹھنڈے شربت سے بھرے ہوئے گلاس اٹھا چکے تو اس نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''بشارت بھائی کس مشکل میں پھنس گئے ہیں؟''

میں نے مور چا سنبھال لیا۔ اس دوران میں، میں نے ذہن بنا لیا تھا کہ اعجاز علی کی آمد سے پہلے میں نے کس طرح اس کی بیوی کے ساتھ نفسیاتی کھیل کھیلنا ہے لہٰذا میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''چودھری صاحب کی پریشانی کا تعلق رخسانہ سے ہے۔ اگر آپ رخسانہ کو یہاں بلا لیں تو زیادہ آسانی سے بات ہو پائے گی.....!''

بات چیت کے دوران میں، میں مسلسل مسز اعجاز کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ رخسانہ کے ذکر

پر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی بے چینی پیدا ہوئی تھی۔ وہ مجھے الجھن کا شکار دکھائی دی تاہم جلد ہی اس نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا اور بیٹے سے کہا۔

''علی! جاؤ، اندر سے رخسانہ کو لے آؤ.....!''

علی رضا اپنی ماں کا حکم بجالانے کی غرض سے بیٹھک سے نکل گیا تو میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ رخسانہ جب یہاں آئے گی تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔''

''میں فکرمند نہیں بلکہ الجھی ہوئی ہوں۔'' وہ ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ بشارت بھائی کی کسی پریشانی سے رخسانہ کا کیا واسطہ ہوسکتا ہے.....؟''

مسز اعجاز علی کی بات میں اتنی ازجی تھی کہ میرے دماغ کے کسی دور دراز حصے میں ایک سرخ بتی جل بجھ کرنے میں مصروف ہوگئی جس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ کیا گڑبڑ؟ میں سردست اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسی گفتگو کے دوران میں، میں نے اپنی جیب سے چودھری بشارت کی فراہم کردہ رخسانہ کی ایک تصویر نکال لی تھی۔

''ہر تعلق واسطہ روزِ روشن کے مانند عیاں ہو جائے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ادھر میری بات مکمل ہوئی، ادھر علی رضا ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکی کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوا۔ مسز اعجاز علی نے اس لڑکی کو اشارے سے بلا کر اپنے پہلو میں بٹھالیا، پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''عارف صاحب! رخسانہ آگئی ہے۔ اب بتائیں، معاملہ کیا ہے؟''

میں نے بغور اس لڑکی کا جائزہ لیا، پھر اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی تصویر پر نگاہ جما کر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ وہ رخسانہ نہیں ہے جس کی تلاش میں، میں باغ پور ضلع جھنگ صدر سے چل کر یہاں آیا ہوں.....!''

''تو پھر آپ کس رخسانہ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں.....؟'' اس نے اضطراری انداز میں استفسار کیا۔

میں نے چودھری بشارت علی کی لاپتا بیٹی رخسانہ کی تصویر کو مسز اعجاز کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اسے!''

مذکورہ تصویر پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تو بشارت بھائی کی بیٹی رخسانہ ہے۔ میں یہی سمجھی تھی کہ آپ ہماری بیٹی رخسانہ کا ذکر کر رہے ہیں.....!''

مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ اعجاز علی کی اس گیارہ بارہ سالہ بیٹی اور چودھری بشارت کی گمشدہ بیٹی کا نام ایک جیسا تھا۔

''آخر معاملہ کیا ہے جناب.....؟'' علی رضا نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ میری پھوپی صفیہ کی بیٹی رخسانہ کے بارے میں یہ کس قسم کی پوچھ تاچھ کرتے پھر رہے ہیں؟''

''بشارت بھائی کی بیٹی رخسانہ خیریت سے تو ہے نا.....؟'' علی رضا کی ماں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

قبل اس کے کہ میں ان ماں بیٹے کے سوالات کے جوابات دیتا، گھر کے اندر ڈور بیل بج اٹھی۔ مسز اعجاز نے بیٹے سے کہا۔

''علی! جا کر دیکھو۔ مجھے لگتا ہے تمہارے ابو آگئے ہیں۔''

مسز اعجاز کو بالکل ٹھیک لگا تھا۔ چودھری بشارت علی کا بڑا سالا اعجاز علی آفس سے واپس آگیا تھا۔ گھر کے اندر دو اجنبی افراد کو دیکھ کر وہ چونکا تو ضرور لیکن میں نے آئندہ چند منٹ میں اپنا اصلی تعارف کرانے کے بعد نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ان چاروں کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

میری فراہم کردہ اس سنگین اور فکر انگیز اطلاع کے بعد ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ آپ بہ خوبی لگا سکتے ہیں۔ میں نے مزید آدھے گھنٹے تک اعجاز علی اور اس کی بیوی یاسمین سے تنہائی میں بات چیت کی جس سے میرے علم میں صرف اتنا اضافہ ہوا..... وہ لوگ چودھری بشارت کی گمشدہ بیٹی رخسانہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ رخسانہ کبھی اکیلی ان کے گھر نہیں آئی تھی۔ چودھری بشارت اپنی بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا اور ان سالا بہنوئی میں یہ طے ہو چکا تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد رخسانہ لاہور کے کسی کالج میں داخلہ لے گی اور ان کے گھر میں رہائش اختیار کرے گی اور جب تک وہ ڈاکٹر نہیں بن جاتی، وہ ان کے پاس لاہور ہی میں رہے گی اور یہ کہ..... وہ لوگ رخسانہ کی اس پراسرار گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے..... وغیرہ وغیرہ.....!

میں نے ان لوگوں کو اویس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور اس کے دو اہم اسباب تھے۔ نمبر ایک، ابھی تک ہمیں جو اطلاع ملی تھی اس کے مطابق اویس کی محبت یک طرفہ تھی لہٰذا اویس اور رخسانہ کی محبت کا ڈھنڈورا پیٹنا ایک نامناسب اور غیر اخلاقی فعل ہوتا۔ نمبر دو، میں نے تنہائی میں اعجاز اور یاسمین سے بات چیت کے دوران میں

یہ محسوس کرلیا تھا کہ وہ لوگ مستقبل میں ڈاکٹر رخسانہ اور انجینئر علی رضا کی شادی کے خواب بن رہے تھے لہٰذا جس معاملے کا میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا، اس کا چرچا کرنا اعجاز علی اور یاسمین کے خوابوں کے شیش محل کو چکنا چُور کرنے کے مترادف ہوتا۔

ظاہر ہے، میں یہ ظلم نہیں کرسکتا تھا!

☆☆☆

ویگن نے ہمیں اچھرہ موڑ پر اتارا اور ہم فیروز پور روڈ کو عبور کرکے دوسری جانب آگئے۔ اس زمانے میں فیروز پور روڈ آج کل کی طرح حد درجہ مصروف سڑک نہیں ہوا کرتی تھی۔ کئی سال پہلے لاہور کے اس اہم سڑک کا نام فیروز پور روڈ سے بدل کر جلال الدین رومی روڈ رکھ دیا گیا تھا لیکن اس قانونی کارروائی نے لاہور کے باسیوں اور مختلف محکموں پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ آج بھی ہر طرف فیروز پور روڈ ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ یہ سڑک شہر لاہور کے قلب سے گزرتی ہے اور جسدِ شہر میں ریڑھ کی ہڈی ایسی حیثیت کی حامل ہے۔

ہم اچھرہ کے مین بازار میں خراماں خراماں چلتے ہوئے پاکستان چوک پہنچ گئے۔ اویس کے خالو صمد علی کا دواخانہ تلاش کرنے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا لیکن میں نے حکیم صاحب سے ملاقات کرنے کے بجائے ان کے گھر کے دروازے پر دستک دینا زیادہ مناسب جانا۔ گھر اور یونانی دواخانہ پہلو بہ پہلو تھے۔

دستک کے جواب میں ایک ستائیس، اٹھائیس سالہ مرد نے دروازہ کھولا۔ اپنے سامنے دو اجنبی افراد کو کھڑے دیکھ کر اس کی پیشانی پر الجھن نمودار ہوئی۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے کراری آواز میں کہا۔

''السلام علیکم.....!''

''جی، وعلیکم السلام۔'' اس نے میرے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''آپ کو کس سے ملنا ہے؟ ابا جی تو دواخانے پر ہیں۔''

اس شخص کی بات سن کر یہ تو پتا چل گیا کہ وہ حکیم صمد علی کا بیٹا تھا۔ میں نے اپنا اور اسد علی کا بالترتیب عارف حسین ادر صابر علی کے ناموں سے تعارف کرانے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم حکیم جی سے ملنے نہیں آئے برخوردار.....''

وہ لگ بھگ میرا ہم عمر ہی تھا لیکن میں نے اپنے انداز میں نرمی اور شفقت کو شامل رکھنا ضروری جانا تھا اسی لیے ''برخوردار'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میرے جواب نے اس کی الجھن میں اضافہ کردیا۔

''تو پھر.....؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''ہم باغ پور والے مہمان سے ملاقات کرنے آئے ہیں.....!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اوہ.....تو آپ اویس سے ملنے آئے ہیں۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اپنے نام تو بتادیے ہیں لیکن یہ پتا نہیں چلا کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟ میں اویس کو آپ کے بارے میں کیا بتاؤں؟''

''ہم باغ پور ہی سے آئے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''اویس کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہم نہایت ہی حساس معاملے پر اس سے بات کرنے آئے ہیں جو ظاہر ہے یہاں گلی میں کھڑے کھڑے مناسب نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم گھر کے اندر بیٹھ کر گفتگو کریں۔ کیا یہ ممکن ہے.....؟''

بات کے اختتام پر میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''ہاں، ہاں..... کیوں نہیں۔ میں آپ کے لیے بیٹھک کھولتا ہوں اور ابا جی کو بھی آپ کی آمد کے بارے میں بتاتا ہوں.....''

''فی الحال تم حکیم جی کو کچھ نہ بتاؤ تو اچھا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''انہیں اپنے مریضوں کے ساتھ مصروف رہنے دو۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم انہیں زحمت دیں گے۔''

پتا نہیں میری بات اس کے پلے پڑی کہ نہیں، بہرحال وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گھر کے اندر غائب ہوگیا۔ ٹھیک ایک منٹ کے بعد ہم حکیم صمد علی کی بیٹھک میں براجمان ہوچکے تھے۔ حکیم کا صاحبزادہ یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا۔

''آپ لوگ اطمینان سے بیٹھیں۔ میں اویس کو لے کر آتا ہوں۔ میرا نام رمضان علی ہے۔ میں حکیم صاحب کا سب سے بڑا بیٹا ہوں۔''

جاتے جاتے وہ اپنا تعارف بھی کرا گیا تھا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ حکیم جی کی چھ اولادیں تھیں۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ سب سے بڑا بیٹا یہی رمضان علی تھا جس کی عمر ستائیس سال تھی۔ اس سے دو سال چھوٹا فیضان علی تھا۔ فیضان سے ایک سال چھوٹی نرگس اور نرگس سے دو

سال چھوٹی عالیہ تھی۔ عالیہ سے دو سال چھوٹا سلطان علی اور سلطان سے دو سال چھوٹی فریدہ تھی۔ رمضان، فیضان، نرگس، عالیہ اور سلطان کی شادی ہو چکی تھی، صرف فریدہ غیر شادی شدہ تھی۔ نرگس اور عالیہ اپنے اپنے گھروں میں راضی خوشی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ حکیم جی کے ہاں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا لہٰذا رمضان، فیضان اور سلطان شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی اپنے باپ کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے زندگی بسر کر رہے تھے اور مزے کی بات یہ کہ وہ تینوں اور ان کی بیویاں اور بچے سب کے سب خوش و خرم اور مطمئن تھے۔ اٹھارہ سالہ فریدہ کو بھی اپنی بھابیوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ عنقریب فریدہ کی بھی شادی ہونے والی تھی۔

رمضان علی کے جانے کے بعد اسد نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! یہ جان لینے کے بعد کہ باغ پور سے دو بندے اس سے ملنے کے لیے آئے ہیں، کیا اویس بیٹھک میں آجائے گا؟ میرے خیال میں ہمیں باغ پور کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''اس سلسلے میں، میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ غلطی میں نے جان بوجھ کر کی ہے!''

''میں سمجھا نہیں ملک صاحب.....!'' وہ الجھ کر رہ گیا۔

''دیکھو..... اگر اویس، رخسانہ کو اپنے ساتھ بھگا کر یہاں لایا ہے تو اس بلاوے پر وہ ہرگز بیٹھک میں نہیں آئے گا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ وہ گھر کے اندر چھپنے یا گھر سے کہیں باہر چلے جانے کی کوشش کرے گا۔ ایسی صورت میں ہم زبردستی گھر کے اندر گھس کر رخسانہ کو برآمد کر لیں گے اور اگر اویس کا رخسانہ کی گمشدگی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تو وہ بے دھڑک رمضان کے ساتھ یہاں چلا آئے گا۔ رمضان کی باتوں سے یہ تو ثابت شدہ ہے کہ اویس اس وقت گھر کے اندر موجود ہے۔''

''ہاں..... یہ بات تو طے ہے۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن اگر اویس، رخسانہ کی گمشدگی میں ملوث ہے اور اس نے رخسانہ کو اس گھر میں لانے کے بجائے کہیں اور رکھا ہوا ہے تو اس کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہم رخسانہ کا نشان بھی کھو دیں گے۔ ہمیں کسی بھی صورت میں اویس کو اس گھر سے باہر قدم نہیں رکھنے دینا چاہیے.....!''

''ایسا ہی ہوگا!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پُروثوق انداز میں کہا۔ ''اگر ہمیں ذرا سا بھی احساس ہوا کہ اویس اس گھر سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو ہم اس کا تعاقب کریں گے اور اسے ہر قیمت پر گرفتار کرنے کی کوشش کریں گے۔ تم ایک دم ریڈ الرٹ رہو۔ ویسے اگر رخسانہ اس گھر میں موجود ہے تو اویس یہاں سے فرار ہونے کے بجائے یہیں کہیں روپوش ہونے کے بارے میں سوچے گا۔ ہمیں ہر پل، ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار رہنا چاہیے.....''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر رمضان علی کسی سے باتیں کرتے ہوئے بیٹھک کی جانب آتا سنائی دیا۔ ہم دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چوکس و چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔

چند سیکنڈ کے بعد رمضان علی ایک دراز قامت نوجوان کے ساتھ بیٹھک میں داخل ہوا۔ مذکورہ نوجوان کی عمر بائیس کے اریب قریب اور قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ وہ غیر معمولی بڑے پاؤں کا مالک ایک وجیہہ و شکیل نوجوان تھا۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ افضل کریانہ فروش کا بیٹا اویس ہی تھا..... وہی اویس جس کی تلاش میں ہم نے جھنگ سے لاہور تک آنے کا کشٹ اٹھایا تھا۔

وہ دونوں ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اویس نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں مجھ سے سوال کیا۔

''بھائی رمضان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ لوگ باغ پور سے یہاں آئے ہیں اور مجھ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں لیکن میں تو آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ میں نے باغ پور میں آپ کو کبھی نہیں دیکھا، پھر یہ کیا معاملہ ہے.....؟''

''تمہیں تمہارے ہر سوال کا جواب ملے گا لیکن بعد میں۔'' میں نے اویس کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر چٹانی لہجے میں کہا۔ ''پہلے تم میرے سوالات کے سیدھے، سچے اور کھرے جواب دو گے۔ کوئی اِدھر اُدھر کی نہیں۔ سمجھ رہے ہو نا میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟''

میرے دوٹوک اور سنسنی خیز انداز کو دیکھتے ہوئے وہ قدرے سہم گیا اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''جی.....!''

''تو شروع کریں.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''جی..... میں تیار ہوں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

میری تجربہ کار نگاہ نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ رخسانہ کی گمشدگی کے حوالے سے اویس بے قصور تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر کسی موہوم سے جرم کا بھی عکس دکھائی نہیں دیتا

تھا۔ وہ حیران اور فکرمند ضرور نظر آتا تھا تاہم اس کے انداز و اطوار سے کسی قسم کا ڈر یا خوف نہیں جھلکتا تھا۔ بہرحال میری قیافہ شناسی اور جہاں دیدگی اپنی جگہ، قانونی کارروائی کی اپنی اہمیت تھی لہٰذا میں نے تفتیش کا آغاز کرتے ہوئے اویس سے سوال کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ تم سترہ مئی کو باغ پور سے لاہور آئے تھے؟''

''جی بالکل ..... یہ سچ ہے۔'' اس نے تصدیق کردی۔

میں نے پوچھا۔ ''اور لگ بھگ ایک ہفتہ تم اپنی بڑی خالہ طاہرہ کے اس گھر میں رہنا چاہتے ہو۔ تم چوبیس مئی کو واپس اپنے گھر باغ پور چلے جاؤ گے؟''

''جی، یہ ساری باتیں درست ہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟ آخر آپ ہیں کون.....؟''

''میں نے کہا نا، تم بعد میں سوال کرنا.....'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اگر تم اسی طرح مجھے بیچ میں ٹوکتے رہے تو کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' وہ تعاون آمیز انداز میں بولا۔ ''اب میں آپ سے کچھ نہیں پوچھوں گا۔''

اسی وقت رمضان علی کا چھوٹا بھائی سلطان علی بھی آگیا اور چپ چاپ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ سلطان کی عمر لگ بھگ بیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت پائی جاتی تھی۔ بعد ازاں مجھے یہ بھی پتا چلا کہ ان دونوں کے بیچ کا بھائی یعنی فیضان علی اس وقت مطب کے معاملات میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

''تو تم سترہ مئی کو باغ پور سے نکلے تھے؟'' میں دوبارہ اویس کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''مجھے بتاؤ، تم کس ذریعے سے لاہور پہنچے تھے؟''

''ظاہر ہے.....بس میں بیٹھ کر آیا تھا۔''

''باغ پور کی طرف سے لاہور آنے والی بسوں کے دو ٹائم ہیں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک صبح نو بجے نکلتی ہے اور دوسری دوپہر گیارہ بجے۔ ہم آج گیارہ بجے والی بس پکڑ کر لاہور آئے ہیں۔ تم نے پرسوں یعنی سترہ مئی کو.....؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''میں صبح نو بجے والی بس پر سوار ہو کر لاہور آیا تھا۔''

''کیا تم گونگا پہلوان کو جانتے ہو؟'' میں نے اچانک سوال کیا۔

''گونگا کو کون نہیں جانتا جناب۔ وہ تو ہمارے گاؤں کی آبرو ہے۔'' وہ جوشیلی آواز میں بولا۔ ''ایسے پہلوان تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔''

میں نے یکا یک ایک عجیب سا سوال کیا۔ ''کیا تمہیں یہ اچھا لگے گا کہ تمہارے گاؤں کی آبرو مٹی میں مل جائے.....؟''

''ہرگز نہیں جناب.....'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''یہ آپ نے کیسی بات کردی.....؟''

''جناب! مداخلت کے لیے بہت معذرت چاہتا ہوں.....'' سلطان علی نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔ ''میرا ایک دوست پولیس میں ہے، میں اکثر اس سے ملنے تھانے جاتا رہتا ہوں لہٰذا وہاں پر اور بھی کئی پولیس والوں سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ میں ان کی بات چیت اور اسٹائل سے اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ بھی پولیس والوں کے انداز میں اویس سے پوچھ تاچھ کررہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟''

''برخوردار! ہم پولیس والوں کی طرح پوچھ تاچھ نہیں کررہے بلکہ ہم پولیس والے ہی ہیں۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''یہ کانسٹیبل اسد علی ہے اور میں ملک صفدر حیات ہوں..... تھانہ انچارج! اگر باغ پور میں سب خیریت ہوتی تو ہمیں یہاں نہیں آنا پڑتا.....''

''خالہ شہناز کے گھر میں سب امن و امان ہے نا؟'' رمضان علی نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''اویس کی ماں، باپ اور چھوٹی بہن سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے اویس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے رمضان علی کے سوال کا جواب دیا۔ ''لیکن تمہارے اس کزن کی محبوبہ کے گھر میں ماتمی ماحول نے ڈیرا جما لیا ہے.....!''

میری بات پر اویس بری طرح چونکا تاہم اس نے کسی قسم کا صوتی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ سلطان علی نے مجھ سے استفسار کیا۔

''تھانے دار صاحب! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے اویس کی کس محبوبہ کا ذکر کیا ہے؟''

''میں رخسانہ کی بات کررہا ہوں..... چودھری بشارت علی کی اٹھارہ سالہ خوب صورت بیٹی رخسانہ۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''سترہ مئی کی صبح سے رخسانہ غائب ہے اور میں اسی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے جناب.....'' رمضان علی نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اویس کا چودھری صاحب کی بیٹی کی گمشدگی میں کوئی ہاتھ نہیں ہوسکتا بلکہ ایسا سوچنا بھی بے وقوفی ہوگی کہ اویس کا کسی لڑکی کے ساتھ پیار محبت کا کوئی معاملہ ہو کیونکہ اس کی شادی تو میری بہن فریدہ سے ہونے والی ہے۔''

''تم منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیوں بیٹھے ہو.....؟'' میں نے اویس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈانٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''اپنے ان خالہ زاد بھائیوں کو بتاؤ گے نہیں کہ تم چودھری بشارت کی بیٹی کو کتنا ٹوٹ کر چاہتے ہو.....؟''

سلطان علی نے گھور کر اویس کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا تمہارا رخسانہ کے ساتھ کوئی عشق ویشق ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں.....'' اویس نے احتجاجی انداز میں جواب دیا۔ ''چودھری بشارت کی بیٹی رخسانہ گاؤں کی سب سے خوب صورت لڑکی ہے۔ ہر نوجوان اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ مجھے بھی وہ اچھی لگتی تھی لیکن کبھی میری اس سے بات نہیں ہوئی۔ کسی پھول کو خوب صورت سمجھنے میں کون سی برائی ہے؟ میری یہ پسندیدگی یک طرفہ تھی اور وہ بھی فریدہ سے بات پکی ہونے سے بہت پہلے۔ جیسا آپ لوگ سمجھ رہے ہیں ویسا کچھ بھی نہیں ہے.....''

اویس کے ایک ایک لفظ سے سچائی ٹپکتی تھی۔ مجھ تک بھی یہی اطلاع پہنچی تھی کہ رخسانہ سے اویس کی محبت کا معاملہ یکطرفہ تھا۔ رمضان علی نے منت ریز لہجے میں مجھ سے کہا۔

''تھانے دار صاحب! ہم اویس کو بچپن سے جانتے ہیں۔ یہ پرسوں اکیلا ہی یہاں آیا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رخسانہ کی گمشدگی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اویس رخسانہ کو بھگا کر یہاں لایا ہے تو آپ ہمارے گھر کے کونے کونے کی تلاشی لے کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔''

''اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ رخسانہ بھی اویس میں دلچسپی رکھتی ہوگی۔'' میں نے باری باری رمضان اور سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''اسی لیے مجھے تفتیش کی غرض سے یہاں آنا پڑا لیکن ابھی آپ دونوں بھائیوں نے مجھے اویس اور فریدہ کے رشتے کے حوالے سے جو کچھ بتایا ہے، اس کے بعد میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں کہ رخسانہ کی گمشدگی میں اویس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے مگر.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چودھری بشارت علی کی بیٹی رخسانہ سترہ مئی کی صبح سے لاپتا ہے اور مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ وہ سترہ مئی کی صبح نو بجے والی بس پر سوار ہو کر باغ پور سے لاہور کی طرف آئی ہے۔ اویس نے بھی اسی بس میں سفر کیا تھا.....''

''آپ کو کسی نے بالکل غلط اطلاع دی ہے تھانے دار صاحب.....!'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اویس بول اٹھا۔ ''میں نے اس بس کے تمام مسافروں کو اچھی طرح دیکھا تھا۔ ان میں کہیں بھی مجھے رخسانہ دکھائی نہیں دی۔''

''میری اطلاع کے مطابق، رخسانہ نے برقع پہن رکھا تھا۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اویس کو گھورا۔ ''کیا تم نے اس بس پر سوار تمام برقع پوش عورتوں کے چہرے بھی دیکھے تھے؟''

بس اسٹینڈ پر پھل بیچنے والے یعقوب نامی ایک شخص نے کانسٹیبل اسد کو بتایا تھا کہ اس نے وقوعہ کے روز گونگا پہلوان کو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ، نو بجے لاہور جانے والی بس پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت میں یعقوب کے بیان کی تصدیق کے لیے اویس سے گھما پھرا کر پوچھ رہا تھا۔

''نہیں جناب.....'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس بس میں چند عورتیں بھی سوار تھیں جن میں سے بعض نے برقعے پہن رکھے تھے اور بعض نے محض دوپٹے اوڑھ رکھے تھے۔ میں صرف انہی عورتوں کے چہرے دیکھ سکا تھا جنہوں نے برقعے نہیں پہنے ہوئے تھے۔ باقیوں کے بارے میں، میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''مطلب یہ کہ اگر رخسانہ برقع پہن کر اس بس میں سوار ہوئی تھی تو تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''جی.....'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ایک بات میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے.....!''

بات مکمل کرنے کے بعد وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''تمہارے دماغ میں کس قسم کی کھٹکن ہو رہی ہے؟''

''اس روز بس اسٹینڈ سے صرف دو افراد لاہور آنے والی بس پر سوار ہوئے تھے۔ ایک میں اور دوسرا کوئی اور مرد تھا جو میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں نے کسی عورت کو بس پر چڑھتے نہیں دیکھا، نہ دوپٹا اوڑھے اور نہ ہی برقع پہنے مگر آپ بتا رہے ہیں کہ رخسانہ برقعے میں تھی اور وہ بھی اسی بس پر سوار ہوئی تھی۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے تھانے دار صاحب؟''

اویس کے سوال میں دم تھا۔ وہ یعقوب پھل فروش کے بیان کی یکسر نفی کر رہا تھا۔ میں نے ایک دوسرے زاویے سے اویس کو گھیرنے کی کوشش کی۔

''میں صرف یہی نہیں کہہ رہا کہ اس روز رخسانہ برقع پہن کر، لاہور آنے والی بس پر سوار ہوئی تھی بلکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس کے ساتھ ایک مرد بھی تھا.....!''

''کون مرد؟'' بے ساختہ اس نے استفسار کیا۔

''تھوڑی دیر پہلے میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا تم گونگا پہلوان کو جانتے ہو.....'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُرمعنی انداز میں کہا۔ ''پوچھا تھا کہ نہیں.....؟''

''جی، جی..... پوچھا تھا۔'' وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور میں نے ہاں میں جواب دیا تھا۔''

''ہماری اطلاعات کے مطابق، سترہ مئی کی صبح ساڑھے سات بجے گونگا پہلوان حسبِ معمول رخسانہ کو تانگے میں بٹھا کر حویلی سے اسکول کی جانب روانہ ہوا تھا مگر اس روز رخسانہ اسکول نہیں پہنچی۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے کے دوران میں کہنا شروع کیا۔ ''رفیق نامی ایک کھیت مزدور نے اسکول سے لگ بھگ دو فرلانگ دور، لاہور آنے والی سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے وہ تانگا خالی کھڑا دیکھا تھا۔ اسی روز سہ پہر میں جب چودھری بشارت علی رخسانہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے میرے پاس آیا تو ہم نے درخت کے تنے کے ساتھ بندھے ہوئے اس تانگے کو پالیا تھا۔ بعدازاں تفتیش کے دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ وقوعہ کی صبح نو بجے گونگا پہلوان کو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ لاہور آنے والی بس پر سوار ہوتے دیکھا گیا ہے، وہی بس جس میں تم بھی بیٹھ کر لاہور آئے تھے۔ اب تم کیا کہتے ہو.....؟''

''باقی باتوں کا تو مجھے پتا نہیں کہ میرے لاہور چلے آنے کے بعد ادھر باغ پور میں کون کون سے واقعات پیش آتے رہے ہیں لیکن ایک بات میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس روز گونگا پہلوان بس پر سوار نہیں ہوا تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اس حوالے سے کسی نے آپ کو بالکل غلط اطلاع دی ہے۔''

اب تک کی مغز ماری اور قدم خوازی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ گونگا پہلوان اور رخسانہ یا اکیلی رخسانہ نے لاہور کا رخ کیا تھا اور نہ ہی اویس، رخسانہ کو اپنے ساتھ بھگا کر لاہور لایا تھا۔ ان دونوں لاپتا افراد کی گمشدگی کا راز باغ پور اور اس کے قرب و جوار ہی میں کہیں گردش کر رہا تھا۔

''میں نے کھوجی کی مدد سے کھرا بھی نکلوایا ہے۔'' میں نے اویس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے پتا چلا ہے کہ تانگے کو اسکول سے دو فرلانگ دور درخت کے تنے سے باندھنے والے بندے کے پاؤں غیر معمولی بڑے ہیں یعنی وہ دس نمبر کے آس پاس کا جوتا پہنتا ہے۔''

بے اختیار اویس کی نظر اپنے پاؤں پر گئی۔ پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے ایک بوجھل سانس خارج کرنے کے بعد مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اوہ..... تو اس وجہ سے آپ کا شک مجھ پر پہنچ کر رک گیا ہے لیکن شاید آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ موضع باغ پور میں ایک میں ہی بڑے پاؤں والا نہیں ہوں تھانے دار صاحب۔''

''مجھے معلوم ہے..... بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ باغ پور میں تمہارے علاوہ ایک اور شخص بھی دس نمبر کا جوتا پہنتا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم میں اور اس بندے میں ایک بنیادی فرق ہے اور وہ یہ کہ..... وہ غلطی سے بھی چودھری بشارت کی بیٹی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا.....!''

جواب میں اس نے ایک گہری سانس لینے پر اکتفا کیا۔

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے اس بندے کی طرف سے آنکھ بند کر رکھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے بعد اس کی بھی باری لگی ہوئی ہے۔''

حکیم صمد علی کی بیٹھک میں کچہری لگائے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اسی دوران میں مغرب کی اذان بھی ہو گئی تھی۔ ہماری اس مجلس کے بارے میں حکیم جی کو خبر ہوئی تو وہ اپنے مطب کے معاملات کو نمٹانے کے فوراً بعد وہاں پہنچ گئے۔ مطب میں مدد کرنے والا بیٹا بھی ان کے ساتھ تھا۔ موجودہ صورتِ حال کو حکیم جی کے ذہن میں بٹھانے کے لیے مجھے کم و بیش پندرہ منٹ تک محنت

کرنا پڑی۔

صمد علی کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی تاہم صحت کے اعتبار سے وہ چالیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ شاید یہ معجونوں اور کشتوں کا چمتکار تھا۔ میں نے اسے ایک سمجھ دار اور بردبار انسان پایا۔ میری وضاحت کو اس نے پوری توجہ اور تحمل سے سنا اور میرے خاموش ہونے پر اس نے فیصلہ کن ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! آپ کو فوری طور پر تین کام کرنا ہیں۔ باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سے تین کام؟''

''کام نمبر ایک.....'' وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا پھر دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام کر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''آپ آئیں میرے ساتھ۔''

میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہولیا۔ کانسٹیبل اسد علی نے بھی میری تقلید کی۔ آئندہ پندرہ منٹ میں حکیم صمد علی نے مجھے اور کانسٹیبل کو اپنے پورے گھر اور دواخانے کے چپے چپے کی سیر کروادی پھر دوبارہ بیٹھک میں پہنچ کر اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آپ نے بڑی تفصیل کے ساتھ خانہ تلاشی لے لی ملک صاحب۔ آپ نے دیکھا، چودھری بشارت علی کی بیٹی رخسانہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اب دوسرے کام کی باری ہے.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے اپنے چھوٹے بیٹے سلطان علی سے کہا۔

''پتر جی! فریدہ کو یہاں لے کر آؤ۔''

ایک منٹ سے بھی پہلے حکیم صمد علی کی سب سے چھوٹی بیٹی فریدہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ فریدہ کی عمر اٹھارہ کے قریب تھی۔ وہ بھولی صورت والی ایک حسین و دلکش لڑکی تھی۔ میں فریدہ کو بہ غور دیکھ ہی رہا تھا کہ صمد علی کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ملک صاحب! جوانی میں ہر لڑکا اور لڑکی کسی نہ کسی کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا یہ فعل عین فطری ہے۔ ممکن ہے، ماضی قریب میں اویس کو چودھری بشارت کی بیٹی اچھی لگتی ہو لیکن میں ایک بات کی گارنٹی لے سکتا ہوں کہ فریدہ سے رشتہ پکا ہوجانے کے بعد اویس نے رخسانہ کے بارے میں کبھی نہیں سوچا ہوگا۔ چھ ماہ پہلے ان دونوں کی منگنی کردی گئی تھی۔ آنے والی سردیوں میں شادی کا پروگرام ہے۔ آپ دعا کریں کہ اللہ پاک کے کرم سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوجائے۔''

''صمد صاحب! میں خود بھی ایک بیٹی کا باپ ہوں اس لیے باپ کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں، محسوس کر سکتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ہر بیٹی کے نیک نصیب اور درخشاں مستقبل کے لیے ہمہ وقت اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں۔''

صمد علی نے فریدہ کو وہاں سے جانے کے لیے کہا پھر مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''ملک صاحب! میں نے چودھری بشارت علی کی بیٹی رخسانہ کو ایک آدھ بار دیکھا ہے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے..... میں پورے یقین اور دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حسن و جمال میں فریدہ، رخسانہ سے کئی گنا زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں مجھے اپنے ہونے والے داماد کے کردار پر بھی مکمل بھروسا ہے۔''

''صمد صاحب! آپ کی باتوں میں وزن ہے کیونکہ آپ نے اس معاملے کے ہر پہلو پر بڑے ٹھوس اور منطقی دلائل دیے ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ کے اس تعاون کے لیے میں حد درجہ شکر گزار ہوں۔ اب آپ جلدی سے تیسرا کام بھی بتادیں تاکہ ہم واپسی کی راہ لیں۔''

''تیسرے کام کے ذیل میں، میں نے اپنی گھر والی کو احکامات دے دیے ہیں اور وہ کام ہے، رات کا کھانا.....'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ دونوں مہمان رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے اور جہاں تک واپسی کی بات ہے تو اس وقت آپ کو جھنگ کی طرف جانے والی کوئی بس یا ویگن نہیں ملے گی۔ اگر آپ چاہیں تو یہ رات میرے غریب خانے پر بھی گزار سکتے ہیں۔''

''یہاں نزدیک ہی میرا چاچا رہتا ہے۔'' صمد علی کی بات کے اختتام پر اسد علی نے کہا۔ ''اگر ہماری واپسی ممکن نہ ہوسکی تو ہم چاچا کے گھر میں ٹھہر جائیں گے۔''

''جیسی آپ کی خوشی۔'' صمد علی نے بڑی سادگی سے کہا پھر کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''آپ کے چاچا یہاں پر کس جگہ رہتے ہیں؟''

یہ بات میرے علم میں تھی کہ اسد علی کا چاچا لاہور میں کہیں رہتا تھا لیکن مجھے ٹھیک طرح سے اس کے ٹھکانے کا پتا نہیں تھا۔ حکیم جی کے سوال کے جواب میں کانسٹیبل نے بتایا۔

''ڈیلدار پارک۔''

''اوہ اچھا.....'' صمد علی ایک گہری سانس خارج

کرتے ہوئے بولا۔ ''ذیلدار پارک تو وہ سامنے ہی فیروز پور روڈ کی دوسری طرف ہے۔''

ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا کیونکہ آج دن کا کھانا گول ہوگیا تھا۔ اس جنگل خواری میں اتنا وقت نہیں مل سکا تھا کہ کہیں آرام سے بیٹھ کر پیٹ پوجا کی جاتی۔ جب ہم ان لوگوں کو ''خدا حافظ'' کہہ کر رخصت ہونے لگے تو صمد علی نے کہا۔

''میں کل صبح اویس کو واپس باغ پور بھیج رہا ہوں۔ جب تک آپ رخسانہ کی گمشدگی کا معاملہ حل نہیں کر لیتے، یہ گاؤں سے باہر نہیں جائے گا اور آپ جب بھی اسے تھانے بلائیں گے، یہ فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا اور ہر نوعیت کا تعاون بھی کرے گا۔''

میں نے حکیم صمد علی کا شکریہ ادا کیا پھر ہم دونوں اچھرہ کے مین بازار میں پیدل مارچ کرتے ہوئے اسد علی کے چاچا ارشاد حسین کے گھر، واقع ذیلدار پارک کی سمت بڑھنے لگے۔ اچھرہ موڑ سے ہم نے فیروز پور روڈ کو عبور کیا اور سامنے والی چوڑی گلی میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

جب کسی شجر کی نسل کا پتا چل جائے تو پھر اس کی جڑ تک رسائی حاصل کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے اور جھوٹ کے پودے میں تو ویسے بھی بہت برکت ہوتی ہے۔ اس کی شاخیں اور جڑیں بڑی تیزی سے، بہت دور تک پھیل جاتی ہیں۔ بیس مئی جمعرات کی دوپہر جیسے ہی میں تھانے پہنچا، میں نے پھل فروش یعقوب کو ٹرائل روم میں پہنچانے کے احکامات صادر کر دیے تھے اور اس وقت وہ حوالدار بشیر حسین کی تحویل میں تھا اور..... بشیر حسین بڑی تندہی سے ''فرائض میزبانی'' انجام دینے میں مصروف تھا۔

پندرہ بیس منٹ تک یعقوب کی درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں میری سماعت پر ہولناک دستک دیتی رہیں پھر یک دم سناٹا چھا گیا۔ میرے ذہن میں اس خدشے نے سر اٹھایا کہ کہیں یعقوب کا ''کام'' تو نہیں ہو گیا۔ میں بشیر حسین کے تفتیشی ہتھکنڈوں کی خطرناکی سے بہ خوبی واقف تھا۔

میں اپنے کمرے سے نکل کر ٹرائل روم کی طرف جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ حوالدار بشیر حسین میرے پاس آ گیا اور جوش بھرے لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! یعقوب کی یادداشت واپس آ گئی ہے اور قوتِ گویائی کی بیٹری بھی میں نے فل چارج کر دی ہے۔ اب آپ اس سے بات چیت کر سکتے ہیں۔''

میں نے کرسی چھوڑ دی اور حوالدار کے ساتھ ٹرائل روم کی طرف جاتے ہوئے تشویش بھرے انداز میں استفسار کیا۔ ''تم نے یعقوب پر ہلکا ہاتھ رکھا تھا یا.....؟''

میں نے دانستہ سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو حوالدار نے معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ''ملک صاحب! اس دور میں شرافت کی زبان بھلا کون سمجھتا ہے۔ یعقوب اگرچہ کوئی عادی مجرم نہیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایک سخت جان انسان ہے چنانچہ اس کی زبان کھلوانے کے لیے مجھے مجبوراً تھرڈ ڈگری کا استعمال کرنا پڑا ہے۔''

''اوہ۔'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''میں حوالدار کی معیت میں جب ٹرائل روم میں پہنچا تو میں نے یعقوب کو چھت سے الٹا لٹکا ہوا دیکھا۔ حوالدار نے اس کے دونوں پاؤں کو نائیلون کی مضبوط رسی سے باندھ کر، چھت میں نصب پلی (چرخی) پر اس طرح ٹانگ رکھا تھا کہ اس کا سر زمین سے محض دو فٹ کی بلندی پر تھا۔ پھر کی کے اوپر سے گزر کر نیچے آنے والے ڈوری کے دوسرے سرے کو حوالدار نے دیوار میں نصب ایک آہنی کنڈے کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ نائیلون کی ڈوری کے اس سرے کی مدد سے یعقوب کے جسم کو حسبِ ضرورت اوپر نیچے کیا جا سکتا تھا۔ یعقوب کے بدن پر اس وقت صرف ایک، اڑسی ہوئی شلوار نظر آ رہی تھی جس نے اس کے ستر کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یعقوب کے جسم کے برہنہ حصوں پر حوالدار کی ''کاری گری'' کے نشانات کو بہ آسانی دیکھا اور سمجھا جا سکتا تھا۔

''اس لنگور کو نیچے اتارو۔'' میں نے بشیر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''اگر خون کا دباؤ زیادہ دیر تک اس کے سر کی طرف رہا تو تمہارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے۔''

میں نے یعقوب کے لیے ''لنگور'' کا لفظ اس لیے استعمال کیا تھا کہ وہ مشکی رنگت کا حامل تھا۔ اس نے گلے میں سیاہ ڈوری والا ایک تعویذ بھی پہن رکھا تھا جو الٹا لٹکنے کے سبب اس کے چہرے پر سے گزر کر اس طور جھول رہا تھا جیسے کسی مشکی گھوڑے کو لگام ڈال دی گئی ہو۔

حوالدار بشیر حسین نے دیوار گیر کنڈے کی رسی کو کھول کر دھیرے دھیرے یعقوب کو سر کے بل زمین پر اتارا اور سہارا دے کر ایک چوبی اسٹول پر بٹھا دیا۔ اس کے دونوں پاؤں ہنوز نائیلون کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے اور پورا بدن پسینا اگل رہا تھا۔

''تھانے دار صاحب .....!'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر

منت ریز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''پپ..... پانی..... تھوڑا پانی..... پلا دیں۔''

''تمہیں ٹھنڈا ٹھار پانی بھی ملے گا اور گرما گرم کھانا بھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔ ''حوالدار صاحب نے تمہاری ضیافت کا مکمل بندوبست کر رکھا ہے لیکن اس خاطر داری سے پہلے تمہیں سچ بولنا ہوگا..... ایک دم سچ!''

''میں آپ کے سامنے سولہ آنے سچ بولوں گا۔'' وہ تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے بولا پھر سہمی ہوئی نظر سے بشیر حسین کو دیکھتے ہوئے وحشت زدہ الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''میں آپ کے ہر سوال کا کھرا جواب دوں گا لیکن آپ کو سوہنے رب کا واسطہ کہ مجھے دوبارہ حوالدار کے حوالے نہ کریں۔ یہ کسی درندے سے کم نہیں، مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا ہے.....!''

''تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ میں تمہارے اندر سے اور کیا کیا نکالنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' حوالدار نے اسے کھا جانے والی نظر سے گھورا۔ ''تم نے مجھے درندہ کہا ہے تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ درندگی کیا ہوتی ہے۔ ذرا ملک صاحب تم سے پوچھ تاچھ کر لیں۔ اس کے بعد میری باری ہے.....!''

حوالدار کے خطرناک تیور دیکھ کر یعقوب کا رنگ سیاہ ترین ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے اور آنکھوں میں دہشت ہلکورے لیتی دیکھی۔ اس کی حالت سے یہی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے سامنے موت کو کھڑا دیکھ رہا ہو..... سفاک اور سنگین موت۔

''بشیر حسین! تم یہاں سے جاؤ اور کسی کانسٹیبل کے ہاتھ ایک گلاس پانی بھیج دو۔'' میں نے سپاٹ آواز میں حوالدار سے کہا۔ ''جب تک میں بلاؤں نہیں، تم نے ادھر کا رخ نہیں کرنا۔''

''او کے سر۔'' حوالدار نے فرماں برداری سے کہا اور ٹرائل روم سے رخصت ہو گیا۔

چند سیکنڈ میں پانی کا گلاس وہاں پہنچا دیا گیا۔ یعقوب نے کسی صدیوں کے پیاسے صحرائی مسافر کے مانند گلاس میں موجود پانی کو ''غٹا غٹ'' حلق سے نیچے اتارا تو اس کی سانس میں سانس آئی۔

''دیکھو یعقوب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنگین لہجے میں کہا۔ ''حوالدار کا اسٹائل تم نے دیکھ لیا ہے۔ اگر میں نے مزید تفتیش کے لیے تمہیں اس کے حوالے کر دیا تو وہ تمہارے ان بندھے ہوئے پاؤں میں رسی ڈال کر باغ پور تک گھسیٹتا لے جائے گا۔ باہر بارش شروع ہو چکی ہے۔ اب تم خود سوچ لو، دو میل کچے راستے پر تمہارا یہ گھسیٹنی سفر کیسا رہے گا۔ وہ تمہاری طرف سے برافروختہ ہے۔ وہ تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لیے تو یہ سب لہو و لعب کی حیثیت رکھتا ہے۔''

''تھانے دار صاحب.....'' وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ''آپ کو اللہ رسول کا واسطہ..... مجھے حوالدار کے سپرد نہ کریں۔ آپ مجھ سے جو بھی پوچھیں گے، میں بتانے کو تیار ہوں۔''

''تم نے کانسٹیبل اسد علی کو بتایا تھا کہ تم نے سترہ مئی کی صبح نو بجے گونگا پہلوان کو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ لاہور جانے والی بس پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔'' میں نے... بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''میں نے کل دوپہر سے آج دوپہر تک یہاں سے لاہور تلک بڑی دوڑ دھوپ کی ہے اور تمہارے بیان کو صد فیصد غلط پایا ہے۔ میں.....''

''میں نے کانسٹیبل سے جھوٹ بولا تھا۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

''کیوں.....؟'' میں نے کھا جانے والی نظر سے اسے گھورا۔ ''انسان عموماً کسی جرم کو چھپانے کے لیے غلط بیانی کرتا ہے یا وہ کسی بڑے فائدے کی خاطر جھوٹ بولتا ہے اور یا پھر وہ کسی بڑے نقصان سے بچنے کی غرض سے دروغ گوئی سے کام لیتا ہے۔ تمہارے ساتھ ان میں سے کون سا معاملہ تھا؟''

''مم..... میں نے کسی کے کہنے پر وہ بیان دیا تھا.....!'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کس کے کہنے پر؟''

''میں اس بندے کا نام بتا دوں گا۔'' وہ امداد طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ وعدہ کریں کہ اس کے بعد مجھے یہاں سے جانے دیں گے اور اس بندے کو بھی یہ نہیں بتائیں گے کہ میں نے آپ کے سامنے اس کا نام اگل دیا ہے۔''

''میں مجرموں سے کسی قسم کا کوئی وعدہ نہیں کرتا۔'' میں نے اس کی خوش فہمی کو دور کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے جو بھی بتانا ہے، غیر مشروط ہی بتانا پڑے گا۔ ہاں البتہ.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر مجھے یقین ہو گیا کہ تم نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا اور گونگا پہلوان و چودھری بشارت علی کی بیٹی کی گمشدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں تو میں اس تعاون پر تمہارے ساتھ نرمی سے پیش آؤں گا۔''

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''ایسا کہنے کے لیے تارا نے مجھ سے کہا تھا اور اس نے مجھے پچاس روپے بھی دیے تھے۔ بس جی، میں لالچ میں آ گیا تھا۔''

''تم اسی ستار عرف تارا کی بات کر رہے ہو نا جو چودھری بشارت کا خاص ملازم ہے اور جھورا کے ساتھ ادھر باغ پور میں چودھری کے ڈیرے پر ہوتا ہے۔'' میں نے تصدیق طلب انداز میں استفسار کیا۔ ''اس کے ہاتھ پاؤں اور قد کاٹھ بالکل جنوں جیسا ہے؟''

''جی..... جی ہاں.....'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''تارا نے تم سے یہ سب کیوں کہلوایا تھا؟''

''یہ تو مجھے پتا نہیں جناب.....!''

''اس نے تم سے کہا کیا تھا۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''مطلب یہ کہ اس کے الفاظ کیا تھے؟''

''تارا نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کوئی پولیس والا گونگا اور رخسانہ کی گمشدگی کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے بس اسٹینڈ پر آئے تو میں نے اسے بتانا ہے کہ گونگا پہلوان ایک برقع پوش عورت کے ساتھ سترہ مئی کی صبح نو بجے لاہور جانے والی بس پر سوار ہوا تھا۔'' اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''پھر تارا نے مجھے پچاس روپے دیے اور کہا کہ یہ میرا زبان بند رکھنے کا انعام ہے۔ بس جی، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ پچاس روپے لے کر میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گا تو اللہ کی قسم، میں یہ غلطی کبھی نہ کرتا۔''

''تم سے یہ غلطی سرزد ہو چکی اور تم نے تارا کے خلاف زبان بھی کھول دی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ نہیں سمجھنا کہ میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات کا یقین کر لوں گا۔ جب تک تمہارے بیان کی تصدیق نہیں ہو جاتی، تم ادھر حوالات ہی میں رہو گے۔ ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمہیں کوئی ایک چنڈ بھی نہیں مارے گا۔''

وہ ڈری سہمی نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور حوالدار بشیر حسین کو بلا کر صورت حال سے آگاہ کیا پھر تحکمانہ انداز میں کہا۔

''تم کسی کانسٹیبل کو ساتھ لے کر فوراً باغ پور روانہ ہو جاؤ اور چودھری کے ڈیرے سے ستار عرف تارا کو گرفتار کر کے میرے پاس لے آؤ۔ اگر وہ گرفتاری دینے میں کسی حیل وحجت سے کام لے تو تم اپنی مرضی سے اس پر کسی بھی ڈگری کا استعمال کر سکتے ہو۔''

''سمجھ گیا ملک صاحب۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں اپنے ساتھ کانسٹیبل محمد یوسف کو لے کر جا رہا ہوں۔ انشاء اللہ! ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کے اندر تارا ہمارے تھانے کی حوالات میں ہوگا۔''

''تارا کو یعقوب والے کمرے میں نہیں رکھنا۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''تارا کو کسی بھی قیمت پر یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ یعقوب ہمارے قبضے میں ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آپ کے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔''

حوالدار کے جانے کے بعد کانسٹیبل اسد علی میرے پاس آ گیا۔ اس کیس میں اسد علی میرے ہمراہ سب سے زیادہ سرگرم عمل رہا تھا۔ میرے سامنے بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''ملک صاحب! یعقوب نے جھوٹ بولنے کی کیا وجہ بتائی ہے؟''

میں نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

قابل رحم

ایک مرد نے اپنی بیوی کے مغالطے میں ایک راہ چلتی خاتون کا ہاتھ پکڑ لیا مگر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ بے حد شرمندہ ہوا اور جلدی سے خاتون کا ہاتھ چھوڑ کر بولا۔ ''معاف کیجیے گا محترمہ! محض غلط فہمی کی بنا پر میں آپ کو اپنی بیوی سمجھ بیٹھا تھا۔''

''قسمت پھوٹ گئی ہوگی اس عورت کی جسے تم جیسا بے وقوف اور بدصورت شوہر نصیب ہوا۔ کبھی آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے۔ کالا منہ، فضول قسم کے کپڑے اور آنکھیں تو ایسی سرخ ہیں جیسے نشہ کیا ہو۔''

''خدا کی پناہ محترمہ! آپ کی صورت ہی نہیں بلکہ گفتگو بھی میری بیوی جیسی ہے۔'' آدمی نے انتہائی حیرانی سے جواب دیا۔

مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ

''میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو تارا، گونگا اور رخسانہ کی گمشدگی کا ذمے دار ہے اور یا پھر وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ دونوں کہاں غائب ہیں۔'' اسد علی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں بھی اسی ڈگر پر سوچ رہا ہوں۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ تارا ہی نے خالی تانگے کو لاہور جانے والی سڑک کے کنارے اس درخت کے نیچے کھڑا کیا تھا اور سڑک کی دوسری جانب چلتے ہوئے وہ باغ پور کی سمت بڑھ گیا تھا۔ کھوجی بابا جلال دین کا علم سچا اور تجربہ اٹل ہے۔ وہ تو بارش نے کھرے والے مشن کا سوستیاناس مار دیا ورنہ بابا جلال نے اس حقیقت کا پتا چلا لینا تھا کہ غیر معمولی بڑے پاؤں والے اس بندے کی منزل کیا تھی۔ خیر.....'' میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک بار تارا ہمارے ہتھے چڑھ جائے پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ یہ کیس ہمارے لیے ''عقدۂ لاینحل'' بن کر رہ گیا ہے۔ میں اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانے کا متمنی ہوں۔''

''ملک صاحب! میں آپ کے زیرنگیں ہوں اور میری خواہش آپ سے مختلف نہیں ہے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''چودھری بشارت کا پالتو سانڈ تارا ایک لحیم انسان ہے۔ اگر اس کی ٹھیک ٹھاک خاطر داری کر دی جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ سب کچھ بک دے گا۔''

بات کے اختتام پر اسد کا لہجہ خاصا کڑوا بلکہ زہریلا ہو گیا تھا۔ تارا کے حوالے سے حاصل ہونے والی تازہ ترین معلومات نے اسد علی کے دماغ کا درجۂ حرارت خاصا بڑھا دیا تھا اور اسی برانگیختی میں وہ بار بار اپنے دانت بھی پیس رہا تھا۔ اس کی ذہنی حالت کو دیکھ کر بڑے وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ اگر اس وقت تارا اس کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اس کی منڈی مروڑ ڈالے گا۔

ہم دونوں لگ بھگ ایک گھنٹے تک بیٹھے رخسانہ اور گونگا پہلوان کی پراسرار گمشدگی کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ عصر کی اذان کے وقت حوالدار بشیر حسین کی واپسی ہوئی اور یہ واپسی خالی ہاتھ تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا۔

''ملک صاحب! آج صبح چودھری صاحب نے تارا کو سرگودھا بھیج دیا ہے۔ وہاں چودھری بشارت کی بڑی بیٹی سلطانہ کی سسرال ہے۔ تارا ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر باغ پور آئے گا۔''

یہ بات میرے علم میں تھی کہ تین سال پہلے چودھری بشارت علی کی بڑی بیٹی سلطانہ کی شادی موضع حبیب نگر، ضلع سرگودھا کے ایک زمین دار محمود الحسن سے ہوئی تھی۔ محمود الحسن سے سلطانہ کے دو بچے تھے۔ دو سالہ عدنان اور ایک سالہ رفعت۔ سلطانہ اپنی گمشدہ بہن رخسانہ سے چھ سال بڑی تھی۔ وہ اس وقت لگ بھگ چونتیس سال کی تھی۔

''تارا کی واپسی کب تک ہے؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں حوالدار سے پوچھا۔

''مجھے پتا چلا ہے کہ وہ لوگ کل دوپہر تک باغ پور پہنچ جائیں گے۔'' بشیر حسین نے جواب دیا۔

''کل کا انتظار کرنے کے سوا اب ہمارے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے.....'' اسد علی نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''کل کی دوپہر آنے میں ابھی بیس گھنٹے باقی ہیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور میں بیس منٹ کے انتظار کا بھی روادار نہیں ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں ملک صاحب۔'' حوالدار نے استعجابیہ نظر سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''آخر آپ نے ایسا کیا سوچ لیا ہے؟''

''اگر آپ کے ذہن میں کوئی انقلاب آفریں منصوبہ ہے تو ہمیں بھی بتائیں۔'' اسد علی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ہم آپ کے ہر حکم پر سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہیں ملک صاحب!''

''تم اور حوالدار بشیر حسین ابھی اور اسی وقت سرگودھا روانہ ہو جاؤ۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں تارا کو حوالات میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر پبلک ٹرانسپورٹ نہ ملے تو پرائیویٹ کار یا ویگن کا بندوبست کرو۔ اس سلسلے میں اخراجات کی پروا نہ کی جائے۔ ہم اس مہم پر خرچ ہونے والا ایک، ایک پیسا مع سود چودھری بشارت سے وصول کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تارا ہمارے قابو میں آگیا تو ہم بہ آسانی گونگا اور رخسانہ تک پہنچ جائیں گے۔''

اسد علی اور بشیر حسین نے میری بات کے اختتام پر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر بہ یک زبان ہو کر بڑے اعتماد سے بولے۔

''ملک صاحب! ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔''

میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

سیانے کیا خوب کہہ گئے ہیں۔ ''تگڑا دیکھ کر ڈر وئیں ماڑا دیکھ کر لڑ وئیں......'' ستار عرف تارا کی ذات اسی محاورے کی عکاس تھی۔ قد کاٹھ اور ڈیل ڈول سے وہ دیو کی مانند دکھائی دیتا تھا مگر گوشت کے اس پہاڑ کے سینے میں کسی چڑیا کا دل رکھا ہوا تھا۔ کم ہمت، بزدل اور کمزور اعصاب۔ یہی سمجھ میں آیا کہ اس کا رعب داب اور دہشت دراصل چودھری بشارت کی پشت پناہی کی وجہ سے تھی ورنہ اس کی اوقات کسی چوہے سے زیادہ نہیں تھی۔ حوالدار بشیر حسین کے ''ہنر'' نے محض پندرہ منٹ میں تارا کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ تکنیکی اعتبار سے اکیس مئی کی شروعات ہو چکی تھی لیکن مذکورہ تاریخ کا سورج طلوع ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے اور آج ویسے بھی جمعتہ المبارک تھا۔ یہ دن میرے لیے بھی مبارک ثابت ہونے جا رہا تھا کیونکہ تارا نے گونگا پہلوان کے قتل کا اقبالِ جرم کر لیا تھا۔

''گونگا جانا مانا ہوا شہ زور تھا۔'' میں نے تکلیف سے کراہتے ہوئے تارا سے سوال کیا۔ ''تمہارے جیسا ڈرپوک انسان گونگا کو موت کے گھاٹ اتارنے میں کیسے کامیاب ہوا؟''

''گونگا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں اس لیے وہ بے خبری میں مارا گیا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کام کو سرانجام دینے کے لیے جھورا نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔''

''اور گونگا کی لاش کا تم نے کیا کیا؟''

''میں نے جھورا کی مدد سے گونگا کی لاش کو گھسیٹ کر ڈیرے کے نزدیک واقع ایک متروک کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔'' وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اور جھورا نے جس مقام پر یہ کارروائی کی وہ ڈیرے کے عقب میں ہے۔ اس طرف کچے راستے کی دونوں جانب والے کھیتوں میں فصل کی کٹائی کا کام مکمل ہو چکا ہے لہٰذا ادھر کوئی بندہ بشر نظر نہیں آتا...... بعدازاں، میں نے ہی تانگے کو نیم پختہ سڑک کے کنارے درخت کے نیچے پہنچا دیا تھا تاکہ یہی تاثر ملے کہ گونگا اور رخسانہ لاہور کی طرف نکل گئے ہیں۔ یعقوب نے بھی میری ہدایت کے مطابق ہی آپ کے سپاہی سے جھوٹ بولا تھا۔''

''صبح ہو جائے پھر میں اس متروک کنوئیں سے گونگا پہلوان کی لاش کو نکلوالوں گا۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، گونگا پہلوان سے تمہاری ایسی کیا دشمنی تھی کہ تم نے اس کی جان لے لی اور میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے چودھری بشارت علی کی بیٹی کے ساتھ کیا کیا ہے۔ رخسانہ بھی سترہ مئی کی صبح ہی سے غائب ہے......؟''

''تھانے دار صاحب! میں تو حکم کا غلام ہوں۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میری نہ تو کسی سے دشمنی ہے اور نہ ہی کسی سے دوستی!''

''اور وہ جو میں نے رخسانہ کے بارے میں پوچھا ہے......؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اسے گھورا۔ ''کیا تم نے اس کا قصہ بھی تمام کر دیا؟''

''میں رخسانہ بی بی کو گزند پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کس کے حکم کے غلام ہو کیونکہ میں تمہارے آقا کے بارے میں جانتا ہوں۔'' میں

نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''بس اتنا بتادو کہ رخسانہ اس وقت کہاں ہے؟''

''میں رخسانہ بی بی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ جہاں بھی ہے، خیریت ہی سے ہوگی۔''

''جب تم نے گونگا کو جھورا کی مدد سے ٹھکانے لگایا تو اس وقت رخسانہ، گونگا کے ساتھ ہی تھی۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ وہ تانگے سے اتر کر کہاں گئی تھی؟''

''میں اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں لگ گیا تھا۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ''میں نے رخسانہ بی بی پر دھیان نہیں دیا اور یہی سچ ہے۔ یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔''

''تمہیں یہ تو یقین ہے نا کہ رخسانہ زندہ ہوگی؟''

''جی تھانے دار صاحب۔'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

''تم نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ تمہارے آقا نے گونگا کو کیوں ٹھکانے لگوا دیا؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''اگر کوئی غلام اپنے آقا کے فرمان پر غوروفکر کرنے بیٹھ جائے تو پھر وہ حکم کی تعمیل کیسے کرے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

''کیا تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ تمہاری یہ پراسرار گفتگو چودھری بشارت علی کو بہت بڑی مشکل میں ڈالنے والی ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ''تم نے جو بھی کہا وہ تمہارے آقا کے خلاف جائے گا کیونکہ تم نے اپنے آقا کے حکم پر گونگا پہلوان کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔''

''تھانے دار صاحب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے آپ سے کب یہ کہا کہ میں نے گونگا کو چودھری بشارت علی کے حکم پر قتل کر کے متروک کنوئیں میں پھینک دیا ہے؟''

میں نے ابتدا میں کیم شیم تارا کو جتنا کم ہمت اور کمزور اعصاب کا مالک سمجھ لیا تھا، وہ ویسا تھا نہیں۔ رفتہ رفتہ اس کا ٹیلنٹ کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ اس وقت وہ بات چیت کی پچ پر جتنا سنبھل کر بیٹنگ کر رہا تھا، اس سے بہ خوبی یہ اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک منجھا ہوا بلے باز تھا۔ یکا یک مختلف الزاویہ لمحات نے میرے ذہن میں ایک سنسنی خیز سوال کو تشکیل دیا۔ ''کیا تارا کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مجھ سے وہ باتیں کر رہا تھا؟''

''تو پھر کون ہے تمہارا آقا؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''چھوٹے چودھری صاحب.....'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

میری معلومات کے مطابق چودھری بشارت علی کی چار اولادیں تھیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ چھوٹے چودھری سے تارا کی مراد چودھری بشارت کے بیٹوں میں سے کوئی ایک تھی۔

''باغ پور کی حویلی میں چھوٹے چودھری صرف دو ہیں۔ چودھری امانت علی اور چودھری دیانت علی۔'' میں نے چودھری بشارت کے دونوں بیٹوں کے نام لینے کے بعد تارا سے پوچھا۔ ''تمہارا آقا ان میں سے کون ہے؟''

''چودھری دیانت علی۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

بے ساختہ میں نے سوال کیا۔ ''چودھری دیانت کو گونگا سے کیا بیر تھا اور گونگا کو ٹھکانے لگوانے کے بعد اس نے رخسانہ کے ساتھ کیا کیا۔ وہ لڑکی کہاں غائب ہے؟''

''یہ بات آپ مجھ سے پہلے بھی پوچھ چکے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بوجھل آواز میں بولا۔ ''اور میرا جواب وہی ہے کہ میں تو حکم کا غلام ہوں سرکار اور غلام اپنے آقا سے سوال کرتے ہیں اور نہ ہی آقا کے معاملات کی ٹوہ میں رہتے ہیں۔''

تارا میری توقع سے زیادہ گہرا ثابت ہوا تھا۔ اس کے موجودہ انداز نے اس کے ابتدائی تاثر کی نفی کر دی تھی۔ اس نے ابھی تک جتنی زبان کھولی تھی، اس سے خاصی اہم معلومات حاصل ہوئی تھیں لیکن یہ بھی طے تھا کہ اس نے ابھی بہت کچھ اپنے اندر دبا رکھا تھا جس کی برآمدگی کے لیے انگلی کو ٹیڑھا کرنے کی ضرورت تھی۔

میں نے تارا کو حوالات میں چھوڑا اور بشیر حسین کو ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ''رات تقریباً گزر چکی ہے۔ تمہاری نیند کا کیا حال ہے؟''

''ملک صاحب! جب میں اور اسد علی تارا کو ایک ویگن میں ڈال کر حبیب نگر سرگودھا سے باغ پور، جھنگ کے تھانے کی طرف محوسفر تھے تو اس وقت نیند کے جھونکوں نے میری حالت خراب کر رکھی تھی مگر اس وقت میں پوری طرح ہشاش بشاش ہوں۔ آنے والا پورا دن مستعدی کے ساتھ جاگ سکتا ہوں۔''

''ویری گڈ۔'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ میں دوپہر تک یا زیادہ سے

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بوروالہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نوابشاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یار خان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	پتوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
حجرہ شاہ مقیم	03006969881				

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

263-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی فون 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

زیادہ شام تک اس کیس کو کنارے لگا دوں گا اور جب تک ایسا ہو نہیں جاتا، تم نے چاق و چوبند اور فعال ہی رہنا ہے کیونکہ صبح حوالاتیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے والا ہے۔''

''ملک صاحب! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔'' حوالدار نے کہا۔ ''تارا نے اپنی زبان سے گونگا پہلوان کو قتل کرنے کا اقرار کر لیا ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ یعقوب پھل فروش کو حوالات کے اندر مزید رکھنے کا کوئی جواز ہے اور نہ ہی کوئی خاص فائدہ۔ اگر ہم اسے چھوڑ دیں تو حوالات کا ایک کمرا خالی ہو جائے گا جس میں ہم دوسرے گرفتار شدہ افراد کو رکھ سکتے ہیں۔''

میرے تھانے کی حوالات کے کُل دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ان کمروں کی مکانیت اور داخلے کا راستہ اس طور جداگانہ تھا کہ ایک کمرے میں موجود قیدی کو دوسرے کمرے کا احوال معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک کمرے میں اس وقت تارا بند تھا اور دوسرے میں یعقوب۔ حوالدار کی تجویز میں مجھے دم محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔ تم یعقوب کو رہا کر دو۔''

''اور تارا کے ساتھ مزید کیا کرنا ہے؟'' بشیر حسین نے سوالیہ نظر سے میری جانب دیکھا۔

''اسے زندہ رکھنا ہے اور مسلسل جسمانی تکلیف و ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنا ہے۔'' میں نے بے رحمی سے کہا۔ ''میں صبح ہوتے ہی سب سے پہلے متروک کنوئیں میں سے گونگا پہلوان کی لاش کو نکلواؤں گا۔ اس کے بعد تارا کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اور ہاں..... تم دو کانسٹیبلز کو ایک دم الرٹ کر دو۔ پو پھٹنے کے بعد وہ میرے ساتھ ہی تھانے سے روانہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک ڈیرے پر جا کر جھورا کو گرفتار کرے گا اور دوسرا چودھری بشارت اور اس کے چھوٹے بیٹے دیانت علی کو متروک کنوئیں تک لے کر آئے گا۔ جھورا کو گرفتار کرنے کے بعد فی الفور تھانے کی حوالات میں لایا جائے گا۔ مجھے امید ہے، تم میرے منصوبے کو سمجھ گئے ہو گے؟''

حوالدار نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

متروک کنوئیں کے نزدیک ہی موٹے تنوں والے دو درخت استادہ تھے۔ میں نے مضبوط رسوں کو مذکورہ درختوں کے تنوں سے باندھ کر ان کے توسل سے دو صحت مند اور جوان افراد کو اس کنوئیں میں اتار دیا۔ ان دونوں کو میں نے اس مشن کے مقصد کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ عام دنوں میں وہ کنواں خشک اور غیر آباد رہتا تھا لیکن حالیہ بارش نے اس کے اندر اچھی خاصی کیچڑ پیدا کر دی تھی اور گونگا کی لاش کے ذریعے اسے قدرے ''آباد'' بھی کر دیا تھا۔

پندرہ بیس منٹ کی تلاش بسیار کے بعد وہ دونوں رضا کار جوان گونگا کی لاش تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے رکوع کے بل جھک کر بہ آوازِ بلند کہا۔

''گونگا کی لاش کو کمر کے مقام پر رسے کی مدد سے مضبوطی کے ساتھ باندھ کر تم ایک ایک کر کے باہر نکل آؤ اور اس رسے کو بھی ساتھ لے آنا جس کے دوسرے سرے پر تم نے گونگا کی لاش کو باندھنا ہے۔''

ان دونوں نے مناسب الفاظ میں، مجھے میری ہدایات پر عمل کرنے کا یقین دلایا تو میں مطمئن ہو گیا۔

اس وقت ابھی صبح کا آغاز ہوا تھا لیکن ہمارے مشن کی سنگینی کے پیش نظر آس پاس کے کھیتوں سے گزرنے والے اِکّا دُکّا لوگ بھی ادھر ہی کھنچے چلے آئے تھے۔ ڈیرے پر سے جھورا کی گرفتاری بھی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ علی مراد نامی کانسٹیبل جھورا کو آہنی زیور پہنا کر اپنے ساتھ تھانے لے گیا تھا۔ میں نے چودھری بشارت اور اس کے بیٹے دیانت کو بلانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو حویلی کی جانب روانہ کر دیا تھا۔ صغیر احمد کے حویلی پہنچنے سے پہلے جھورا کی گرفتاری کی اطلاع وہاں تک رسائی حاصل کر چکی تھی چنانچہ چودھری اپنے فرزند خورد کے ہمراہ آناً فاناً متروک کنوئیں پر پہنچ گیا۔ اس وقت تک وہاں درجن بھر افراد جمع ہو چکے تھے۔

''ملک صاحب! یہ آپ کیا کرتے پھر رہے ہیں؟'' اس نے متروک کنوئیں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے، آپ نے میرے ملازم جھورا کو بھی گرفتار کر لیا ہے۔''

چودھری کی آمد تک کنوئیں میں اترنے والے دونوں جوان باہر نکل آئے تھے۔ بس، اب گونگا کی لاش کو اوپر کھینچنا باقی تھا۔ میں نے چودھری کے سوال کے جواب میں کہا۔

''چودھری صاحب! میں جو کچھ کرتا پھر رہا تھا اس کا نتیجہ تو ابھی آپ کے سامنے آجائے گا۔'' پھر میں نے رضا کاروں کو حکم دیا۔ ''چلو، دھیرے دھیرے کھینچنا شروع کرو۔'' اس کے بعد میں دوبارہ چودھری کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''جھورا کو میں نے اس لیے گرفتار کیا ہے کہ میری معلومات کے مطابق، گونگا کی لاش کو ٹھکانے لگانے میں اس

نے قاتل کی بھرپور مدد کی تھی۔''

''قاتل کی مدد..... کون قاتل..... گونگا کو کس نے قتل کیا ہے اور اس کی لاش کہاں ہے اور..... اور..... میری رخسانہ کدھر ہے.....؟'' چودھری بشارت نے ایک ہی سانس میں متعدد سوالات کر ڈالے۔

اس دوران میں، میں ٹٹولنے والی نظر سے مسلسل چودھری دیانت علی کو گھور رہا تھا۔ وہ بھولی صورت والا ایک دراز قامت اور قدرے فربہ نوجوان تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس کی عمر بیس اور اکیس کے درمیان رہی ہوگی۔ تارا نے اپنے آقا یعنی چھوٹے چودھری دیانت علی کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا تھا، وہ میرے ذہن میں تازہ بہ تازہ تھا لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے دیانت کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نظر نہیں آیا جو اس کا موجودہ معاملے میں ملوث ہونا ثابت کرتا ہو۔ یا تو تارا نے دیانت کے حوالے سے غلط بیانی کی تھی اور یا پھر چھوٹا چودھری بلا کا اداکار تھا۔ میں نے اسے مسلسل نگاہ میں رکھتے ہوئے بڑے چودھری سے کہا۔

''گونگا کی لاش ابھی آپ کے سامنے اس کنوئیں سے برآمد ہونے والی ہے اور اس کے قاتل کو میں نے پچھلی رات ہی گرفتار کر لیا تھا۔ قاتل نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا ہے اور بتایا ہے کہ گونگا کی لاش کو ٹھکانے لگانے میں جھورا نے اس کی مدد کی تھی۔ اسی کی نشاندہی پر میں نے یہ ''مشن متروک کنواں'' شروع کر رکھا ہے۔ گونگا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے سرکاری اسپتال بھجوانے کے بعد ہم سب تھانے چلیں گے۔ وہاں میں آپ کی قاتل سے ملاقات کرواؤں گا اور آپ کے سامنے ہی قاتل سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ رخسانہ بی بی کہاں ہے۔''

میں نے یہ سب کچھ نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ اس دوران میں ایک بار بھی چودھری دیانت علی نے اپنے منہ سے ایک لفظ ادا نہیں کیا تھا اور نہ ہی چودھری بشارت علی نے تارا کی بابت کوئی بات کی تھی۔ میں نے تارا کی گرفتاری کو ابھی تک ٹاپ سیکرٹ رکھا ہوا تھا۔ چودھری صاحبان اور دوسرے لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ تارا حبیب نگر، سرگودھا گیا ہوا ہے۔

آئندہ آدھے گھنٹے میں، میں نے موقع کی کارروائی کو مکمل کر کے گونگا کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے کانسٹیبل صغیر احمد کی نگرانی میں ضلعی اسپتال بھجوا دیا۔ صغیر احمد چودھریوں کے ساتھ ہی جائے وقوعہ پر آ گیا تھا۔ اس کام سے نمٹنے کے بعد میں ان باپ بیٹے کو تھانے لے آیا۔

چودھری بشارت گونگا کے قاتل سے ملنے کے لیے بڑا بے چین ہو رہا تھا تاہم دیانت کے چہرے پر مجھے کوئی خوف یا پریشانی نظر نہیں آئی۔ ہاں البتہ وہ بہت زیادہ برداشتہ خاطر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

''چودھری صاحب! اس وقت آپ کا اپنے چھوٹے بیٹے دیانت کے ساتھ تھانے میں آنا میرے لیے اطمینان کا باعث ہے کیونکہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے آپ دونوں کا میرے سامنے موجود ہونا بہت ضروری ہے۔''

''اور..... وہ قاتل.....؟''

''اس سے میں آپ کی ملاقات ضرور کراؤں گا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''لیکن پہلے آپ کو میری بات نہایت ہی توجہ اور تحمل سے سننا ہوگی۔''

وہ ایک دم شانت ہو گیا اور گہری سنجیدگی سے مجھے تکنے لگا۔ دیانت کی خاموش نگاہ بھی مجھ ہی پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر باری باری ان دونوں کی جانب دیکھنے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''قاتل نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے اپنا بیان قلم بند کروایا ہے کہ اس نے چودھری دیانت کے حکم پر گونگا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور دیانت نے رخسانہ کو قتل کر کے اس کی لاش کو کہیں چھپا دیا ہے۔'' آخری بات میں نے اپنی طرف سے ٹانک دی تھی تاکہ دیانت کا ردعمل دیکھنے کو ملے۔

''یہ جھوٹ ہے..... سراسر مجھ پر الزام ہے۔'' دیانت علی شدید ترین ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے احتجاجی انداز میں چلّا اٹھا۔ ''آپ قاتل کو سامنے لائیں۔ میں پوچھتا ہوں، اس نے یہ غلط بیانی کیوں کی ہے.....؟''

ترگیلا دکھائی دینے والا چودھری دیانت یکایک برافروختہ ہو گیا تھا۔ اس کی برہمی سے سچائی ٹپکتی تھی۔ چودھری بشارت نے کہا۔

''ملک صاحب! رخسانہ، دیانت کی سگی بہن ہے۔ وہ اسے کیوں قتل کرے گا؟ اس نے تو کبھی ایک مرغی ذبح نہیں کی اور آپ بتا رہے ہیں کہ اس نے گونگا کو موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا ہے۔ یہ ساری گڑبڑ وہ قاتل ہی کر رہا ہے۔ آپ اسے یہاں بلائیں یا مجھے اس کے پاس لے کر چلیں۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

چودھری کی بات میں نے سنی تو پوری لیکن میرا ذہن ایک ہی پوائنٹ پر رک گیا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''رخسانہ، دیانت علی کی سگی بہن ہے..... سے آپ کی کیا مراد ہے چودھری صاحب؟''

''مراد یہ کہ رخسانہ اور دیانت میری دوسری بیوی صفیہ میں سے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جبکہ سلطانہ اور امانت میری پہلی بیوی بشریٰ کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اکیس سال پہلے بشریٰ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اسی سال کے آخر میں، میں نے صفیہ سے دوسری شادی کر لی تھی۔''

میں نے حوالدار بشیر حسین کو اپنے پاس بلا لیا اور معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ ''ہمارے پرندے کا کیا حال ہے؟''

''میں نے آپ کی ہدایات کے عین مطابق اس کا خاص الخاص خیال رکھا ہوا تھا۔'' اس نے بھی پُرمعنی انداز میں جواب دیا۔ ''لیکن میں جیسے ہی سرخ مرچوں کا ڈنڈا گھما کر فارغ ہوا، اس نے اپنا آقا بدل دیا ہے۔''

''تو کیا اب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ.....'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''اس نے چودھری بشارت کے حکم پر گونگا کو موت سے ہمکنار کیا تھا؟''

''نہیں جی۔'' حوالدار نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''وہ قرآن مجید کی قسم کھا کر یہ کہہ رہا ہے کہ اس نے چودھری امانت علی کے کہنے پر یہ سب کیا ہے۔''

''وہ بدبخت قاتل آخر ہے کون؟'' چودھری بشارت علی نے بے حد غصیلے لہجے میں کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں اس نامراد کا ٹیٹوا دبا دوں گا۔ اس کی اتنی ہمت کہ میرے بیٹوں پر اتنے گھناؤنے الزامات لگا رہا ہے۔''

''آرام سے بیٹھ جائیں چودھری صاحب۔'' میں نے چودھری بشارت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''وہ بدبخت اور نامراد کوئی غیر نہیں بلکہ آپ کا اپنا ہے.....!''

''اپنا کون؟'' چودھری بشارت نے بپھرے ہوئے انداز میں پوچھا۔

میں نے حوالدار کو اشارہ کیا کہ وہ تارا کو لے آئے۔

☆☆☆

اکثر لوگ پولیس کی تفتیش کے طریقہ کار پر تنقید کرتے ہوئے اسے ظالمانہ، بہیمانہ اور نہ جانے کون کون سا ''مانہ'' قرار دیتے رہتے ہیں لیکن ایسے نقادوں کو یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مجرم ایسے بھی بے بندے نہیں ہوتے کہ ایک طمانچہ کھانے کے بعد وہ اپنے جرائم کی پوری ہسٹری اگل دیں۔ ہمیں مجرم کی زبان کھلوا کر سچائی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بعض اوقات سختی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ بسا اوقات یہ ''سختی'' حد سے تجاوز کر جاتی ہے لیکن بہرحال، نتائج بھی دیتی ہے۔ جیسا کہ مرچوں والے ڈنڈے کے چودہ طبق گل کر دینے والے طلسماتی اثرات نے تارا کو صد فیصد سچ بولنے پر مجبور کر دیا تھا۔

چودھری امانت علی اگرچہ اپنے مزاج کے اعتبار سے بہت اوکھا، جوشیلا، غصہ ور اور فطری طور پر نہایت ہی چالاک، ہوشیار اور کینہ پرور تھا لیکن ناز و نعم میں پلنے کے سبب وہ اتنا سخت جان نہیں تھا کہ اس کی زبان کھلوانے کے لیے تھرڈ ڈگری کی ضرورت پیش آتی۔ اس نے بڑی شرافت سے رخسانہ کی جان لینے کا اعتراف بھی کر لیا تھا۔ پولیس کی کسٹڈی میں اس نے جو بیان قلم بند کروایا، وہ سنسنی خیز، رونگٹے کھڑے کر دینے والا اور غور طلب تھا۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

امانت علی نے اپنی سوتیلی ماں صفیہ کو گونگا پہلوان کے ساتھ نازیبا حالت میں دیکھ لیا تھا۔ بعد ازاں اسے یہ بھی پتا چلا کہ گونگا دھیرے دھیرے رخسانہ کو بھی اپنے دام ہوس میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ امانت علی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک بدکردار عورت (صفیہ) اور اس کی اولادیں (دیانت اور رخسانہ) ان کی خاندانی زمین و جائداد میں حصے دار بنیں۔ اس سلسلے میں چودھری بشارت سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ وہ اپنی چہیتی بیوی صفیہ کے خلاف ایک لفظ سننے کو تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اس مسئلے کو اپنے طور پر حل کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا جس کے دو حصے تھے۔ پہلے مرحلے پر تارا کی مدد سے گونگا اور رخسانہ کو ٹھکانے لگا کر اس معاملے میں اپنے سوتیلے بھائی دیانت علی کو پھنسانا تھا تاکہ وہ زندگی بھر کے لیے جیل چلا جائے۔ دوسرے مرحلے میں اس نے صفیہ کا شافی بندوبست کرنا تھا جس کی نوبت ہی نہیں آئی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ امانت علی کی نشاندہی پر میں نے ڈیرے کے پچھواڑے والے کھیت کے ایک مخصوص مقام کو کھود کر رخسانہ کی لاش کو بھی برآمد کر لیا تھا۔

(تحریر: حسام بٹ)

انگوٹھی کی تلاش

حسن عبداللہ

کچھ چیزیں خاندان میں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں جو نسل در نسل چلتے ہوئے اپنا سفر طے کرتی رہتی ہیں... اس انگوٹھی کی بھی ایسی خاصیت اور اہمیت تھی مگر... اس کی تلاش نے اچانک بہت سے رازوں سے پردہ ہٹادیا... ایسے جرائم کی نقاب کشائی کردی جن کی فائلیں بند ہو چکی تھیں۔

مرحوم ماں کی آخری خواہش کی تکمیل کا حیرت انگیز ماجرا

''وہ جگہ اب کتنی دور ہے؟'' میں نے اپنی بہن بیکی سے پوچھا۔

''ہم اس کے قریب ہی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''آنٹی پیگ نے یہ جگہ کیسے تلاش کی؟'' کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہماری کزن جین نے پوچھا۔

''شاید ان دنوں یہاں اتنے زیادہ سیلف اسٹور نہیں تھے۔'' بیکی نے کہا۔

''یا پھر یہ ستا مل گیا ہوگا۔'' میں نے اضافہ کیا۔

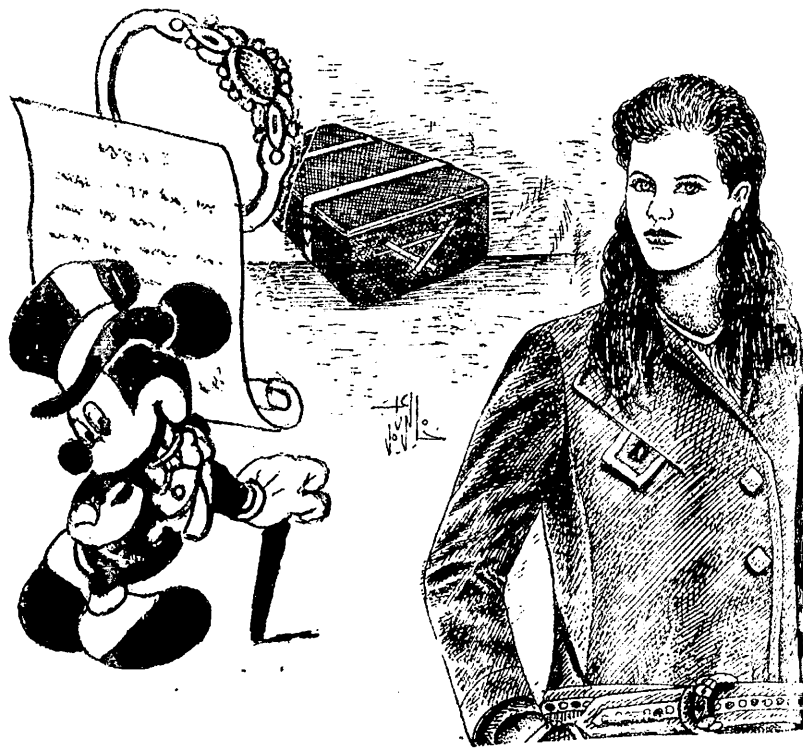

''ماما ہمیشہ خرچ کرنے کے معاملے میں بڑی محتاط تھیں۔'' بیکی نے کہا جو میرے خیال میں درست تھا لیکن بچپن سے جوان ہونے تک ایسے کئی مواقع آئے جب میں نے سوچا کہ کاش ہماری ماں تھوڑی سی فیاض ہوتیں۔

جب سڑک آگے جا کر بائیں جانب مڑی تو بالآخر مجھے وہ عمارت نظر آگئی۔ میں جانتی تھی کہ اس کا کرایہ کچھ زیادہ نہیں ہوگا ورنہ اس دور افتادہ بے ہنگم عمارت کا انتخاب کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔ میں نے بھی سیلف اسٹور استعمال کیے ہیں لیکن وہ ایک قطار میں بنی ہوئی عمارتیں تھیں جن میں گیراج کی طرح اوپر اٹھنے والے دروازے لگے ہوئے تھے جبکہ یہ ایک اونچی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت تھی۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید یہ شروع میں ہوزری مل ہوگی۔ وہاں کوئی نیون سائن نہیں تھا۔ اس کے بجائے سامنے والے دروازے پر پینٹ سے اسٹوریج ''ویئر ہاؤس۔ فائبر پروف'' کے الفاظ لکھ دیے گئے تھے۔ اس میں سے بھی شروع کے تین اور فائر کا F مٹ چکا تھا۔

''ریگ ویئر ہاؤس۔ آئر پروف۔'' میں نے پڑھا۔

''یقیناً یہاں وہ سامان رکھا جاتا ہوگا جو آپ کو پسند نہ ہو۔''

جین نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اسی وقت ہماری گاڑی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی۔

''میں صرف امید کرسکتی ہوں کہ یہ عمارت ائر کنڈیشنڈ ہوگی۔'' میں نے کہا۔ اگست کے مہینے میں نارتھ کیرولینا کا موسم بہت گرم اور مرطوب ہوتا ہے۔

''ہمیں کل تک انتظار کرنا چاہیے تھا۔'' جین نے کہا۔ ''آج رات طوفان کے آنے کی پیش گوئی ہے۔ اس کے بعد موسم ٹھنڈا ہوجائے گا۔''

''کیل کل صبح جارہی ہے۔'' بیکی نے اسے یاد دلایا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بشرطیکہ یہ اپنا پروگرام تبدیل کرکے کچھ عرصہ مزید قیام کرسکے۔''

''معاف کرنا۔ مجھے اپنے کام پر جانا ہے۔'' میں نے کہا جو آدھا سچ تھا۔ بے شک مجھے اپنی ملازمت پر واپس جانا تھا لیکن میرے باس نے کہہ دیا تھا کہ اگر مجھے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد ضرورت ہو تو مزید چھٹیاں کرسکتی ہوں لیکن مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں پیر کے روز آئی تھی۔ منگل کی صبح ماما کی تدفین اور دوپہر میں بیکی کے گھر استقبالیہ ہوا۔ پھر میں نے نرسنگ ہوم میں ماما کا کمرا صاف کروایا اور ان لوگوں کو شکریے کے خطوط لکھے جو آخری رسومات کے لیے پھول لائے تھے کیونکہ بیکی کا خیال تھا کہ اس کے مقابلے میں میری ہینڈ رائٹنگ بہت اچھی ہے اور لوگ اسے آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ اس طرح میں نے اپنے تمام فرائض پورے کردیے۔ مجھے اپنی ماما سے محبت تھی لیکن اس تعلق میں گرمجوشی نہیں تھی۔ میں نہیں سمجھتی کہ ماما نے کسی بھی تعلق کو نبھانے میں گرمجوشی دکھائی ہو۔

جین نے کہا۔ ''بیکی! میں اور تم کل یا اس ہفتے کے آخر میں بھی آسکتے ہیں۔ ماما کو بھی ہماری مدد کرکے خوشی ہوگی۔''

بیکی نے میری طرف دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماما کی بھائی آنٹی جینی یہاں آئے۔ وہ مدد کرنے کے بجائے سن گن لینے کے لیے آتی۔ اس کی بیٹی جین اتنی بری نہیں تھی۔ ہم اسے اپنے ساتھ صرف اس لیے لائے تھے کہ آنٹی جینی کو خاندان کے لوگوں سے اس مہم کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا اور اس نے جین کو ہماری مدد کے لیے بھیج دیا تھا۔ درحقیقت وہ یہ توقع کررہی تھی کہ اس کی بیٹی واپس آکر تفصیلی رپورٹ دے گی کہ ہمیں اس مہم کے دوران کیا ملا۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ آنٹی اپنی دوسری مصروفیات کے سبب ہمارے ساتھ نہ آسکی۔

جین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہمیں انگوٹھی مل گئی تو ہم اسے کیل کو ڈاک کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔''

''میں اتنی قیمتی انگوٹھی ڈاک کے ذریعے نہیں بھیج سکتی۔'' بیکی نے کہا۔ ''اگر وہ گم ہوگئی تو کیا ہوگا؟''

''تم اس کا بیمہ کرواسکتی ہو۔ تمہارے خیال میں اس کی کیا قیمت ہوگی؟'' بعض اوقات جین بالکل اپنی ماں کی طرح بات کرتی تھی۔

بیکی نے طنز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی ایک جذباتی قیمت ہے جس کا بیمہ نہیں ہوسکتا۔ وہ انگوٹھی کئی نسلوں سے ہمارے خاندان میں ہے اور اب وہ کیل کی ہے۔''

''میں نہیں سمجھتی کہ ایسا کیوں ہے؟'' جین نے کہا۔ ''میرے ڈیڈی آنٹی، پیگ سے چھوٹے تھے پھر یہ انگوٹھی انہیں کیوں نہیں ملی؟''

دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہی تھی کہ یہ انگوٹھی جینی کو کیوں نہیں ملی جو بعد میں جین کے حصے میں آئی۔

بیکی نے کہا۔ ''کیونکہ یہ انگوٹھی ہمیشہ چھوٹی بیٹی سے اس کی چھوٹی بیٹی کو منتقل ہوتی ہے نہ کہ سب سے چھوٹے بھائی کو۔''

میری بڑی بہن میں مجھ سے زیادہ صبر اور برداشت کا مادہ تھا۔ اس نے پوری کہانی دوبارہ سنائی۔ گو کہ ہم دونوں کو یقین تھا کہ جین پہلے بھی اسے سن چکی ہے۔

اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ کئی پشت پہلے ہماری ایک لکڑ دادی جو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں، اس بات پر ناراض ہوگئیں کہ ان کی تمام خاندانی جائداد بڑے بھائی کو چلی گئی۔ انہوں نے تہیہ کرلیا کہ ان کا چھوڑا ہوا اثاثہ ان کے سب بچوں میں تقسیم ہوگا لیکن ایک خاص چیز سب سے چھوٹی بیٹی کے حصے میں آئے گی اور وہ خاص چیز سونے کی انگوٹھی میں جڑا ہوا یاقوت تھا جو نسل در نسل چھوٹی بیٹی سے اس کی چھوٹی بیٹی کو منتقل ہوتا ہوا ماما تک پہنچ گیا اور اب وہ مجھے ملنے والا تھا، چاہے میں اسے لینا چاہوں یا نہیں۔

مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ماما کی یہ انگوٹھی مجھ سے زیادہ بیکی کے لیے اہم تھی۔ وہ اسے ایک خاندانی ورثہ سمجھتی تھی جبکہ میری نظر میں وہ ایک پرانے فیشن کا زیور تھا۔ اس کے باوجود میرا ارادہ تھا کہ میں اس انگوٹھی کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گی لیکن جب یہ پتا چلا کہ ماما نے اسے کہاں رکھا تھا، اس بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تو مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

دوسری جانب بیکی اس بارے میں کافی پریشان تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مجھے یہ انگوٹھی لینی چاہیے اور وہ اسے تلاش کرنے کے لیے کوشش کرنا چاہ رہی تھی۔

''آج موسم کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ہمیں مزید انتظار کرنے کے بجائے اندر جانا چاہیے۔'' بیکی نے کہا۔

پارکنگ لاٹ میں کوئی دوسری کار نہیں تھی۔ میں نے دروازے کا تالا چیک کیا۔ وہ مقفل نہیں تھا۔ عمارت کے اندر موسم بہتر تھا۔ نہ جانے یہ ائرکنڈیشنگ کی وجہ تھی یا کھلی کھڑکیوں سے ہوا آرہی تھی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا لیکن وہاں کوئی ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اس کے بجائے ایک زنگ آلود گھنٹی رکھی تھی۔ ایک تختی پر لکھا ہوا تھا۔

''ضرورت پڑنے پر اسے استعمال کریں۔''

''میرا خیال ہے کہ ماما کا یونٹ دوسری منزل پر ہے۔'' بیکی ہمیں نیم تاریک سیڑھیوں کی طرف لے جانے لگی۔

''کیا تم یہاں پہلے نہیں آئیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''کیا واقعی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ وہ مجھ سے نو سال بڑی تھی اور اس نے اپنی ساری زندگی راکی شول میں گزاری تھی۔ وہ میری نسبت ماما سے زیادہ قریب تھی۔

''مجھے تو ماما کی بیماری سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ انہوں نے اسٹوریج میں کوئی چیز رکھی تھی۔ یہ مجھے اس وقت پتا چلا جب میں نے ان کی ڈاک دیکھی تاکہ بلوں کی ادائیگی کرسکوں۔ اسی ڈاک میں اس عمارت کی طرف سے نوٹس بھی تھا۔ جب میں نے ان کے رجسٹر میں اس ادائیگی کا اندراج کیا تو پتا چلا کہ انہوں نے یہ جگہ اس وقت کرائے پر لی جب میں ہائی اسکول میں تھی۔''

''تمہیں پھر بھی معلوم نہیں ہوا کہ یہاں کیا رکھا ہوا ہے؟'' جین نے کہا۔ ''کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ ان کی بیٹیاں بھی اس سامان کے بارے میں نہیں جانتیں؟''

''ماما کو پرائیویسی پسند تھی۔'' بیکی نے کہا۔

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ انگوٹھی یہاں ہے؟ کیا آنٹی پیک نے بتایا تھا کہ انہوں نے اسے کہاں رکھا ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' بیکی نے اعتراف کیا۔ ''لیکن آخری دنوں میں جب وہ ٹھیک طرح سے بول بھی نہیں سکتی تھیں، ماما نے اپنی چابیوں کے لیے شور مچانا شروع کردیا۔ جب تک ہم نے وہ انہیں نہ دے دیں۔'' اس نے ماما کا چابیوں کا گچھا نکالا جو وہ ہمیشہ اپنے پرس میں رکھتی تھیں۔ اس میں کئی چابیاں تھیں۔ ''ماما نے اس جگہ کی چابی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اسٹوریج روم'' ظاہر ہے کہ وہ اپنی انگوٹھی کے بارے میں ہی بات کررہی تھیں۔ ویسے بھی وہ کسی اور جگہ پر نہیں ہے۔''

''ماما کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا ہوگا کہ وہ انگوٹھی ہمیں نہیں ملی۔''

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر نے ہمیں بتایا تھا کہ ماما کو ایک سے زیادہ مرتبہ فالج کا حملہ ہوچکا ہے لیکن کسی کو اس کی خبر نہیں ہوئی کیونکہ وہ تنہا رہتی تھیں، اس لیے کوئی بھی ان کی دماغی کیفیت کے بارے میں نہ جان سکا تاوقتیکہ وہ ایک حادثے کا شکار ہوگئیں۔ وہ چولہے پر روسٹ بھون رہی تھیں کہ چولہا بند کرنا بھول گئیں اور اس پر رکھا ہوا روسٹ جل کر سیاہ ہوگیا۔ ایک پڑوسی نے دھواں دیکھ کر فائر ڈیپارٹمنٹ کو فون کیا اور آگ بجھانے والے عملے نے بروقت کارروائی کرکے مکان کو جلنے سے بچالیا۔ اس وقت تک وہی پڑوسی آنٹی جینی کو بھی فون کرچکا تھا۔ وہ دوڑی ہوئی آئی۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ بلکہ باقی گھر کو دیکھ کر بھی لگ رہا تھا کہ یہ کسی طوفان کی زد میں آیا ہے۔ جہاں تک ماما کا تعلق ہے تو وہ اتنی الجھی ہوئی تھیں کہ انہوں نے سائرن کی آواز پر بھی توجہ نہیں دی۔ آگ بجھانے والے عملے نے انہیں فالتو بیڈروم میں پرانے جوتوں کے ڈبوں کی تلاشی لیتے ہوئے دیکھا۔''

''آنٹی جینی نے مما کو اسپتال لے جانے کے لیے ایمبولینس بلوائی اور وہاں چند ہفتے رہنے کے بعد ہم نے مما کو نرسنگ ہوم منتقل کردیا اور وہیں ان کی موت واقع ہوئی۔ اس افراتفری میں وہ انگوٹھی گم ہوگئی اور کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کب اور کہاں کھوئی۔ بیکی نے پورا گھر چھان مارا۔ اس نے آگ بجھانے والے عملے اور اسپتال کے اسٹاف سے بھی پوچھا۔ اس کے علاوہ ہم نے نرسنگ ہوم کے عملے سے بھی دریافت کیا لیکن انگوٹھی کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہوسکا۔''

''ہوسکتا ہے کہ مما نے بے دھیانی میں وہ انگوٹھی کچرے میں پھینک دی ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔ اسے یہیں ہونا چاہیے۔'' بیکی اپنی ضد پر قائم رہی۔

میں نے ایک سرد آہ بھری اور اس کے ساتھ چلتی ہوئی کمرا نمبر چوبیس کے دروازے پر پہنچ گئی۔

بیکی نے اس کا تالا کھولا اور بولی۔ ''خدا ہم پر رحم کرے۔''

بغیر کھڑکیوں کے یہ کمرا فرنیچر، بکسوں، تھیلوں اور پرانے سوٹ کیسوں سے بھرا ہوا تھا اور وہاں میری توقع کے مطابق خاصی گرمی اور حبس تھا۔

''اس انگوٹھی کو سامنے والے ڈھیر میں ہونا چاہیے۔'' میں نے توقع ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

بیکی نے میرا کندھا تھپتھپایا۔ ''فکر نہ کرو۔ اگر ضرورت ہوئی تو ہم تمام تھیلے اور باکس دیکھیں گے۔''

''زبردست۔'' میں نے کہا اور دل میں سوچنے لگی کہ مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔

کمرے میں بہت کم خالی جگہ تھی اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہر باکس کو ہال میں لے جائیں جہاں نسبتاً بہتر روشنی اور تازہ ہوا تھی۔ ابھی تک ہم نے اپنے علاوہ کسی اور کو نہیں دیکھا تھا اس لیے یہ امکان نہیں تھا کہ ہم کسی کی نظروں میں آتے۔

''واؤ۔'' جینن ایک باکس کھولتے ہی چلائی۔

''کیا انگوٹھی مل گئی؟'' بیکی نے کہا۔

''اوہ نہیں۔ اس میں کھلونے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں کہ شاید اس بیگ میں گڑیاں ہوں۔ میں نے پڑھا ہے کہ وہ بہت اچھی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔''

میں اچھی طرح جانتی تھی کہ بیکی یا میرے پاس کبھی ایسی گڑیاں نہیں رہیں۔ ماما کا خیال تھا کہ وہ بدصورت ہوتی ہیں اور میں جینن سے یہ نہ کہہ سکی کہ تم سے متفق نہیں ہوں البتہ اتنا ضرور کہا۔ ''تم کچھ نہیں جانتیں۔'' شاید اس طرح وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوجائے۔

پھر جب اس نے ایک پرانا ٹیڈی بیئر نکالا تو مجھے ہنی ماؤس کا خیال آگیا۔

''کیا یہ بھی کوئی رکھنے کی چیز ہے؟''

''نہیں۔ یہ محض ایک کھلونا ہے۔ میں اسے مکی ماؤس نہیں کہتی تھی۔''

بیکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ ماما، مسٹر ماؤس کو یہاں چھوڑ دے گی۔ تم اس کے کھوجانے پر کتنی پریشان تھیں؟''

''تم نے کہا کہ ماما نے تیس سال یہاں سامان رکھا تھا اور تبھی مسٹر ماؤس بھی غائب ہوگیا تھا۔ ممکن ہے کہ ماما نے غلطی سے اسے دوسرے سامان کے ساتھ پیک کردیا ہو۔''

میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماما نے ایسا جان بوجھ کر کیا لیکن مجھے یاد نہیں کہ جب میں مسٹر ماؤس کے غائب ہونے پر روئی تو انہوں نے مجھ سے ہمدردی کی ہو۔ بس اتنا کہا کہ میں کوئی دوسرا کھلونا لے کر بستر میں لیٹ جاؤں۔

''بہرحال اگر وہ تمہیں مل جائے تو مجھے بتانا۔'' میں نے جینن سے کہا۔

''ضرور بتاؤں گی۔'' جینن نے جواب دیا اور کھلونے نکالنے لگی۔

میں نے جو باکس کھولا وہ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں انگوٹھی چھپانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ''کیا یہ تمہاری کتابیں ہیں؟'' میں نے بیکی سے پوچھا۔

اس نے میرے ہاتھ میں نورا رابرٹس کی کتاب دیکھی اور بولی۔ ''اوہ نہیں۔ یہ ماما کی کتابیں ہیں۔ وہ رومانی ناول پڑھنے کی عادی تھیں۔''

''واقعی؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ماما اس طرح کی کتابیں پڑھتی ہیں۔'' بیکی مجھ سے نو سال بڑی تھی اور اسے کئی ایسی باتیں معلوم تھیں جو میں نہیں جانتی تھی۔

میں نے باکس بند کردیا اور پرس سے پین نکال کر اس پر کراس کا نشان بنادیا تاکہ ہمیں معلوم رہے کہ اس باکس کی تلاشی ہوچکی ہے۔ پھر میں دوسرا باکس لینے واپس اسٹور روم گئی۔ اس باکس میں پلاسٹک کے پیالے اور پلیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ میں انہیں ہٹا کر انگوٹھی تلاش کررہی تھی کہ بیکی نے کہا۔ ''یہ دیکھو۔''

اس کے ہاتھ میں باریک جالی دار اسکرٹ اور رقص میں پہننے والے جوتے تھے۔ ''اوہ میرے خدا! مجھے یقین نہیں آرہا کہ ماما نے انہیں بھی سنبھال کر رکھا ہوگا۔'' مجھے یاد

آ گیا کہ میں نے یہ لباس ایک ڈانس میں پہنا تھا، جب میں پہلی جماعت میں تھی۔

''تم اتنی پیاری لگ رہی تھیں۔'' بیکی نے کہا۔'' کہ ماما تمہیں اسٹیج پر ڈانس کرتا دیکھ کر مسلسل مسکراتی رہیں۔''

''مجھے ڈانس کلاس پسند تھی لیکن میں صرف ایک سال جاسکی کیونکہ ماما کا کہنا تھا کہ اس کی فیس بہت زیادہ ہے۔''

''اب میں سمجھ گئی کہ یہ سامان کہاں سے آیا۔'' بیکی نے کہا۔ ''تمہیں وہ بڑا سا سفید مکان یاد ہے جہاں ہم کچھ عرصہ رہے تھے؟''

''وہ مکان جو شہر کے مضافات میں تھا؟'' مجھے اپنا پہلا مکان یاد نہیں تھا کیونکہ اس وقت میں بہت چھوٹی تھی جب ڈیڈی کا ایک کار کے حادثے میں انتقال ہوا اور ہمیں وہ مکان بیچنا پڑ گیا لیکن اس کے بعد ہم جس مکان میں گئے، وہ مجھے یاد تھا۔ میں گھنٹوں گھر کے باہر کھیلتی رہتی تھی۔

''اس کے بعد ہم جس اپارٹمنٹ میں شفٹ ہوئے وہ اتنا بڑا نہیں تھا اسی لیے ماما کو بہت سا سامان کسی اور جگہ رکھنا پڑا۔''

''مجھے اس اپارٹمنٹ میں جانا یاد ہے لیکن اس کی وجہ معلوم نہیں۔ مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا اور میں اس تنگ بدبودار اپارٹمنٹ سے نفرت کرتی تھی۔ کیا ہم پیسے بچانا چاہتے تھے؟''

جین نے ڈرامائی انداز میں سرد آہ بھری۔ ''تم نہیں جانتیں؟ اس واقعے کے بعد آنٹی پیگ خوفزدہ ہوگئی تھیں، اسی لیے وہ جگہ چھوڑ دی۔''

''کیسا واقعہ؟''

''اس بوڑھے شخص کیہان کے لاپتا ہونے کے بعد۔''

''کیہان؟ ایک منٹ۔ کیا تمہارا اشارہ انکل لونی کی جانب ہے؟ وہ واحد مکان تھا جو ہمارے گھر سے نظر آتا تھا۔''

''کیا تم نہیں جانتیں کہ وہ ہمارے حقیقی انکل نہیں تھے؟'' بیکی نے کہا۔ ''وہ مالک مکان تھے۔''

''میرا خیال ہے کہ میں یہ بات جانتی ہوں لیکن انہوں نے کہا تھا کہ میں انہیں انکل لونی کہہ سکتی ہوں۔ ذرا سوچو کہ انہوں نے ہی مجھے مسٹر ماؤس دیا تھا۔ ہم ایک گیم کھیلا کرتے تھے جس میں مسٹر ماؤس کا چوہے کا بل تلاش کرنا ہوتا تھا اور......'' میں نے جین کو دیکھا جو مجھ پر مسکرا رہی تھی۔ میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''کوئی نہیں جانتا۔'' جین نے اداس لہجے میں کہا۔ ''ایک دن کوئی شخص ان کے مکان پر آیا اس کے بعد وہ لاپتا ہوگئے۔ ان کے بستر پر سلوٹیں اور سنک میں ناشتے کے خالی برتن پڑے ہوئے تھے اور کار بھی اپنی جگہ موجود تھی لیکن اس کے بعد انہیں کبھی نہیں دیکھا گیا۔''

میں نے جین کی بات کا یقین نہیں کیا۔ مجھے یہ ایک فرضی کہانی لگ رہی تھی۔ اس طرح کا کوئی واقعہ راکی شول میں پیش نہیں آیا لیکن بیکی تائید میں سر ہلا رہی تھی۔

''ماما کا کہنا تھا کہ انہوں نے انکل کو دو دن قبل دیکھا تھا لیکن وہ بالکل ٹھیک دکھائی دے رہے تھے اور ہم میں سے کسی نے بھی اس رات کچھ نہیں سنا جب وہ غائب ہوئے۔ پولیس بھی کوئی سراغ نہیں لگا سکی۔ ہر شخص اس بارے میں کافی دنوں تک بات کرتا رہا لیکن ماما نے کسی کو بھی تمہارے سامنے اس کا ذکر نہیں کرنے دیا۔ تم نے ان سے ایک یا دو مرتبہ انکل کے بارے میں پوچھا لیکن انہوں نے کوئی بہانہ بنا کر ٹال دیا۔''

مجھے اب بھی یقین نہ آتا لیکن اپنا جالی والا اسکرٹ دیکھ کر میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ میں ماما کے بارے میں بہت سی باتیں نہیں جانتی۔

''میں نہیں جانتی کہ ماما وہاں رہنے سے خوفزدہ تھیں۔'' بیکی نے کہا۔ ''لیکن میں بہت ڈر گئی تھی۔ اس واقعے کے بعد کئی ہفتوں تک ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی لہٰذا ماما نے ایسا مکان تلاش کیا جو ہم افورڈ کر سکتے تھے۔ گو کہ وہ بہت اچھی جگہ نہیں تھی لیکن میں وہاں سو سکتی تھی۔''

جین اس بارے میں مزید بات کرنا چاہ رہی تھی اور اس کے پاس انکل لونی کے بارے میں بہت سی عجیب کہانیاں تھیں لیکن بیکی نے کہا کہ انگوٹھی کو تلاش کرنا ان پرانی افواہوں کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے چنانچہ ہم دوبارہ اپنے کام میں لگ گئے۔ اگلے دو گھنٹوں میں ہم نے پہلی قطار میں رکھے ہوئے بکس دیکھ ڈالے۔ ان میں بچوں کے کپڑے، ایک چائنا کا سیٹ، ایک پرانی لکڑی کی کرسی، کئی ناکارہ بلب، تین کچن کی کرسیاں اور ایک اوزاروں کا بکس ملا جو یقیناً میرے ڈیڈی کا ہوگا۔ اس کے علاوہ ہمیں جیولری بھی ملی جن میں پنیں، نیکلس اور بریسلیٹ وغیرہ تھے لیکن وہ سب مصنوعی زیورات تھے اور ان کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ بیکی کو یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ اس بکس میں بھی ماما کی انگوٹھی نہیں تھی۔

میں نے ایک سوٹ کیس کھولا۔ اس میں پرانے اور بوسیدہ کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے بہت زور کی چھینک آئی۔ میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیکی!

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم کسی اور وقت بھی انگوٹھی تلاش کر سکتے ہیں۔''

''کب؟ تم گھر کب واپس آؤ گی؟''

''میں نہیں جانتی۔ شاید اگلی گرمیوں میں...''

''یا شاید اس سے اگلی گرمیوں میں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے بولنے سے روک دیا۔ ''یہ اچھی بات ہے کہ تم... کونیکٹی کٹ میں اپنی زندگی گزار رہی ہو لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم ماما کی انگوٹھی کے بغیر یہاں سے جاؤ۔''

''یہ محض ایک پرانی روایت ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ اس کی پروا کرے گی؟''

بیکی نے دونوں ہاتھ اپنی پشت پر رکھے۔ اس وقت وہ بالکل ماما کی طرح لگ رہی تھی۔ ''جس دن تم پیدا ہوئیں تو ماما نے مجھے بتایا کہ اس کی منگنی کی انگوٹھی اور شادی کی کڑا میرے حصے میں آئے گا لیکن اس کی روبی کی انگوٹھی تمہاری ہوگی اور میں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ انگوٹھی تمہیں دوں گی۔''

اس کے بعد میں کیا کہہ سکتی تھی۔ میں نے دوسرا بکس کھولنا شروع کر دیا۔ ابھی میں اس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ ہی رہی تھی کہ بیکی کمرے میں گئی اور چلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم میں سے کوئی ایک میری مدد کر سکتا ہے؟''

''کیا تم جاسکتی ہو؟'' جین نے کہا۔ ''میں میکڈونلڈ فون کر رہی ہوں۔''

''یقیناً۔'' یہ کہہ کر میں کمرے میں داخل ہوگئی۔ ''کیا ہوا؟''

''میں اکیلے اسے نہیں اٹھا سکتی۔'' بیکی نے کہا۔

وہ ایک پرانے طرز کا بنا ہوا لیدار کا بکس تھا۔ ''یہ کہاں سے آیا؟''

''تمہیں ماما کا وہ بکس یاد نہیں جس میں وہ اپنی چیزیں رکھا کرتی تھیں اور وہ ہمیشہ ان کے بستر کی پائینتی رکھا ہوتا تھا؟''

میں نے اسے ایک طرف سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ بہت وزنی تھا۔ ''کیوں نہ ہم اسے یہیں کھول لیں؟''

''اچھا آئیڈیا ہے۔''

جب ہم نے اس کا ڈھکنا اٹھایا تو پہلی چیز جو مجھے نظر آئی، وہ ایک نرم روئیں دار کپڑے کا بنا ہوا کی ماؤس تھا جس نے ایک جیکٹ اور ہیٹ پہن رکھا تھا۔

''مسٹر ماؤس!'' میں نے اسے اٹھایا لیکن گلے نہیں لگایا۔ اس کے سینے پر ایک گہرا براؤن دھبا تھا جو مجھے یاد نہیں۔ اس کے نیچے ایک لفافہ اور بڑا بنڈل تھا جسے پلاسٹک کے تھیلوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور اس میں سے ایک ناگوار... بو آرہی تھی۔

''میں نہیں سمجھتی کہ اس میں انگوٹھی ہوگی۔''

''میں نہیں جانتی کہ یہ کیا ہے۔'' بیکی نے کہا۔ وہ بھی حیرت زدہ تھی۔ اس نے پلاسٹک کھینچنا شروع کیا اور بالآخر چھ انچ کا خلا بنانے میں کامیاب ہوگئی۔ ہمیں اس میں ایک اونی چار خانے کا کپڑا نظر آرہا تھا جیسے وہ کسی مرد کی قمیص کا حصہ ہو۔

''اس میں صرف کپڑے ہیں۔'' اس نے کہا اور مزید پلاسٹک کھینچنے لگی۔ ''یہ..... یہ کیا ہے؟'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

اسے دیکھ کر مجھے چلانا یا رونا چاہیے تھا لیکن میں اپنی جگہ پر منجمد ہوگئی۔ میری نظریں آستین کے نیچے انسانی جلد پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی سوکھی ہوئی کلائی پر ایک گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ میں اس گھڑی کو پہچانتی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ کی ماؤس کو کون پسند کرتا ہے۔

''اوہ میرے خدا..... بیکی! یہ تو انکل لونی ہیں۔''

میں نہیں جانتی کہ ہم دونوں کتنی دیر کھڑے اسے دیکھتے رہے تبھی جین نے آواز لگائی۔ ''کیا تم دونوں کو کچھ کامیابی ہوئی؟''

گو کہ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کیا کرنا چاہیے لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ جین بکس میں دیکھے۔ میں نے اس کے آنے سے پہلے اس کا ڈھکنا بند کر دیا۔

''اس میں کیا ہے؟'' اس نے کہا۔ ''کیا وہ کھلونا مل گیا جس کی تمہیں تلاش ہے؟''

''ہاں۔ وہی ہے۔''

''یہ تمہارے حق میں اچھا ہوا۔'' جین نے کہا۔ ''بیکی! کیا تم ٹھیک ہو؟''

پہلی بار میری بہن کا چہرہ زرد ہوگیا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسے گرمی لگ رہی ہے۔''

''کیوں نہ ہم کسی اور دن آئیں۔'' جین نے کہا۔

''مجھے صرف ایک وقفہ چاہیے۔'' بیکی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

''جین! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہماری کار لے جاؤ اور شہر سے ہمارے لیے کولڈ ڈرنکس لے آؤ۔ یہ میری طرف سے ٹریٹ ہے۔''

جین خوش ہوگئی۔ اسے ٹریٹ لینا اچھا لگتا تھا۔ ''کیوں نہیں۔ کیا میں اسنیک بھی لیتی آؤں؟''

میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''بسکٹوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ بہرحال جو تمہارا دل چاہے۔'' میں اپنا پرس لینے چل دی جس میں کچھ پیسے رکھے ہوئے تھے۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

''اگر میری غیر موجودگی میں تمہیں کچھ مل جائے تو مجھے ضرور بتانا۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

''آرام سے جاؤ۔ کوئی جلدی نہیں ہے۔''

میں نے اس کے سیڑھیاں اترنے کا انتظار کیا پھر خود نیچے گئی تاکہ مجھے اطمینان ہوجائے کہ وہ کار لے کر چلی گئی ہے، پھر میں واپس ماما کے اسٹور روم میں آئی اور دروازہ بند کردیا۔ گو کہ عمارت خالی تھی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی، پھر میں نے بکس کا ڈھکنا اٹھانا شروع کردیا۔

''یہ تم کیا کررہی ہو؟'' بیکی نے پوچھا۔

''میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ لفافے میں کیا ہے۔''

جب میں نے بکس بند کیا تو میں اور وہ دونوں ہی پُرسکون ہوگئے کیونکہ اب وہ لاش ہمیں نظر نہیں آرہی تھی تاہم اس کی بو ابھی تک مجھے محسوس ہورہی تھی۔

وہ لفافہ سربمہر نہیں تھا۔ میں نے اس میں سے ایک کاغذ نکالا جس پر ماما نے اپنی ہینڈ رائٹنگ میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اس کی عبارت کچھ یوں تھی۔

''جس کسی کا بھی اس سے تعلق ہو۔

اگر تم یہ خط پڑھ رہے ہو اور تمہیں لونی کی لاش ملی ہے تو جان لو کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔ وہ میرا محبوب تھا، گو کہ ہم نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی کیونکہ ہم نہیں سمجھتے تھے کہ لوگ اسے پسند کریں گے۔ کچھ عرصے بعد میں نے اس سے تعلق ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن جب میں نے اسے بتایا تو وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے میرے چن سے ایک چاقو اٹھایا اور مجھ پر حملہ کرنے والا تھا کہ میں نے کافی ٹیبل سے ایک ماربل کی ایش ٹرے اٹھا کر اس کے سر پر ماردی۔ میری چھوٹی بیٹی اوپر سو رہی تھی اور بڑی اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹی میں گئی ہوئی تھی اس لیے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں نے کیا کردیا ہے۔

میرا ارادہ اسے قتل کرنے کا نہیں تھا اور میں پولیس کو اس واقعے کے بارے میں بتا دیتی اگر مجھے اپنی بیٹیوں کا خیال نہ ہوتا۔ میں ایک بیوہ ہوں۔ میرے والدین کا انتقال ہوچکا ہے اور میرے چھوٹے بھائی کا گھر بچوں سے بھرا ہوا ہے لہٰذا میرے جیل جانے کے بعد دونوں لڑکیاں بے سہارا ہوجاتیں اور ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا، لہٰذا میں نے اس جگہ سے خون صاف کیا اور لاش کو اس بکس میں چھپادیا۔ وہ ایش ٹرے بھی بکس کی تہ میں رکھی ہے۔ لونی کے غائب ہوجانے کے بعد پولیس نے میرے گھر کی تلاشی نہیں لی کیونکہ وہ ہمارے تعلق کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔

چند ہفتوں بعد میں نے اس بکس کو اسٹور ریج میں رکھوادیا اور یہ اس وقت سے یہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا۔

مارگریٹ گریر!''

یہ بڑی دلچسپ بات تھی۔ مجھے بالکل بھی شبہ نہیں تھا کہ ماما کسی کو قتل کرسکتی تھیں، اگر ان کے پاس عقل ہوتی۔ البتہ مجھے ان حالات نے حیران کردیا تھا۔ ''کیا ماما کے انکل لونی سے جنسی تعلقات تھے؟'' 1988ء میں ماما کی عمر تیس سال ہوگی جبکہ انکل لونی کے بال سفید ہوچکے تھے۔ ''اگر عمر کا فرق ان کے درمیان حائل نہیں تھا تو وہ کیوں انکل لونی سے تعلق ختم کرنا چاہ رہی تھیں؟''

''مجھے اس پر یقین نہیں۔'' بیکی نے کہا۔ ''بے شک تم اس وقت چھوٹی تھیں لیکن ایسی کوئی بات ہوتی تو مجھے معلوم ہوجاتا۔ انکل نے کبھی بھی ماما میں ذرا سی دلچسپی ظاہر نہیں کی اور وہ اس وقت بھی ڈیڈی کا سوگ منارہی تھیں۔''

''ممکن ہے کہ شاید وہ تنہائی محسوس کرتی ہوں۔''

ڈیڈی کے انتقال کے بعد ماما کو فل ٹائم جاب کرنا پڑی۔ اس کے علاوہ انہیں میری اور بیکی کی دیکھ بھال کرنا ہوتی تھی۔ اس کے بعد ان کے پاس سوشل لائف کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ ''ممکن ہے کہ انکل نے ان کے بیوہ ہونے کا فائدہ اٹھایا ہو؟''

''کیا تم واقعی سمجھتی ہو کہ کوئی شخص ماما کے بیوہ ہونے کا فائدہ اٹھا سکتا تھا اور انہوں نے مزاحمت نہ کی ہو؟''

''ہوسکتا ہے کہ انکل نے کوشش کی ہو اور اسی لیے ماما نے انہیں قتل کردیا۔''

''پھر انہوں نے خط میں اس کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟''

''میں نہیں جانتی۔ میرے مقابلے میں تمہیں اس وقت کی باتیں اچھی طرح یاد ہیں۔ یہ بتاؤ کہ انکل لونی کس قسم کے آدمی تھے؟''

بیکی نے کندھے اچکائے۔ ''دیکھنے میں وہ اچھے معلوم ہوتے تھے۔ وہ ماما کو چرچ میں ملے تھے۔ انہیں کسی طرح معلوم ہوگیا کہ ہم اپنے مکان میں رہنا افورڈ نہیں کرسکتے لہٰذا انہوں نے کہا کہ ہم ان کے برابر والا مکان کرائے پر لے لیں۔ وہ انہیں کبھی کبھار ڈنر پر بلاتیں اور جب ماما کی نائٹ شفٹ ہوتی تو وہ تمہیں سنبھالتے تاکہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ باہر جاسکوں۔ وہ کہتے تھے کہ تمہیں دیکھ کر انہیں اپنی چھوٹی

بیٹی یاد آجاتی ہے لہٰذا شاید تم نے میرے مقابلے میں ان کے ساتھ زیادہ وقت گزارا تمہیں کیا یاد ہے؟''

میں نے ایک کچن چیئر کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی۔ مسٹر ماؤس میرے ہاتھ میں تھا۔ ''مجھے اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مجھے مسٹر ماؤس دیا تھا اور جب وہ میری دیکھ بھال کے لیے آتے تو ہم ماؤس ہول کا گیم کھیلتے۔ پھر وہ مجھے اوپر لے جاتے تاکہ میں کارٹون دیکھ سکوں اور مجھے پینے کے لیے کوک دیتے۔ ماما کا کہنا تھا کہ اس طرح میں رات کو دیر تک جاگتی رہوں گی لیکن زیادہ تر میں کاؤچ پر ہی سو جاتی۔ پھر انکل لونی مجھے بستر پر لاتے اور مسٹر ماؤس کو بھی میرے ساتھ ہی لٹا دیتے۔''

میں نے مسٹر ماؤس کے سینے پر دھبا دیکھا۔ ''اوہ میرے خدا! میرے خیال میں یہ خون ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے فرش پر پھینک دیا۔

''اس پر خون کا دھبا کیسے آسکتا ہے؟ ماما نے انکل لونی سے تمہارے بیڈروم میں لڑائی نہیں کی تھی۔''

''ممکن ہے کہ انکل لونی نے اس مرتبہ مسٹر ماؤس کو نیچے چھوڑ دیا ہو جب وہ مجھے بیڈروم میں لے کر گئے تھے۔''

''کیل! مجھے اس گیم کے بارے میں بتاؤ۔'' بیکی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ کیوں پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''وہ درحقیقت کوئی گیم نہیں تھا۔ انکل لونی، مسٹر ماؤس کو ہاتھ میں پکڑ کر کبھی ماؤس کی آواز نکالتے۔ مجھے اپنے ماؤس ہول میں جا کر اسے تلاش کرنا ہوتا۔ وہ کہاں ہو سکتا ہے؟ اور پھر مسٹر ماؤس میرے کان، بازو کے نیچے، منہ اور میری ناف میں دیکھتا۔''

''تمہاری ناف میں؟''

ہاں۔ اس نے میری قمیص اوپر اٹھائی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس نے میری پینٹ کے نیچے، ٹانگوں کے درمیان اور.....'' میں نے رک کر بیکی کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگی۔ اسی وقت مجھے بڑے زور کی قے آئی لیکن میں نے فوراً ہی ایک پرانی بالٹی پکڑ لی۔

بیکی نے میری کمر تھپتھپائی جب تک میں فارغ نہ ہو گئی، پھر وہ باتھ روم سے میرا چہرہ صاف کرنے کے لیے کاغذ کا تولیا گیلا کر کے لائی، پھر اس نے ایک پرانی پیالی میں پانی بھر کر دیا تاکہ میں کلی کر سکوں۔ جب وہ میری دیکھ بھال کر رہی تھی تو میں نے کچھ سوچنے کی کوشش نہیں کی لیکن بالآخر مجھے کہنا پڑا۔ ''ماما نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ کیا ایسا نہیں تھا؟''

''میں نے ایک آرٹیکل پڑھا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس میں بوڑھے لوگ، کم عمر لڑکیوں میں جنسی کشش محسوس کرتے ہیں۔''

''ایک ایسی لڑکی جس کا باپ مر گیا ہو اور ماں کو دن رات کام کرنا پڑ رہا ہو۔''

''اور جس کی بڑی بہن اس کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتی ہو۔''

''بس کرو۔ ہم میں سے کسی کے ساتھ تیس سال پہلے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا اور یہ تم بھی جانتی ہو۔''

''بہرحال ایسے لوگ کھیلوں اور مختلف کھلونوں کے ذریعے بچوں کی تربیت کرتے ہیں۔''

''جیسے مسٹر ماؤس۔ میں نہیں سمجھتی کہ کبھی اس کو دوبارہ ہاتھ لگانے کی خواہش کی ہو۔''

''پھر کسی مرحلے پر وہ سوچتے ہیں کہ یہ ایک محفوظ طریقہ ہے یا مزید یہ عمل دہراتے ہیں۔''

''کیا تم سمجھتی ہو کہ اس نے میرے ساتھ مزید کچھ کیا تھا؟''

''کیا تمہیں کبھی کسی نقصان کی علامت نظر آئی؟''

میں نے اچانک ہی قہقہہ لگایا۔ ''میرے خدا! ہم جوان ہونے کے باوجود کچھ کہنے سے ڈرتے ہیں۔ نہیں، میں نے کبھی کوئی ایسی علامت نہیں دیکھی اور نہ ہی میری گائناکولوجسٹ کو ایسی کوئی بات محسوس ہوئی۔ ماما نے ضرور اسے بروقت پکڑ لیا ہوگا لیکن اس نے پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟''

پھر میں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ''کیونکہ یہ تیس سال پہلے کی بات ہے۔ کوئی بھی اس پر یقین نہ کرتا بلکہ آج اگر یہ واقعہ پیش آجائے تب بھی کوئی اس کا یقین نہیں کرے گا۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن ہم ماما کو جانتے ہیں۔ یہ واحد وجہ نہیں ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''یقیناً وہ اندر آئی اور اس نے دیکھا کہ وہ تمہارے ساتھ زیادتی کرنے والا ہے لہٰذا اس نے تمہیں بچا لیا۔ یہ بالکل سادہ اور سیدھی سی بات ہے۔ یہاں تک کہ اس نے تمہیں بچانے کے لیے بھی جھوٹ لکھا تاکہ اگر کبھی لاش دریافت ہو تو تم پر کوئی بات نہ آئے۔ اسے یہی خدشہ تھا کہ کسی شخص کو سچ نہ معلوم ہو جائے۔''

''اب ایسا ہو چکا ہے۔ وہ ہم سے کیا چاہتی ہوں گی؟

تم انہیں مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو۔''

''تم ہمیشہ یہی کہتی ہو لیکن وہ تمہاری بھی ماں تھی۔ تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''میں ماما کے بارے میں یہی جانتی ہوں کہ وہ خود مختار، ریزرو اور بہت مضبوط عورت تھیں۔ وہ کسی پر آسانی سے بھروسا نہیں کرتی تھیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے مجھے انکل لونی سے بچایا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کی انہیں کیا قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کیا میں اس احسان کا بدلہ اتار سکتی ہوں؟''

''ہم ان کے راز کی حفاظت کریں گے۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''فی الحال ہم اس لاش کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں اور یہاں کا کرایہ دیتے رہیں گے۔ اس طرح ہمیں اتنا وقت مل جائے گا کہ ہم اس لاش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی محفوظ طریقہ ڈھونڈ سکیں۔''

تھوڑی دیر بعد جین بھی کوک اور دوسرا سامان لے کر آ گئی۔ اس سے پہلے ہی میں اور بیکی سب چیزیں اسٹور روم میں واپس رکھ کر اسے مقفل کر چکے تھے۔

''تم دونوں کیا کر رہی ہو؟'' جین نے پوچھا۔ ''کیا تم اپنی مطلوبہ چیز تلاش نہیں کر رہیں؟''

''ہم نے فیصلہ کیا ہے.....'' میں کہتے کہتے رک گئی۔ وہ کیوں یہ سوچے کہ ہم نے تلاش ختم کر دی۔ ''تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہم نے تمہاری غیر موجودگی میں تلاش نہیں کی؟''

اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں صرف یہ سوچ رہی تھی کہ اگر تمہیں انگوٹھی مل جاتی تو مجھے ضرور بتاتیں لیکن تم خوش نہیں لگ رہی ہو۔''

''ہم نے سوچا ہے کہ وہ انگوٹھی یہاں نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟ میرا مطلب ہے کہ تمہیں نہیں معلوم وہ انگوٹھی کہاں ہے۔ کیا تم جانتی ہو؟''

''نہیں، ہم نہیں جانتے۔ کیا تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ سرخ ہو گیا۔ میں نہیں سمجھتی کہ ایسا گرمی کی وجہ سے ہوا ہوگا۔

''یہ مضحکہ خیز بات ہے۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میں کیسے جان سکتی ہوں؟''

شاید میرے پاس اس سوال کا جواب تھا۔ ''بیکی! کیا تم نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ آنٹی جینی خاندان کی پہلی فرد تھیں جو اس روز مکان پر پہنچیں جب ماما آگ میں گھری ہوئی تھیں؟''

بیکی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ماما کے ساتھ اسپتال گئی تھی لیکن آنٹی جینی مکان پر ہی رک گئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ چیزوں کو ٹھیک کرنے میں مدد دینا چاہتی ہیں۔''

ہم دونوں بہنوں نے جین کی طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تمہاری ماما نے وہ انگوٹھی اٹھائی تھی؟''

''تم نے ایسا سوچا بھی کیوں.....؟'' جین نے کہنا شروع کیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ڈیڈی سب بہن بھائیوں میں چھوٹے تھے اور شاید آنٹی پیگ نے ماما کو بتا دیا ہوگا کہ اس نے انگوٹھی کے بارے میں اپنا ذہن تبدیل کر لیا ہے کہ وہ کس کو ملے گی۔ ویسے بھی گیل تمہیں اس کی زیادہ پروا نہیں تھی.....''

ہم انتظار کرتے رہے کہ وہ کوئی مناسب بہانہ سوچ لے۔ بالآخر اسے احساس ہو گیا کہ ایسی کوئی بھی کوشش بے کار ہے اور وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے کہنے پر یاد آیا، ماما نے کہا تھا کہ آنٹی پیگ نے انہیں کچھ چیزیں حفاظت کی غرض سے دی تھیں کیونکہ ان کے گھر میں اجنبی لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا اور اسپتال کے علاوہ نرسنگ ہوم سے بھی ان کی چیزیں غائب ہو رہی تھیں۔''

''تم نہیں جانتی تھیں کہ کب کون سی چیز چوری ہوئی؟'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''اگر ماما کے پاس انگوٹھی ہوتی تو انہیں یاد نہیں رہا ہوگا کیونکہ خاندان میں ایک موت ہو گئی تھی۔ میں انہیں فون کر کے پوچھتی ہوں.....''

''ابھی نہیں۔'' بیکی نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ ہم خود جا کر ان سے بات کریں۔''

اب جینی کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس کے بعد ہم آنٹی جینی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

مجھے ان دونوں ماں بیٹی میں سے کسی پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ جین اپنی ماں کا دفاع کر رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ مجھے انگوٹھی کی پروا نہیں اور میں نے بھی کبھی ایسا محسوس نہیں کیا۔ یہ آنٹی جینی کی سیف کیپنگ ہی تھی جس کی وجہ سے ہم ویئر ہاؤس گئے اور ہمیں وہ ورثہ ملا جو میرے لیے کسی انگوٹھی کے مقابلے میں خاصا قیمتی تھا۔

بہر حال میں نے بعد میں بیکی کو بتا دیا کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں ماما کی انگوٹھی پر اپنا حق نہیں جتاؤں گی۔ میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتی۔

⌘⌘⌘

محفلِ شعر و سخن

❁ ناہید یوسف ..... اسلام آباد

تم جانتے ہو وقت سے بنتی نہیں میری
ضد کس لیے کرتے ہو کہا نا نہیں ملتا
کیا یہ بھی کوئی رسم رقابت ہے کہ جس میں
تم ملتے ہو مجھ سے تو زمانہ نہیں ملتا

❁ وزیر محمد خان ..... بلل ہزارہ

یونہی روتا نہیں کوئی صاحب
عشق اندر سے اجاڑ دیتا ہے

❁ اختر پرویز ..... کراچی

اے بے خودی ٹھہر کہ بہت دن گزر گئے
مجھ کو خیالِ یار کہیں ڈھونڈتا نہ ہو

❁ ریاض انصاری ..... لاہور

آگہی مجھ کو کھا گئی ورنہ
میں نے جینا تھا اپنے مرنے تک

❁ طیب شاہین ..... کھیالہ شیخاں

ہجومِ غم میں بھی توہینِ ضبطِ غم نہ ہوئی
اس احتیاط سے روئے کہ آنکھ نم نہ ہوئی

❁ محمد شہباز اکرم نوئی ..... پاکپتن شریف

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

❁ ناظر علی ..... کراچی

تجھے خبر نہیں کیا شے ہے خوف تنہائی
ڈھلے جو شام تو خود اپنا گھر ڈراتا ہے

❁ امتیاز احمد ..... بھالیہ

کتنی باتیں ہیں دل میں جو کہہ نہیں سکتے
تم سے کہے بغیر بھی لیکن رہ نہیں سکتے

❁ محمد انور ندیم ..... حویلی لکھا

زندگی زندہ دلی کا ہے نام
مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

❁ مہتاب احمد ..... حیدرآباد

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو
میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں

❁ سائرہ نواب ..... پشاور

چھوڑو یہ سرسری وعدے نہیں پورے ہوتے
میں اسی وقت جو مرجاؤں تو مرجاؤ گے کیا؟

❁ نعیم احمد ..... بہاولپور

احتراماً اداس رہتے ہیں
ورنہ ہم بھول گئے ان کو

❁ کامران شاہد ..... میرپور خاص

اب کوئی اس سے تعلق نہ مراسم نہ قرار
اب اگر جان یہ جاتی ہے ہماری جائے
ہم بھی کچھ اپنی وضع داریاں کم کریں گے
پہلے یہ ضد تو طبیعت سے تمہاری جائے

❁ صبا احمد ..... ٹنڈو الہیار

یہ مہرباں سی نگاہیں سپردگی کی وعید
میں جانتا ہوں یہ اس کی ادا ودا ہے سب

❁ سحر خان.....کوئٹہ
یہ روز و شب بھی ساتھ کہاں تک نبھائیں گے
ہونی تو ہے کہیں پہ کسی روز شام بھی
ان موسموں کی شاخ ہواؤں کے ساتھ ساتھ
کچھ یاد آئے بھولے ہوئے ہم کو نام بھی
❁ عمران شیروانی.....لاہور
گھوم پھر کر تو بہت دیکھ لیا سارے میں
اب تو بس فیصلہ کرنا ہے ترے بارے میں
❁ ماہین فاطمہ.....اوکاڑہ
مجھ میں یوں تازہ ملاقات کے موسم جاگے
آئینہ ہنسنے لگا ہے مری تیاری پر
❁ محمد امجد ریاض.....چیچہ وطنی
زمانہ جن کے تجسس میں سرگرداں ہے وہ لوگ
ہوئے ہیں سنگ ترے آستاں پہ بیٹھے ہوئے
❁ وسیم اکرم.....خانیوال
فکر تو یہ ہے کہ اب اور کیا کیا جائے
آج بے دست تو ہو آئے ہنر کی خاطر
❁ شاہینہ مہتاب.....چنیوٹ
بھلا ہوا کہ اجڑ ہی گیا یہ گوشۂ دل
تمہاری یاد کو کب تک یہ زحمتیں دیتے
مٹا دیا ہے بھلا نقشِ پا کو کیوں اپنے
ہمارے سجدے اسے اور عظمتیں دیتے
❁ حنظلہ شاہد.....سکھر
راستہ روک ہی لیتا ہے تغیر کا غبار
ورنہ ہر راہ کھلی ہے یہاں جانے کے لیے
❁ عاصم خان.....کراچی
دستک بدست کوئی ہوا کی طرح ہے کیوں
اک خواب کی طرح سے ہے کیوں روبرو کوئی
❁ سنبل علی.....سرگودھا
تاریخ تمہاری بھی گواہی کبھی دیتی
نیزہ ہی بدل جاتا اگر سر نہیں بدلا
❁ آصف احمد.....نواب شاہ
ہم نے ہر شب کے اندھیروں سے سحر چھینی ہے
ہم کو آتا نہیں خوابوں پہ قناعت کرنا
❁ صائمہ عمران.....جہلم
رت جگے صرف تمہارا ہی مقدر تو نہیں
میں بھی اک خواب کو آنکھوں میں لیے پھرتا ہوں

❁ یمنیٰ جاوید.....کراچی
مسافروں کو نصاب سفر بھی یاد نہیں
پلٹنا چاہتے ہیں اور گھر بھی یاد نہیں
❁ صالحہ ایوب.....کراچی
لاکھ مسمار کیے جائیں زمانے والے
آ ہی جاتے ہیں نیا شہر بسانے والے
❁ بینش صدیقی.....حیدرآباد
وہ اور ہوں گے جو ہوں گے ترے قریبوں میں
مری تو خیر سے دہلیز تک رسائی تھی
❁ لبنیٰ وکیل.....کوئٹہ
اب اس سے بڑھ کے محبت کا قحط کیا ہوگا
سب اجنبی ہیں یہاں رسم و راہ ہوتے ہوئے
❁ جنید ملک.....کراچی
اور کچھ دن جو یہی خوف کا عالم ہے تو پھر
نہ دعائیں کوئی دے گا نہ سلام آئے گا
❁ عظیم احمد.....جھنگ
کتنی مفلس ہوئی جاتی ہے یہ دنیا پھر بھی
سوچتی ہے کہ کوئی اور نظام آئے گا
❁ شاہد علی.....فیصل آباد
اب بھلا پوچھیں تو کیا پوچھیں کسی سے تعبیر
خواب تو صبح سے پہلے ہی بکھر جاتے ہیں
❁ صبا سحر.....کراچی
جب سے لوگ کناروں پر آباد ہوئے
دریا میں طغیانی بڑھتی جاتی ہے
❁ منیر شگفتہ.....وہاڑی
ہم حادثے کی زد سے تو محفوظ ہوگئے
اچھا ہے وقت پہ ہمیں ادراک ہوگیا
آئی نہ راس اس کو نئی وضع بھی کوئی
خاک تھا جسم آج وہی خاک ہوگیا
❁ زوہیب ملک.....کراچی
ہمارے دشمنوں میں چاہنے والے بھی شامل ہیں
سو ہم جس حال میں بھی ہوں محبت کم نہیں ہوتی
❁ اقبال احمد.....روہڑی
اپنوں میں مجھے کوئی بھی اپنا نہیں ملتا
اب درد تو ملتا ہے میں نہیں ملتا
ڈوبیں تو ابھرنے کی تمنا نہ ہو پیدا
ایسا بھی کسی ذات کا دریا نہیں ملتا

❊ انعم کمال.....حیدر آباد
کیسی راہوں کے مسافر ہوئے ہم لوگ جہاں
سایہ آتا ہے کہیں اور نہ سراب آتے ہیں

❊ طیب اسد شاہنواز.....ڈیرہ اسماعیل خان
جنہیں سلیقہ آرائشِ چمن ہی نہیں
یہاں تو ان کے گلے ہی میں ہار ڈالے گئے

❊ اعتزاز ظفر.....اسلام آباد
کیا مسیحائی کرے گا وہ عیادت کے سوا
مجھ سے واقف ہی نہیں جو مری حالت کے سوا

❊ سلیم قادر.....میانوال رانجھا
مدتوں کے بعد تم نے رخ کیا اس کی طرف
کیا یہی تھا آئینے کے ٹوٹ جانے کا سبب

❊ نوشتہ گلزار.....بھکر
چلو ہم بھی تو دیکھیں اس نشے میں ایسی مستی میں
کدھر کو جارہے ہیں روز و شب آہستہ آہستہ

❊ عاصمہ احمد.....سیالکوٹ
عشق کے لیے کنار صحرا میں
کم . نہیں ہے کناریاں دل کی

❊ اسد خان.....مانسہرہ
دل ہے جاگیر تری عشق ترا سرمایہ
اپنی اس مملکتِ خوش رنگ و خوشبو میں تو آ

❊ نوید ممتاز.....سکھر
ہر محاذ پر تنہا خود کو ہم نے پایا تھا
دشمنوں کی ہر جانب سو طرح کی گھاتیں تھیں

❊ آمنہ عمران.....لاہور
محرومیوں کے راستے اس درجہ سخت تھے
سایہ بھی دھوپ کا کوئی سر پر نہیں ملا

❊ فریال احمد.....بہاولنگر
سارے منظر چپ چپ ہیں اور ساری فضائیں ہیں خاموش
شہر کی ساری گلیاں سونی رستے سب سنسان ہوئے

❊ ملک محمد ظفر.....راجن پور
ناگہاں پھیل گئی تجھ سے ملاقات کی گرد
ورنہ رسوائی کسی اور سبب ہے اپنی

❊ الیس سجاد.....اوکاڑہ
مل ہی جائے گا اب نشان کوئی
رنگ اجڑے کھنڈر کا باقی ہے
آس اب بھی نہیں گئی دل کی
اک ستارہ سحر کا باقی ہے

❊ ردا جاوید.....بٹل ہزارہ
قدم قدم پہ تھیں بکھری پڑی ہوئی یادیں
چلی سموم تو دل کی امانتیں بھی گئیں

❊ وقاص احمد.....چنیوٹ
وہ آگ کا تھا سمندر گزر گئے ہم بھی
ہمارے صبر کا کچھ امتحان تو ہونا تھا

❊ خلیق الزماں.....پشاور
جس بات کا سننا تمہیں منظور نہیں تھا
ہم کو بھی وہی بات سنانی ہی کہاں تھی

❊ شاہانہ فیض.....ٹنڈو الہیار
زندگی کے صحرا میں کچھ نشاں نہیں ملتے
راستے تو ملتے ہیں کارواں نہیں ملتے

❊ ثنا صادق.....کراچی
مجھے گنوا کے سدا وہ بھی وحشتوں میں رہا
خود اپنی ذات کی ویران خلوتوں میں رہا

❊ ناصر خان.....ایبٹ آباد
کتنی ویراں سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ سے چلے جاتے ہیں جانے والے

❊ عالیان علی.....مری
وہ بھی غبارِ خواب تھا ہم بھی غبارِ خواب
وہ بھی کہیں بکھر گیا ہم بھی کہیں بکھر گئے

❊ کہکشاں.....پنڈی
کبھی توڑا کبھی جوڑا پھر جوڑ کے توڑا
ناکارہ کردیا دل کو تیری اس پیوند کاری نے

کوپن
نومبر
2020

نام : --
پتا : --

منزل

غلام قادر

ناحق کسی انسان کا خون ہوجائے اور ... قدرت خاموش رہے ، ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے ... یہ معمولی خاک کا پُتلا چاہے جتنی طاقت حاصل کرلے اوقات تو اس کی وہی ہے ... مٹی سے بنے اس کھلونے نے بھی بہت ظلم کیے اور بالآخر ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس خاک کو اڑا کر رکھ دیا۔

منزل پر پہنچ کر بھی بے منزل رہنے والے مسافروں کا قصہ

میں رات گیارہ بجے والی بس میں سوار ہوا۔ میری منزل صادق آباد تھی جہاں سے مجھے فون آیا تھا کہ فوزیہ نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔ فون ساڑھے دس بجے میرے بھائی نے کیا تھا جو اس وقت صادق آباد میں ہی تھا۔ وہ میرے اور فوزیہ کے تعلقات کے بارے میں پوری طرح آگاہ تھا۔ صرف وہی نہیں ، فوزیہ کے دونوں بھائی بھی اس سے آگاہ تھے بلکہ فوزیہ کی والدہ بھی کسی حد تک آگاہ تھیں۔

میں سکھر سے بس میں سوار ہوا تھا اور بس نے ابھی کچھ ہی سفر طے کیا تھا کہ اچانک ڈرائیور کو بس روک دینی پڑی۔ ''آدھی رات کو کس نے انہیں سڑک پر چھوڑ دیا ہے۔'' ڈرائیور بڑبڑایا۔

میں نے جھانک کر دیکھا تو گایوں کا ایک ریوڑ سڑک کراس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا... اندھیرا ہونے کے باوجود کچھ ایسی نشانیاں نظر آئیں تو میں نے خود سے کہا۔ ''ابھی تو بس ''پنوعاقل'' ہی تک پہنچی ہے۔'' یعنی ابھی زیادہ سفر طے کرنا باقی تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے میں اتنا مگن تھا کہ جب میں نے نظر دوبارہ اندر بس کی طرف کی تو میرے برابر کی سیٹ جو خالی تھی، اس پر ایک لڑکی براجمان تھی۔ مجھے اپنی جانب دیکھتا دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آگئی۔

''میں رتنا ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا۔
''میں ڈاکٹر حماد ہوں۔'' میں نے اس کے تعارف کے جواب میں اپنا تعارف کروایا۔
''آپ ڈاکٹر ہیں؟'' اس نے سوال کیا تو میری گردن اثبات میں ہل گئی۔
''ابھی پڑھ رہے ہیں یا ڈاکٹر بن چکے ہیں؟'' اس نے ایک اور سوال کیا۔
''میں پڑھ نہیں رہا بلکہ سکھر کے میڈیکل کالج میں پڑھا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔
''اچھا تو آپ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ٹیچر بھی ہیں۔'' اس نے ایک اور سوال کر دیا۔
'عجیب باتونی لڑکی ہے۔' میں نے سوچا لیکن اس سے صرف اتنا کہہ سکا۔ ''جی ہاں۔''
پہلی بار میں نے اسے غور سے دیکھا تھا۔ وہ پندرہ برس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ دبلی، پتلی اور کمزور سی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ بھی سانولا تھا، صرف اس کے چہرے پر موجود آنکھیں نمایاں تھیں۔ اتنی نمایاں کہ ایک بار کوئی اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتا تو پھر دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مقناطیسیت تھی جو کسی بھی شخص کو اپنے سحر میں مبتلا کر سکتی تھی۔
'ایسی آنکھیں تو فوزیہ کی بھی نہیں ہیں۔' میں نے سوچا اور ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔
''آپ میرے سوالوں سے بور تو نہیں ہو رہے؟'' میرے کانوں میں اچانک اس کی آواز آئی۔
''نہیں تو.....'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ایسا کہہ دیا۔
''میری ماتا کو یہی شکایت ہے کہ میں بہت بولتی ہوں۔'' اس نے شکایت بھرے انداز میں کہا۔
''غلط کہتی ہیں وہ۔'' میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔
''میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''تم تو ایک چھوٹی سی پیاری سی بچی ہو۔'' میں نے کہا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔
''ماتا اور بابا دونوں کہتے ہیں کہ تم بڑی ہو گئی ہو، اب اکیلے گھر سے مت نکلا کرو۔'' اس نے کہا۔
''غلط کہتے ہیں وہ دونوں۔'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔
''ایک بات پوچھوں؟'' کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔
''پوچھو۔'' میں نے کہا۔
''آپ اپنی عام زندگی میں بھی اتنے ہی سنجیدہ ہیں یا پھر میری وجہ سے ایسے بن گئے ہیں؟'' اس نے سوال کیا۔
''میں اپنی عام زندگی میں بھی سنجیدہ ہی ہوں لیکن اس وقت ایسی الجھن میں ہوں کہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا ہوں۔''
''میرا حق تو نہیں ہے لیکن اگر وہ الجھن مجھ سے شیئر کر لیں تو.....'' اس نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔
''لمبی کہانی ہے، تم بور ہو جاؤ گی۔'' میں نے کہا۔
''میرا وعدہ ہے کہ میں بور ہوئی تو آپ سے کہہ دوں گی کہ میں بور ہو رہی ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اور میرا یہ وعدہ ہے کہ جیسے ہی تم مجھ سے کہو گی کہ تم بور ہو رہی ہو، میں اپنی کہانی وہیں روک دوں گا۔''
''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' میری خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تو اس نے مجھے مخاطب کیا۔
''ہاں۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں۔'' میں نے کہا۔
''بالکل شروع سے.....'' اس نے جواب میں کہا۔
''تم سکھر کی رہنے والی ہو؟'' میں نے اپنی کہانی شروع کرنے کے بجائے سوال کیا۔
''نہیں، میں صادق آباد سے آگے ایک چھوٹا سا شہر ہے، میرا تعلق وہیں سے ہے۔''
''تب تو تم ناگ والے بابا کو جانتی ہو گی۔'' میں نے ایک اور سوال کیا۔
''جانتی تو نہیں ہوں لیکن اپنے بابا سے ان کا ذکر سنا ہے۔'' اس کا جواب تھا۔
''وہ ناگ والے بابا اس لیے مشہور ہیں کہ انہوں نے بہت سے خطرناک سانپ پالے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''بابا بتاتے تھے، ناگ ان کے مرید ہیں۔'' رتنا نے کہا۔
''مرید وغیرہ نہیں بلکہ یہ سانپ اس کی کمائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔''
''وہ کیسے؟'' رتنا نے سوال کیا۔
''وہ ان سانپوں کا زہر نکال کر ایکسپورٹ کرتا ہے جس سے بہت سی دوائیں بنتی ہیں۔''
''لیکن وہ تو خود بہت بڑے زمیندار ہیں۔'' رتنا نے اس طرح کہا جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔
''وہ تو اب ہیں۔'' میں نے کہا۔
''میرے والد رحیم یار خان میں اسٹیشن ماسٹر تھے۔'' میں آہستہ آہستہ موضوع کی طرف آ رہا تھا۔
''یہ کب کی بات ہے؟'' رتنا کا سوال تھا۔
''وہ متحدہ ہندوستان میں بھی ریلوے میں تھے۔

یوں کہہ لو کہ قیام پاکستان سے پہلے ہی وہ یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔ اس وقت یہ سارا علاقہ نواب آف بہاولپور کے زیر انتظام تھا۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ تقسیم سے پہلے ہی یہاں آ گئے تھے؟'' رتنا نے کہا۔

''بالکل ایسا ہی ہے۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''بابا بتاتے تھے کہ اس وقت یہ ناگ والے بابا اسٹیشن کے پاس ہی ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔'' میں نے بات آگے بڑھائی۔

''اب تو اس کی زمین میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔'' رتنا کی آواز میں حیرت تھی۔

''بابا بتاتے تھے کہ خطرناک سانپ اس وقت بھی اس کے پاس تھے لیکن اتنی تعداد میں نہیں تھے۔'' میں نے کہا تو رتنا مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ ''بابا کا کہنا تھا کہ یہ سپیروں کی کسی ٹولی سے بچھڑ کر یہاں آباد ہوا تھا اور سانپ پالنے کے علاوہ یہ سانپ کے کاٹے کا علاج بھی کرتا تھا۔'' میں وہی کچھ کہہ رہا تھا جو بابا کی زبانی سنا تھا۔

''ایک بار نواب بہاولپور کی چہیتی بیگم کو کسی سانپ نے ڈس لیا جس کا علاج اس نے کیا اور نواب بہاولپور نے خوش ہو کر اسے کافی ساری زمینیں دے دی تھیں۔'' میں نے بات آگے بڑھائی تو رتنا مزید حیرت زدہ ہوئی۔

''میرے پتاجی نے تو بتایا تھا کہ نواب بہاولپور کو اسٹیشن کی زمین بھی اسی نے دی تھی۔''

''نواب بہاولپور کے یہاں اکثر مہمان ہوتے تھے بلکہ وائسرائے تک ان کے مہمان ہوتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''ہوتے ہوتے ان انگریزوں تک بھی اس کی شہرت پہنچی اور ان میں سے کچھ نے اس کی کٹیا میں آنا جانا شروع کر دیا۔ ان میں سے ہی کسی ایک انگریز نے اسے یہ رستہ دکھایا کہ اگر یہ سانپ کا زہر نکال کر ایکسپورٹ کرے تو بہت امیر ہو سکتا ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں ایسی پھنسی کہ اس نے یہ کام شروع کر دیا۔ اب اس نے کیا یہ کہ اپنی برادری کے سپیروں سے رابطہ کیا اور ان کے ذریعے یہ خطرناک سانپ حاصل کرتا اور ان کی پرورش کرتا اور پھر ان کا زہر نکال کر ایکسپورٹ کرتا تھا اور اس طرح امیر سے امیر تر ہوتا چلا گیا۔''

''یہ باتیں آپ کو اپنے والد کے ذریعے پہنچیں؟''

''ابتدائی باتیں ان کے ذریعے ہی پہنچی تھیں، بعد میں ان کے بیٹوں سے دوستی ہوئی کیونکہ ہم ایک ہی اسکول میں تھے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ دونوں بھائی اور ان کی بہن کار میں اسکول آتے تھے لیکن اس طرح کہ ان کے ساتھ گارڈز ہوتے تھے اور ان گارڈز کی وجہ سے ہی اسکول کا کوئی بچہ ان کے قریب بھی نہیں جاتا تھا اور اگر کوئی بچہ ہمت کر کے ان کے قریب آ بھی جاتا تو گارڈز اسے کچھ اس طرح گھورتے کہ وہ دوبارہ ان کے قریب جانے کا سوچتے ہوئے بھی گھبراتا۔ یہی وجہ تھی کہ ان تینوں کا اسکول میں کوئی بھی دوست نہیں تھا۔

''میں اور میرا بھائی جواد پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ ہم دونوں اپنی اپنی کلاسوں میں اول آتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عبدالرحیم اور عبدالکریم ہمارے قریب آتے چلے گئے۔ عبدالرحیم بڑا تھا اور میری کلاس میں تھا اور عبدالکریم جواد کی کلاس میں تھا اور اس کی دوستی اس سے ہو گئی تھی۔ فوزیہ ان دونوں سے چھوٹی تھی۔ ہماری اس کے بھائیوں سے دوستی ہو گئی تو اس سے بھی دوستی ہو گئی۔

''عبدالرحیم سے دوستی ہوئی تو اس نے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ اس وقت تک اس کے والد کی جھونپڑی ایک حویلی میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن عام لوگوں میں اب اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ میں نے عبدالرحیم کی دعوت کے سلسلے میں ابا سے ذکر کیا تو انہوں نے کہا۔ ''لوگ اس حویلی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں لیکن مجھے ان باتوں پر یقین نہیں ہے۔ تم جاؤ ضرور لیکن احتیاط رکھنا۔''

''جس روز میں ان کے گھر گیا تھا، وہیں میری فوزیہ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ عبدالرحیم مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اس کے بابا نے حویلی کا ایک حصہ اپنے سانپوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور اس حصے کی جانب کسی کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ سانپوں کو غذا دینے بھی خود جاتے تھے۔

''عبدالرحیم نے تفصیل سے اس طرح سمجھایا تھا کہ عبدالرحیم کے والد سے ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے سانپوں والے کمرے دیکھنے کی فرمائش نہیں کی۔ میں اور جواد اس حویلی میں ساتھ گئے تھے اور وہیں ہماری فوزیہ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بچپن میں ہی اتنی خوب صورت تھی کہ جو اسے دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔

''ہماری واپسی وہاں سے رات کے کھانے کے بعد ہوئی تھی۔ کھانے کی میز پر عبدالرحیم کی والدہ تو موجود تھیں لیکن ان کے والد شریک نہیں ہوئے۔ جواد نے پوچھا بھی لیکن ان کی والدہ نے کہا کہ برسوں سے ان کا شیوہ یہی ہے کہ وہ ناشتا اور رات کا کھانا اپنے کمرے میں ہی لیتے ہیں۔ ایک ملازم مخصوص ہے کہ جب وہ اپنے سانپوں کو کھانا دے کر

آتے ہیں تو وہ ان کا کھانا ان کے کمرے میں پہنچا دیتا ہے۔

''عبدالرحیم کی والدہ ایک مہربان خاتون تھیں۔ وہ ہم سے ہماری تعلیم کے بارے میں سوالات کرتی رہیں۔ میں نے اور جواد نے جوابات دیے۔ میں نے کہا تھا کہ میں ڈاکٹر بنوں گا اور جواد نے کہا تھا کہ وہ وکیل بنے گا۔ عبدالرحیم نے بتایا کہ وہ بیرسٹر بنے گا جبکہ عبدالکریم نے کہا تھا کہ وہ زمینوں کی دیکھ بھال کرے گا جبکہ فوزیہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔

''تم دونوں بھائی اسی طرح پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہو؟'' انہوں نے ہم دونوں سے سوال کیے تھے۔

''ہمارا خاندان مذہبی خیالات کا ہے۔ ہمیں بچپن سے ہی نماز پڑھنے کی تلقین کی جاتی رہی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''زیادہ زور کس کی جانب سے دیا جاتا تھا امی یا ابو کی طرف سے؟'' انہوں نے سوال کیا تھا۔

''دونوں کی جانب سے۔'' جواد نے جواب میں کہا تھا۔ ''میں کچھ سست ہوں تو فجر کی نماز میں سستی کر جاتا تھا لیکن امی مجھے اٹھا دیتی تھیں۔'' جواد نے اپنی بات پوری کی۔ یونہی باتوں میں وقت گزرنے کا ہمیں احساس نہیں ہوا کہ ایک ملازم نے آکر بتایا کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب آئے ہیں۔ ہم باہر آئے تو ابا اپنی موٹر سائیکل پر موجود تھے اور ان کے ساتھ ہی عبدالرحیم کے والد بھی تھے۔ میں نے اور جواد نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے ہمیں دعا دی پھر ابا سے بولے۔ ''ماشاء اللہ آپ نے اپنے بچوں کی بہت اچھی تربیت کی ہے۔''

''میں تو ڈیوٹی پر ہوتا ہوں، یہ سب کمال میری بیگم کا ہے۔'' ان کا جواب تھا۔

''کبھی آپ بھی آئیں نا اپنی بیگم کے ساتھ۔'' انہوں نے دعوت دی اور ابا ''جی بالکل'' کہہ کر خاموش ہو گئے۔

''ہم سے انہوں نے کہا کہ تم دونوں بھی آتے رہنا تو ہم دونوں نے بھی ابا کی تقلید میں ''جی بالکل'' کہا اور ابا کی موٹر سائیکل پر سوار ہو گئے۔ عبدالرحیم کے والد نے ایک بار بھی نہیں کہا ''میرا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔'' ہمیں اس کا احساس نہیں ہوا لیکن گھر پہنچے تو ابا نے باتوں ہی باتوں میں اماں سے شاکی لہجے میں یہی بات کی۔

''انہوں نے مجھے اور آپ کو بھی مدعو کیا ہے۔'' ابا نے اماں سے کہا۔

''میں تو کبھی نہ جاؤں اس جادوگر کے گھر۔'' اماں نے فوراً ہی جواب دیا۔

''ارے وہ جادوگر وغیرہ کچھ نہیں ہے، ایک معمولی سا سپیرا ہے جسے تم جیسے لوگوں نے پتا نہیں کیا بنا دیا ہے۔'' ابا نے ناراض لہجے میں کہا لیکن اماں اپنی بات پر ڈٹی رہیں۔

''اور جو سب لوگ کہتے ہیں۔'' امی نے اپنے طور پر دلیل دی۔

''ان تمام لوگوں میں آدھے تو ہم پرست ہیں اور آدھے جاہل ہیں۔'' ابا نے کہا۔

''ابا! آپ نے ہی ایک بار کہا تھا تو ہم پرستی جاہلیت کی پہلی سیڑھی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو تم نے لڑکوں کو اس کے گھر جانے کی اجازت دے دی، میں ہوتی تو کبھی بھی اجازت نہ دیتی۔'' اماں نے اچانک موضوع بدل دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں اور جواد ہنسنے لگے۔

''اماں! ان کے بیٹے ہمارے دوست ہیں۔'' جواد نے کہا۔

''زیادہ عقلمند بننے کی کوشش نہ کرو۔'' اماں نے اسے پھٹکارا تو جواد خاموش ہو کر میرا چہرہ تکنے لگا جیسے میں اس کی مدد میں کچھ کہوں گا لیکن مجھ میں پھٹکار سننے کا حوصلہ نہیں تھا اس لیے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

میٹرک کا رزلٹ آیا تو میں پورے ضلع میں پہلے نمبر پر تھا۔ ابا نے مٹھائی تقسیم کی اور مجھ سے کہا یہ دو ڈبے اپنے دوستوں کو بھی دے آؤ۔ اماں کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

''تم پھر اس جادوگر کے گھر بھیج رہے ہو۔'' انہوں نے ابا سے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''یہ اس کے بیٹوں کے دوست ہیں اور اپنی خوشی میں دوستوں کو شریک کرنا سنت ہے۔''

میں ان کے گھر پہنچا تو عبدالرحیم اور عبدالکریم دونوں گھر پر تھے۔

''تمہارا رزلٹ کیا رہا؟'' میں نے عبدالرحیم سے پوچھا۔

''تمہارے جتنا تو اچھا نہیں رہا لیکن ضلع میں پانچویں پوزیشن آئی ہے۔''

''اب اول تو ایک ہی شخص آسکتا ہے۔'' عبدالرحیم کی والدہ کا جواب تھا۔

جواد اور عبدالکریم الگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں فوزیہ ڈرائنگ روم میں آئی۔

''میرے حصے کی مٹھائی۔'' اس نے براہِ راست مجھے مخاطب کیا تھا۔

''ابا نے دو ڈبے ہی دیے تھے کہ اپنے دوستوں کو دے آؤ۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''تو ان سے کہہ دیتے کہ اس گھر میں میری دوست بھی ہے۔'' فوزیہ نے کہا تو اس پر اس کی ماں نے اسے ڈانٹ دیا۔

''لڑکوں کے دوست لڑکے ہوتے ہیں، لڑکیاں نہیں۔''

ماں کی ڈانٹ سن کر وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

''اس کا رزلٹ کیا رہا؟'' میں نے پوچھ لیا۔

''اپنی کلاس میں دسویں نمبر پر آئی ہے۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''تب تو اس کا ڈاکٹر بننا مشکل ہے۔'' میں نے اس کی ماں سے کہا۔

''تم صحیح کہہ رہے ہو لیکن اس کا دل ہی نہیں لگتا پڑھائی میں۔''

''اماں! آپ اسے ٹیوشن کیوں نہیں لگوا دیتیں۔'' عبدالرحیم نے کہا۔

''بیٹا! میں کل سے لگوا دوں لیکن تمہارے ابا کی شرط ہے کہ وہ صرف خاتون کو اجازت دیں گے کہ وہ اسے گھر پر آکر پڑھائے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں ایسی خاتون ٹیوٹر کہاں سے لاؤں؟'' عبدالرحیم کی ماں نے کہا۔

''میں پڑھانے کے لیے تیار ہوں لیکن فوزیہ کو میرے گھر آنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔''

''میں ابا سے بات کروں گا۔'' عبدالرحیم نے کہا۔

''وہ تیار نہیں ہوں گے۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''بات کرنے میں کیا حرج ہے۔'' عبدالرحیم اپنی بات پر جما رہا۔

عبدالرحیم نے اپنی سی کوشش کر لی لیکن ہوا وہی جو اس کی ماں نے کہا تھا۔ فوزیہ کو اجازت نہیں ملی کہ وہ ہمارے گھر آکر ٹیوشن لے سکے۔

''میں جوان ہوتی ہوئی بیٹی کو کیسے اس گھر جانے دے سکتا ہوں جہاں دو جوان مرد موجود ہوں۔''

ایک سال بعد جب فوزیہ نویں میں تین پرچوں میں فیل ہوگئی تو ان کے گھر میں دوبارہ سے یہ باب کھلا۔ اب کی بار عبدالرحیم کا باپ خود چل کر میرے والد کے پاس آیا۔

''گزشتہ برس میں نے اس بات سے انکار کیا تھا کہ میری بیٹی آپ کے گھر جا کر حماد سے ٹیوشن لے لیکن اب میں چل کر آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ میں اپنی بیٹی آپ کے سپرد کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ اس کی حفاظت اپنی بیٹی کی طرح کریں گے۔'' انہوں نے کہا تھا۔

اس شام ابا اسٹیشن سے آتے ہوئے فوزیہ کو اپنے ساتھ لائے تھے اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ ''تمہیں اسے میٹرک کی تیاری اسی طرح کروانی ہے جس طرح تم نے خود کی تھی۔''

ابا کا حکم تھا، میں کس طرح انکار کر سکتا تھا۔ میں نے اور جواد نے مل کر محنت کی اور خود فوزیہ کو بھی اچھا سبق مل گیا تھا۔ میٹرک میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی اور وہ بھی بھائیوں کی صف میں آگئی۔ عبدالکریم نے بھی فرسٹ ڈویژن لی تھی اور اب فوزیہ کی بھی فرسٹ ڈویژن آئی تھی۔

میں اس وقت گھر پر ہی تھا جب فوزیہ اپنے باپ کے ساتھ مٹھائی کا ٹوکرا لے کر ہمارے گھر آئی تھی۔

''میں تو مایوس ہو چکا تھا لیکن تم نے اس طرح پڑھایا کہ آج میرا سر فخر سے بلند ہوگیا ہے۔'' عبدالرحیم کے والد نے مجھ سے کہا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا، ساری محنت فوزیہ کی اپنی ہے۔'' میں نے کہا لیکن فوزیہ نے میری تردید کی۔

''آپ نے نہیں کہا تھا کہ علاقے میں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے، تم بن جاؤ گی تو نہ جانے کتنی ہی عورتوں کی جان بچ جائے گی جو اب لیڈی ڈاکٹر کے نہ ہونے کی وجہ سے مر جاتی ہیں۔'' فوزیہ نے کہا۔

اسی سال میرا میڈیکل میں داخلہ ہوگیا اور میں کھر شفٹ ہوگیا۔ میرے بھائی نے میری جگہ لے لی۔ سال بھر کی کامیاب ٹیوشن کے بعد فوزیہ کے گھر والوں کو اتنا اعتماد تو ہوگیا تھا کہ اب فوزیہ کو ہمارے گھر بھیجنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ جتنی دیر وہ ٹیوشن پڑھتی، اس کے بعد اماں کے ساتھ کچن میں مصروف ہو جاتی۔

ایک دو بار اس کی والدہ ہمارے یہاں آئیں تو فوزیہ اس وقت میری امی کے ساتھ کچن میں تھی۔ وہ آئیں، انہوں نے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے واپس چلی گئیں۔ ''میرے حصے کا کام بھی آپ نے اپنے سر لے لیا ہے۔'' انہوں نے اماں سے کہا تھا۔

میں کھر میں تھا اور عید قریب آئی تو میں ٹرین میں بیٹھ کر گھر آگیا۔

اس عید پر عبدالرحیم اور عبدالکریم دونوں بھائی دن بھر ہمارے گھر رہے۔ شام میں ان کے والدین بھی ہمارے گھر آگئے۔

والدہ نے میز سجائی اور عبدالرحیم کے والد سے کہا۔ ''شیر خورمہ ضرور چکھیے گا، یہ آپ کی بیٹی نے بنایا ہے۔''

میں ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ بس رک گئی۔ ''بس دس منٹ یہاں رکے گی۔ جس نے اترنا ہے، وہ جلدی سے چائے وغیرہ پی کر دس منٹ میں واپس آجائے۔'' کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا۔

''آپ اتر رہے ہیں؟'' رتنا نے بہت مدھم لہجے میں سوال کیا۔ ''یہ کھونکی ہے نا؟'' اور میں نے گردن ہلا کر جواب دیا کہ ہاں۔ ''مت اتریں۔'' اس نے مدھم آواز میں ہی مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں آگے بڑھ چکا تھا۔

مجھے روکنے والی خود بھی میرے پیچھے آگئی تھی۔ ''یہاں ڈاکو ہوتے ہیں۔'' اس نے بس سے اترتے ہوئے کہا۔

''تم کیسے جانتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''دو سال پہلے یہاں سے میری ایک دوست اغوا ہوئی تھی۔'' اس نے کہا۔

''کس نے اغوا کیا تھا؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''یہ تو کوئی نہیں جانتا لیکن دو دن بعد اس کی لاش یہیں جھاڑیوں سے اس طرح ملی تھی کہ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور اس کی عزت لوٹی جا چکی تھی۔''

''کیا عمر تھی اس کی؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ مجھ سے دو سال بڑی تھی، اس کی عمر اتنی ہی ہوگی جتنی اب میری ہے۔'' اس کا جواب تھا۔

''قاتل پکڑے نہیں گئے؟'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''کون پکڑتا صاحب ان کو۔'' اس نے تقریباً رونے والے انداز میں کہا۔ ''دو چار روز اخبارات میں شور مچا اس کے بعد معاملہ ٹھپ ہوگیا۔''

''پوسٹ مارٹم تو ہوا ہوگا؟'' میں نے ایک نیا سوال کیا۔

''ہوا تھا لیکن.....'' رتنا کا جواب تھا۔

''لیکن کیا؟'' میں سوال کیے بغیر نہ رک سکا۔

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کے ساتھ چار لوگوں نے زیادتی کی تھی۔'' رتنا کا جواب تھا۔

''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ میری سہیلی تھی اور میرے اسکول میں پڑھتی تھی۔'' رتنا نے جواب دیا۔

''میں اس پوسٹ مارٹم رپورٹ کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کی۔

''اس لڑکی کی مسخ شدہ لاش ملی تو اسکول میں ایک ہنگامہ ہوا اور تین دن تک اسکول بند رہا۔''

''تم اپنی معلومات کے ذریعے کی وضاحت نہیں کر سکی ہو۔'' میں نے کہا۔

''لاش برآمد ہوئی تو پولیس حرکت میں آئی۔ کچھ تفتیشی افسران اسکول بھی آئے تھے۔'' اس کا جواب تھا۔ ''ہمارے کچھ ٹیچرز سے تفتیش بھی کی، انہی کے ذریعے مجھ تک اور باقی لوگوں تک معلومات پہنچی تھیں۔'' رتنا جواب دے کر خاموش ہوگئی۔

''واپس چلیں۔'' کچھ دیر بعد رتنا نے کہا۔ میں بھی اپنی ٹانگیں کچھ دیر ٹہل کر سیدھی کر چکا تھا اس لیے فوراً تیار ہوگیا۔

''تم چلو، میں آتا ہوں۔'' اس کے ساتھ بس تک آنے کے بعد میں نے کہا اور وہ بس کے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

بس نے دوسرا ہارن دیا تو میں تیزی سے بس کی جانب بڑھا لیکن ابھی بس میں سوار نہیں ہوا تھا کہ میرا موبائل بجنے لگا۔ ''ہاں جواد بولو۔'' میں نے اسکرین پر اپنے بھائی کا نام دیکھ کر کہا۔

''بھائی! ابھی تک حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔'' جواد نے کہا۔ ''بلکہ طبیعت پہلے سے زیادہ بگڑ گئی ہے۔'' مجھے اچانک ڈپریشن کا احساس ہوا۔ اگر خدانخواستہ فوزیہ کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ میں اتنا ہی سوچ سکا تھا۔ اس سے آگے میری سوچ کے دھارے رک گئے تھے۔

کیا میں بھی حرام موت کو گلے لگا کر اپنی وفا کا ثبوت دوں یا پھر..... میں نے سوچا لیکن سوچ کے دھارے رک گئے تھے۔

میں اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ رتنا پہلے ہی اپنی جگہ پر آچکی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ بس چل پڑی تھی۔ باہر صرف اندھیرا تھا اور میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک برابر سے رتنا کی آواز آئی۔ ''خیریت تو ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

میں کچھ دیر اس کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں لاتعداد سوال تھے۔ ''میں نے کچھ پوچھا ہے؟''

''نہیں، خیریت نہیں ہے۔'' میں نے ہلکی آواز میں جواب دیا۔ ''فوزیہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔''

''مطلب.....؟'' رتنا نے اس انداز میں کہا جیسے وہ کچھ نہ سمجھ سکی ہو۔

''اس نے اپنے باپ کے ایک سانپ سے خود کو ڈسوا لیا تھا۔''

''مطلب یہ کہ ایسا کیا ہوا کہ وہ یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئی؟'' رتنا نے وضاحت مانگی۔

''اس کے پاس شاید اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔'' میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''وہی میں پوچھ رہی ہوں کہ ایسی کیا بات ہوئی کہ وہ یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہوگئی۔''

''انٹر کے بعد فوزیہ نے اسی میڈیکل کالج میں داخلہ لیا جہاں میں پڑھا رہا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''آپ نے وہ محبت اس پر ظاہر کردی جو اب تک آپ چھپائے ہوئے تھے؟'' رتنا کا سوال تھا۔

''اظہارِ محبت پہلے اس کی جانب سے ہوا تھا اور اس میں بھی پانچ برس لگے تھے۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''اتنا عرصہ کیوں لگا؟'' رتنا نے ایک اور سوال کردیا۔

''میڈیکل کی تعلیم اتنی آسان نہیں ہوتی کہ کسی اور جانب توجہ ہو۔'' میں نے کہا تو رتنا نے اثبات میں گردن ہلا دی جیسے وہ مجھ سے متفق ہو۔

''یہ بات تو اپنی جگہ لیکن اس نے اظہار کیا..... کس طرح کیا؟'' رتنا کا سوال تھا۔

''اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا بلکہ یہ بات اس کی میری والدہ سے ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''اب آپ بات بدل رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''میں بدل نہیں رہا، تم بات پوری ہونے سے پہلے سوالات کی بوچھاڑ کردیتی ہو۔''

''اوہ..... اب میں سوال نہیں کروں گی، اپنی بات پوری کرلیں۔'' رتنا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''جب اس کے میڈیکل کالج کا مرحلہ آیا تو اس کے باپ نے بھرپور مخالفت کی لیکن عبدالرحیم اور عبدالکریم نے پہلی بار باپ سے اختلاف کیا۔ ان کے باپ نے اس کالج میں میری موجودگی کو وجہ بتاتے ہوئے مخالفت کی تو اس کی ماں نے بھی بیٹوں کی حمایت کی۔'' ''کیا دوسرے کالجوں میں مرد ٹیچر نہیں ہوں گے؟'' ماں نے شوہر کی دلیل رد کردی تھی۔

''جس کی آپ مخالفت کررہے ہیں اسے ہم سب بچپن سے جانتے ہیں۔ وہ اس طرح کا شخص نہیں ہے جس طرح کا آپ بتا رہے ہیں۔'' عبدالرحیم نے جو اس وقت تک وکیل بن چکا تھا، دلیل دی۔

ان تینوں کے دباؤ میں آکر فوزیہ کو داخلے کی اجازت تو مل گئی لیکن ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہ مل سکی۔ فوزیہ اپنے کسی رشتے دار کے یہاں رہنے لگی تھی۔ جمعے کو اس کے باپ کی کار اسے لینے آتی اور پیر کی صبح وہ پھر سے کالج میں ہوتی۔

اسے چھوڑنے کبھی اس کا باپ بھی ساتھ آتا تھا۔ ایک دو بار وہ میری طرف بھی آیا اور کچھ ہلکی پھلکی گپ شپ کرنے کے بعد چلا گیا۔ کالج میں میری فوزیہ سے ملاقات کم کم ہی ہوتی تھی اور یہ بھی ایک استاد اور شاگرد کے درمیان جو باتیں ہوسکتی تھیں، اس سے زیادہ نہیں ہوتی تھیں۔

پانچ سال مکمل ہونے کے بعد جب فوزیہ کا ہاؤس جاب شروع ہوا تو ہماری ملاقاتیں بڑھ گئیں۔ اسی دوران فوزیہ نے مجھ سے کہا کہ آپ کی والدہ آپ کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی۔

فوزیہ نے اپنے باپ سے ضد کر کے ضلع میں چھوٹا سا کلینک بنوا لیا تھا۔ وہ مکمل ڈاکٹر نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا کلینک چل پڑا تھا۔ اس نے چند بار مجھ سے بھی کہا کہ میں ان دنوں جب میں گھر پر ہوتا ہوں اس کے کلینک آجایا کروں لیکن میں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ معاملہ کسی اور جانب مڑ جائے۔

ایک بار عبدالرحیم اور عبدالکریم دونوں بھائی میرے گھر آئے اور انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا اور بات یہاں تک پہنچی کہ اگر آپ فوزیہ کے کلینک نہیں جاسکتے تو ہم آپ کو الگ کلینک بنوا دیتے ہیں۔ میں نے ان کی بات سنی لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

فوزیہ کا کلینک بہت اچھا چل رہا تھا لیکن وہ فارغ وقت نکال ہی لیتی تھی اور اس فارغ وقت میں وہ میرے گھر پر ہی ہوتی تھی اور میری اماں کے ساتھ اس کی بہت اچھی انڈراسٹینڈنگ ہوچکی تھی۔

اسی دوران جب وہ ایک روز ہمارے گھر میں تھی اور میرا بھائی بھی وہاں موجود تھا، اور اماں نے دوبارہ سے میرے لیے لڑکی دیکھنے کی بات کی تو فوزیہ نے کہا۔ ''آنٹی! آپ کی قریب کی نظر کیا کمزور ہے؟'' فوزیہ کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میری امی خاموش رہیں اور جواد نے کہا۔

''اماں! فوزیہ کچھ کہہ رہی ہے۔''

''میری سمجھ میں پہیلیاں نہیں آتیں جو کچھ کہنا ہے وہ کھل کر کہو۔'' اماں نے کہا تو فوزیہ نے کھل کر بات کردی۔

''جب میں موجود ہوں تو آپ باہر لڑکیاں کیوں دیکھ رہی ہیں؟'' فوزیہ نے کھل کر بات کی تو اماں مشکل میں پڑ گئیں۔

''یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔'' اماں نے کہا۔

''میں سمجھی نہیں کہ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' فوزیہ نے جواب دیا۔

''تمہارا باپ کبھی نہیں مانے گا۔'' اماں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟'' فوزیہ نے کہا۔

''تمہیں وہ سب باتیں تو یاد ہوں گی جو وہ عام معاملات میں رکاوٹیں ڈالتا رہا ہے، تو اتنے بڑے معاملے میں وہ آسانی سے مان لے گا؟''

''میں اپنے بھائیوں سے بات کر چکی ہوں۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟'' جواد نے سوال کیا۔

''وہ پوری طرح میرے ساتھ ہیں۔'' فوزیہ نے جواب میں کہا۔

''لیکن ویٹو پاور تو تمہارے والد کے پاس ہے۔'' جواد نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے۔'' فوزیہ نے تردید کی۔

''جب میرے میڈیکل کالج میں داخلے کا مسئلہ تھا تو ابا نے شدید مخالفت کی تھی لیکن نہ صرف میرا داخلہ ہوا بلکہ آج میں ہاؤس جاب کر رہی ہوں۔'' فوزیہ نے کہا۔

''اس وقت بھی مسئلہ میرے بھائی تھے۔'' جواد نے سوال کیا تو فوزیہ کی گردن اثبات میں ہل گئی۔

''جب وہ میڈیکل کالج میں داخلہ لینے پر مسائل پیدا کر سکتے ہیں تو تمہاری زندگی بھر کے ساتھی چننے کو وہ کس طرح مان سکتے ہیں؟'' جواد نے کہا تو فوزیہ کے چہرے پر تشویش چھا گئی۔

''آپ ایسا کریں کہ میرے بھائیوں سے بات کر لیں۔'' فوزیہ نے رائے دی۔

''بات میں کر لوں گا لیکن ابھی سے بتا دیتا ہوں کہ اس سے فرق نہیں پڑنے والا۔'' جواد نے جواب دیا۔

''عبدالکریم تو آپ کا دوست ہے۔'' فوزیہ نے کہا۔

''ہم برسوں ساتھ پڑھے ہیں۔'' جواد نے کہا۔

''لیکن اس سے کیا فرق پڑے گا۔''

''دوسرا صرف ایک راستہ رہ جاتا ہے۔'' فوزیہ نے کہا۔

''اس کے لیے بھائی کبھی بھی تیار نہیں ہوں گے۔'' جواد نے فوزیہ کے فقرے کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ تیار ہوں بھی تو میں اس کی اجازت کبھی نہیں دے سکتی۔'' اماں نے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بھی نہیں چاہتیں کہ میں بہو بن کر اس گھر میں آؤں؟'' فوزیہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

''کورٹ میرج کے بعد جو دشمنی ہوتی ہے اور جو نسلوں تک چلتی ہے، اماں اس سے بچنے کی بات کر رہی ہیں۔'' اماں کے بجائے جواد نے جواب دیا۔

''میں پروا نہیں کرتی۔'' فوزیہ نے کہا۔

''لیکن میں کرتی ہوں۔'' اماں کا جواب تھا۔ ''میں اپنے بیٹے کی جان کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔'' اماں نے اپنی بات مکمل کی تو فوزیہ کے چہرے پر تشویش کی لہر اور گہری ہو گئی۔

''آپ ابا سے بات کر لیں پھر ہم سب مل کر کسی نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔'' جواد نے مشورہ دیا۔

''یہ ٹھیک ہے۔'' اماں اس پر تیار ہو گئیں اور فوزیہ کے چہرے کی تشویش کچھ کم ہو گئی۔

شام میں ابا آئے تو اماں نے ان سے بات کی۔ ابا نے اس معاملے کو کسی اور طرح سے دیکھا۔

''وہ سپیرا کس طرح ہمارے بیٹے کو مسترد کر سکتا ہے؟'' ابا نے کہا۔ ''مگر سب سے پہلے اپنے بیٹے کی رضامندی تو معلوم کر لو۔'' انہوں نے مشورہ دیا۔

''جب وہ آئے گا تو میں بات کر لوں گی۔'' اماں نے اتنا کہا اور وہاں سے اٹھ آئیں۔

میں ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ موبائل کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو جواد کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو نہیں کی اور بیل بجنے دی۔ کسی بری خبر کے لیے میں ذہنی طور پر بالکل بھی تیار نہیں تھا۔

رتنا نے میری توجہ اس جانب دلائی کہ بیل بجے جا رہی ہے تو میں نے اس سے بھی یہی کہا کہ کسی بری خبر کے لیے تیار نہیں ہوں، تو وہ مسکرا دی۔

''اللہ پر یقین رکھیں، سب خیریت ہو گی۔'' رتنا نے کہا تو میں اسے گھور کر رہ گیا۔

''کیا کہنا چاہ رہی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔'' رتنا کا جواب تھا۔

''تم نے اپنا دھرم تو تبدیل نہیں کر لیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''کچھ چیزیں مذہب سے ہٹ کر بھی ہوتی ہیں۔'' اس کا جواب تھا۔ ''ہم مسلمان نہ ہونے کے باوجود انشاء اللہ، ماشاء اللہ اپنی روزمرہ کی زبان میں استعمال کرتے ہیں۔''

اتنے میں موبائل کی بیل ہوئی تو میں نے فون اٹھا لیا۔

''کیا خبر ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ایک خبر اٹھی ہے اور ایک بری خبر ہے۔'' جواد نے جواب دیا۔

''پہلے بری خبر سناؤ۔'' میں نے کہا۔
''بری خبر یہ ہے کہ فوزیہ کو وینٹی لیٹر پر شفٹ کر دیا گیا ہے۔'' اس نے کہا۔
''اور اچھی خبر؟'' میں نے سوال کیا۔
''اچھی خبر یہ ہے کہ فوزیہ کا باپ پہنچ گیا ہے اور وہ ابا کے ساتھ دیر سے بیٹھا گفتگو کر رہا ہے۔'' جواد نے بتایا۔
''اچھی خبر تو جب ہوتی جب وہ اپنے رویّے کی معافی مانگ لیتا۔'' میں نے کہا۔
''میں جب اس کے قریب پہنچا اور ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی تو وہ معافی بھی مانگ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا میں اپنے رویّے پر بہت شرمندہ ہوں۔''
''اب عقل آئی بیٹی کو اس حالت تک پہنچا کر۔'' میں نے کہا۔
''بھائی بس یہ دعا کرو کہ بھابی وینٹی لیٹر سے واپس آ جائیں۔'' اس نے کہا۔
''میں بھی دعا کر رہی ہوں۔'' رتنا نے کہا تو دوسری جانب جواد بھی بری طرح چونکا۔
''یہ آواز کس کی تھی؟'' اس نے سوال کیا۔
''یہ رتنا تھی، یہیں بس میں ملاقات ہوئی تھی۔ بہت پیاری بچی ہے۔'' میں نے رتنا کا تعارف کروایا۔
''تو آپ نے بہن کی کمی پوری کر لی؟'' اس نے کہا۔
''لالہ! آپ کے بھائی بہت فکر مند ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ انشاء اللہ آپ کی محبت کو کچھ نہیں ہو گا۔'' رتنا نے جواد سے براہِ راست بات کی۔
''بھائی نے آپ کا نام رتنا بتایا تھا۔'' جواد کے لہجے میں حیرت تھی۔
''ہم جس ماحول میں رہے ہیں وہاں یہ عام بول چال کے لفظ ہیں۔'' رتنا نے اپنی بات دہرائی۔
''بھائی کو فون دیں۔'' اس نے کہا۔ ''بھائی کہاں پہنچ گئے؟''
''اوباڑو کراس کر چکے۔ لاری اڈے پہنچ جانا۔'' میں نے گفتگو ختم کرنے سے پہلے اسے یاد دلایا۔
''عبدالرحیم اور عبدالکریم ایک گھنٹے سے وہیں ہیں۔'' اس نے بتایا۔
''بس کچھ ہی دیر کی بات ہے، ہم پہنچ رہے ہیں۔'' میں نے جواب دیا اور لائن کاٹ دی۔
''بہت پیار کرتا ہے آپ کا بھائی آپ سے۔'' رتنا نے کہا۔
''بہت سے بھی زیادہ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم دو بھائی ہی تو ہیں۔''
''بہن کی کمی تو محسوس ہوتی ہو گی؟'' رتنا نے اچانک سوال کیا۔
''ہوتی تھی لیکن آج کے بعد نہیں ہو گی۔'' میں نے جواب دیا تو نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''آپ نے بھی میرے بھائی کی کمی دور کر دی۔'' رتنا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''جب ہمارے گھر چلو گی تو اماں تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔'' میں نے کہا۔
''نہیں لالہ! میں آپ کے گھر نہیں جا سکوں گی۔'' رتنا نے کہا۔
''کیوں؟'' میں اس کی بات سمجھ نہیں سکا۔
''جس طرح آپ کے لوگ منتظر ہوں گے، اسی طرح مجھے بھی لینے کوئی آیا ہو گا۔'' رتنا کا جواب تھا۔
''اسپتال تو چلو گی؟'' میں نے اصرار کیا۔
''شاید نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''اس سے تو مل لینا جس کے لیے مجھے حوصلہ دیتی رہی ہو اور دعائیں کرتی رہی ہو۔''
''دعائیں تو میں ہر وقت کرتی رہوں گی۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔
''دعائیں بھی کرتی رہنا لیکن ایک بار اس سے مل تو لو۔'' میں نے اصرار کیا۔
''میں نے کہا نا کہ میں جہاں بھی ہوں گی، آپ دونوں کے لیے دعا کرتی رہوں گی۔'' اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں سمجھا کہ یہ لہجہ ان آنسوؤں کی وجہ سے ہے جو اس کی آنکھوں میں آ چکے تھے۔
''اب زیادہ وقت نہیں ہے، اب تم جلدی سے وہ کہانی مکمل کر لو جو ادھوری رہ گئی تھی۔''
''میں کہاں پر تھی اپنی کہانی سناتے ہوئے۔'' اس نے سوال کیا۔
''تم اس بچی کا ذکر کر رہی تھیں جو تمہارے اسکول میں تھی اور جسے اغوا کر لیا گیا تھا اور پھر اس کی لاش ملی تھی کہ اس کے کپڑے پھاڑ دیے گئے تھے جس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں یہ آیا تھا کہ چار لوگوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''اور اس کے قاتل پکڑے نہیں جا سکے تھے۔'' اس کے چہرے پر اس طرح کے تاثرات آئے جیسے اسے سب یاد آ گیا ہو۔
''قاتل اس لیے گرفتار نہیں ہو سکے کہ پولیس نے

رشوت لے لی تھی۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''ایک ایمان دار انویسٹی گیشن افسر نے اس کیس کا پیچھا نہیں چھوڑا، باوجود اس کے کہ اس پر بہت زیادہ دباؤ تھا'' رتنا نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''اس آئی او نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ وہ لڑکی کس کے ساتھ گئی تھی۔'' رتنا نے یہاں تک کہا اور رک گئی، پھر مزید کہا۔

''اس نے دو بندے گرفتار بھی کیے لیکن اس کی تمام محنت اس وقت ضائع ہوگئی جب بس کمپنی کا مالک بیچ میں آ گیا۔''

''یہ بس مالک بیچ میں کہاں سے آ گیا؟'' میں سوال کیے بنا نہیں رہ سکا۔

''مجھ سے تو آپ نے کہا تھا کہ میں بیچ میں ٹوک دیتی ہوں اور اب آپ کیا کر رہے ہیں؟'' رتنا نے الٹا سوال کیا۔

''آئی او کی تحقیق کے مطابق اس لڑکی کو لے جانے والا اس بس کا کنڈیکٹر تھا۔'' رتنا اتنا کہہ کر رک گئی تھی۔

''دو افراد جو گرفتار ہوئے تھے ان میں سے ایک وہ کنڈیکٹر ہوگا۔'' میں نے ایک اور سوال کر دیا۔

''آپ صحیح سمجھے۔ وہ آئی او جس نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا تھا، مضبوط گواہ لایا تھا کہ اس کا اچانک قتل ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی وہ کیس سی کلاس ہوگیا۔'' رتنا نے کہا۔

''کیس سی کلاس تو عدالت نے کیا ہوگا؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لاش پر جو شواہد تھے جن کی بنا پر پوسٹ مارٹم رپورٹ میں درج تھا کہ چار لوگوں نے زیادتی کی ہے ان میں سے اگر دو ہاتھ آ گئے تھے تو ان کا ڈی این اے کروایا جاتا اور ان سے باقی ساتھیوں کے بارے میں معلوم کیا جاتا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا بلکہ آئی او قتل ہوا اور گواہ توڑ لیے گئے..... کچھ رشوت دے کر اور کچھ کو دھمکیاں دے کر۔'' رتنا نے کہا۔

''تو مرنے والی کے لواحقین نے کچھ نہیں کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس کا باپ ایک مالی تھا۔ اب مالی کی کیا اوقات ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک کے آگے؟'' رتنا نے مایوس کن لہجے میں کہا۔

''وہ اپیل تو کر سکتے تھے۔'' میں نے سوال کیا۔

''وکیل کے پیسے ہوتے تو اپیل کرتے نا۔'' رتنا نے کہا۔

..... ''ٹرانسپورٹ کمپنی نے اتنے بڑے وکیل کیے تھے کہ عام وکیل تو ان کے سامنے پیش ہونے سے گھبراتا تھا جو ایک دو تیار ہوئے وہ فیس ہی اتنی مانگ رہے تھے کہ مالی اپنے آپ کو بیچ کر بھی ان کی ڈیمانڈ پوری نہیں کر سکتا تھا۔'' رتنا کی بات ختم ہوئی تو میں اس ناانصافی کے بارے میں سوچنے لگا۔

میرے کانوں میں اس معصوم کی چیخیں گونج رہی تھیں کہ جب اس پر تشدد ہوا ہوگا تو وہ یقینی طور پر چلائی ہوگی۔

''کورٹ میں مقدمہ سی کلاس ہوگیا تھا تو اخبارات کے ذریعے تو معاملہ اٹھایا جا سکتا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس نے کوشش تو کی ہوگی لیکن اس ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ اسی نے ان اخبارات کو بھی خرید لیا تھا جنہوں نے ابتدا میں اس معاملے کی کوریج کی تھی۔ اب انہی اخبارات میں اس کے خلاف خبریں چھپنے لگیں کہ اس طرح کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس بوڑھے مالی پر بھی کیس بنا دیا گیا کہ اس نے یہ تمام ڈراما کیا اور پھر جھوٹے گواہوں کی مدد سے اس لڑکی کے باپ کو سات سال کی سزا بھی دلوا دی۔''

''اس فیملی میں اب کوئی بچا بھی ہے؟'' میں نے رتنا سے سوال کیا۔

''شاید نہیں۔'' رتنا کا جواب تھا۔

ہم ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ میرے موبائل کی بیل ایک بار پھر بجنے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں فون اٹھاتا، رتنا نے فون اٹھا لیا۔

''ہاں لالہ! کیا خبر ہے؟'' رتنا نے سوال کیا تو میں سمجھ گیا کہ کس کا فون ہو سکتا ہے۔

''خبر ایسی ہے کہ ہم سب خوشی سے ناچ رہے ہیں۔'' میں نے اپنے بھائی کی آواز سنی، رتنا نے مائیک آن کر دیا تھا۔

''کیوں! ایسی کیا بات ہوئی؟'' رتنا کی آواز میں بھی خوشی تھی۔

''جس مریض کو ایک گھنٹے پہلے ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اب اس کی زندگی کی کوئی امید نہیں ہے، اسے ہی ایک گھنٹے بعد کہہ رہے ہیں کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے۔'' بھائی کی آواز خوشی سے لبریز تھی۔

''معجزہ ہوا ہے دیدی۔'' بھائی نے بات آگے بڑھائی تو میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

''میں نے کہا تھا نا کہ مایوسی کفر ہے۔'' رتنا مجھ سے مخاطب ہوئی لیکن مجھ میں کہنے یا سننے کی طاقت ہی نہیں تھی۔

''بھائی کہاں ہیں؟'' میرے کانوں میں ایک بار پھر جواد کی آواز آئی۔

''میرے برابر میں بیٹھے ہیں اور تمہاری آواز سن رہے ہیں۔'' رتنا نے کہا۔

''بھائی! کہاں تک پہنچے؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''پنجاب کی حدود میں داخل ہو چکے ہیں۔'' رتنا نے فون میری جانب بڑھایا تو میں نے کہا۔ ''گوٹ سبزل کراس کیے دس منٹ ہو چکے ہیں۔'' میں نے بتایا۔

''تب تو سمجھو کہ پہنچ ہی گئے ہو۔'' جواد نے جواب میں کہا۔

''بس چند منٹ اور۔''

''میں بھی اب اسپتال سے نکلنے والا ہوں۔ فوزیہ کے والد بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ میں ان کی گاڑی میں ہی لاری اڈے پہنچ رہا ہوں۔'' جواد نے کہا۔ ''وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ حماد کس بس سروس سے آرہا ہے تو میں نے کہا میں نہیں جانتا۔ دس بجے وہ سکھر سے چلے ہیں اس پر انہوں نے کہا کہ دس بجے تو ہماری ٹرانسپورٹ کی بس آتی ہے۔''

''ان کی کوئی ٹرانسپورٹ کمپنی بھی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''پرانی بات ہو گئی اب تو..... فوزیہ کے سکھر میں داخلہ لینے کے فوراً بعد اس ٹرانسپورٹ کمپنی کا آغاز ہوا تھا۔'' جواد نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ ''حیرت ہے آپ نہیں جانتے۔''

اس سے بات ختم ہوئی تو میں نے اپنی برابر کی سیٹ پر دیکھا لیکن رتنا وہاں نہیں تھی۔ میں نے ڈرائیور اور کنڈیکٹر سے بھی معلوم کیا لیکن دونوں نے ہی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ''سر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ سکھر سے یہاں تک آپ اکیلے ہی اس سیٹ پر آئے ہیں۔'' کنڈیکٹر نے تو مجھے بالکل جھٹلا دیا تھا۔

''یار! پنوعاقل پر جب ناشتے سامنے آئی تھیں اور تم نے گاڑی روکی تھی، تب وہ سوار ہوئی تھی۔'' میں نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

''سر! آپ نے کوئی خواب دیکھا ہوگا۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''پنوعاقل پر گاڑی سامنے آئی تھیں اور میں نے بریک بھی مارے تھے لیکن بس میں کوئی سوار نہیں ہوا تھا۔ میں نے ایک دو مسافروں سے بھی تصدیق چاہی لیکن وہ سب بھی کنڈیکٹر اور ڈرائیور کا ساتھ دیتے رہے۔ بس صادق آباد پہنچ گئی اور میں نے بس کے اندر سے ہی عبدالرحیم اور عبدالکریم کو دیکھ لیا تھا۔ ان سے کچھ دور میرا بھائی اور فوزیہ کے والد کھڑے تھے۔ میں بھی بس سے اپنا سامان لے کر اترا اور بھائی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ فوزیہ کے والد نے ایک چیخ ماری۔ میں حیران تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر چیخے کیوں تھے لیکن فوری طور پر مجھے احساس ہوا کہ وہ مجھے دیکھ کر نہیں چیخے تھے کیونکہ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑ لیا تھا۔ اس طرح کہ جیسے کوئی ان کا گلا دبا رہا ہو، ساتھ ہی وہ چیخ رہے تھے۔ ''مجھے بچا لو..... مجھے بچالو، یہ مجھے مار دے گی۔''

عبدالرحیم اور عبدالکریم باپ کو بچانے آگے بڑھے لیکن وہاں کوئی ہوتا تو وہ بچاتے۔ چند منٹ بعد اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور اس نے وہاں درجنوں لوگوں کی موجودگی میں جان دے دی۔

عبدالرحیم اور عبدالکریم کے چہرے تاریک ہو گئے۔ انہیں چند منٹ پہلے بہن کی جان بچ جانے کی خوشی تھی لیکن اب ان کے باپ کی لاش ان کے سامنے پڑی تھی۔ وہاں موجود ہر شخص خاموش تھا کہ اچانک میرے کانوں میں رتنا کی آواز آئی۔ ''یہی شخص ہے جس نے میرے قتل کی تمام شہادتوں کو مسخ کر کے میرے قتل کے کیس کو سی کلاس کروایا تھا۔ آج میں نے اپنا بدلہ لے لیا۔''

میرے اور فوزیہ کے راستے کی پہلی اور آخری دیوار گر گئی تھی۔ اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ ہمارا نکاح بہت سادگی سے ہوا۔ فوزیہ کی ماں نے اپنی پوری جائداد فوزیہ کے جہیز میں دے دی۔ میں نے اسے فروخت کر کے ایک اسپتال بنا لیا جس میں غریبوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ فوزیہ بھی اسی اسپتال میں کام کرتی ہے۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ بڑی بیٹی اور چھوٹا بیٹا..... مگر نہ جانے کیوں میری بیٹی جب بھی اپنے بھائی کو مخاطب کرتی ہے یا کچھ معلوم کرنا ہوتا ہے تو وہ اسے لالہ کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔

ٹرانسپورٹ کمپنی میں نے بند نہیں کی لیکن اس کا نام تبدیل کر کے رتنا ٹرانسپورٹ رکھ دیا ہے اور عبدالکریم کو اس کا جنرل منیجر بنا دیا ہے۔

عبدالرحیم سے بات کر کے میں نے رتنا کے والد کی سزا ختم کروا دی۔ اب وہ جیل سے آنے کے بعد ہمارے ساتھ ہی ہیں اور ہمارے لان کے انچارج بھی ہیں۔ ہمارے لان میں جو طرح طرح کے پھول کھلے رہتے ہیں، یہ ان کی ہی مہربانی ہے۔ میرے بچے انہیں نانا ابو کہتے ہیں۔

فوزیہ ہر جمعرات کو قرآن خوانی کروا کر اپنے والد کی روح کو بخشواتی ہے اور میں بھی اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرتا۔

⌘⌘⌘

ساتواں حصہ

ساشا

عمر عبداللہ

دور چاہے جو بھی ہو معاشرتی ناسور ہر
عہد میں متحرک رہے ہیں۔ وہ جو دانا باپ کا
بہادر بیٹا تھا، سرداری اسے وراثت میں ملی
تھی اور بچپن کی خوب صورت یادیں اس کا
سرمایہ تھیں... کمسنی میں ساتھ کھیلتے کھیلتے
اب جوانی میں بھی زندگی بھر ساتھ رہنے کے خواب
دیکھنے لگے تھے۔ اگرچہ محلاتی سازشوں سے وہ بے
خبر نہ تھا، اس کے باپ نے اس کے "آگاہ" رہنے کی صلاحیت
کو اتنا نکھارا تھا کہ اس کی حسیات جانوروں سے زیادہ
چوکنا ہو گئی تھیں۔ کہیں رنگِ وفا سے کھیلتا ہوا اور کہیں
زہرِ جفا سے نبرد آزما... زندگی کے نشیب و فراز میں الجھی
رنگین و سنگین لمحات کی داستان... ایک ایسے سادہ دل
نوجوان کا فسانۂ حیات جس کے لہو میں محبت کی خوشبو اور
آنکھوں میں سنہرے خواب تھے جن کی حفاظت کے لیے اسے ایک طویل
مگر اذیت بھرا سفر درپیش تھا۔

طاقت کے گھمنڈ اور غرور کے محلوں کو مسمار کرتے ہوئے آگے بڑھنے والے ایک شجاع کے عزم کا سنسنی خیز سلسلہ

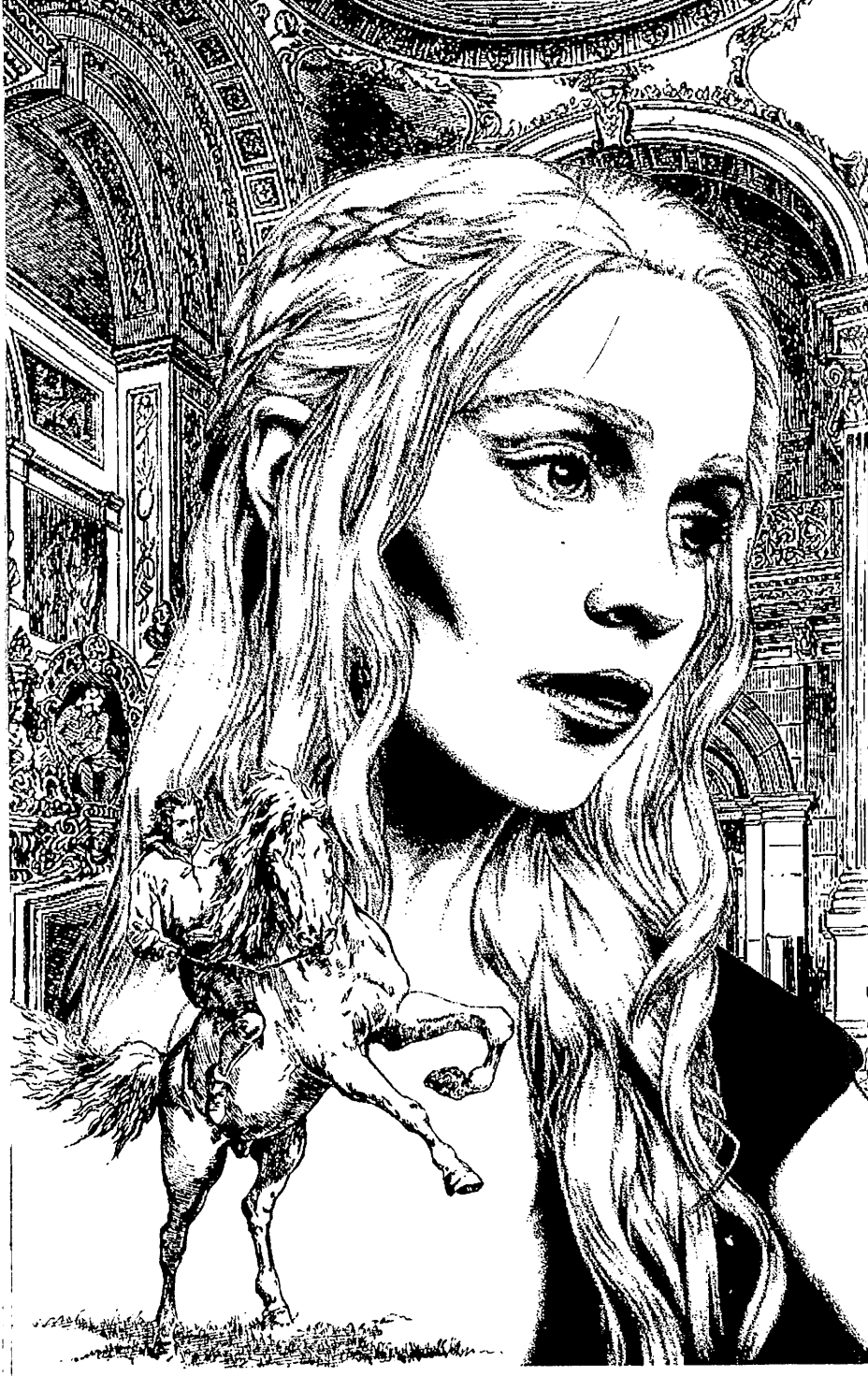

''مجھے افسوس ہے میرے دوست کہ رات تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو یہاں تکلیف سے دو چار ہونا پڑا۔'' وہ ادھیڑ عمر سردار مراد کے مقابل بیٹھا تھا اور سردار چہرے پر ذرا شرمساری کے تاثرات لیے اس سے مخاطب تھا۔

''وہ ایک خطرناک صورت حال تھی محترم سردار! اگر کچھ نامعلوم لوگوں نے اس موقع پر مدد نہیں کی ہوتی تو اس وقت میرے پاس پچھتاوے اور شرمندگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

''میں جانتا ہوں۔'' سردار نے اس کے گمبھیر تاثرات دیکھے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں اس سازش کا سراڈھونڈنے کے لیے اپنے طور پر تحقیقات بھی کروا رہا ہوں، مجرم ہاتھ آجائیں تو انہیں بدترین سزا دی جائے گی۔''

''اس طرح کے معاملات میں عام طور پر ذمے داروں کا تعین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اصل مجرم تک پہنچنے میں خاصا وقت لگ جاتا ہے۔ ہم مسافر ہیں، ہمیں کسی کو سزا و جزا دلوانے سے زیادہ اپنا سفر جاری رکھنے کی فکر ہے۔ آج کا دن تو میرے ساتھی سفر کرنے کے لائق نہیں ہیں البتہ کل ہم صبح سویرے یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔'' داؤد نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

''شاید تم ایک ایسی جگہ رکنے میں متذبذب ہو جہاں تمہیں اپنے تحفظ سے متعلق خدشات لاحق ہو چکے ہیں۔'' سردار مضطرب ہوا۔

''ہمیں ہر صورت یہاں سے جانا ہی تھا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہی بہتر ہے کہ ہم جلد از جلد روانہ ہو جائیں۔''

''مجھے خدشہ ہے کہ تمہیں راستے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور وہ لوگ اتنی آسانی سے تمہارے قافلے کو یہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں دیں گے لیکن جو کچھ کل رات ہوا، اس کے بعد میں تمہیں روکنے پر اصرار کرنے کا حق کھو بیٹھا ہوں۔'' سردار اداس نظر آنے لگا۔

''آپ شرمسار نہ ہوں۔ زندگی میں اکثر ہی انسان کو غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ نے اپنے طور پر ہمارے لیے مناسب انتظامات کیے تھے لیکن شاید آپ اپنی صفوں میں شامل سازشی عناصر کا سدباب نہیں کر سکتے۔'' داؤد نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''میں ان سازشی عناصر کو ضرور تلاش کروں گا جن کی وجہ سے مجھے اس قدر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔'' سردار کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔

''اپنی صفوں میں شامل ان کالی بھیڑوں کو تلاش کرنا خود آپ کے حق میں مناسب ہوگا۔ بہرحال، اب آپ مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے کوچ کے حوالے سے اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات بھی دینی ہیں۔'' داؤد وہاں سے اٹھنے کے لیے پر تولنے لگا۔ سردار مراد سے اس ملاقات میں وہ یہ اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا کہ سردار کا اس سازش سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ بظاہر تو اسے سردار بے گناہ ہی معلوم ہوتا تھا۔

''میں شرمندہ ہوں کہ میں تم لوگوں کی میزبانی کا حق پورا نہ کر سکا لیکن میری خواہش ہے کہ جانے سے قبل تم لوگوں کے لیے ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کر سکوں۔ اگر تم اور دیگر اہلِ قافلہ آج شام میری قیام گاہ پر اس ضیافت کے لیے جمع ہو جائیں تو میں دلی مسرت محسوس کروں گا۔'' سردار نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے درخواست کی۔

''آپ خوامخواہ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ دعوت کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے جبکہ ہم مستقل ہی آپ کی میزبانی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔''

''تکلف نہیں بس اسے میرے دل کی خوشی سمجھو۔'' سردار نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہلکا سا دبا ڈالا۔

''اگر اس میں آپ کی خوشی ہے تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔ شام تک انشاء اللہ میں اور میرے ساتھی حاضر ہو جائیں گے۔'' اس نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی اور پھر سردار سے رخصت لے کر اپنے ساتھیوں کے درمیان لوٹ گیا۔

''سب کو اطلاع دے دو کہ آج شام سردار مراد کی قیام گاہ کے سامنے دعوت میں شرکت کے لیے جمع ہو جائیں۔'' اپنے قریبی ساتھیوں کے درمیان بیٹھ کر اس نے انہیں سردار سے ملاقات کا احوال سنانے کے بعد آخر میں لطیف کو حکم دیا۔ لطیف فوراً ہی تعمیلِ حکم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ کچھ مضطرب نظر آتے ہیں۔'' عبدالمالک جو اب کافی حد تک صحت یاب ہو چکا تھا، اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''مجھ پر بھاری ذمے داری کا بوجھ ہے عبدالمالک! میں اپنے قافلے کو بہ حفاظت کسی مقام تک پہنچانے کی خواہش رکھتا ہوں لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ روانہ ہونے کے بعد ہمیں کس قسم کے حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔'' وہ عبدالمالک کے سامنے اپنی پریشانی چھپانے کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔

''آپ بے فکر رہیں۔ یہ بازو ناتاریوں کی وحشت اور بے رحمی سے نمٹ کر آئے ہیں اور ابھی ان میں اتنی طاقت

ہے کہ تاتاریوں کے مقابلے میں ان کم خطرناک دشمنوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکیں۔'' عبدالمالک پُرعزم تھا۔

''مجھے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بازوؤں کی طاقت پر کوئی شک نہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ ہر لڑائی اپنا خراج وصول کرتی ہے اور اب میں اس خانماں برباد قافلے کا مزید نقصان نہیں چاہتا۔''

''اللہ سے اچھی امید رکھیے۔ اس رب العزت نے ہمیں اتنے مشکل حالات سے نکال کر ابھی تک زندہ رکھا ہوا ہے تو آگے بھی انشاء اللہ ہمیں اس کی مدد حاصل رہے گی۔'' عبدالمالک نے اسے تسلی دی۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں اپنے رب کی مہربانی پر یقین رکھتے ہوئے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنا چاہیے۔ چلو آؤ، تم اور میں مل کر سوچتے ہیں کہ دستیاب وسائل اور افرادی قوت کے ساتھ ہم اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کر سکتے ہیں۔'' وہ مایوسی کو ذہن سے جھٹک کر ایک نئے عزم سے عبدالمالک کے ساتھ مل کر آنے والے کل کی منصوبہ بندی کرنے لگا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے راہنما بوڑھے حاطب کو بھی گفتگو میں شامل کر لیا۔ اس مشاورت اور دیگر معاملات کا جائزہ لینے میں شام تیزی سے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ سردار مراد نے اپنے ایک نمائندے کو یاد دہانی کے لیے بھجوا دیا تو وہ اہلِ قافلہ کے ساتھ دعوت کے مقام پر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

''سب خواتین ساتھ جا رہی ہیں یا نہیں؟ سردار نے مجھے باور کروایا تھا کہ خواتین کے لیے پردے کا خصوصی اہتمام ہے اس لیے کسی کو شرکت کرنے میں تردد نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ثریا سے دریافت کیا۔

''جی سب ہی موجود ہیں۔ صرف خالہ منیرا اپنی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے یہیں رکے رہنے پر مصر ہیں۔ انہوں نے اپنی پوتی کو بھی اپنے پاس ہی روک لیا ہے۔ کہہ رہی تھیں میرے پاس پڑی آرام سے سوتی رہے گی، کیا ضرورت پڑی ہے کہ طیبہ خوامخواہ گود میں لادے لادے پھرے۔'' ثریا نے ہنس کر بتایا۔

''تم لوگوں نے خالہ کے کھانے پینے کا کوئی انتظام کیا یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہماری واپسی تک یونہی بھوکی پڑی رہیں۔'' ہر ایک کا خیال رکھنے کے عادی داؤد نے فوراً استفسار کیا۔

''جی..... طیبہ نے انہیں کچھ پھل کھلا کر دودھ پلا دیا ہے اور اس وقت وہ سکون سے اپنے بستر پر آرام فرما رہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر اب چلتے ہیں۔'' اس کے جواب سے مطمئن ہو کر داؤد نے عندیہ دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ ضیافت کے مقام پر پہنچ چکے تھے۔ خواتین کو سردار کے گھر کے اندر پہنچا دیا گیا۔

دعوت کا بہترین انتظام کیا گیا تھا۔ بھنے ہوئے گوشت اور خمیری روٹیوں کی مہک دور، دور تک پھیل رہی تھی۔ شیریں اور فرحت بخش مشروبات کا الگ انتظام تھا۔ اہلِ قافلہ ساری پریشانیاں بھول بھال کر اس پُرتکلف دعوت سے لطف اندوز ہونے لگے۔

''میں کوشش کر رہا ہوں کہ اپنے لوگوں میں سے چند سمجھ دار لوگوں کو قابوس کے پاس بھجوا کر اسے مذاکرات پر راضی کر سکوں۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جانے پر تم لوگوں کو اس علاقے سے نکلنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔'' مشروب کا پیالہ ہونٹوں سے جدا کرتے ہوئے سردار مراد نے اہم معاملے پر گفتگو چھیڑی۔

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی کوشش سودمند ثابت ہو سکے گی۔ ہم پر سنگین الزامات ہیں اور مجھے نہیں لگتا کہ قابوس ہم سے کسی قسم کی نرمی برتے گا۔'' داؤد زیادہ پُرامید نہیں تھا۔

''الزامات کو رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں خود گواہی دوں گا کہ مفرور راہبائیں تمہارے قافلے میں شامل نہیں ہیں اور جو کچھ خانقاہ میں ہوا، اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں اب آپ کی گواہی بھی رائگاں جائے گی۔ کل شب بے شک وہ راہباؤں کو یہاں سے اغوا کر کے لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں لیکن انہیں یہ یقین دہانی تو ہو گئی ہے کہ راہبائیں قافلے میں موجود ہیں۔ اس یقین کے بعد آپ کی گواہی ان کے غصے کو مزید مہمیز کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکے گی۔'' اس نے دلیل سے سردار کی بات کو رد کیا۔

''پتا نہیں وہ کون تھے جنہوں نے راہباؤں کو اغوا کرنے کی سازش تیار کی۔ میں قابوس کے مزاج سے آشنا ہوں۔ وہ مشتعل مزاج آدمی ہے اور سازشوں اور منصوبہ بندی سے زیادہ براہِ راست چڑھائی پر یقین رکھتا ہے۔ میرا دل نہیں مانتا کہ کل رات جو کچھ ہوا اس میں قابوس کا کوئی ہاتھ تھا۔'' سردار متذبذب تھا۔

''آپ پہلے بھی سازش کا ذکر کر چکے ہیں لیکن میری سمجھ سے باہر ہے کہ قابوس نہیں تو اور کون ہو سکتا ہے جسے ان راہباؤں سے دلچسپی ہے یا وہ ہم سے دشمنی رکھتا ہے۔'' داؤد

نے اپنے لہجے کو نرم ہی رکھا لیکن اندر سے وہ قدرے جھنجلا گیا تھا۔ ایک طرف اسے بہت سے مصائب کا سامنا تھا اور دوسری طرف پتا نہیں کیوں سردار اس کی توجہ دوسری سمت میں مرکوز کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ شاید اپنی الجھنوں میں گھرا میں تم لوگوں کے لیے بھی ذہنی کوفت کا باعث بن رہا ہوں۔'' سردار کے چہرے کے تاثرات سے شرمندگی جھلکنے لگی۔

''آپ دل پر نہ لیجیے۔ ذہنی الجھنیں دونوں طرف ہیں جن کی وجہ سے مزاج بھی متاثر ہو رہا ہے لیکن ہم آپ کی میزبانی پر دل سے شکر گزار ہیں۔'' حاطب نے گفتگو میں دخل دے کر سردار کی دلجوئی کی کوشش کی۔ سردار اخلاقاً ذرا سا مسکرایا۔ ابھی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہوئی تھی کہ ایک شخص گھبرایا ہوا وہاں آیا۔ یہ وہی تھا جس سے گزشتہ شب بھی داؤد کا واسطہ پڑا تھا۔

''غضب ہو گیا سردار! قافلے والوں کی رہائش گاہوں میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔'' اس کی دی اطلاع پر سردار سمیت سب ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیا کہہ رہے ہو کبیر! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' سب سے پہلے سردار کی زبان سے ہی الفاظ نکلے۔

''کچھ نہیں معلوم سردار! ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہم لوگوں نے اس طرف آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے دیکھے ہیں۔ میں نے چند آدمیوں کو آگ بجھانے کے لیے روانہ کیا اور خود آپ کو اطلاع دینے کے لیے دوڑا آیا۔'' کبیر، سردار کو بتا رہا تھا جبکہ داؤد اور اس کے ساتھی اس کی پوری بات سنے بغیر ہی وہاں سے دوڑ لگا چکے تھے۔

آگ کی لپٹوں کو دور سے ہی دیکھ کر داؤد کا دل حلق میں آ گیا۔ آگ خواتین کو فراہم کی گئی رہائش گاہوں میں لگی ہوئی تھی اور اسے اچھی طرح یاد تھا کہ خالہ منیرا اور ان کی نومولود پوتی دعوت کے شرکاء میں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ ایک موہوم سی امید پر اس نے اپنے دوڑتے قدموں کی رفتار مزید بڑھا دی لیکن قریب سے دیکھنے پر منظر مزید دہشت ناک تھا۔ آگ اتنی شدید تھی کہ کسی ذی روح کا اس سے بچ نکلنا ناممکن تھا۔ وہ اپنی بے پناہ جرأت مندی کے باوجود اس بھڑکتی آگ میں گھسنے کا فیصلہ نہیں کر سکا، اس لیے نہیں کہ اسے خود کو اس آگ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا بلکہ اس لیے کہ اسے اندازہ تھا کہ آگ نے اب تک سب کچھ ختم کر دیا ہوگا۔ وہ کسی بارے ہوئے جواری کی طرح اس پھنکارتی آگ کے سامنے کھڑا ان لوگوں کو دیکھتا رہا جو ہاتھوں میں بالٹیاں اور ڈول اٹھائے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پانی پھینکنے پر آگ کے وہ شعلے بجھتے نہیں تھے بلکہ کچھ اور بھی اس طرح بھڑکتے تھے جیسے کوئی عفریت غضب ناک ہو کر پھنکاریں مار رہا ہو۔

''یہ آگ لگی نہیں لگائی گئی ہے۔ میں فضا میں مٹی کے تیل کی بو واضح طور پر سونگھ سکتا ہوں۔'' عبدالمالک جو پتا نہیں کب اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا، آنچ دیتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یہ آگ صرف ان در و دیوار میں نہیں، میرے دل میں بھی بھڑک رہی ہے عبدالمالک اور اس وقت تک نہیں بجھے گی جب تک اس ظلم کے ذمے داروں کو بھسم نہ کر ڈالے۔'' وہ جو چند گھنٹوں قبل اپنے ساتھیوں کو مزید کسی لڑائی میں جھونکنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا، اس وقت سراپا قہر محسوس ہو رہا تھا۔

''آپ مجھے اور دیگر ساتھیوں کو ہر پل اپنے سنگ پائیں گے اخی!'' عبدالمالک نے فوراً ہی اسے قول دیا پھر یکایک ان کی توجہ بٹ گئی۔ وہ عورتوں کے چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں تھیں جو لحہ بہ لحہ نزدیک آتی جا رہی تھیں۔

''انہیں بھی خبر ہو گئی۔'' عبدالمالک زخمی لہجے میں بڑبڑایا۔ اس سمیت کسی کے لیے بھی صورتِ حال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ زنان خانے میں آگ لگنے کے واقعے کی اطلاع یقیناً کچھ تاخیر سے پہنچی تھی اور اطلاع پاتے ہی خواتین نے اس طرف دوڑ لگا دی تھی۔ اپنے مال و متاع کے ساتھ دو انسانی جانوں کے جل کر بھسم ہو جانے کا خیال ایسا نہیں تھا کہ نازک دل خواتین اس صدمے کو سہہ سکتیں۔ وہ روتی چلاتی اس طرف دوڑی آ رہی تھیں۔ آخر کار وہ وہاں پہنچ گئیں۔

''میری بیٹی..... میرے دل کا ٹکڑا'' درد بھرے بین کرنے والی اس خوب صورت نوجوان عورت کو آج آسمان پہلی بار بے پردہ دیکھ رہا تھا۔

''چھوڑ دو مجھے جانے دو۔ مجھے اپنی بچی کو بچانا ہے۔'' عقل والوں کو عقل نے سمجھا دیا تھا کہ اس آگ میں گھس کر کچھ حاصل نہیں ہوگا لیکن ایک ماں کی جنونی ممتا اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اگر کئی عورتوں نے بیک وقت اسے مضبوطی سے نہ تھام رکھا ہوتا تو وہ بے دریغ اپنی بچی کی جستجو میں اس آگ میں کود جاتی جس نے مردوں کے حوصلے کو بھی مات دے دی تھی۔

''تمہیں خدا رسول کا واسطہ ہے، مجھے میری بچی کو بچانے کے لیے جانے دو۔ میرا اس کے بغیر جینا بیکار ہے۔''

وہ اب دہائیاں دے رہی تھی لیکن اس کی آواز لمحہ بہ لمحہ پست ہوتی چلی جارہی تھی پھر شاید وہ صدمے کی شدت سے بے ہوش ہوکر عورتوں کے ہاتھوں میں جھول گئی تو سماعتوں کو اس کی درد بھری پکاروں سے نجات ملی۔

''جو کچھ ہوا میں اس کے لیے بے حد شرمندہ ہوں اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ذمے داروں کو عبرتناک انجام سے دوچار کروں گا لیکن فی الحال آپ سے درخواست ہے کہ خواتین کو واپس میری قیام گاہ چلے جانے کی ہدایت دیجیے۔ آگ کو جو کچھ جلانا تھا جلا چکی۔ دھیمی پڑتے، پڑتے یہ کچھ دیر میں بجھ جائے گی اور اس وقت میرے ساتھی لاشوں کو نکالنے کی کوشش کریں گے۔ خواتین کی نظر ان سوختہ لاشوں پر نہ ہی پڑے تو مناسب ہے۔'' وہ سردار مراد تھا جوان کے سامنے بے حد نادم کھڑا ملتجی لہجے میں درخواست کررہا تھا۔

''لاشیں ہم خود نکال لیں گے۔ ہمیں اپنے پیاروں کی لاشیں ڈھونڈنے کا آپ کے مقابلے میں بہت زیادہ تجربہ ہے۔ آپ صرف اتنی مہربانی کیجیے کہ جلد از جلد مجرموں کو تلاش کرکے ہمارے حوالے کیجیے تاکہ ہمارے سینوں میں بھڑک اٹھنے والے الاؤ سرد ہوسکیں۔'' داؤد سے پہلے عبدالمالک نے جلبلا کر اسے جواب دیا۔

''میں تمہارے جذبات کو سمجھ رہا ہوں نوجوان! مجھے خود بھی اس حادثے پر بہت زیادہ دکھ ہے۔ میں پوری تحقیق کرواؤں گا کہ آگ کسی کی غفلت سے لگی یا یہ کوئی سوچی سمجھی سازش تھی۔'' عبدالمالک کے انداز پر پہلے ہی سے شرمندہ سردار کے چہرے کا رنگ مزید پھیکا پڑ گیا لیکن اس نے رسانیت سے جواب دیا۔

''تحقیق.....!'' عبدالمالک نے حقارت سے ہنکارا بھرا۔

''فضا میں بسی مٹی کے تیل کی اس بو کے باوجود آپ کو اس سانحے کے بارے میں کوئی شک کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ اصل میں کیا تھا؟'' داؤد خاموش تھا اور عبدالمالک پوری بے باکی سے سردار کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کررہا تھا۔

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ خواتین چراغ جلتے چھوڑ کر عجلت میں دعوت کے لیے روانہ ہوگئی تھیں۔ پہرے دار دیکھ لینے کے باوجود اندر جاکر چراغ بجھانے کی ہمت اس لیے نہیں کرسکے کہ انہیں اندیشہ تھا کہ اگر کوئی چیز غائب ہوگئی تو الزام ان پر آئے گا۔ انہیں تو اس بات کا بھی علم نہیں تھا کہ خواتین میں سے کوئی یہاں رہ گیا ہے۔'' سردار مراد ایسے لہجے میں وضاحتیں پیش کررہا تھا جیسے اسے خود بھی اپنے کہے پر یقین نہ ہو۔

''چراغ سے آگ لگنے کی صورت میں اتنی تیز مٹی کے تیل کی بو نہیں پھیلا کرتی۔'' عبدالمالک نے تلخ لہجے میں جواب دے کر واضح کردیا کہ سردار کے موقف کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اس بحث سے بے نیاز داؤد کی توجہ مسجد سے آتی عشا کی اذان کی طرف مبذول تھی۔ اس نے پوری توجہ سے اذان سنی اور کسی معمول کی طرح قدم اٹھانے لگا۔

''تم تمام خواتین کو لے کر سردار مراد کی قیام گاہ پر واپس جاؤ۔ میری طرف سے کوئی نئی ہدایت ملنے تک تم لوگوں کو وہیں ٹھہرنا ہوگا۔'' وہ ثریا کے قریب لمحہ بھر آ کر رکا اور اسے ہدایت دے کر ایک بار پھر چل پڑا۔ اس کے قدم مسجد کی سمت بڑھ رہے تھے۔ ثریا کے ساتھ ہی موجود سارہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ جو تذبذب کا شکار تھا، حالیہ حادثے کے بعد اس شخص سے ملنے کا فیصلہ کرچکا ہے جس کے بارے میں سفید پوشوں کی طرف سے اس نے اسے پیغام پہنچایا تھا۔

داؤد واقعی اسی شخص سے ملاقات کرنے جارہا تھا۔ حالیہ حادثے نے اس کے سردار مراد پر کیے گئے اعتماد پر ایک اور ضرب لگائی تھی اور اس کے دل میں یہ شکوک بڑھ گئے تھے کہ سردار ان کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ اپنے اندرونی اضطراب کے باوجود اس نے پورے خشوع و خضوع سے نماز ادا کی اور کافی دیر تک بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ پھیلائے اس کا کرم اور رحم طلب کرتا رہا۔ دعا مانگنے سے اس کے مضطرب دل نے قدرے سکون محسوس کیا۔ اب اسے اس شخص کا انتظار تھا جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ ازخود اس سے رابطہ کرے گا۔ اس کی نظریں ہر طرف نمازیوں میں اس شخص کو ڈھونڈنے کی کوشش کررہی تھیں لیکن اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کا مطلوبہ شخص کون ہوسکتا ہے۔ وہاں کچھ چہرے اس کے لیے شناسا تو کچھ غیر شناسا تھے۔ اس نے اپنے قافلے کے چند افراد کو بھی نمازیوں میں شامل دیکھا۔ نماز کے بعد ایک ایک کرکے لوگ مسجد سے باہر نکلنے لگے۔ ذرا دیر میں اس کے علاوہ بس دو تین لوگ ہی مسجد میں رہ گئے۔ یہ وہ نمازی تھے جو فرض نماز کی ادائیگی کے بعد نوافل اور تسبیحات پڑھنے کی نیت سے مسجد میں رک گئے تھے۔ وہ اندازہ لگانے لگا کہ کیا ان میں سے کوئی اس کا مطلوبہ شخص ہوسکتا ہے؟ ان تینوں کے چہروں سے پھسلتی اس کی نظر اپنے مصلے پر واپس آئی تو وہ وہاں ایک تہ کی ہوئی پرچی پڑی دیکھ کر چونک گیا۔ اس نے آس پاس نظریں دوڑائیں، کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پرچی اٹھالی اور اس کی تہیں کھولنے لگا۔

''فی الوقت تمہارے لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ واپس جا کر انہیں حوصلہ اور ہمت دلاؤ۔ ہم سے تمہاری ملاقات اب صبح فجر کے بعد ہو سکے گی۔'' کاغذ پر لکھا وہ دو سطری پیغام یقیناً اسی کے لیے تھا۔ پیغام پڑھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس کی یہ حیرانی اپنی جگہ برقرار تھی کہ کون اور کب وہ پرچی وہاں اتنی خاموشی سے ڈال گیا تھا کہ اسے خبر تک نہیں ہو سکی تھی۔

☆☆☆

اہلِ دربار کی نظریں سنبل پر جمی تھیں اور وہ خاموش کھڑا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں سنبل کہ کل رات خلیل نام کے کسی شخص نے تمہیں صفیہ بیگم کی طرف سے حورم کے نام بھیجا گیا کوئی خط پہنچایا تھا یا نہیں؟'' سنبل کو خاموش پا کر امیر نے ایک بار پھر سخت لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ امیر کے اس لہجے پر سنبل واضح طور پر کانپ گیا پھر ہاتھ جوڑ کر تھوک نگلتے ہوئے کپکپاتی آواز میں بولا۔

''میرے اندر اتنی تاب نہیں کہ آپ کے مرحوم بھائی کی بیوہ کو جھٹلا سکوں لیکن حقیقت یہی ہے کہ میرے پاس ایسا کوئی خط موجود نہیں ہے۔'' اس کے محتاط الفاظ پر ساشا زیرِ لب مسکرایا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسے خط نہیں ملا۔ اس نے صرف اپنے پاس خط کی موجودگی سے انکار کیا تھا اور وہ اپنے دعوے میں اس لیے سچا تھا کہ خط اس نے ازخود تلف کر دیا تھا۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ خلیل نے تمہیں خط پہنچانے کی اطلاع خود مجھے دی تھی۔'' اس کے بیان نے صفیہ کے اشتعال کو مزید بڑھا دیا۔ سنبل جواباً سر جھکائے یوں خاموش کھڑا رہا جیسے کوئی جواب دے کر گستاخی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا ہو۔

''افسوس کہ آپ اپنے جھوٹ کے لیے کوئی گواہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔'' ساشا نے طنزیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ میرا واسطہ تم جیسے شاطر سے پڑا ہے۔ تم جانتے تھے کہ تمہاری اصلیت کھل جائے گی اس لیے تم نے پہلے ہی انتظام کر لیا کہ میرے حق میں گواہی دینے والا کوئی نہ ہو۔'' صفیہ کے غصے میں بھی شکست خوردگی تھی۔

''میرا خیال ہے امیرِ محترم، اب ہمیں اس بحث کو مزید جاری رکھ کر قیمتی وقت ضائع کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے۔ فرض کیجیے کہ ساشا تاجر کے بجائے سچ مچ کوئی ڈاکو ہے، تب بھی اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ قصر میں اپنی آمد سے لے کر اب تک اس کی ذات سے ہمیں فائدہ ہی ہوتا رہا ہے۔ کیا میں آپ کو یاد دلاؤں کہ یہ ساشا ہی تھا جس نے ہمیں لوئیس کی سازش سے بچایا، سانک جیسے موذی سے نجات دلائی، ابوبکیٰ جیسے غدار کا چرایا ہوا سامانِ حرب واپس دلایا..... گزشتہ جھڑپ میں بے جگری سے لڑ کر پورے قافلے کو تباہی سے بچانے کے ساتھ ساتھ بالخصوص میری جان بچائی اور اب بھی وہ ہمارے تعاقب میں آنے والے مشکوک افراد کو ٹھکانے لگا کر آیا ہے۔ اس کی آنکھوں کی سرخی گواہ ہے کہ گزری شب اس نے آرام کرنے کے بجائے ہمارے تحفظ کے لیے جاگ کر گزاری ہے۔ ایسے میں کیا ہمیں یہ زیب دیتا ہے کہ ایک ناقابلِ اعتبار فرد کے بیان پر اس شخص کو سرِ دربار کھڑا کر کے اس سے اس کی بے گناہی کا ثبوت طلب کریں؟ جب الزام لگانے والے کے پاس کوئی ثبوت یا گواہ نہیں ہے تو ساشا سے بھی ایسا مطالبہ کرنا سراسر ناانصافی تصور کی جائے گی۔'' ارسلہ خاتون کو ساشا کا اپنی جان بچانے کا احسان یاد تھا یا پھر صفیہ سے کوئی ذاتی عناد... اس بات کا تو فی الوقت فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس وقت اس نے کارروائی میں مخل ہو کر جس طرح اس کے حق میں دلائل دیے تھے، صورتِ حال پوری طرح اس کے حق میں ہو گئی تھی۔

''ارسلہ کی بات میں وزن ہے۔ ساشا کا ماضی کچھ بھی رہا ہو، حقیقت یہی ہے کہ اس نے ہماری عملداری میں کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے بلکہ اس کے برعکس ہمارے لیے گراں قدر خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ ہم اس سے مزید تفتیش جاری رکھ کر ایک کارآمد آدمی کی ناقدری اور اپنے وقت کے زیاں کے متحمل نہیں ہو سکتے، اس لیے ہمارا حکم ہے کہ اس سارے قصے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔'' ارسلہ خاتون کی سفارش مؤثر ثابت ہوئی اور امیر نے منطقی انداز میں سوچتے ہوئے سارا قضیہ لپیٹ ڈالا..... پھر صفیہ کی طرف رخ کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک غدار اور باغی ہونے کی وجہ سے اگرچہ سالک بھائی ہونے کی رعایت سے محروم ہو چکا تھا لیکن ہماری وضع داری کو گوارا نہیں کہ اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔ آپ ہمارے قافلے کے ساتھ سفر جاری رکھ سکتی ہیں۔ اگر ہمارے پاس افرادی قوت ہماری ضرورت سے زائد ہوتی تو ہم آپ کو واپسی کی بھی پیشکش کر سکتے تھے۔ فی الحال آپ کا ہمارے ساتھ سفر جاری رکھنا مجبوری ہے۔ البتہ آپ چاہیں تو آگے نہیں کوئی

آبادی مل جانے کی صورت میں ہمارا ساتھ چھوڑ سکتی ہیں۔"

"میں امیر محترم کی اس مہربانی کے لیے ان کی شکر گزار ہوں۔ انجان لوگوں کی کسی بستی میں ٹھہرنے کے مقابلے میں، میں آپ کے سایۂ عافیت میں سفر کی صعوبتیں اٹھانا زیادہ مناسب سمجھتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے زیرِ سایہ سفر کرتے ہوئے مجھے اپنے اسباب سے محروم ہو جانے کا احساس بالکل بھی نہیں ستائے گا۔" وہ جو کچھ دیر قبل سخت مشتعل محسوس ہو رہی تھی، ہوا کا رخ بدلتے دیکھ کر تیزی سے اپنا لب و لہجہ بدل گئی اور نرم و لوچ دار لہجے میں امیر سے مخاطب ہوئی۔

"آپ یقیناً خود کو مایوس نہیں پائیں گی۔" امیر کا جواب مختصر تھا لیکن اس کے لہجے سے شوخی جھانکتی تھی، ایک عورتوں کے شائق مرد کے دل میں کسی حسین عورت کے نرم لہجے سے ترنگ پیدا نہ ہوتی، یہ کیسے ممکن تھا۔ شوہر کی مزاج آشنا ارسلہ خاتون اس وقت اپنی جگہ پر بل کھا جانے اور صفیہ کو کینہ توز نظروں سے گھورنے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

"تم یقیناً رات بھر کی بھاگ دوڑ کے نتیجے میں تھکے ہوئے ہو گے لیکن تمہیں معلوم ہے کہ ہم سفر روکنے کے متحمل نہیں ہو سکتے، ہمیں جلد اپنے قافلے کو کوچ کا حکم دینا ہوگا۔" اب امیر ایک بار پھر ساشا کی طرف متوجہ تھا۔

"بے فکر رہیے امیر محترم! میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کو کسی آرام دہ بستر کے مقابلے میں گھوڑے کی پشت زیادہ پرکشش محسوس ہوتی ہے۔ آپ شوق سے کوچ کا حکم دیجیے۔ میں سفر کے لیے تیار ہوں۔" مودبانہ لہجے میں جواب دے کر وہ واپسی کے لیے پلٹا تو اسے خبر تھی کہ کسی کی جلتی سلگتی آنکھیں اس کے وجود میں گڑی ہوئی ہیں۔ سیاہ لباس والی اس لڑکی نے اگرچہ اس سارے معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت سے ظاہر تھا کہ اگر صفیہ بیگم کا خط اسے مل گیا ہوتا تو وہ خود کو اس خط کے لیے بہترین انتخاب ثابت کر دکھاتی۔ یہ صرف اس کی قسمت کی یاوری تھی کہ وہ دو انتقام سے لبریز خواتین کے داؤ میں آنے سے بچ گیا تھا اور اس کے بارے میں وہ انکشاف جس سے وہ خود بھی خوف زدہ رہتا تھا، حالات کے تحت خود ہی غیر مؤثر ہو گیا تھا۔

ہاں، یہ سچ تھا کہ اس کا باہنر، باعلم اور بہادر باپ ڈاکوؤں کے ایک بڑے گروہ کا سردار تھا اور وہ اپنے باپ کا جانشین نڈر، چالاک اور پھرتیلا...... سردار ساشا!

☆☆☆

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ پرچا نہیں ملتا اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس 100 روپے ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1500 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 750 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

''مجھے نہیں معلوم کہ سچ کیا ہے لیکن ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ہم خطرے میں ہیں اور اس خطرے کی سمت کا تعین نہیں ہے۔ ایک طرف سردار مراد ہم پر مہربان نظر آتا ہے تو دوسری طرف اس کا کردار مشکوک محسوس ہونے لگتا ہے۔ میں اس کے اس دعوے کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہتا کہ اسے کسی سازش کا شکار بنایا جارہا ہے۔ سچائی جو بھی ہو، ہمارے لیے اہمیت اس بات کی ہے کہ نقصان ہمیں پہنچ رہا ہے اس لیے ہمیں اپنی حفاظت کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔ تم دونوں ذہین اور معاملہ فہم ہو، اس لیے میں خواتین کے معاملات کی دیکھ بھال اور حفاظت کی ذمے داری تمہیں سونپ رہا ہوں۔ تم اپنے درمیان میں سے جن خواتین کو اہل پاؤ، انہیں اپنی مدد کے لیے منتخب کرسکتی ہو۔'' داؤد زنان خانے سے متصل ایک کمرے میں سارہ اور ثریا سے ملاقات کر کے انہیں یہ ہدایات دے رہا تھا۔

''کیا ہمارے لیے یہ بہتر نہیں ہوگا اخی کہ ہم جلد از جلد یہاں سے روانہ ہو جائیں؟'' ثریا نے مضطرب سے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔ وہ خاصی متحمل دکھائی دیتی تھی اور اس کی آنکھیں یوں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں جیسے بہت دیر تک روتی رہی ہو۔

''میں فوری روانگی کا ہی ارادہ رکھتا تھا لیکن مجھے لگتا ہے کہ کوئی ہے جسے میرا یہ ارادہ پسند نہیں آیا اور ہمیں روکے رکھنے کے لیے آتش زنی کی وہ گھناؤنی واردات کی گئی جس میں دو بے گناہ جانوں کے ساتھ ساتھ ہمارا بہت سا مال و اسباب بھی جل کر خاکستر ہوگیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ سامان کا بیشتر حصہ خواتین والے حصے میں ہی رکھوایا گیا تھا۔ اب اگر ہم بغیر اسباب کے سفر کرنے کا فیصلہ کریں تو ہمارے لیے مشکلات مزید بڑھ جائیں گی۔'' داؤد نے اضطراب سے اپنی پیشانی مسلی۔

''میں اس جگہ نہیں رہنا چاہتی اخی! میں جب جب سوچتی ہو کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے خالہ منیرا اور ان کی معصوم پوتی کی جان لے لی تو میرا دم سینے میں گھٹنے لگتا ہے۔'' ثریا یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''تم تو بہت بہادر ہو ثریا! اگر تم اس طرح حوصلہ چھوڑ بیٹھو گی تو پھر باقیوں کو کون حوصلہ دے گا۔'' اس نے بے بسی سے روتی ہوئی بہن کو دیکھا اور پھر سارہ کو مخاطب کر کے التجا آمیز لہجے میں بولا۔

''تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ سارہ! یہ وقت جذبات کے ریلے میں بہنے کا نہیں بلکہ ہمت اور حوصلے سے کام لینے کا ہے تاکہ خود کو اس مشکل سے نکال سکیں۔''

''یہ سنبھل جائے گی۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ اصل میں ننھی بچی کی موت سے اس کے دل کو زیادہ ہی صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ہم سب کے لیے ایک پیاری سی گڑیا کی طرح تھی اور اس گڑیا کی ایسی اندوہناک موت نے سب ہی کے دل کو دہلا کا لگایا ہے۔'' وہ ثریا کی پشت سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی تو اس کی اپنی آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی تھی لیکن کمال ضبط سے کام لے کر وہ اس نمی کو آنسوؤں میں تبدیل ہونے سے روکے ہوئے تھی۔

''مجھے خود بھی دونوں اموات کا شدید دکھ ہے۔ مالی نقصان کا تو پھر کوئی نہ کوئی ازالہ ہو جائے گا لیکن مرنے والوں کو کون واپس لاسکتا ہے۔ میں نے ان کی قبروں پر کھڑے ہو کر خود سے عہد کیا ہے کہ ذمے داروں کو کڑی سزا دیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔'' مرنے والوں کی تدفین رات ہی رات میں کر دی گئی تھی اور وہ تدفین میں شرکت کے بعد ہی سیدھا یہاں آیا تھا۔

''طیبہ کی حالت بہت ابتر ہے۔ مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ کچھ دیر قبل ہی اسے خواب آور دوا دے کر بڑی مشکل سے سلایا گیا ہے۔'' اس نے داؤد کو مزید احوال سے آگاہ کیا۔

''صدمہ ہی اتنا بڑا ہے کہ اس بے چاری کے لیے صبر کرنا ممکن نہیں۔ بس اللہ ہی سے دعا کی جاسکتی ہے کہ اس کے غموں کا بہترین مداوا کرے۔'' وہ خود افسردہ تھا۔

''آمین۔'' سارہ نے خلوصِ دل سے کہا۔

''تم جا کر منہ دھو کر آؤ ثریا اور خود کو سنبھالو تاکہ طیبہ کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ دیگر امور کو انجام دینے کے لائق ہو سکو۔ غم میں رونا ایک فطری عمل سہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف رونے دھونے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ جاؤ شاباش، منہ دھو کر آؤ تاکہ میں ایک بار پھر اپنی اس بہن کا چہرہ دیکھ سکوں جس نے اس سے بھی کڑے وقت کا بہت بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔'' ثریا کی مسلسل سسکیاں اس کے لیے تکلیف کا باعث تھیں، چنانچہ اس بار عمداً ذرا سخت اور حکمیہ لہجہ اختیار کیا۔ ثریا کے لیے بھی اس کی حکم عدولی کہاں ممکن تھی۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

''ہمارا ماضی اتنا دردناک ہے کہ ہمارے دلوں سے کبھی اس وقت کی یاد نہیں نکل سکتی۔ ثریا نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے پورے خاندان کو ختم ہوتا ہوا دیکھا ہے اور

مجھے یقین ہے کہ خالہ منیرا اور ان کی پوتی کی اموات نے ان زخموں کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے جو ابھی اندر سے کچے ہی ہیں۔''
ثریا کے جانے کے بعد اس نے افسردگی سے تبصرہ کیا۔

''میں ثریا کی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ آپ بے فکر رہیں، میں اسے سنبھال لوں گی۔ وہ ذمے دار اور حساس طبیعت کی لڑکی ہے۔ ہم آپ کی ہدایات کے مطابق جب یہاں کے معاملات کی نگرانی کی ذمے داری سنبھالیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے جذبات کو پس پشت ڈال کر پوری ہمت سے اس فرض کی ادائیگی میں سرگرم ہوجائے گی۔'' اس کے دعوے کے پیچھے اتنے دنوں کے ساتھ کے سبب حاصل ہونے والی مزاج آشنائی تھی۔

''شکریہ! تمہیں ثریا کے ساتھ پاکر میں ایک تقویت سی محسوس کرتا ہوں۔'' داؤد نے بہت سادہ سے لہجے میں ایک بات کہی تھی لیکن جانے کیوں اسے ایسا لگا کہ اس کی تہ میں وہی خواہش چھپی ہوئی ہے جس کا بارہا ثریا بھی اظہار کر چکی ہے۔ داؤد بن معتبر ایک شاندار انسان تھا، اس بات سے اسے انکار نہیں تھا لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ اس کے بارے میں ایسے جذبات و احساسات نہیں رکھتی تھی کہ اسے اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کرنے کے بارے میں سوچتی۔ اس بار بھی اس نے تیزی سے موضوع بدل دیا اور لہجے میں تجسس پیدا کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''آپ نے بتایا نہیں کہ رات عشا کی نماز کے بعد آپ کو مسجد میں کون ملا تھا اور اس نے آپ سے کیا کہا؟''
اس نے دھیان رکھا تھا کہ سوال اتنی آہستہ آواز میں کرے کہ داؤد کے سوا اگر کوئی چاہے بھی تو سن نہ سکے۔ جواب میں داؤد نے پیغام والی پرچی اس کے سامنے رکھ دی۔

''فجر کا وقت ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ ملاقات کر کے دیکھ لیجیے، شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔'' اس نے تحریر پڑھی اور حوصلہ دینے والے انداز میں بولی۔

''میں مسجد کی طرف ہی جانے لگا ہوں۔'' وہ مختصر جواب دے کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر کبیر سمیت سردار مراد کے کئی دوسرے آدمیوں سے اس کا سامنا ہوا لیکن اس نے ان میں سے کسی سے بھی گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سیدھا مسجد کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ راستے میں ہی اس نے اذان کی آواز سنی۔ مسجد پہنچ کر وضو کرنے کے بعد وہ مصلے پر کھڑا ہوا تو اس وقت تک کئی اور نمازی بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ ان نمازیوں میں قافلے کے بھی کئی افراد شامل تھے۔

''اتنے لوگوں کے درمیان کسی خفیہ ملاقات کے کتنے امکانات ہیں؟'' امام کے تکبیر کہنے سے پہلے اس کے دماغ میں یہ سوال گونج رہا تھا۔ نماز شروع ہوئی اور تمام نمازی صفوں میں شانے سے شانہ جوڑ کر کھڑے ہوئے تو اس نے اپنی توجہ نماز کی طرف مرکوز کر لی۔ فرض نماز کی دوسری رکعت میں جب وہ رکوع کرنے کے بعد سیدھا ہو رہا تھا تو اس نے محسوس کیا کہ دائیں طرف موجود نمازی ضرورت سے زیادہ قریب آگیا ہے۔ الجھن محسوس کرنے کے باوجود وہ دوران نماز کوئی ردعمل ظاہر کرنے سے قاصر تھا اس لیے کوشش کی کہ پوری توجہ نماز کی طرف ہی مبذول رہے۔ اس کوشش کے باوجود اس نے اپنی جیب میں کسی کے ہاتھ کا جانا محسوس کرلیا۔ فطری طور پر اس کے جسم میں ذرا سا تناؤ پیدا ہوگیا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک بار پھر اس تک کوئی خفیہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے یا یہ کوئی جیب کترا ہے جو اس کی جیب مارنا چاہتا ہے۔ شعوری کوشش کر کے اس نے اپنے دماغ کو زیادہ دیر اس سوال میں الجھنے بھی نہیں دیا۔ اس وقت وہ اپنے رب کے حضور حاضر تھا اور عبودیت کا تقاضا تھا کہ عبادت کے علاوہ دھیان کو کسی اور سمت میں نہ جانے دے۔ اپنی اس سوچ کے تحت جب اس نے کامل اطمینان کے ساتھ سلام پھیرنے کے بعد اپنے دائیں جانب دیکھا تو پتا چلا کہ وہاں موجود نمازی کی جگہ خالی ہو چکی ہے۔ کسی سے سوال کرنے کو غیر ضروری مان کر وہ تسبیحات اور دعا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنے دائیں جانب کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی انگلیوں نے فوراً کاغذ کے لمس کو محسوس کیا۔ اس کاغذ کو فوری طور پر باہر نکالنے کے بجائے اس نے دیگر نمازیوں کے ساتھ خاموشی سے باہر کا رخ کیا۔

''ہم لوگوں کے لیے کیا حکم ہے اخی؟'' ابھی باہر پہنچا ہی تھا کہ عبدالمالک اور لطیف نے اسے گھیر لیا۔

''تم لوگ رات بھر کے جاگے ہوئے ہو، بہتر ہے کہ فی الحال آرام کرلو لیکن دھیان رکھنا کہ چند لوگ باری باری پہرا دیتے رہیں۔ اب ہم کسی اور پر انحصار کرنے کی غلطی نہیں دہرا سکتے۔''

''آپ بھی رات بھر ہمارے ساتھ ہی جاگتے رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ بھی چل کر کچھ دیر آرام کرلیں۔'' عبدالمالک نے بھانپ لیا کہ وہ ان کے ساتھ جانے کے بجائے نہیں رکے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لیے اصرار کیا۔

''میں کچھ دیر ہوا خوری کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ اس سے میرے دماغ کو سکون ملے گا اور زیادہ بہتر نیند آئے گی۔'' اس نے بہانہ بنایا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں اخی۔'' لطیف نے دریافت کیا۔

''نہیں۔'' اس کا لہجہ نرم لیکن قطعیت لیے ہوئے تھا۔

لطیف کا چہرہ بجھ گیا۔

''تم جا کر آرام کرو۔ میں کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں۔'' اس نے لطیف کے شانے پر تھپکی دے کر اس کی دلجوئی کی کوشش کی۔ اس بار دونوں میں سے کسی نے مزید کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑا انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا پھر خود ہی کسی خاص سمت کا تعین کیے بغیر ایک طرف چل پڑا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ دیگر لوگوں کی نظروں سے دور ہو چکا ہے تو اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ کا وہ تہ کیا ہوا پرزہ باہر نکالا۔ صبح کی ہلکی روشنی نمودار ہونا شروع ہو چکی تھی۔ اس نے اس معمولی روشنی میں کاغذ پر لکھی تحریر غور سے پڑھی، لکھا تھا۔

''مسجد سے نکل کر دائیں جانب ناک کی سیدھ میں چلتے جاؤ۔ تم سے از خود رابطہ کر لیا جائے گا۔'' اس تحریر کو پڑھنے کے بعد اس نے اپنی سمت کا تعین کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ اتفاقاً مسجد سے نکل کر دائیں سمت میں ہی قدم آگے بڑھاتا رہا ہے۔ ابھی تک اسے کوئی نہیں ملا تھا چنانچہ مزید چلتے رہنے کا فیصلہ کر کے قدم آگے بڑھا دیے۔

''ادھر، اس طرف میرے پیچھے پیچھے چلے آئیں۔''

وہ جو سر جھکائے راستے پر آگے بڑھتا جا رہا تھا، بائیں جانب کی بغلی گلی سے اچانک نمودار ہونے والے شخص کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ شخص اس کی طرف سے کسی ردِعمل کے اظہار تک رکنے کے بجائے پیٹھ موڑ کر گلی میں چلنا شروع ہو چکا تھا۔ جیسے یقین ہو کہ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔ وہ سر جھٹک کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ گلی قدرے طویل اور پتلی تھی اور اس میں اسی طرح کے مکانات بنے ہوئے تھے جیسے مکانات انہیں رہائش کے لیے دیے گئے تھے۔ حالت کے اعتبار سے چند مکانات بہتر اور کچھ خستہ حالت میں تھے۔ ان مختلف النوع چھوٹے بڑے مکانات کے سامنے سے گزر کر جب وہ گلی کے آخری سرے پر پہنچے تو اس کے آگے چلتا ہوا آدمی گلی کے سب سے آخری مکان کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ یہ مکان بہت اچھی حالت میں تھا اور گلی کے تمام مکانات کے مقابلے میں بڑا تھا۔

راہنمائی کا فریضہ انجام دینے والے نے مکان کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے اجنبی زبان میں کوئی سوال پوچھا گیا۔ جواباً راہبر نے بھی اسی نامانوس زبان میں کوئی جواب دیا۔ دروازہ فوراً کھل گیا۔

''تشریف لائیے جناب۔'' اس کے راہبر نے اس کی طرف مڑ کر با اخلاق لہجے میں اس سے کہا اور خود پیچھے ہٹ کر پہلے اسے اندر داخل ہونے کا موقع دیا۔

''شکریہ۔'' دروازے کی اونچائی زیادہ نہیں تھی۔ وہ سر کو ذرا جھکا کر اندر داخل ہوا۔

''اس طرف دائیں جانب۔'' دو قدم چلنے کے بعد اس کی مزید راہنمائی کی گئی اور وہ نظر آنے والی راہداری میں مڑ گیا۔ اس راہداری میں صرف ایک دروازہ تھا۔ اس کے دروازے تک پہنچتے ہی اس کے دونوں پٹ وا ہو گئے اور ایک نوجوان نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

''یہاں تک پہنچنے میں اگر کوئی زحمت ہوئی ہو تو میں اس کے لیے شرمندہ ہوں۔'' گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے نوجوان نے عاجزی سے کہا۔

''زحمت تو کوئی نہیں ہوئی لیکن بس ذرا سا ذہن الجھ گیا کہ اس قدر رازداری اور احتیاط کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔'' اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا اور نوجوان کے اپنے بازو پر دباؤ ڈالنے پر اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس کی راہنمائی کا فریضہ انجام دینے والا شخص البتہ باہر ہی رک گیا تھا۔ کمرا کشادہ اور سادہ تھا جس کے پورے فرش پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ اس چاندنی پر قدم رکھتے ہی اس کے پیروں نے جو نرماہٹ محسوس کی، وہ یقینی طور پر چاندنی کے نیچے موجود کسی نرم و دبیز قالین کے سبب تھی۔

''رازداری اور احتیاط ہماری مجبوری ہے کہ اس کے بغیر ہماری بقا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہاں کچھ نگاہیں ہر پل ہماری گھات میں لگی رہتی ہیں اور انجان راستوں سے موت ہم پر جھپٹنے کے لیے تیار بیٹھی ہوتی ہے۔'' وہ اس کا ہاتھ تھامے ایک قطار میں رکھے گاؤ تکیوں تک لے گیا اور بڑے محبت بھرے انداز میں اسے اپنے روبرو بٹھایا۔

''اس درجے دشمنی کی کوئی وجہ بھی تو ہو گی؟'' اس نے نوجوان کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے نظریں جھکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سوال پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ داؤد کو اعتراف کرنا پڑا کہ اس سے قبل اس نے کسی مرد کا ایسا

خوبصورت چہرہ اور اتنی پُرکشش مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی۔

''حق سے باطل کو بس ایک ہی تو دشمنی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ حق اسے مٹانے کے لیے آیا ہے اور ایک دن مٹا کر رہے گا۔''

''میں آپ کے یہ اشارے کنایے سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' داؤد سب کچھ وضاحت سے جاننا چاہتا تھا۔

''کمال ہے، اتنا بہت کچھ سہہ کر بھی آپ وضاحت کے طلب گار ہیں۔''

''کسی حتمی فیصلے پر پہنچنے کے لیے وضاحت ضروری ہے۔'' داؤد اپنی بات پر مصر رہا۔

''وضاحت تو بس اتنی سی ہے کہ میں خیر خواہ کے روپ میں ملنے والے بھیڑیے سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بچانا چاہتا ہوں۔ میرا یقین کیجیے کہ وہ کبھی آپ کو یہاں سے نکلنے نہیں دے گا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک اس کے حلیفوں کی خواہشات پوری نہیں ہو جاتیں۔ آنے بہانے سے وہ اس وقت تک یہاں آپ کے قیام کو طول دینے کے لیے رکاوٹیں کھڑی کرتا رہے گا جب تک آپ خود ہتھیار نہیں ڈال دیتے یا اتنے کمزور نہیں ہو جاتے کہ حریفوں کے لیے ترنوالہ ثابت ہوں اور وہ آسانی سے آپ کو شکست دے دیں۔'' وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، حالات کی روشنی میں بالکل درست محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے خوبصورت اور نرم تاثر والے پُرکشش چہرے میں بھی کوئی ایسی بات تھی کہ دل خود بخود اس کی بات مان لینے کی طرف مائل ہوتا تھا۔ داؤد نے بھی خاصی حد تک خود کو قائل پایا لیکن پوری طرح مطمئن ہونے کے لیے کچھ اور بھی جاننا ضروری تھا چنانچہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''ہمارے تمام معاملات تو آپ کے سامنے ہیں لیکن میں تجسس رکھتا ہوں کہ آپ کے کیا مسائل اور اختلافات ہیں۔ آپ لوگوں کا پراسرار رویہ دل میں شکوک بھی پیدا کرتا ہے۔''

''بے شک ایسا ہی ہوگا لیکن ہم یہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ اسی میں ہماری بقا اور لوگوں کے لیے امن ہے۔ سردار مراد خود سے اختلاف رکھنے والے لوگوں کو قطعی برداشت نہیں کرتا جبکہ مجھے چاہنے والے بھی ہر دم مجھ پر جان چھڑکنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ان حالات میں اگر تصادم کی نوبت آگئی تو خاصا خون خرابا ہوگا جو مجھے منظور نہیں ہے۔'' وہ اپنی مرکے مقابلے میں بہت بردبار انداز میں گفتگو کر رہا تھا اور اس کا خوبصورت لب ولہجہ داؤد کو اس کی بات پوری توجہ سے سننے پر مجبور کر رہا تھا۔

''آپ کا طرزِ فکر قابلِ ستائش ہے لیکن یہ تو بتائیں کہ وجہِ اختلاف کیا ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔ بس چھوٹے موٹے عقائد کے اختلافات ہیں جنہیں ہوا دی جاتی ہے۔ سردار مراد جابرانہ طبیعت کا مالک انسان ہے اور چاہتا ہے کہ لوگ اپنے سوچنے سمجھنے کا حق استعمال کرنے کے بجائے بس وہ مانیں جو وہ کہتا ہے۔ پہلے کسی زمانے میں لوگ اس کے دباؤ میں آکر اس کے آگے سر جھکا دیتے تھے لیکن جب سے انہیں ہمارا ساتھ اور شعور حاصل ہوا ہے، وہ اپنے حق کے لیے بولنے لگے ہیں اور سردار کو یہ سب گوارا نہیں۔''

''میرے خیال میں آپ یہاں کے مقامی باشندے نہیں ہیں۔'' داؤد نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں کچھ سال قبل اپنے والد کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ والد کی سحر انگیز شخصیت نے مختصر عرصے میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ لوگ ان کے پاس بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا پسند کرتے تھے۔ بچے، بوڑھے، جوان سب ہی ان سے متاثر تھے اور وہ بڑے خلوص سے یہاں درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے متعلق سردار کی ناپسندیدگی کی اطلاعات بھی ملتی رہتی تھیں لیکن انہوں نے کبھی پروا نہیں کی اور نتیجتاً مجھے نوجوانی میں ہی ان کے سایۂ شفقت سے محروم ہونا پڑا۔''

''کیا مطلب؟ کیا سردار نے انہیں قتل کروا دیا؟'' داؤد کی حیرت سوال بن کر اس کے لبوں پر چلی آئی۔

''واضح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہمیں تو بس اتنا معلوم ہے کہ اس رات سردار نے انہیں کھانے پر مدعو کیا تھا اور وہ اس دعوت پر حیران ہونے کے باوجود صرف اس لیے شرکت کے لیے چلے گئے تھے کہ انکار کی صورت میں سردار کا مزاج برہم ہو سکتا تھا۔

''دعوت سے واپس آنے کے بعد انہوں نے مجھ سے طبیعت کی گرانی کا ذکر کیا تو مجھے گمان ہوا کہ سادہ غذا کا عادی ان کا معدہ مرغن غذا کو برداشت نہیں کر پایا ہے۔ میں نے ان کے لیے خصوصی قہوہ بنوایا جسے پی کر انہوں نے طبیعت میں بہتری کا اظہار کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ان کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں بھی سو گیا لیکن جب معمول کے مطابق وہ تہجد کی نماز کے لیے نہیں اٹھے تو مجھے تشویش ہوئی اور ان کی طبیعت دریافت کرنے کے لیے ان کے پاس پہنچ گیا لیکن مجھے دیر ہو چکی تھی۔ ان

کی ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اور روح جسم کا ساتھ چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اندازہ یہی تھا کہ موت کی وجہ زہر خورانی ہے لیکن ہمارے پاس کسی پر الزام لگانے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا، اس لیے خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ اب میں کسی نہ کسی طرح والد صاحب کی ذمے داریاں سنبھالے ہوئے ہوں۔'' بات کے اختتام تک اس کا لہجہ خاصا رنجیدہ ہوگیا تھا۔

''بہت افسوس ہوا۔ والد کے سائے سے محروم ہوجانا یقیناً ایک بیٹے کے لیے بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔'' داؤد نے اس سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اسے اس وقت بے ساختہ ہی اپنے والد کی یاد آگئی تھی۔ وہ جس وقت میدانِ جنگ میں تھے، اس کے والد نے گھر اور گھر کی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے ضعف کے باوجود بڑی ہمت و جرأت سے اپنی جان نچھاور کردی تھی۔

''والد کی وفات میرے اکیلے کا غم نہیں تھی۔ ان کے چاہنے والوں کے لیے بھی یہ ایک بہت بڑا صدمہ ثابت ہوا تھا لیکن میں نے اس وقت صبر کا دامن تھام لیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے صبر و تحمل کا مظاہرہ نہیں کیا تو بہت بڑا طوفان اٹھ کھڑا ہوگا اور گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہنے لگیں گی۔ میں نے غصے اور انتقام کے اس طوفان کے آگے کیسے بند باندھا، یہ بس میں ہی جانتا ہوں۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے لوگوں کو والد صاحب کی تعلیمات پر قائم رکھا اور انہیں بھولنے نہیں دیا کہ انسانیت کی بقا امن میں ہی ہے۔ ہم خود سمیت کسی بھی انسان کو نقصان پہنچتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے اسی لیے جب سے آپ کے قافلے نے اس علاقے میں قدم رکھا ہے، میری ہدایت پر میرے لوگ کوشش کرتے رہے ہیں کہ آپ لوگوں کے تحفظ کا خیال رکھ سکیں۔ پہلی بار ہم کامیاب رہے لیکن دوسری بار ہمیں بھی دھوکا ہوگیا جس کے نتیجے میں آپ لوگوں کو مالی نقصان کے ساتھ ساتھ جانی نقصان سے بھی دوچار ہونا پڑا۔''

''آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا، اس کے لیے میں آپ کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔'' داؤد نے احسان مندی کا مظاہرہ کیا۔

''شکریے کی کوئی بات نہیں میرے بھائی! ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا حق ہے کہ اس کی جان و مال کی حفاظت کا خیال رکھا جائے۔'' اس نے داؤد کا ہاتھ تھام کر حلاوت سے کہا۔

''اب ہمارے لیے آپ کا کیا مشورہ ہے؟'' اس نے اپنے خیر خواہ سے مشاورت ضروری سمجھی۔

''یہاں سے روانگی کا فیصلہ تو آپ کر چکے ہیں۔ اس فیصلے پر عملدرآمد کے لیے میں آپ سے تعاون کا وعدہ کرتا ہوں۔ اگرچہ ہمارے وسائل محدود ہیں لیکن سفر کے انتظام کے لیے جس قدر ممکن ہوسکا، وسائل مہیا کردیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ میں کوشش کروں گا کہ کچھ بہادر اور دلیر نوجوان آپ لوگوں کے اس علاقے سے دور نکل جانے تک آپ کے قافلے کے ساتھ رہیں تاکہ راستے میں کسی حملے کی صورت میں وہ آپ کی مدد کرسکیں۔''

''موجودہ حالات میں آپ کا یہ تعاون ہمارے لیے بہت بڑی نعمت ہے۔ اگرچہ آپ شکریے کو پسند نہیں کرتے لیکن نعمتوں پر بس شکر ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔'' داؤد تھوڑا سا جذباتی ہوگیا۔ جواب میں وہ نوجوان کسی بزرگ کے سے تدبر سے مسکرا کر رہ گیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور نوجوان کے اجازت دینے پر وہی شخص جس نے مکان کے دروازے پر اس کا استقبال کیا تھا، ہاتھ میں طشت اٹھائے اندر داخل ہوا۔ اس نے وہ بڑا سا طشت داؤد اور اس نوجوان کے درمیان لاکر رکھ دیا۔ طشت ایک جالی دار کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا لیکن اس سے اٹھتی ہوئی خوشبوئیں بتا رہی تھیں کہ اس میں کھانے پینے کی اشیاء رکھی ہوئی ہیں۔

''صبح صبح زحمت دے کر میں نے آپ کو ناشتے کی مہلت بھی نہیں دی۔ اب اگر آپ میرے ساتھ ناشتا فرمائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔'' طشت لانے والا خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا۔ نوجوان نے خوش دلی سے داؤد کو کھانے کی دعوت دیتے ہوئے طشت پر ڈھکا ہوا کپڑا ہٹایا۔ طشت میں تازہ پھل، خشک میوہ جات، بھنے ہوئے گوشت کے پارچے، روغنی نان اور کوئی مربّا موجود تھا۔

''آپ کو اس قدر تکلف سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔''

''تکلف کی کیا بات ہے۔ یہ آپ کے نصیب کا رزق ہے جو آپ تک پہنچ گیا ہے۔'' اس نے نہایت خوبصورتی سے داؤد کا اعتراض رد کیا۔

''سچ یہ ہے کہ ذہنی دباؤ اور دو بے گناہ جانوں کے نقصان نے میری بھوک ماردی ہے۔ طبیعت کھانے پینے کی طرف راغب ہی نہیں ہوتی۔''

''آپ بسم اللہ کیجیے۔ مجھے امید ہے کہ میرا خلوص آپ کی اشتہا کو جگادے گا۔''

داؤد کے انکار کے جواب میں اس کا اصرار زیادہ طاقتور تھا۔ وہ مزید انکار کرکے اپنے میزبان کی دل آزاری

نہیں کرسکتا تھا اس لیے خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی طشت کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ نوجوان بے حد اصرار سے اسے ایک ایک شے کھانے کے لیے پیش کرتا رہا۔ نہ نہ کرکے بھی داؤد نے کافی کچھ کھالیا۔ کھانے کے بعد ایک مشروب پیش کیا گیا۔ مشروب ذائقے اور خوشبو دونوں میں لاجواب و منفرد تھا۔

''میں نے اس قدر خوش ذائقہ اور فرحت بخش مشروب کبھی نہیں پیا۔'' داؤد کو اس کے روبرو اعتراف کرنا پڑا۔

''والد صاحب حکمت میں بھی دخل رکھتے تھے۔ یہ مشروب ان ہی کے نسخے کے مطابق تیار کیا جاتا ہے اور واقعی لاجواب ہے۔'' اس نے مسکرا کر بتایا۔

''مجھے افسوس ہے کہ اتنے شاندار انسان سے ملنا میرے نصیب میں نہیں تھا۔''

''نصیب کے آگے سر جھکا دینے میں ہی بھلائی ہے۔'' اس نے پہلی بار داؤد کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر بات کی۔ داؤد کو یہ محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں سے طاقتور لہریں نکل کر اس کی آنکھوں کے راستے پورے جسم میں پھیل رہی ہوں۔

''واقعی! نصیب کے آگے سر جھکا دینے میں ہی بھلائی ہے۔'' اس نے خوابیدہ سے لہجے میں اتفاق کیا۔

''بس تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی مجھ سے ملاقات بھی نصیب کا لکھا تھا اور آپ جس قدر میری ذات پر بھروسا کریں گے، آپ کو اتنا ہی فائدہ ہوگا۔''

''بے شک۔'' داؤد نے ایک بار پھر خود کو اس سے متفق پایا۔

''امید ہے اگلی ملاقات جلد ہی ہوگی۔'' نوجوان نے اس سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو داؤد کا ہاتھ بھی خودکار انداز میں آگے بڑھ گیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی نوجوان کی آنکھوں پر اس طرح جمی ہوئی تھیں جیسے وہ دو طاقتور مقناطیس ہوں۔

''آپ کو یہاں لانے والا واپسی کے لیے آپ کا منتظر ہے۔ وہ آپ کو ایسے مقام تک پہنچا دے گا جہاں سے آپ بہ آسانی اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ سکیں۔'' اب وہ دونوں اپنی جگہ سے کھڑے ہو چکے تھے۔ نوجوان نے دروازے تک جا کر اسے الوداع کہا۔ حسبِ اطلاع باہر اس کی راہنمائی کرنے والا موجود تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے واپسی کا سفر طے کرنے لگا۔ واپسی کے اس سفر میں وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے سر سے بہت سا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ ایک ہلکے پھلکے احساس کے ساتھ وہ اس وقت مستقبل کے لیے اتنا فکرمند نہیں تھا۔

☆☆☆

''طبیب شمس الدین نے آپ کو طلب فرمایا ہے۔ ابھی ابھی ایک آدمی مجھے ان کا یہ پیغام دے کر گیا ہے۔'' وہ طویل مسافت کی تھکن اتارنے کے لیے بستر پر لیٹنے ہی لگا تھا کہ فیرس نے اندر جھانک کر اسے پیغام پہنچایا۔

''کیا اسی وقت؟'' اس نے دریافت کیا۔

''جی ہاں! ان کی طرف سے تاکید ہے کہ سونے سے پہلے ملاقات ضرور کرلیں۔''

''ٹھیک ہے۔ پہلے میں ان سے مل کر آجاتا ہوں۔'' اس نے اپنے لیے تیار بستر پر ایک نگاہ ڈالی۔ جب سے سفر شروع ہوا تھا اسے اس بستر پر لیٹنے کا بہت کم موقع ملا تھا۔ اب بھی وہ بستر پر دوسری نگاہ ڈالے بغیر باہر نکل گیا۔ باہر خاموشی تھی۔ تھکے ہارے مسافروں میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں تھی کہ اس موقع کو گنوا کر آرام کے علاوہ کسی اور شغل کے بارے میں سوچ سکیں۔ ایسے میں طبیب شمس الدین جیسے عمر رسیدہ بزرگ کا آرام کرنے کے بجائے اسے ملاقات کے لیے بلاوا بھیجنا ایک غیر معمولی اہمیت کی بات تھی۔ طبیب کے خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے اسے آسمان پر چمکتے تاروں اور اپنی باری کا پہرا دیتے پہرے داروں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیا۔ پہلے دن کی غفلت پر پکڑے جانے کے بعد کسی فرد نے یہ ہمت نہیں کی تھی کہ اپنی باری پر پہرا دینے کے بجائے سونے کی حماقت کرسکے۔ اب بھی سارے پہرے دار پوری طرح چوکنا تھے۔ ان پہرے داروں میں تقریباً نصف امیر سفیان کے آدمی شامل تھے جن کے اب تک کے طرزِ عمل نے ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنی قدیمی رسم کے مطابق کیے جانے والے عہد کی مکمل پاسداری کررہے ہیں۔

''مجھے طبیب شمس الدین نے ملاقات کے لیے بلوایا ہے۔'' امیر ارغل کے خیمے سے کچھ فاصلے پر ہی نصب اس شاندار خیمے کے باہر کھڑے ہو کر اس نے پہرے دار کو اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔

''اندر تشریف لے جائیے۔ وہ آپ کے منتظر ہیں۔'' پہرے دار نے اسے پہچان کر اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ اندر چراغ روشن تھا اور دیکھتے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ یہاں موجود کسی فرد کا فوری طور پر سونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

''ساشا آگیا ہے استادِ محترم!'' پہلے ہی سے خیمے میں موجود سلیمان نے ایک وسیع کاغذ پر جھکے بوڑھے شمس الدین کو اطلاع دی۔

''بے وقت بلاوے پر آمد کا شکریہ۔'' شمس الدین نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ علاج معالجے پر حیرت انگیز دسترس رکھنے والے اس بوڑھے کو اگرچہ کوئی عارضہ لاحق نہیں تھا لیکن عمر کے اثرات اور عرصہ دراز سے گزاری جانے والی آرام دہ زندگی کے باعث اس کے لیے یہ سفر تکلیف دہ ظاہر ہو رہا تھا اور اس کی صحت واضح طور پر متاثر نظر آتی تھی۔

''آپ میرے محسن ہیں۔ آپ دن رات کے کسی بھی حصے میں مجھے طلب کریں، میرے لیے آپ کا بلاوا بے وقت نہیں ہوسکتا۔ ہاں، مجھے اس بات پر تشویش ضرور ہے کہ آپ اس وقت آرام کرنے کے بجائے کن مسائل کی وجہ سے جاگنے پر مجبور ہیں؟'' گزرتے وقت کے ساتھ وہ شمس الدین کا احترام کرنے لگا تھا۔ وہ ایک باعلم اور باکردار انسان تھے جنہوں نے ایک طرف امیر ارغل کا نمک حلال کیا تھا تو دوسری طرف اسے بے قصور پا کر اس کی بھی ممکنہ مدد کی تھی۔ اگر وہ اس کے لیے یہ سب نہ کرتے تو آج وہ موجودہ مقام پر نہیں ہوتا۔

''میری عمر میں انسان کو زیادہ نیند نہیں آتی۔ میں تو بستر پر لیٹ کر بھی عموماً کروٹیں ہی بدلتا رہتا ہوں۔'' انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''نیند نہ بھی آئے تو آپ کے لیے آرام کرنا مناسب ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ آپ کے لیے یہ سفر خاصا سخت ہے۔''

''میں اس حقیقت سے انکار نہیں کروں گا لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہندوستان پہنچنے کا یہ مختصر اور محفوظ زمینی راستہ میرے سوا کسی کے علم میں نہیں ہے۔ میری راہنمائی کے بغیر صرف نقشوں کے سہارے سفر کرنے میں قافلے کے بھٹک جانے کا اندیشہ تھا اس لیے امیر محترم نے بہ اصرار مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔'' ان کے چہرے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے بھی تھکن جھلک رہی تھی۔

''جی ہاں! میں نے سنا ہے کہ آپ برسوں پہلے اس راستے سے گزر کر ہندوستان سے آئے تھے۔ آپ نے اتنا طویل سفر تنہا تو طے نہیں کیا ہوگا۔ یقیناً کچھ اور لوگ بھی آپ کے ساتھ ہوں گے تو کیا ان میں سے کوئی فرد جو عمر میں نسبتاً عالم سے کم ہو، دستیاب نہیں ہوسکتا تھا؟'' اس کی ذہین و پرتجسس آنکھیں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ان سے اس کا سوال ٹالا نہیں گیا اور آہستہ سے مسکرا کر بولے۔

''یقیناً میں اس سفر میں تنہا نہیں تھا۔ میرے ساتھ میرے دو دوست، ان کے اہلِ خانہ اور چند ملازمین بھی موجود تھے لیکن اپنے متفقہ فیصلے کے تحت ہم خطرے کی حدود سے نکلنے کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو کر الگ الگ سمتوں میں بڑھ گئے تھے۔ وہ آخری دن تھا جب ہم دوستوں نے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مجھ سے جدا ہو کر وہ کہاں گئے۔ میں البتہ اپنے ایک ملازم کے ساتھ بھٹکتا بھٹکتا امیر ارغل کے والد تک پہنچ گیا اور ان کے بعد امیر ارغل کی ملازمت اختیار کرلی۔ میرا ملازم کئی برسوں کی رفاقت کے بعد فوت ہوگیا تھا اس لیے اس کے بعد میں وہ واحد آدمی رہ گیا ہوں جسے اس راستے کا علم ہے۔'' وہ ذرا سا سانس لینے کے لیے رکے، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

''ویسے اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ وہ ملازم زندہ ہوتا تو بھی اسے راستے کے بارے میں کچھ یاد ہوتا۔ وہ ایک ان پڑھ اور اوسط سے نچلے درجے ذہانت کا مالک انسان تھا جس پر بھروسا کر کے اتنا پیچیدہ سفر اختیار نہیں کیا جاسکتا تھا۔''

''آپ نے اتنے طویل عرصے تک وہ راستہ، جس پر آپ نے پوری زندگی میں صرف ایک بار سفر کیا، کیسے یاد رکھا؟ کیا آپ پُریقین ہیں کہ آپ کو آج بھی سب کچھ اچھی طرح یاد ہے؟'' وہ ذرا سی تشویش میں مبتلا ہوا۔ اس کا انداز دیکھ کر شمس الدین ہنس پڑے، پھر ذرا افتخارانہ انداز میں بولے۔

''میں اور میرے دونوں دوست اپنی ریاست کے ذہین ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میرے دونوں دوست حیات ہوئے تو انہیں بھی وہ راستہ بہت اچھی طرح یاد ہوگا۔ البتہ تمہاری تسلی کے لیے میں اتنا بتاتا چلوں کہ دورانِ سفر میں نے کچھ یادداشتیں محفوظ کرلی تھیں اور بعد میں سکون میسر آنے پر تفصیلی نقشے بھی تیار کرلیے تھے۔ وہ نقشے آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں اور اس وقت تمہیں اور سلیمان کو مدعو کرنے کا مقصد یہی ہے کہ تم دونوں کو وہ نقشے اچھی طرح سمجھانے کے ساتھ ساتھ چند ضروری ہدایات بھی دے دوں تاکہ آگے کوئی دشواری پیش آئے تو تم دونوں مل کر اس کا حل نکال لو۔''

''آپ کے ساتھ موجود ہوتے ہوئے اس کی کیا ضرورت ہے استادِ محترم؟'' سلیمان نے گفتگو میں پہلی بار دخل دیا تو اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے بھی تشویش جھلک رہی تھی۔

''زندگی کے سفر میں کب کون ساتھ چھوڑ جائے، کسے

خبر ہوتی ہے۔ میں تو ویسے بھی عمر کے اس حصے میں ہوں کہ آدمی خود کو چراغِ سحر تصور کرنے لگتا ہے۔ ایسے میں تھوڑی احتیاط کر لینا مناسب ہے تاکہ باقی لوگوں کا سفر کھوٹا نہ ہو۔'' انہوں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

''آپ کی ایسی باتیں میرے دل کے لیے باعثِ تکلیف ہیں۔'' سلیمان جذباتی ہو گیا۔ وہ بہت چھوٹی عمر سے شمس الدین کے ساتھ تھا اس لیے اس کی ان کے ساتھ جذباتی وابستگی تھی۔

''موت ایک کائناتی سچائی ہے سلیمان! اس کے لیے دنیا کے ہر بشر خصوصاً میری عمر کے شخص کو ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔ تم بھی اس حقیقت کو سمجھو اور جذباتیت میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس پر توجہ دو جو میں تمہیں بتانا اور سمجھانا چاہتا ہوں۔''

اس یاران کے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ایک قطعیت سی تھی۔ سلیمان کے پاس مزید تعرض کی گنجائش نہیں رہی۔ ساشا تو پہلے ہی ان حقیقتوں کا آشنا تھا۔ اس لیے شمس الدین کو پسند کرنے کے باوجود ایسی کسی جذباتیت کا شکار نہیں ہوا تھا۔

''یہاں میرے قریب آؤ اور اس نقشے کو دیکھو۔'' انہوں نے حکم دیا تو وہ اور سلیمان ان کے مزید قریب چلے گئے۔ وہ انہیں رنگین لکیروں اور علامات کی مدد سے تیار کردہ اس نقشے کے ذریعے راستے کے پیچ وخم سے آگاہ کرنے لگے۔ جوں جوں وہ وضاحت کرتے گئے، ساشا کی پیشانی کے بل بڑھتے گئے اور دل کی دھڑکنیں منتشر ہوتی چلی گئیں۔ یہ وہی راستہ تھا جس پر اس کو بہت پہلے سفر کرنا چاہیے تھا لیکن پہلے باپ کی موت کے صدمے، پھر مطربہ کے عشق اور بعد میں حالات کی الٹ پلٹ نے اسے موقع ہی نہیں دیا کہ وہ یہ سفر کر پاتا۔

''یہ یہاں، اس جگہ دیکھو۔ اس تنگ درّے سے گزرنے کے بعد تقریباً ایک دن کا سفر کر کے جب تم اس مقام تک پہنچو گے تو تمہیں یہاں انسانی آنکھ سے مشابہ ایک چٹان دکھائی دے گی۔ اس مقام سے آگے بڑھنے کے بعد تمہیں جلد ویرانوں سے نجات مل جائے گی اور چھوٹی چھوٹی انسانی آبادیاں ملنا شروع ہو جائیں گی۔'' وہ نقشے پر مختلف مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے بتا رہے تھے لیکن ساشا کی نظریں اس مقام پر ہی اٹک گئی تھیں جہاں انہوں نے انسانی آنکھ سے مشابہ چٹان کی موجودگی کی نشاندہی کی تھی۔ یہی تو وہ مقام تھا جہاں جانے کی اسے اس کے باپ سردار امان نے نصیحت کی تھی۔ اس وقت اس نے باپ کی نصیحت کو ٹال دیا تھا لیکن اب قسمت خود اسے اس طرف لے جانے پر مصر تھی۔

''کن خیالوں میں گم ہو ساشا! استادِ محترم تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں؟'' سلیمان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پکارنے پر وہ اپنے بھٹکے ہوئے خیال کو جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''معذرت چاہتا ہوں، میں کسی سوچ میں گم ہو گیا تھا۔'' اس نے قدرے جھینپے ہوئے انداز میں اپنی غائب دماغی کی وضاحت دی۔

''میں تم سے پوچھ رہا تھا کہ تم ایک تاجر ہو تو کیا کبھی تمہارا ہندوستان جانے کا اتفاق ہوا ہے؟''

''جی نہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ خواہش کے باوجود میں کبھی وہاں نہیں جا سکا۔ البتہ میرے والد وہیں سے آئے تھے اور میں نے ان کی زبانی وہاں کے بہت سے قصے سن رکھے ہیں۔'' شمس الدین کو جواب دیتے ہوئے وہ ان کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اس راستے سے ان کے ساتھ ہندوستان سے آنے والوں میں ان کے دو دوست اور ان کے اہلِ خانہ شامل تھے تو کیا ان کے ان دوستوں میں سے ایک اس کا اپنا باپ سردار امان بھی تھا؟

''تمہارے والد ہندوستان کے کس علاقے کے رہنے والے تھے؟'' اس کے جواب نے شمس الدین کے لیے مزید سوالات کی راہ کھول دی۔

''یہ تو مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، بس اتنا خیال ہے کہ انہوں نے دہلی کے آس پاس ہی کسی ریاست کا ذکر کیا تھا۔'' اس نے بات بنائی۔ حقیقت یہ تھی کہ اسے نہیں معلوم تھا کہ سردار امان ہندوستان کے کس حصے سے ہجرت کر کے آیا تھا۔ اسے تو یہ بات بھی سردار نے اپنی موت سے ذرا پہلے ہی بتائی تھی کہ اس کا تعلق ہندوستان سے تھا۔

''کیا تمہارے والد بھی تمہاری طرح تاجر پیشہ تھے؟''

''جی ہاں۔''

''پھر تو کوئی مجبوری ہی رہی ہوگی کہ وہ دوبارہ ہندوستان نہیں گئے۔ آدمی ہندوستان سے واقف ہو اور تاجر ہوتے ہوئے وہاں کی وسیع منڈی کا رخ نہ کرے، ایسا بلاسبب نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے تبصرہ کیا جس پر وہ خاموش ہی رہا۔

''تمہیں اپنے سفر میں بہت احتیاط کی ضرورت

ہے، ساشا! صفیہ بیگم نے امیر کے سامنے تمہارے متعلق جو شوشا چھوڑا تھا، اسے بات مل جانے کے باوجود غیر اہم نہ مانو۔ فی الحال امیر تمہاری خدمات کی وجہ سے خاموش ہیں لیکن تمہارے ڈاکو ہونے کا خدشہ کسی کانٹے کی طرح ان کے دل میں گڑا ہوا ہوگا۔ وہ ایک بڑی دولت کے حصول کے لیے یہ سفر کررہے ہیں۔ دولت حاصل ہونے کے بعد یہ خیال انہیں بے چین کردے گا کہ ایک ڈاکو ان کے ساتھ ہے جو ان سے ان کی دولت چھین سکتا ہے۔''

''اور شاید وہ اس ڈر سے نجات کے لیے اپنے دل میں گڑا کانٹا نکال پھینکنے کی کوشش کریں۔'' اس نے شمس الدین کے خدشات سے اخذ کیا جانے والا نتیجہ تلخ لہجے میں ان کے سامنے رکھ دیا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے اس اندازے کی تردید نہیں کرسکوں گا۔'' انہوں نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

''پھر میرے لیے آپ کا کیا مشورہ ہے؟ کیا میں چپکے سے فرار ہوکر اپنی جان بچانے کا انتظام کرلوں؟'' اس نے ان کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

''مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے ایسا کوئی مشورہ دیا بھی تو تم اس پر عمل نہیں کرو گے۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے توجہ دوبارہ سامنے پھیلے نقشے کی طرف مبذول کرلی۔

''آپ کے خلوص پر مجھے پورا بھروسا ہے۔ بے فکر رہیے، اتنی آسانی سے کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' وہ ہمیشہ کی طرح پُراعتماد تھا۔

''یہ چہرہ کسی ڈاکو کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ میں اس چہرے پر کسی جنگجو حکمران کا سا جلال دیکھتا ہوں۔'' شمس الدین نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے یکدم پہلے والے موضوع پر واپس آگئے۔

''ہاں تو میں تم لوگوں کو بتا رہا تھا کہ یہاں سے چھوٹی چھوٹی آبادیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ عموماً آبادیوں میں بسنے والے لوگ بے ضرر ہوتے ہیں لیکن اگر کسی بات پر مزاج بگڑ جائے تو ان کی متقسم مزاجی سے جان چھڑانا آسان نہیں ہوتا۔ ہمیں پوری کوشش کرنی ہوگی کہ ان لوگوں کو ناراض ہونے کا موقع دیے بغیر ان کے درمیان سے نکل جائیں۔'' وہ ہدایات دیتے رہے جنہیں وہ اور سلیمان توجہ سے سن کر ذہن نشین کرتے چلے گئے۔

''اب تم لوگ جاؤ، جاکر آرام کرو۔ میں نے تمام بنیادی نکات تو تم لوگوں کو سمجھا دیے ہیں۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو دوبارہ تمہیں زحمت دے دوں گا۔''

رات خاصی گہری ہوچکی تھی اور وہ پہلے سے بھی زیادہ نحیف اور تھکان زدہ دکھائی دینے لگے تھے چنانچہ وہ دونوں فوراً ہی ان کے خیمے سے رخصت ہوگئے۔

''استادِ محترم کے احتیاط کے مشورے کو نظر انداز مت کرنا میرے دوست! عورتوں کی چالیں بہادر مردوں کی تلوار سے زیادہ کاٹ دار ہوتی ہیں۔''

رخصت ہوتے ہوئے سلیمان نے اس سے یہ الفاظ کہے تو اس کی نظریں امیر ارغل کے خیمے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے بھی خیمے میں غائب ہونے والا وہ نسوانی ہیولا دیکھ لیا تھا جس کے بارے میں وہ کسی تصدیق کے بغیر بھی یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ صفیہ بیگم کے علاوہ کوئی اور عورت نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆

''بہت عجیب بات ہے کہ آپ کو ان صاحب کا نام معلوم کرنے کا خیال نہیں آیا۔'' داؤد اور پُراسرار نوجوان کی ملاقات کا احوال سن کر سارہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''بس کچھ ایسے عجیب ڈھب سے ملاقات ہوئی کہ تعارف کا مرحلہ ہی نہیں آیا۔'' اس نے کچھ جھینپتے ہوئے سے انداز میں وضاحت دی۔

''خیر! جو بھی ہے، اس ملاقات کے بعد سردار مراد کا کردار اور بھی مشکوک نظر آنے لگا ہے۔ آگ نے ہمارا جو اسباب جلا کر خاکستر کیا ہے، اس میں خیمے بھی شامل ہیں۔ خیموں کی غیر موجودگی میں طویل سفر جاری رکھنا تقریباً ناممکن سی بات ہے۔'' وہ اسے زیادہ شرمندہ کرنے کے بجائے مسائل پر گفتگو کرنے لگی۔

''اس سلسلے میں میری سردار مراد سے بات ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جلد از جلد ہمارے لیے خیموں کا انتظام کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''اگر اس کی نیت ہی درست نہیں ہے تو اس کے کسی قول کا کیا بھروسا.....'' اس نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے اردگرد نظر دوڑائی۔ وہ دونوں جس چھوٹی پہاڑی پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ آبادی سے تھوڑا ہٹ کر تھی اس لیے اس بات کا خدشہ نہیں تھا کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کسی کے کان میں پڑ سکے تاہم یہ پہاڑی اتنی دور بھی نہیں تھی کہ وہاں سے آبادی انہیں دکھائی نہیں دیتی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے وہ مکانات، مسجد اور چھوٹے سے بازار کو دیکھ سکتے تھے۔ بازار

میں اس وقت خریداروں کی چہل پہل جاری تھی۔

''سردار کی نیت پر تو مجھے بھی زیادہ بھروسا نہیں رہا ہے لیکن اللہ نے جو ایک نیا وسیلہ پیدا کر دیا ہے، اس سے امید ہے کہ ہمارے لیے بہتری کی صورت نکل آئے گی۔ وہ شخص اجنبی اور پُراسرار ضرور تھا لیکن اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ میں خود کو اس پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور پا رہا ہوں۔''

''کوئی بھی فیصلہ اکیلے کرنے کے بجائے آپ کو اپنے قریبی ساتھیوں سے مشاورت کر لینی چاہیے۔'' ابھی تک یہ معاملہ اس کے اور داؤد کے درمیان ہی تھا لیکن اس وقت اس نے ضرورت محسوس کی کہ دیگر ساتھیوں کو بھی اس معاملے میں شامل کر لیا جائے۔

''ضرورت محسوس ہوئی تو میں ایسا ضرور کروں گا۔'' داؤد کے جواب سے ظاہر تھا کہ وہ اس کے مشورے پر فوری عمل کا ارادہ نہیں رکھتا، پھر اس نے موضوع بھی بدل دیا۔ ''ثریا اور طیبہ کا کیا حال ہے؟ کچھ بہتری آئی ان کی کیفیت میں؟''

''ثریا نے خود کو سنبھال لیا ہے اور ایک بار پھر دیگر خواتین کا حوصلہ بڑھانے میں مصروف ہے۔ البتہ طیبہ کی حالت میں زیادہ بہتری نہیں آئی ہے۔ سردار مراد کا معالج اسے سکون آور ادویات کا استعمال کروا کر ذہنی دباؤ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔'' اس نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''اللہ اس خاتون کے غم کے مداوے کی کوئی صورت نکالے گا۔ اب تم واپس جاؤ اور فی الحال کسی سے اس معاملے میں بات نہیں کرنا۔ مجھے شک ہے کہ ہمارے معاملات سے باخبر رہنے کے لیے کچھ جاسوس لازماً سن گن لیتے پھرتے ہوں گے۔ اس الگ تھلگ جگہ تمہیں ملاقات کے لیے بلوانے کا مقصد بھی یہی تھا۔''

''میں خیال رکھوں گی۔'' وہ مختصر یقین دہانی کروا کر وہاں سے رخصت ہوگئی۔ داؤد اپنی جگہ بیٹھا اس وقت تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی نظروں کی حدود میں رہی۔ جب اس نے سردار مراد کی قیام گاہ کی طرف جانے والے موڑ پر قدم رکھا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے لیے گویا وہاں بیٹھے رہنے کا مقصد ختم ہوگیا اور خود بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر سست روی سے آبادی کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی بازار کے قریب ہی پہنچا تھا کہ لطیف سے ٹکراؤ ہوگیا۔

''آپ کہاں تھے اخی؟ میں آپ کو کب سے تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ یہاں بڑا ہنگامہ مچا ہوا ہے اور سردار مراد نے آپ کو طلب کیا ہے۔'' اس کی صورت دیکھتے ہی لطیف نے تیز تیز لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔

''کیسا ہنگامہ؟'' وہ تشویش میں مبتلا ہوا۔

''سردار مراد کے آدمیوں نے ایک مشکوک شخص کو گرفتار کیا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ وہ شخص کھانے میں خواب آور دوا ملا کر ہمارے قافلے کے افراد اور سردار کے پہرے داروں کو بے ہوش کرنے کے جرم کا ذمے دار ہے۔'' لطیف کی دی اطلاع خاصی سنسنی خیز تھی۔ داؤد کے قدم خود بخود تیزی سے سردار مراد کی قیام گاہ کی طرف جانے والے راستے پر اٹھنے لگے۔ لطیف اس کے ساتھ تھا۔ قیام گاہ پہنچنے پر اس کی صورت دیکھ کر پہرے داروں نے فوراً اسے اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ وہ پُرجوش سا مردوں کے ملاقاتی حصے میں پہنچا تو وہاں کی صورتِ حال دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ وہاں موجود ہر شخص کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات تھے اور وسط میں ایک ایسی لاش پڑی تھی جس کے منہ، ناک اور کانوں سے خون رس رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' اس نے سردار مراد کے کھنچے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرے آدمیوں نے سخت محنت کر کے اس شخص کا کھوج لگایا تھا جو پہلی رات کے واقعے کا ذمے دار تھا۔ اس آدمی سے تفتیش کر کے ہم اپنے خلاف سازشیں کرنے والے اصل شخص تک پہنچ سکتے تھے لیکن اس شخص نے خودکشی کر کے ہمارے سارے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔'' سردار مراد نے شکستہ لہجے میں اسے بتایا۔

''جب بھی سازشی ٹولے کا کوئی فرد گرفتار ہوا، ہمیں اسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔'' یہ کوئی اور تھا جس کے کیے تبصرے نے داؤد کو چونکا دیا۔

''اگر یہ حقیقت ہے تو اس شخص کو گرفتار کرتے ہی آپ کو اس بات کو یقینی بنانا چاہیے تھا کہ یہ خودکشی نہ کر سکے۔'' اس نے اعتراض کھڑا کیا۔

''اس کی گرفتاری کے بعد پہلا کام اس کی تلاشی لینے کا ہی کیا گیا تھا لیکن نہ جانے اس نے کس جگہ وہ مہلک زہر چھپایا ہوا تھا جس نے تفتیش کا عمل شروع ہوتے ہی اس کا کام تمام کر دیا اور ہم ہمیشہ کی طرح خالی ہاتھ رہ گئے۔'' سردار مراد نے پریشانی کے عالم میں اپنا سر تھام لیا۔

''اس بات کا مطلب ہے کہ آپ ہماری آمد سے قبل بھی حادثات کا شکار ہوتے رہے ہیں؟''

''بالکل! اس سے قبل میرا ایک نائب پراسرار طور

پر قتل کر دیا گیا تھا۔ ہم قاتل تک پہنچ بھی گئے تھے لیکن اس نے بھی اسی طرح خودکشی کر لی۔ بعد میں چند دوسرے افراد بھی شک میں گرفتار کیے گئے۔ ان افراد میں سے دو نے خودکشی کر کے اپنی زندگیاں ختم کر لیں جبکہ باقی تفتیش پر بے گناہ ثابت ہوئے۔'' سردار مراد اسے حالات سے باخبر کر ہی رہا تھا کہ عورتوں کے رونے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔

''یہ لاش یہاں سے اٹھواؤ۔'' سردار نے گھبرائے ہوئے لہجے میں حکم دیا اور خود عجلت میں باہر کی طرف لپکا۔ داؤد سمیت چند دوسرے لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔

''قاتل، ظالم، لعنتی.....'' سردار کو دیکھتے ہی عورتوں نے جو کہ دربان کو دھکے دیتی ہوئی اندر آ گھسی تھیں، چلّانا شروع کر دیا۔ سردار کا چہرہ احساسِ توہین سے سرخ پڑ گیا اور وہ سخت لہجے میں بلند آواز سے بولا۔

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ مرنے والے نے خودکشی کی ہے۔ یقیناً وہ انہی بھٹکے ہوئے نوجوانوں میں شامل تھا جو اس طرح خودکشی کر کے مرنے میں اپنے لیے جنت کی امید رکھتے ہیں۔''

''ہمیں تیرے جیسے جہنمی کی باتوں کا کوئی بھروسا نہیں۔ تُو اپنے مخالفوں کو دھوکے سے قتل کروا کے ان پر خودکشی کا جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ میرے جوان بیٹے کا قتل بھی تیری گردن پر ہے۔'' غم و غصے سے نڈھال ایک درمیانی عمر کی عورت حلق کے بل دہاڑی اور سینہ کوبی کرنے لگی۔ اس کے ساتھ آنے والی عورتیں بھی اس عمل میں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے سردار کی مخالفت میں نعرے بھی لگ رہے تھے۔ سردار کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شدید غصے میں ہے اور کسی نہ کسی طرح ان عورتوں کو وہاں سے ہٹا دینا چاہتا ہے لیکن مصلحتاً ضبط سے کام لے رہا ہے۔

ابھی وہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کوئی حکم صادر نہیں کر سکا تھا کہ باہر سے مردانہ آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ آوازوں پر غور کرنے سے اندازہ ہوا کہ مرد بھی سردار کے خلاف نعرے لگا کر وہی الزام دہرا رہے ہیں جو اس سے پہلے عورتوں نے عائد کیا تھا۔ ان کے نزدیک بھی سردار قاتل اور سازشی تھا۔ مردانہ نعرے سن کر عورتوں کا جوش و خروش مزید بڑھ گیا اور وہ پہلے سے زیادہ بلند آہنگ میں نعرے لگانے لگیں۔ ایک طرف خاموشی سے کھڑا داؤد عورتوں کے نفرت بھرے جذبات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ یہ نفرت صرف آج کے واقعے کا ردِعمل نہیں بلکہ ان کے دلوں میں کافی عرصے سے سردار کے لیے نفرت بھرے جذبات جمع ہیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک عورت نے پتھر اٹھایا اور سردار کی طرف اچھال دیا۔ پتھر سردار کے ماتھے پر آ کر لگا اور فوراً ہی وہاں سے خون پھوٹ پڑا۔ اس پہلے پتھر کے ساتھ ہی مزید پتھر برسانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سردار سمیت اس کے ساتھ موجود تمام افراد کو عجلت میں اندر کی طرف بھاگنا پڑا۔ بھاگ کر اندر پناہ لینے والوں میں داؤد بھی شامل تھا۔

''یہ لوگ پاگل ہو گئے ہیں کیا؟'' ماتھے سے بہنے والے خون کو روکنے کے لیے زخم پر ایک کپڑا رکھ کر دباتے ہوئے سردار غصے سے بولا۔

''جوان اولاد کی موت پر کوئی بھی پاگل ہو سکتا ہے۔'' کسی نے تبصرہ کیا۔

''خبر اتنی جلدی باہر نکالنے کی حرکت کس نے کی؟'' سردار نے غرا کر پوچھا لیکن وہاں کوئی جواب دینے والا نہیں تھا۔ ایسے میں اس کا خاص آدمی کبیر آگے بڑھا اور دلاسا دینے والے انداز میں بولا۔

''آپ حوصلے سے کام لیں سردار! میرے جیسے جاں نثاروں کے ہوتے ہوئے کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں ابھی ان سارے مظاہرین کو منتشر کروا دوں گا۔'' وہ ایک دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ وہ سب اندر دم سادھے بیٹھے ان نعروں کو سنتے رہے جن کی آوازیں لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اچانک ہی ان آوازوں میں دردناک چیخوں کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لوگ شدید تکلیف سے بلبلا رہے ہوں۔ داؤد بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ایک کھڑکی سے باہر جھانکا۔ فوراً ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اوپر چھت پر سے مظاہرین پر بھاری تعداد میں پتھر برسائے جا رہے ہیں۔ لوگ ان پتھروں کی زد میں آ کر زخمی ہو رہے تھے اور اپنی جانیں بچانے کے لیے چیختے چلّاتے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔

''جسے اپنی زندگی عزیز ہے، وہ اس مکان سے دور رہے۔ اب اگر کسی نے سردار یا ان کے ساتھیوں کو نقصان پہنچانے کی حماقت کی تو ہماری طرف سے پتھروں کے بجائے تیر برسا کر جواب دیا جائے گا۔'' جب لوگ اس قدر پیچھے ہٹ گئے کہ چھت پر سے پھینکے جانے والے پتھروں کی زد سے دور نکل گئے تو چھت پر سے ہی کسی شخص نے بلند

آواز میں اعلان کیا۔ اس اعلان کو سن کر احتجاج کے لیے جمع ہجوم نے نعرے بازی کی لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں پیدا ہوئی کہ آگے آسکے۔ اس صورتِ حال نے داؤد کی طبیعت کبیدہ کردی۔

''اپنے ہی لوگوں سے ایسا سلوک نہایت ظالمانہ عمل ہے۔'' وہ خود کو اعتراض کرنے سے نہیں روک سکا۔

''میرے لیے بھی یہ کوئی پسندیدہ صورتِ حال نہیں لیکن تم دیکھ ہی چکے ہو کہ ابتدا ان کی طرف سے ہوئی تھی۔ اگر انہیں نہ روکا جاتا تو یہ بڑی تباہی مچا سکتے تھے۔ اس تباہی کی زد میں صرف میں یا میرے اہلِ خانہ نہیں آتے بلکہ تمہاری ان خواتین کو بھی نقصان پہنچنے کا احتمال تھا جو اس وقت یہاں مقیم ہیں۔'' سردار نے ناگوار تاثرات کے ساتھ اس کے اعتراض کا جواب دیا تو وہ پل بھر کے لیے خاموش ہوگیا۔ گیہوں کے ساتھ گھن کے پس جانے کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا تھا۔

''جبر سے وقتی طور پر لوگوں کو پسپائی پر تو مجبور کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے جذبات کو قابو نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، اس کے ردِعمل میں ان کے جذبات مزید بھڑکیں گے اور آپ کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ میں اس پر بحث نہیں کرتا کہ نوجوان کی موت کا سبب کیا تھا لیکن آپ کو یہ بات سمجھنی ہوگی کہ اس کے ورثاء اور اقارب اس وقت صدمے میں مبتلا ہیں۔ آپ کو اس وقت ان کے ساتھ سختی برتنے کے بجائے نرمی سے مذاکرات کرنے چاہئیں اور انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔''

''مذاکرات اس سے کیے جاتے ہیں جو بات سننے کو تیار ہو۔ تم نے ان کا آج کا طرزِ عمل دیکھ ہی لیا ہے۔ وہ تشدد پسند لوگ ہیں۔ ان کا کوئی بھروسا نہیں کہ سردار انہیں مذاکرات کے لیے بلائیں اور وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر ان پر حملہ کردیں۔'' کبیر پتا نہیں کس وقت وہاں آگیا تھا اور اب داؤد کے مشورے کے جواب میں تلخ لہجے میں اپنا موقف بیان کررہا تھا۔

''میرے خیال میں کبیر ہمارے مہمان کا مشورہ مناسب ہے۔ ہمیں ایک بار مذاکرات کی دعوت دے کر ان لوگوں کا غم و غصہ کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' ابھی داؤد، کبیر کی بات کے جواب میں کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ سردار مراد نے بھی پُرسوچ لہجے میں کہتے ہوئے اس کے موقف کی تائید کردی۔

''مگر سردار.....!'' کبیر نے اعتراض کرنا چاہا۔

''جو کہا ہے، اس پر عمل کرو۔ کیا تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص ہتھیار ساتھ لیے مذاکرات کے بہانے مجھ تک پہنچ کر مجھے نقصان پہنچا سکے؟'' سردار کا اٹل لہجہ کبیر کی زبان کو تالے لگا گیا۔ وہاں موجود دوسرے افراد کو بھی اختلاف کی جرأت نہیں ہوسکی۔

''آپ سب لوگ اپنے اپنے طور پر سوچ بچار کر کے تجاویز تیار کرلیں کہ مذاکرات کے اہم نکات کیا ہوں گے۔ دو گھنٹے بعد ایک بار پھر اکٹھے ہوکر آپس میں مشورہ کرنے کے بعد مذاکرات کے لیے ان لوگوں کو پیغام بھجوادیں گے۔'' سردار فیصلہ سنا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے جانے کے بعد کچھ لوگ وہیں رک کر آپس میں صلاح مشورے کرنے لگے جبکہ کچھ نے جگہ چھوڑ دی۔ داؤد بھی آخر الذکر افراد میں شامل تھا۔ باہر نکل کر اس نے سردار کے مکان کے وسیع احاطے میں ایک چکر لگایا۔ پہرے دار پوری طرح چوکس نظر آرہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اب تک باہر موجود ہونے کے باوجود مظاہرین نے دوبارہ حملے کی ہمت نہیں کی تھی لیکن وہ باہر موجود تھے اور وقفے وقفے سے نعرے لگا رہے تھے۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچ گیا۔ وہاں بھی پہرے دار موجود تھے اور پتھروں کے بڑے ذخیرے کے ساتھ ساتھ تیر و تفنگ سے بھی مسلح تھے۔ اس نے چھت کی منڈیر سے جھانک کر دیکھا، مظاہرین بہت بڑی تعداد میں موجود نہیں تھے لیکن انہوں نے مکان کو اس طرح گھیرے میں لیا ہوا تھا کہ مکان میں موجود افراد عملی طور پر محصور ہوکر رہ گئے تھے۔ اسے باہر موجود اپنے ساتھیوں کا خیال آیا۔ وہ یقیناً اس صورتِ حال پر پریشان ہوں گے لیکن فی الحال وہ ان سے رابطہ کرکے انہیں تسلی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والا لطیف بھی پتا نہیں کہاں غائب ہوگیا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ جس وقت ہنگامے کا آغاز ہوا، لطیف اسی وقت سے غائب تھا۔ شاید وہ پتھراؤ کے وقت جان بچا کر اندر آنے کے بجائے مکان سے باہر نکل گیا تھا۔

سردار مراد کی سوچ بچار کے لیے دی گئی دو گھنٹے کی مہلت اس نے ایسے ہی اِدھر اُدھر چکراتے ہوئے گزاری اور پھر واپس وہیں پہنچ گیا جہاں سب لوگوں کو جمع ہونا تھا۔ باقی لوگوں کے ساتھ سردار بھی تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ماتھے کے زخم پر اب پٹی بندھی ہوئی تھی اور

چہرے کے تاثرات پہلے سے زیادہ سنجیدہ تھے۔ نہایت سنجیدہ ماحول میں مشاورت کا عمل شروع ہوا۔ داؤد نے اس مشاورت میں حصہ نہیں لیا لیکن ان کی گفتگو سن کر یہ اندازہ لگانے میں کامیاب رہا کہ ان میں سے بیشتر مظاہرین کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات رکھتے ہیں اور اس ناپسندیدگی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کے مذہبی عقائد کے مخالف تھے۔ اس طرزِ فکر نے اسے پراسرار نوجوان کی یاد دلادی۔ اس نے بھی اسے یہی بتایا تھا کہ عقائد کے اختلاف کے باعث اس کے اور اس کے ساتھیوں کے خلاف انتقامی کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ داؤد پہلے ہی اس طرزِ فکر سے بیزار تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بغداد کے عیش پرست حکمرانوں نے سلطان جلال الدین کی پکار پر اپنا قومی فریضہ ادا کرنے سے جان چھڑانے کے لیے ایک ترکیب یہ بھی لڑائی تھی کہ جلال الدین کے مذہبی عقائد پر سوالات کھڑے کر کے لوگوں کے دلوں میں اس کے خلاف شکوک پیدا کردیے تھے اور بہت سے مسلمان صرف اس وجہ سے بھی اس کے ساتھ جہاد میں شامل نہیں ہوئے تھے کہ انہیں ایک غلط العقیدہ شخص کی سربراہی میں لڑ کر جہاد کا ثواب حاصل ہونے کی امید نہیں تھی۔ نتیجتاً قیصر و کسریٰ کو شکست کا ذائقہ چکھا کر طویل عرصے دنیا پر حکمرانی کرنے والے مسلمانوں کی اولادوں پر یہ وقت آگیا تھا کہ وہ قراقرم کے پہاڑوں سے اٹھنے والے وحشیوں کے آگے بے بس ہوگئے تھے اور پناہ کے لیے کرۂ ارض پر اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے تھے۔

''داؤد..... میرے دوست! میں چاہتا ہوں کہ میری طرف سے تم ان بپھرے ہوئے لوگوں تک مذاکرات کا پیغام لے کر جاؤ۔ تم یہاں مہمان ہو اور وہ تمہارا لحاظ کرلیں گے جبکہ میرے کسی ساتھی کے باہر جانے کی صورت میں اس کے لیے خطرات ہوں گے۔'' ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ ذرا دیر کے لیے حال کو فراموش کر چکا تھا۔ سردار مراد نے پکارا تو اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی بات سن کر بولا۔

''میں جانے کے لیے تیار ہوں لیکن خیال رہے کہ کسی قسم کا دھوکا نہیں ہونا چاہیے ورنہ میرے اپنے ساتھیوں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ جائیں گی۔''

''تم اطمینان رکھو، جو کچھ ہوگا تمہیں بھی اس میں شامل رکھا جائے گا۔'' سردار کو اگرچہ اس کے الفاظ ناگوار گزرے تھے لیکن اس نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر میں ہی داؤد سفید جھنڈا ہاتھ میں تھامے مکان سے باہر جارہا تھا۔ باہر موجود مظاہرین نے اسے دیکھ کر پُرتشدد کارروائی تو نہیں کی لیکن ان کے سردار مخالف نعروں میں تیزی آگئی اور عورتیں بھی پہلے سے زیادہ بلند آواز میں بین کرتے ہوئے سینہ کوبی کرنے لگیں۔ داؤد سفید جھنڈا تھامے ان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس وقت تک خاموش رہا جب تک انہوں نے خود ہی نعرے بازی بند کر کے اس کی بات سننے کے لیے آمادگی ظاہر نہیں کی۔

''جو کچھ پیش آیا ہے، سردار مراد نے اس پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور آپ لوگوں کے لیے پیغام بھیجا ہے کہ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے بجائے مل بیٹھ کر تصفیہ کرلیتے ہیں۔ آپ اپنے درمیان سے چند افراد کو منتخب کر کے سردار اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مذاکرات کے لیے بھیج دیں۔''

''قاتل سے کوئی بات نہیں ہوگی۔ خونی سے تصفیے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' کچھ لوگوں نے جوش میں چلّانا شروع کردیا لیکن پھر ان ہی کے درمیان سے چند افراد نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے ان کا جوش و خروش ٹھنڈا کیا اور آپس میں مشاورت کرنے لگے۔

''ہم مذاکرات کے لیے تیار ہیں لیکن ہمارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔'' آخر کار فیصلہ سنایا گیا۔

''میں ضمانتی ہوں۔ میں پورا خیال رکھوں گا کہ آپ لوگوں کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔'' داؤد نے انہیں یقین دہانی کروائی۔ کچھ دیر میں وہ ان میں سے چار افراد کے ساتھ واپس اندر جارہا تھا۔ اندر جانے سے پہلے ان سب کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ اس سلوک پر وہ کچھ جز بز تو ہوئے لیکن تعاون سے انکار نہیں کیا۔ کچھ دیر میں ہی دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔

''جو کچھ ہوا مجھے اس پر بہت افسوس ہے۔ ہمارے درمیان کچھ اختلافات سہی لیکن میں نے یہ بات کبھی فراموش نہیں کی کہ آپ میرے اپنے ہیں اور اپنوں کے نقصان پر انسان ہمیشہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔'' گفتگو کا آغاز سردار مراد نے ہی کیا۔ آنے والے سرد تاثرات لیے اس کی بات سنتے رہے۔

''آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے داؤد بن معیز اور ان کے قافلے کو اپنے علاقے میں پناہ دی ہے اور ان کی حفاظت و دیکھ بھال کی ذمے داری نبھانا میرا فرض ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنوں ہی کے درمیان کچھ شرپسند عناصر کی وجہ سے میں یہ ذمے داری خوش اسلوبی سے نبھانے میں ناکام رہا ہوں۔ اپنی اس ناکامی کی تلافی کے لیے مجرموں کو

تلاش کرنا میرا فرض بنتا تھا۔ میرے آدمیوں نے بڑی عرق ریزی کے بعد سازشی عناصر کے ہاتھوں میں کھیلنے والے اس نوجوان تک رسائی حاصل کی تھی جس کی خودکشی نے آپ سب کو اس قدر مشتعل کردیا ہے کہ آپ ہر قسم کے لحاظ و مروت کو بالائے طاق رکھ کر میرے گھر کا محاصرہ کیے کھڑے ہیں۔ آپ خود ہی فہم و فراست سے کام لے کر جواب دیجیے کہ کیا میرا سازش میں ملوث اس نوجوان کو گرفتار کروانا کوئی غلط فعل تھا؟ یا اس کا خودکشی کرلینا میرا جرم ہے جو آپ لوگ میرے خلاف یوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟'' بولتے بولتے سردار کی آواز غصے سے ذرا بلند ہوگئی۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس نے خودکشی نہیں کی، تم نے اسے قتل کروایا ہے۔'' مذاکرات کے لیے آنے والوں میں سے ایک تیس پینتیس سالہ شخص سردار سے بھی زیادہ بلند آواز میں چلایا۔

''مجھے اس سے اس کے ساتھیوں کے نام معلوم کرنے تھے اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں اسے قتل کروا کر معلومات کے اتنے اہم ذریعے کو کھو دیتا۔'' سردار نے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے دلیل دی۔

''ایسا تم نے خود اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے کیا ہے۔ اصل سازشی تم خود ہو اور دوسروں پر جھوٹے الزامات لگا رہے ہو۔'' ایک اور شخص نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے جواب دیا۔ اس کی بے باکی میں داؤد کو بغاوت کی آگ بھڑکتی دکھائی دی۔ حقیقتاً وہ ایک ایسے شخص کا چہرہ تھا جسے اپنے حق پر ہونے کا کامل یقین ہو۔

''سردار سے گستاخی سے بات مت کرو۔'' اس شخص کے لہجے نے سردار کی پشت پر کھڑے کبیر کو مشتعل کردیا اور اس نے ایک جھٹکے سے تلوار نیام سے باہر نکال لی۔

''ہمیں نہتا کرکے ہم پر ہتھیار اٹھانا تمہارے بدعہد ہونے کی نشانی ہے اور بدعہدوں کے ساتھ مذاکرات و معاہدے کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔'' وہ شخص سخت طیش میں کہتا ہوا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ لوگ شدید غصے میں مذاکرات کیے بغیر وہاں سے جانے والے ہوں۔ اس صورتِ حال نے داؤد سمیت ہر شخص کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔ خود سردار مراد اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھ جایئے۔ آپ سب بیٹھ کر سکون سے بات کیجیے۔'' عالمِ اضطراب میں وہ اپنی جگہ چھوڑ کر مشتعل شخص کے قریب آ کھڑا ہوا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اگلا پل اس سمیت وہاں موجود ہر شخص کے لیے حیرت انگیز تھا۔ کیا ہوا، یہ تو کسی نے بھی واضح طور پر نہیں دیکھا، بس سردار کی چیخ سنائی دی اور بائیں پہلو پر جمے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان سے سرخ مائع بہتا ہوا دکھائی دیا۔ بے ساختہ ہی کئی لوگ اسے سنبھالنے کے لیے آگے بڑھے۔ اس دوران سردار کو نشانہ بنانے والے سمیت اس کے تمام ساتھی باہر کی طرف دوڑ لگا چکے تھے۔

''پکڑو۔ جانے نہ پائیں۔'' چند افراد للکارتے ہوئے ان کے پیچھے لپکے۔

''زخم پر کپڑا رکھ کر پٹی باندھو..... طبیب کو بلاؤ.....'' وہاں موجود ہر شخص اپنی بولی بول رہا تھا۔ داؤد باہر کا رخ کرنے والوں کے پیچھے لپکا۔ باہر ایک خونیں منظر اس کے سامنے تھا۔ فرار کی راہ اختیار کرنے والوں میں سے ایک کا سر تن سے جدا ہوچکا تھا اور اس کا سر سے محروم دھڑ کھلے احاطے میں پڑا پھڑک رہا تھا۔ ایک مفرور کا بازو کٹ کر گر گیا تھا اور وہ اس کٹے ہوئے بازو سے بے نیاز اپنے پیچھے خون کا ایک آبشار سا گراتا ہوا کھلے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ دروازے کی دوسری طرف اپنے ساتھیوں کی واپسی کے منتظر ین پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔

''دروازہ بند کردو۔ ایک بھی فرد باہر نہ جانے پائے۔'' کسی نے چیخ کر حکم دیا تو دربانوں نے پھرتی سے بھاری دروازے کے دونوں پٹ دھکیلنے شروع کردیے۔

''رک جاؤ۔ مت مارو انہیں۔'' داؤد چیخ کر بولا تو اپنی پھٹی پھٹی آواز خود اسے بھی اجنبی لگی۔ وہاں ہا ہنگامے میں کسی کو اس کی پکار سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک لاش اور گر گئی۔ شور بے تحاشا بڑھ گیا۔ یہ صرف مرنے اور مارنے والوں کا شور نہیں تھا۔ یہ ان محاصرین کی بھی آوازیں تھیں جنہوں نے اپنے ساتھیوں کو مرتے ہوئے دیکھ کر فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے بھرا مار کر بند ہوتے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ ان کی یہ کوشش جزوی طور پر ہی کامیاب ہوسکی۔ یکا یک ہی چھت پر تعینات افراد کی طرف سے ہونے والی تیروں کی بارش نے انہیں زخمی ہوکر گرنے اور پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ جو چند افراد اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے تھے، ان کا انجام اور بھی برا ہوا۔ احاطے میں موجود تیغ زنوں نے انہیں کاٹ کر رکھ دیا۔

حقیقتاً اس وقت وہ احاطہ ایک میدانِ کارزار کا منظر پیش کر رہا تھا جہاں دم توڑتے، چیختے چلّاتے انسانی جسموں سے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ایک ناظر کی حیثیت سے اس منظر میں موجود داؤد کے مشاہدے میں یہ بات خاص طور پر آئی کہ مرنے والوں کی اکثریت مسلح نہیں تھی لیکن سردار مراد کے آدمیوں نے ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برتی تھی۔ میدانِ جنگ کی خون ریزی اور سفاکی کی گواہ اس کی آنکھوں کے لیے انسانی خون کی یہ ارزانی کوئی نئی بات نہیں تھی پھر بھی وہ لرز کر رہ گیا۔ شاید اس لیے کہ اس لڑائی میں در رے فریق کو ہتھیار استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اسی وقت اس نے کبیر کو باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔

''یہ کیا کیا تمہارے لوگوں نے؟ اتنا خون بہانے کے بعد تم محاصرین سے کیسے مذاکرات کر پاؤ گے؟'' وہ سخت رنج وغصے کی کیفیت میں کبیر پر برس پڑا۔

''سردار پر حملہ کرنے والوں کے ساتھ یہ اس کے سوا کیا سلوک کر سکتے تھے؟'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔

''سردار کا کیا حال ہے؟ کیا اس کا زخم بہت زیادہ گہرا ہے؟'' اسے سردار کی فکر لاحق ہوئی۔

''حملہ آور نے چھوٹے پھل کا لیکن انتہائی تیز دھار خنجر استعمال کیا ہے۔ خنجر کی تیز دھار نے کئی رگیں کاٹ کر رکھ دی ہیں جس کی وجہ سے خون تیزی سے بہا ہے لیکن ہمیں خون کے بہاؤ سے زیادہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں وہ خنجر زہر میں بجھا ہوا نہ ہو۔ طبیب اپنے طور پر سردار کی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔ دعا کرو اس کی یہ کوشش رنگ لائے۔'' کبیر نے قدرے تفصیل سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''خنجر کے زہر میں بجھے ہوئے ہونے کا اندیشہ کیوں ہے؟'' داؤد نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمارا تجربہ ہے کہ ان لوگوں میں زہر کا استعمال عام ہے۔ انہیں خود مرنا ہو یا دوسروں کو مارنا ہو، عموماً زہر ہی کا انتخاب کرتے ہیں۔''

''کون ہیں یہ لوگ؟''

''کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہمارے درمیان ہی سے کسی موقع پر اچانک کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اس طرح کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا اور وہاں سے ہٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ شاید مقتولین کے سلسلے میں کچھ ہدایات جاری کرنی تھیں۔

داؤد نے دروازے کے پار سے سنائی دیتے شور کی آوازیں سنیں اور بوجھل قدموں سے اندر کی طرف مڑ گیا۔

☆☆☆

''آپ نے بتایا تھا کہ آپ اور آپ کے دونوں دوست اپنی ریاست کے ذہین اور قابل ترین افراد میں سے تھے۔ ایسے لوگوں کی تو ہر جگہ بہت قدر کی جاتی ہے۔ پھر آپ لوگوں نے ہجرت کا فیصلہ کیوں کیا؟'' اسے جب سے شبہ ہوا تھا کہ طبیب شمس الدین کے ہمراہ ہندوستان سے آنے والے دو دوستوں میں سے ایک دوست سردار امان تھا، وہ سخت متجسس ہو گیا تھا اور موقع ملنے پر ان سے اس حوالے سے کوئی نہ کوئی سوال کر ڈالتا تھا۔

''تمہاری بات غلط نہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جہاں قابل افراد کے قدر دان ہوتے ہیں، وہیں انہیں دگنی تعداد میں حاسدین کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم بھی قسمت کی ستم ظریفی اور سازشیوں کے بچھائے جال کا شکار ہو کر اپنی اس خوش باش اور عیش وعشرت کی زندگی سے محروم ہو گئے۔ عیش وعشرت تو خیر پھر سے نصیب ہو گیا لیکن دل سے وہ خوشی روٹھ گئی جو اپنے دوستوں اور ہم وطنوں کی سنگت میں حاصل ہوتی تھی۔'' انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔

''آخر ایسا کیا ہوا تھا کہ آپ دوستوں کی زندگیوں کا دھارا ہی بدل کر رہ گیا؟'' اس کے اندر کا متجسس سوال بن کر اس کے ہونٹوں پر مچلا۔

''گڑے مُردے اکھاڑ کر کیا حاصل ہونے والا ہے۔ ماضی کو ماضی ہی رہنے دو۔'' انہوں نے اسے ٹالا اور پھر یکدم ہی گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے بولے۔ ''میرا اندازہ ہے کہ ہم اس پہاڑی درّے کے قریب پہنچ چکے ہیں جس کے متعلق میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔''

''جی ہاں! نقشہ تو یہی بتا رہا ہے۔'' اس نے شمس الدین کے خیال کی تائید کی۔

''اس درّے کو پار کرتے ہی میری طرف سے امیر کو پڑاؤ ڈالنے کا پیغام دے دینا۔ آج میں زیادہ ہی نقاہت محسوس کر رہا ہوں اس لیے اس سے زیادہ سفر کا متحمل نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے اس سے کہا تو اس نے دزدیدہ نظروں سے ان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں واقعی بے حد نقاہت تھی۔ وہ جو بڑھاپے کے باوجود قصر میں قیام کے عرصے میں خاصے صحت مند اور چاق وچوبند محسوس ہوتے تھے، اس سفر میں ڈھے سے گئے تھے۔ سفر کی سختیوں نے یکدم ہی

بڑھاپے کو ان پر غالب آنے کا موقع دے دیا تھا اور مستقل بے آرامی ان پر بُرے اثرات مرتب کر رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ طبیب شمس الدین کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر ہم مستقل اسی رفتار سے سفر کرتے رہے تو ان کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔'' امیر ارغل تک طبیب کا پیغام پہنچانے کے بعد اس نے سلیمان کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

''میں پہلے ہی اس سلسلے میں امیر محترم سے بات کر چکا ہوں لیکن وہ رفتار کم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ استادِ محترم کی اسد عارد کر کے زبردستی انہیں اس سفر پر لے کر نکلے ہیں اور اب انہیں استادِ محترم کی صحت اور زندگی سے زیادہ اپنے مقصد کے حصول سے دلچسپی ہے۔ تم خود ہی سوچو کہ جس دولت نے خون کے رشتوں کی مروت نہیں رکھی، وہ ایک وظیفہ خوار ملازم کی حالت کو کیسے اپنی راہ میں حائل ہونے دے گی۔'' سلیمان کے لہجے میں تلخی بھری مایوسی تھی۔ ساشا جواباً کچھ نہ بولا۔ اسے بھی سلیمان کی بیان کردہ حقیقت کا اندازہ تھا۔ واقعی امیر ارغل جیسے آدمی سے اتنی مروت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

قافلہ اپنی معمول کی رفتار سے آگے بڑھتا رہا۔ سلیمان اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ شمس الدین کی سواری کے قریب رہیں۔ شام کے قریب سلیمان پر انکشاف ہوا کہ شمس الدین کو خاصا تیز بخار ہے۔ شاید بخار انہیں پہلے ہی سے آ رہا تھا لیکن انہوں نے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور خود ہی اپنے طور پر ادویات کا استعمال کر رہے تھے۔ اگر انہیں آرام کرنے کا موقع میسر آ جاتا تو شاید دوا اثر بھی کر جاتی لیکن مسلسل بے آرامی ان کے بوڑھے وجود کے لیے ایسا آزار بن گئی تھی جو انہیں صحت یاب نہیں ہونے دے رہی تھی۔

''آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ میں امیر کے پاس جا کر ان سے پڑاؤ ڈالنے کی درخواست کرتا ہوں۔'' شمس الدین کی حالت پر تشویش محسوس کرتے ہوئے سلیمان نے ایک بار پھر کمر باندھی۔

''نہیں۔ اب ہم درّے کے بہت قریب ہیں۔ مناسب ہوگا کہ درّہ پار کرنے کے بعد ہی پڑاؤ ڈالیں۔'' انہوں نے اسے روک دیا۔

شام کے سائے معدوم ہونے تک وہ سچ مچ اس تنگ درّے میں سفر کر رہے تھے۔ یہ وہی درّہ تھا جو داؤد کے قافلے کے پیچھے آنے والے تاتاریوں اور ان کے حلیفوں کے لیے موت کی راہ گزر ثابت ہوا تھا۔ گنتی کے چند تاتاریوں کے حلیف بستی والے بعد میں قتل ہونے والوں کی لاشیں اٹھا کر لے گئے تھے۔ چنگیز خان کی موت کے بعد اپنے معاملات کو سدھارنے اور سوگ منانے میں مصروف اس کے بیٹوں کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس غیر اہم مقام کی طرف توجہ دیتے۔ وہ اب نئی مہمات کی طرف متوجہ تھے اور ان کی نظریں دنیا کی دوسری بڑی ریاستوں پر لگی ہوئی تھیں۔ فطرتاً بزدل بستی والوں نے بھی انجان اور دشوار گزار راستوں پر داؤد اور اس کے قافلے کے تعاقب میں نکلنے اور مرنے والوں کے خون کا بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک طرح سے یہ خوارزم کے اس خانماں برباد قافلے کے لیے ایک غیبی مدد تھی کہ دشمنوں کے دل میں ان سے انتقام لینے کا خیال ہی نہیں آنے دیا تھا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ماضی قریب میں یہاں سے کوئی قافلہ گزرا ہے۔'' درے سے گزرتے ہوئے ساشا کی تیز حسیات نے اسے پیغام دیا اور اس نے سلیمان کے سامنے اپنے اندازے کا اظہار کیا۔

''استادِ محترم نے طویل عرصے پہلے اس راستے پر سفر کیا تھا تو یہ راستہ انسانی قدموں سے نا آشنا تھا لیکن اس امکان کو رد تو نہیں کیا جا سکتا نا کہ ان کے اور ان کے دوستوں کے بعد کسی اور نے بھی اس راستے کو دریافت کر لیا ہو اور اب قافلے اس راستے پر سفر کرتے ہوں۔'' سلیمان نے تدبر سے جواب دیا۔

''لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اس درّے میں کوئی خون ریز معرکہ ہوا ہے۔ میرے نتھنے انسانی خون کی بو سونگھ رہے ہیں۔'' اس بار اس کا انداز انکشاف کرنے والا تھا۔ سلیمان ششدر رہ گیا۔

''کیا تمہیں اپنے کہے پر یقین ہے؟''

''سو فیصد۔ میری حسیات نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔'' اس نے یقین سے جواب دیا۔ وہ لوگ خوراک اور دیگر ضروریات کے حصول کے لیے راستے کی آخری بستی پر رکے ہوتے تو شاید انہیں حالات کا علم ہو بھی جاتا۔

''زمین کا معائنہ کر کے میرے اندازے کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔'' اس نے کہا اور اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ سلیمان نے اس کی پیروی کی۔ غلام فیرس جو دور رہ کر بھی ساشا کی طرف سے بے خبر نہیں رہتا تھا، ان دونوں کو رکتے ہوئے دیکھ کر ان کے قریب چلا آیا۔

''کوئی مسئلہ ہے آقا؟'' اس نے مؤدبانہ پوچھا۔

''میں زمین کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم مشعل تھام کر مجھے روشنی دکھاؤ'' اس نے فیرس کو حکم دیا اور خود جھک کر زمین کا جائزہ لینے لگا۔ فیرس اور سلیمان دیکھ سکتے تھے کہ وہ دیکھنے سے زیادہ سونگھنے پر زور دے رہا ہے۔ اس کے نتھنے کسی ایسے شکاری جانور کی طرح پھول پچک رہے تھے جو اپنے شکار کی بو سونگھتا ہوا اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ قافلے والوں میں سے کئی نے اس کی اس مصروفیت کو حیرت اور تجسس سے دیکھا لیکن سلیمان نے کسی کو رک کر سوال کرنے کی مہلت نہیں دی اور ہاتھ سے اشارہ کر کے آگے بڑھتے رہنے کی ہدایت کرتا رہا۔

''یہ..... یہ دیکھو..... فیرس! ذرا اپنی مشعل کو اس جگہ کے نزدیک لاؤ۔'' ایک مقام پر ساشا رک گیا اور فیرس کو حکم دیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ چہرے پر تجسس لیے سلیمان نے جھک کر دیکھا، پتھریلی زمین پر بڑا سا سیاہ دھبا پڑا ہوا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ اس معرکے کے بعد ہم سے پہلے کوئی قافلہ اس راستے سے نہیں گزرا ہے اور ہم ایسی دوسری علامات بھی تلاش کر سکتے ہیں جو میرے اندازے کی تصدیق کریں۔'' وہ گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھے سلیمان سے مخاطب تھا۔ اس بار سلیمان نے بھی اس کی پیروی کی تھی اور نتھنے سکیڑ کر بو سونگھ رہا تھا۔ اس کی حسِ شامہ نے بھی ساشا کے خیال کی تصدیق کر دی تھی۔ اس پہلے دھبے کے بعد انہیں کچھ مزید دھبے اور بھی ملے۔ پتھریلی زمین پر کئی جگہ خون جذب ہو کر غائب ہو جانے کے بجائے جم کر سوکھ گیا تھا۔ انہوں نے تلاش شروع کی تو ایک گل سڑ جانے والا انسانی ہاتھ، دو تین تلواریں اور کئی تیر بھی راستے میں بکھرے ہوئے مل گئے۔ ان سب چیزوں کی موجودگی ساشا کے اس اندازے کا ثبوت تھی کہ وہاں کوئی معرکہ ہوا ہے۔

''میرا اندازہ ہے کہ حملہ آوروں نے اوپر پہاڑوں پر سے گھات لگا کر یہاں سے گزرنے والوں کو نشانہ بنایا ہوگا اور درّے کے دونوں سروں پر بھی ان کے آدمی تعینات ہوں گے جس کی وجہ سے اس درّے میں داخل ہونے والے کسی بھی فرد کو زندہ سلامت بھاگ جانے کا موقع نہیں ملا ہوگا۔'' یہ سردار امان کی دی گئی تربیت کا کمال تھا کہ وہ بالکل درست اندازے لگا رہا تھا۔

''تمہاری ہر بات سمجھ آ رہی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لاشیں کہاں گئیں؟'' سلیمان کے چہرے پر ہیجان تھا۔

''یہ میں نہیں بتا سکتا، نہ ہی یہ ہمارا مسئلہ ہے البتہ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہوگا کہ کہیں ہمارے لیے بھی آگے کوئی خطرہ منتظر نہ ہو۔''

''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' سلیمان نے اضطراب سے پوچھا۔

''فی الحال تو ہم آنکھیں کھلی رکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔''

''کیا میں امیر کو اس صورتِ حال سے آگاہ کروں؟''

''اس صورت میں وہ درّہ پار کرنے کے بعد بھی پڑاؤ ڈالنے کی اجازت نہیں دیں گے اور طبیب شمس الدین کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' اس نے سلیمان کو نتیجے سے آگاہ کیا۔

''ان کی طرف سے سوال جواب تو ضرور ہوں گے۔ اب تک کسی نہ کسی نے انہیں ہماری اس سرگرمی کی خبر پہنچا دی ہوگی۔''

''ان سے بہانہ کیا جا سکتا ہے کہ راستے پر کچھ خطرناک جانوروں کی موجودگی کی علامات ملی ہیں۔ اس بہانے سے ہم رات میں سخت پہرے کا بھی جواز پیدا کر سکتے ہیں۔'' اس نے فوراً تجویز پیش کی، پھر فیرس کی طرف مڑ کر بولا۔

''میں، تم اور سلیمان حالات سے آگاہ ہیں اس لیے ہم تینوں بھی رات میں باری باری پہرا دیں گے تاکہ کسی خطرے کو جلد اور زیادہ بہتر طور پر بھانپ سکیں۔ ہماری نگرانی کی وجہ سے دیگر پہرے داروں کو بھی سستی دکھانے کا موقع نہیں ملے گا۔''

''جو آپ کا حکم۔'' فیرس نے فوراً فرماں برداری سے سر جھکایا۔

وہ رات اس سفر کی راتوں میں سے ایک سخت رات تھی۔ کسی متوقع حملے کے خطرے کے ساتھ ساتھ شمس الدین کی طبیعت کی خرابی بھی اعصاب کے لیے بوجھ بنی ہوئی تھی۔ ان کی خدمت کے لیے متعین ملازموں کے ساتھ ساتھ سلیمان بھی مسلسل ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ طبیب شمس الدین سے حاصل کردہ علم اور ان کے مشوروں کی مدد سے اس نے انہیں کئی ادویات وقفے وقفے سے استعمال کروائیں لیکن افاقہ نہ ہوا اور وہ پوری رات بخار میں پھنکتے رہے۔ صبح کے قریب جا کر ان کے بخار کا زور ٹوٹا تو سلیمان نے سکون کا سانس لیا اور ساشا کے اصرار پر کچھ دیر کے لیے سو گیا۔ سونے سے پہلے اس نے اس بات کا انتظام کر لیا تھا کہ امیر ارغل تک شمس الدین کی حالت کی خبر پہنچنے کے ساتھ

ساتھ اس کی یہ استدعا بھی پہنچ جائے کہ آج کے دن سفر نہ کیا جائے اور شمس الدین کو مکمل آرام کا موقع دیا جائے۔

وہ سورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد کا وقت تھا جب شمس الدین کی دیکھ بھال کے لیے ان کے سرہانے بیٹھے ساشا نے قدموں کی آہٹ سنی۔ آنے والا امیر ارغل تھا۔

''کیسی طبیعت ہے اب شمس الدین کی؟'' اس نے بھاری اور رعب دار آواز میں دریافت کیا۔

''اس وقت تو بخار ٹوٹ گیا ہے اور آرام سے سو رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہم اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔'' امیر کے چہرے پر اطمینان دوڑنے لگا۔

''سلیمان کا خیال ہے کہ بے آرامی کی صورت میں ان کی طبیعت دوبارہ بگڑ سکتی ہے۔''

''سلیمان ابھی اتنا قابل طبیب نہیں بنا ہے کہ ہم اس کے مشوروں پر عمل کرنا ضروری سمجھیں۔ ویسے بھی ہم تاخیر کے متحمل نہیں ہو سکتے۔'' امیر نے اپنا فیصلہ واضح کر دیا اور پلٹ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ حکمِ حاکم کے بعد انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد قافلہ دوبارہ سفر کے لیے تیار تھا۔ غصے اور بے بسی کا شکار سلیمان امیر کے حکم سے سرتابی کی تو جرأت نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے سارا زور اس بات پر لگا دیا کہ شمس الدین کو دورانِ سفر ہر ممکنہ آرام میسر رہے۔ وہ مستقل ان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ انہیں دوبارہ بخار نہ چڑھنے پائے لیکن دو ڈھائی گھنٹوں بعد ہی ایک بار پھر شمس الدین کا جسم گرم ہونے لگا۔

''میں نے تم دونوں کو ممکنہ حد تک نقشہ ذہن نشین کروا دیا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم میری راہنمائی کے بغیر بھی قافلے کو آرام سے ہندوستان تک لے جاؤ گے لیکن پھر بھی اگر تمہارے ذہنوں میں کوئی سوال یا الجھن موجود ہے تو تم اسے دور کرنے کے لیے مجھ سے گفتگو کر سکتے ہو۔'' ایسے وقت میں جبکہ وہ لوگ انہیں بخار چڑھتے دیکھ کر تشویش میں مبتلا ہو رہے تھے، انہوں نے نحیف آواز میں گفتگو چھیڑی۔

''آپ ان ساری فکرات کو چھوڑ کر آرام کیجیے۔ ذہنی دباؤ آپ کی صحت پر بُرے اثرات مرتب کر سکتا ہے۔'' سلیمان نے فوراً انہیں ٹوکا۔

''میرے سفرِ زندگی کا سورج ڈھل رہا ہے میرے بیٹے! مگر میں نہیں چاہتا کہ میری کوئی کوتاہی اتنے سارے لوگوں کو ان پہاڑوں میں بھٹکا کر موت کے منہ میں لے جائے۔ میرے لیے اب دنیا کے سارے خزانے اور لذتیں بے معنی ہیں لیکن میں دنیا سے جاتے جاتے یہ بوجھ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا کہ میری وجہ سے اتنی ساری انسانی جانیں خطرے میں پڑ گئی ہیں۔'' اپنا موقف سمجھاتے سمجھاتے ان کی سانس پھولنے لگی تھی۔

''آپ بار بار اپنے جانے کی بات کر کے میرا دل مت دکھائیں۔'' سلیمان جذباتی ہونے لگا۔

''صبر کے علاوہ کوئی شے دل کو غم سے نجات نہیں دلا سکتی۔ صبر، ہمت اور حقیقت پسندی سے کام لو گے تو دنیا کے ہر امتحان سے کامیابی سے گزر جاؤ گے۔'' انہوں نے نڈھال سا ہو کر آنکھیں موند لیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں اور نہ ہی ذہن پر کوئی بوجھ لیں۔ ہم نے آپ کی بتائی ہوئی ہر بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے اور مجھے کوئی شک نہیں کہ ہم یہ سفر کامیابی سے طے کرنے میں کسی پریشانی کا شکار ہوں گے۔'' اس بار ساشا نے گفتگو میں مداخلت کی اور شمس الدین کو یقین دہانی کروائی۔

''جیتے رہو۔ مجھے تمہاری یہ خود اعتمادی بہت پسند ہے۔ تمہاری پُرعزم آنکھیں دیکھ کر بے ساختہ ہی مجھے کوئی یاد آ جاتا ہے۔''

''کون.....؟'' شمس الدین کے الفاظ نے اس کا دل دھڑکایا اور اس نے تجسس سے پوچھا۔

''بس کوئی تھا جو ماضی کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ ایک ایسا انسان جس کی مہربانیوں نے ہمیں زندگی کے ہر لطف سے آشنا کیا اور جب وہ روٹھا تو میں اور میرے دوست ان پہاڑوں میں اپنے لیے زندگی تلاش کرتے پھرے۔''

''کون.....کون تھا وہ؟'' اس بار وہ اپنی بے تابی کو چھپا نہیں سکا لیکن شمس الدین نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ ایک بار پھر آنکھیں موند چکے تھے۔

''غیر ضروری سوالات میں الجھا کر ان کا آرام کیوں خراب کرتے ہو؟ انہیں صحت مند ہونے دو، پھر سب کچھ پوچھ لینا۔'' سلیمان نے خفگی بھرے لہجے میں اسے ٹوکا تو اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔

سفر اپنی پوری رفتار سے جاری رہا اور شمس الدین کی طبیعت میں بھی تغیر آتا رہا۔ کبھی ان کا بخار کم ہو جاتا، کبھی تیز۔ سلیمان کی بے حد کوشش کے باوجود وہ چند گھونٹ پانی کے علاوہ کوئی شے حلق سے نیچے نہ اتار سکے۔ شام نے اپنے پر پھیلائے تو پہلی بار ان کا بخار مکمل طور پر اترا ہوا محسوس ہوا

اوران کی مسلسل بے چینی میں بھی کمی دکھائی دی۔ اس بہتری نے سلیمان کے چہرے پر رونق دوڑا دی اور وہ ایک ساتھی کے پیٹ میں درد کی اطلاع سن کر اس کے معائنے کے لیے چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد واپس آکر اس نے شمس الدین کو دیکھا تو وہ گہری نیند سوئے ہوئے ملے۔ ان کے بخار کا اندازہ لگانے کے لیے اس نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ پیشانی سرد تھی۔ اتنی سرد کہ اس نے زندگی کی حرارت کی غیر موجودگی کا اعلان کر دیا۔ سلیمان نے گھبراہٹ کے عالم میں ان کی نبض ٹٹولی اور سینے میں دل کی دھڑکنوں کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ طبیب شمس الدین نہایت خاموشی سے اپنے نئے سفر پر روانہ ہو چکے تھے۔ صدمے نے اسے گنگ کر دیا۔ اس کی اس کیفیت کو سب سے پہلے ساشا نے محسوس کیا پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے قافلے میں پھیل گئی کہ شمس الدین وفات پا چکے ہیں۔ امیر کو فوری طور پر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دینا پڑا۔

شمس الدین تقریباً ہر شخص کے لیے قابلِ احترام تھے۔ ان کی وفات کی خبر نے سب کو رنجیدہ کر دیا۔ فوری طور پر ان کی آخری رسومات کی ادائیگی کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ ان کی تدفین سے فارغ ہونے تک کافی رات ہو چکی تھی۔ وہ سب رات گئے سونے کے لیے لیٹ سکے۔ تاخیر سے سونے کے باوجود ساشا کی آنکھ جلد کھل گئی اور وہ خیمے سے نکل کر باہر آ گیا۔ آخری پہر نگرانی کرنے والے پہرے دار اب اتنے چوکس نہیں رہے تھے اور بے پروائی سے ادھر ادھر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ اسے ایک طرف پانچ چھ افراد کے ساتھ نمازِ فجر کی ادائیگی کرتا فیرس بھی دکھائی دیا۔ مضبوط اعصاب کا مالک فیرس جو سخت محنتی تھا اور رات کا بہت کم حصہ آرام میں گزارتا تھا۔ کبھی کوئی نماز قضا کرنا گوارا نہیں کرتا تھا اور نماز میں اس کا خشوع و خضوع ایسا ہوتا تھا کہ وہ جو ویسے ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہتا تھا، نماز پڑھتے ہوئے اردگرد سے بالکل بیگانہ ہو جاتا تھا۔

اس نے فیرس سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دوڑائیں تو دھندلی سی روشنی میں فاصلے پر دکھائی دیتی اس چٹان کو نظر انداز نہیں کر سکا جس کے متعلق اس کے دماغ میں بہت کچھ محفوظ تھا۔ بے ساختہ ہی اس کے قدموں نے اس چٹان کی طرف اٹھنا شروع کر دیا۔ فاصلہ زیادہ تھا لیکن اس کی مضبوط ٹانگوں میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اس فاصلے کو بہ آسانی طے کر سکے۔ فاصلہ طے کر کے قریب پہنچنے پر اسے اپنے باپ کی ذہن نشین کروائی گئی دوسری نشانیاں بھی نظر آنے لگیں۔ ان نشانیوں کے سہارے قدم آگے بڑھاتا وہ ایک مخصوص غار تک پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کے اعصاب تن گئے کہ اس غار کے دہانے پر رکھا بھاری پتھر ہٹا ہوا ہے۔

''شاید اس راستے پر سفر کرنے والے کچھ مسافروں نے اس غار کو دریافت کر لیا ہو۔'' وہ فراموش کر چکا تھا کہ شراب اور شباب کے خمار میں وہ اس راز سے کسی اور کو بھی آگاہ کر چکا ہے اس لیے اپنے طور پر ایک اندازہ قائم کیا اور اس امید پر کہ ضروری نہیں کہ اس غار کو دریافت کر لینے والوں نے یہاں پوشیدہ اس کی امانتوں کو بھی دریافت کر لیا ہو، اپنے قدم آگے بڑھائے۔ دہانے کی کم اونچائی کی وجہ سے اسے کافی زیادہ جھک کر غار میں داخل ہونا پڑا۔

اندر داخل ہو کر اسے اپنی ایک بڑی غلطی کا احساس ہوا۔ باہر اس وقت یوں بھی بہت کم روشنی تھی اور غار کی ساخت بھی ایسی تھی کہ باہر کی روشنی دہانے سے گزر کر اندر داخل ہونے میں شاید ہی کامیاب ہو پاتی۔ اس وقت تو اندر بالکل گھٹا ٹوپ اندھیرا ہو رہا تھا اور وہ اپنے ساتھ کوئی مشعل لے کر نہیں آیا تھا۔ مشعل لینے کے لیے واپس جانا بھی مشکل تھا۔ اس صورت میں وہ کسی اور کی نظروں میں آ سکتا تھا اور اسے کسی اور کو اس غار کے راز میں شامل نہیں کرنا تھا۔ اس نے اپنے باپ کے سکھائے اسباق ذہن میں دہرائے اور کسی گھنے جنگل یا اندھیرے غار میں رہنے والے جانور کی جبلت اپنے اندر جگا کر غار کا جائزہ لینے لگا۔ تلاش کا آغاز اس نے غار کی دیواروں کو انگلیوں سے ٹٹول کر کیا۔ اس کی پوری توجہ دیوار پر موجود رخنوں پر مبذول تھی۔ چھوٹے چھوٹے رخنوں کو ٹٹولتے ہوئے اس کی انگلیوں نے ایک نسبتاً بڑے رخنے کو چھوا۔ اس کے اندر ایک جوش سا جاگا۔ اس جوش کے تحت وہ کچھ کر پاتا اس سے قبل ہی اسے سانپ کی پھنکار سنائی دی اور اس پھنکار کے ساتھ ہی اس نے اپنی چھوٹی انگلی میں دو کانٹے سے گڑتے ہوئے محسوس کیے۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سانپ نے اسے ڈس لیا ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور پلٹ کر باہر نکلنا چاہا لیکن عین اسی لمحے غار کا دہانہ بند کر دیا گیا اور وہ انگلی میں سرایت کرتے زہر کے ساتھ تاریک غار میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔

پُر خطر جزیروں اور بغاوتوں کے جنگل
میں بھٹکتے مسافر کی داستان کی
مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

وہ حسین پھول کچلا ہوا اور لہو رنگ تھا۔ وہ کسی نرگسی پھول کے مانند خوبصورت اور دلکش تھی لیکن کسی نے اسے بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

اس کا خاوند شہزاد بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ سسک کر بولا۔ ''نیلوفر! کاش میں وہیل چیئر سے اٹھ سکتا، کھڑا ہو سکتا، تمہاری تجہیز و تکفین میں حصہ لے سکتا۔ اُف! میں کس قدر بے بس اور مجبور ہوں۔ پہلے ایک آوارہ لڑکے نے گاڑی سے ٹکر مار کے مجھے اپاہج بنا دیا اور اب تمہارا بے رحمانہ قتل..... میری تو دنیا ہی اجڑ گئی ہے۔'' اس کا سر جھک گیا اور وہ وہیل چیئر کے بازوؤں کو سختی سے تھامے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ ممکن نہ تھا۔

گھر کے دوسرے افراد گم صم، سہمے ہوئے، سر جھکائے کھڑے تھے۔ لاش کو ایک سفید چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ صرف گردن اور چہرہ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اہلِ خانہ پولیس کو

سنگ دل

انجم فاروق ساحلی

یہ بات تو طے ہے کہ ازدواجی زندگی میں دھوکا کسی طور قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اور اگر... دے دیا جائے تو رشتہ قائم نہیں رہ پاتا۔ وہ بھی انہی اذیتوں کا شکار تھا مگر... ایک دن اسے اذیتوں سے چھٹکارے کی تدبیر سوجھ ہی گئی... اور پھر جیسا اس نے سوچا تھا ویسا ہی ہوا۔

اعتماد اور دل کو پتھر سمجھ کر توڑنے والی بیوی کا عبرت ناک انجام

اطلاع دے چکے تھے۔

شہزاد پھٹی پھٹی نگاہوں سے نیلوفر کے یاقوتی ہونٹوں کو دیکھنے لگا جن سے اب ایک لفظ بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ مرنے کے بعد بھی نیلوفر کے..... حسن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

اس وقت کمرے میں داخل ہوکر آگے بڑھنے والے انسپکٹر عمران نے شہزاد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسے حوصلہ، تسلی دی اور پھر قتل کی بہیمانہ واردات کے متعلق استفسار کیا۔

شہزاد علی چند لمحے ساکت سفید چادر سے ڈھکی اپنی بیوی کی لاش کو دیکھتا رہا پھر بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! قتل کی واردات رات کے ایک بجے کے قریب ہوئی۔ میں اہلِ خانہ کے ساتھ کھانے کی میز پر اپنی بیوی نیلوفر کا منتظر تھا۔ اچانک ہی میرا دل گھبرانے لگا۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ میری بیوی ابھی تک دوسری منزل سے نیچے نہیں آئی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ دوسری منزل پر واقع اپنی خواب گاہ میں دیر تک موبائل فون پر سہیلیوں سے گپ شپ کرتی رہتی تھی یا پھر اسے انڈین فلمیں دیکھنے کا بھی شوق تھا۔ میں نے موبائل فون پر نیلوفر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا فون آف تھا۔ میں نے ملازم کو اوپر بھیجا۔ سب بھوک سے نڈھال تھے اور اس کے آنے کے منتظر۔'' شہزاد کو چکر سا آگیا۔ اس نے کرسی کے بازوؤں کو مضبوطی سے تھام کر دلی کرب پر قابو پانے کی کوشش کی۔

انسپکٹر عمران نے پھر اس کا حوصلہ بڑھایا تو وہ گویا ہوا۔

''انسپکٹر صاحب!'' اس کی آواز میں دردناک کراہ تھی۔ ''ملازم نے نیچے آکر بدحواسی کے عالم میں بتایا کہ اوپر خواب گاہ میں میم صاحبہ کی لاش خون سے بھری ہوئی ہے۔ وہ مرچکی ہیں۔ انہیں کسی نے بے رحمی سے قتل کردیا ہے۔ ملازم کے جوتوں کی نوک فرش پر بہنے والے نیلوفر کے خون سے تر تھی۔ میں لرز اٹھا۔ کانپ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر میں کہاں اٹھ سکتا تھا۔ میں تو حادثے کی وجہ سے معذور ہوچکا ہوں۔ اہلِ خانہ اور میں کسی نہ کسی طرح اوپر پہنچے تو نیلوفر لاش کے ایک بھیانک منظر میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس کی چھاتی، گردن اور بازوؤں پر خنجر کے متعدد سنگ دلانہ نشانات تھے۔''

''موقع واردات کی صورت حال۔'' انسپکٹر عمران نے لقمہ دیا۔ وہ چند لمحے رک کر حواس مجتمع کرتا رہا پھر تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

''انسپکٹر صاحب! خواب گاہ کی عقبی کھڑکی کسی ملازم کی غلطی سے کھلی رہ گئی تھی۔ قیاس یہی ہے کہ قاتل، جو درحقیقت بے رحم ڈاکو تھا، اسی راستے سے اندر داخل ہوا۔ اس نے ماسٹر کی سے قیمتی جواہرات والی تجوری کھولی۔ نیلوفر واش روم میں تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو شاید نامعلوم ڈاکو تجوری سے ہیرے جواہرات سمیٹ رہا تھا۔ نیلوفر نے اسے للکارا ہوگا۔ وہ خنجر بردار تھا۔ نیلوفر پر حملہ آور ہوا اور اسے بے رحمی سے قتل کردیا۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا تو انسپکٹر عمران نے فوراً سوال داغ دیا۔

''نیلوفر کے چیخنے چلّانے کی آوازیں کیوں نیچے نہیں آئیں؟''

''انسپکٹر صاحب! کیا بتائیں۔'' وہ کھڑکی سے باہر خلا میں کچھ گھورتے ہوئے بولا۔ ''جب سے ہماری کوٹھی کے سامنے والی مارکیٹ میں دوسری منزل پر شادی ہال کھلا ہے، ہم شور وغل کی مصیبت سے دوچار ہوگئے ہیں۔ چنانچہ میں نے نیلوفر کے اصرار پر اور پروالی خواب گاہ کو ساؤنڈ پروف کروالیا تھا۔''

''اوہ!'' انسپکٹر عمران چونک پڑا۔ ''بے چاری کی چیخیں اندر ہی اندر رہ گئیں۔ آپ کے پاس اپنی چابی موجود ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

''ہاں! میری چابی تو میرے پاس موجود ہے..... یہ دیکھیے۔'' شہزاد علی نے کوٹ کی اندرونی جیب سے مجوری کی چابی نکال کر انسپکٹر عمران کو دکھائی۔

''ٹھیک ہے، بادی النظر میں یہ ڈکیتی کی واردات معلوم ہوتی ہے مگر اصل حقائق بعض اوقات بعد میں منکشف ہوتے ہیں۔'' ان الفاظ کے ساتھ انسپکٹر عمران اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے لاش کا جائزہ لیا۔ اس کا اسسٹنٹ فرحان، فوٹو گرافر اور فنگر پرنٹس تلاش کرنے والے ماہرین کے ساتھ آپہنچا۔ لاش کی تصاویر اترنے لگیں اور ایکسپوز پاؤڈر خواب گاہ میں چھڑک کر انگلیوں کے نشانات کی تلاش شروع ہوگئی۔

کچھ دیر بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ انسپکٹر عمران ملازموں سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔ ملازم باری باری آکر بیان دینے لگے۔ ملازم شرفو جو ہیڈ مالی تھا اور عقبی باغ کے کوارٹر میں ہی رہتا تھا، صرف اس نے ہی کام کی ایک بات بتائی کہ اس نے رات کے وقت ایک لمبے سیاہ سائے کو عمارت کے عقبی برآمدے سے نکل کر سامنے درختوں کے جھنڈ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ خنجر بردار تھا اور اس کے خنجر سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ آدمی چاند کی زرد روشنی میں بڑا خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اس نے منہ پر سیاہ نقاب لگا رکھا تھا۔ میں ایک کونے میں دبک گیا۔ میری ہمت نہ ہوئی کچھ کرگزرنے کی۔ میں نے اسے ڈرائیور کی رہائش گاہ کی طرف

جاتے دیکھا تھا جو پرانے کنوئیں کے پاس ہے۔''

انسپکٹر عمران نے دوسری منزل پر آکر تفتیش کا آغاز کیا۔ خواب گاہ کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ عقبی کوریڈور میں گرد پر قدموں کے ہلکے ہلکے نشانات موجود تھے لیکن جوتوں کا سائز عام سا تھا۔ انسپکٹر عمران نیچے اترا اور عمارت کے عقبی برآمدے سے ہوکر باغ میں چلا آیا۔ باغ کافی گھنا اور سرسبز و شاداب تھا۔ پھولوں سے لدی پھلواریاں ایک حسین منظر پیش کررہی تھیں۔ انسپکٹر عمران، شرفو کے بیان کی روشنی میں چلتا ہوا ڈرائیور کے کوارٹر کے سامنے چلا آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر ماحول پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ ایک جگہ کوئی شے چمک رہی تھی۔ انسپکٹر عمران نے اسے جھک کر گھاس سے اٹھالیا۔ وہ ایک قیمتی موتی تھا۔ انسپکٹر عمران نے اسے جیب میں رکھ لیا اور بیرونی دروازے کو زور سے دھکا مار کر کھول دیا۔ جلد ہی ڈرائیور شیر خان گھبرایا ہوا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ انسپکٹر عمران اسے غصیلی نگاہوں سے گھورنے لگا۔

کال کرنے پر اسسٹنٹ فرحان اور سپاہی بھی آگئے۔

''اس کے کوارٹر کی اچھی طرح تلاشی لو۔'' انسپکٹر عمران نے سخت لہجے میں کہا۔ جلد ہی شیر خان کے اسٹور روم سے تجوری کے جواہرات برآمد ہوگئے اور خونی خنجر کوارٹر کی پشت پر واقع کنوئیں کی تہ سے مل گیا جسے نکالنے میں کافی جدوجہد کرنا پڑی۔

''اسے ہتھکڑی لگا کر کوٹھی میں لے چلو۔'' انسپکٹر عمران نے سرد لہجے میں کہا۔

شیر خان بری... طرح گھبرا گیا۔ ''انسپکٹر صاحب..... انسپکٹر صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا، کسی نے مجھے پھنسایا ہے۔''

''تم ایک جرائم پیشہ آدمی ہو اور تجوریاں توڑنے میں تمہیں مہارت رہی ہے۔'' انسپکٹر عمران نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم کئی بار کے سزا یافتہ بھی ہو۔ یہاں تم ڈاڑھی مونچھیں بڑھا کر کسی پیر کے مرید بن کے ڈرائیور کی نوکری کررہے ہو۔ تم لالچ میں آگئے اور تم نے جواہرات لوٹ کر یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنالیا۔''

''یہ..... یہ درست ہے کہ میں ماضی میں بُرا آدمی تھا مگر اب میں عرصہ ہوا جرم کی دنیا چھوڑ چکا ہوں۔ مجھے شرافت کا یہ انعام ملا ہے کہ قتل اور ڈکیتی کی واردات میں پھنسا دیا گیا ہے اور آپ مجھے مجرم ثابت کرنے پر تل گئے ہیں۔''

انسپکٹر عمران نے اسے خاموشی سے آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ شہزاد علی کی محل نما عمارت کے ڈرائنگ روم میں اس وقت سب لوگ ذہین سراغ رساں انسپکٹر عمران کے منتظر تھے۔

ڈرائیور شیر خان اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ ہتھکڑی میں جکڑے ہوئے تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس کا جھکا ہوا سر اٹھا اور اس نے شہزاد علی سے آنکھیں چار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بے قصور ہوں، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' شہزاد نے یقین نہ کیا اور بڑھ بڑھ کر اسے ہی موردِ الزام ٹھہرانے لگا۔

''ابھی تمہیں شبہے میں پکڑ رہے ہیں، تم مجرم ثابت نہیں ہوئے۔'' انسپکٹر عمران نے شیر خان سے کہا اور گھر کے افراد کو باری باری سوالات کے لیے بلالیا۔

اس وقت شہزاد علی کی بہن سونیا سامنے تھی۔ انسپکٹر عمران نے گہری نگاہ سے اس کا جائزہ لیا۔ ''آپ کیوں قتل کی واردات کے وقت دوسری منزل پر چپکے سے گئیں اور پھر واپس نیچے کھانے کی ٹیبل پر چلی آئیں؟ آپ نے بہانہ یہ بنایا کہ میں اماں کی دوا ڈھونڈنے اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔''

''انسپکٹر صاحب! بس اتنی سی بات پر شک وشبہ؟ درست بات یہ ہے کہ میں دوا تلاش کرنے کے بعد جب بھائی سے ملنے اوپر گئی تو وہ بے رحمی سے قتل کی جاچکی تھیں۔ میں خوفزدہ ہوکر نیچے آئی اور کسی سے خوف کی وجہ سے ہی ذکر نہ کیا۔''

''آپ آخر اوپر کیوں گئی تھیں؟'' انسپکٹر عمران نے پھر پوچھا۔

سونیا ہچکچائی لیکن پھر سنبھل کر گویا ہوئی۔ ''انسپکٹر صاحب! بھابی کا بھائی شان علی خواہ مخواہ میری طرف ملتفت ہورہا تھا۔ میں اس سلسلے میں انہیں پہلی بار خاموش وارننگ دینے کے لیے گئی تھی۔ اب سمجھ میں آگیا؟'' اس کا لہجہ ناخوشگوار تھا۔

''آپ شک وشبہے سے بری نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ کسی کی آلۂ کار ہوں یا کوئی آپ کا آلۂ کار بنا ہوا ہو اور آپ دولت حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔''

''انسپکٹر صاحب! آپ کا شبہ افسوسناک ہے لیکن آپ کو بتایا کس نے کہ میں اوپر گئی تھی؟''

''اوپر ٹھہرے ہوئے مہمان نے، جسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔''

''انسپکٹر صاحب! کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں ایک ادنیٰ ڈرائیور کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے اس گھر کو لوٹنا چاہتی تھی؟''

''سونیا صاحبہ! ناراضی پر معذرت۔ ہمیں ہر زاویے سے سوچنا پڑتا ہے۔'' سونیا بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ اٹھ گئی۔ اس کے بعد شہزاد علی کے چھوٹے بھائی فرقان علی کی باری آئی۔ انسپکٹر عمران نے اس پر بھی شک وشبہ کیا کہ وہ جوئے اور شراب کا عادی ہے اور لڑکیوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ آج کل اس کی محبوبہ کسی دوسرے امیر آدمی سے عشق کی پینگیں بڑھا رہی ہے اور اب اسے واپس اپنی محبوبہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے دولت کی ضرورت ہے۔ اس نے ہی ڈرائیور کو

لالچ دے کر قتل پر آمادہ کیا ہوگا۔

''ہوسکتا ہے بعد میں تم ڈرائیور کو ٹھکانے لگا دیتے اور تجوری کے سارے قیمتی پتھر اور موتی تمہاری جھولی میں آن گرتے۔''

انسپکٹر عمران کی گفتگو سن کر فرقان علی آگ بگولا سا ہوگیا اور خون کے گھونٹ بھرتا ہوا اٹھ گیا۔ انسپکٹر عمران نے عمارت کا جائزہ لیا اور تحقیق جاری رکھی۔

اگلی دوپہر کو اس نے اعلان کردیا کہ قاتل کو گرفتار کیا جارہا ہے۔ اہل خانہ اور ملازم ہال میں جمع ہوگئے۔ شہزاد علی کا ڈاکٹر بھی آپہنچا۔ سب کے دل دھک دھک کررہے تھے۔ شہزاد علی کچھ زیادہ ہی مضطرب معلوم ہوتا تھا۔ وہ جلد از جلد بیوی کے قاتل کو دیکھنا چاہتا تھا۔ انسپکٹر عمران نے سب پر ایک ڈرامائی نگاہ ڈالی۔ سب لوگ سسپنس اور تجسس کی کیفیت میں اسے دیکھ رہے تھے۔

''قاتل کون ہے؟'' شہزاد علی چلّا اٹھا، پھر بولا۔ ''قاتل کون ہے..... قاتل کون ہے؟ جلدی بتایئے انسپکٹر صاحب!''

''قاتل تم ہو۔ تم نے سنگ دلی اور بے دردی سے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔'' کمرے میں بم سا پھٹا۔ ہر شخص ہل کر رہ گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے انسپکٹر عمران اور شہزاد علی کو دیکھنے لگا۔

''لیکن میں تو معذور ہوں، اپاہج ہوں۔ اپنی وہیل چیئر سے سہارے کے بغیر اٹھ بھی نہیں سکتا۔'' شہزاد علی حلق پھاڑ کر چیخا۔

''تم اٹھ سکتے ہو..... تم اٹھ سکتے ہو۔ تمہیں اپنی بیوی کے کردار پر شک تھا۔ تم کھانے کی میز سے اٹھ کر واش روم میں گئے۔ وہیل چیئر سے اٹھ کر شاور چلایا۔ واش روم کو اندر سے بند کیا، پھر دوسرے متروک دروازے کو کھول کر اسٹور روم سے ہوکر عقبی زینے سے اپنی بیوی کی خواب گاہ کی کھلی کھڑکی سے اندر کودے جو تم نے ہی کھول رکھی تھی۔ تم نے اسے بے دردی سے قتل کیا۔ وہ تم سے شاید بے وفائی کررہی تھی۔ اس کے بعد تم نے اپنی چابی سے تجوری کھول کر جواہرات کا صفایا کیا اور تجوری کھلی چھوڑ کر ڈکیتی کا تاثر دے کر باغ میں نکل گئے۔ تم کل رات سیاہ لباس ہی پہنے ہوئے تھے اور مالی نے سیاہ لباس والے کو ہی بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم نے ڈرائیور کی حقیقت جان کر اسے پھنسانے کی کوشش کی۔ موتی دروازے کے باہر پھینکا۔ باقی اسٹور روم میں چھپائے اور خنجر، جس سے تم نے بے دردی سے اپنی بیوی کا قتل کیا، اسے کنوئیں میں پھینک دیا۔''

انسپکٹر عمران رکا تو ڈاکٹر فوراً غصیلے لہجے میں بولا۔

''انسپکٹر! تم نے کہانی تو اچھی بنائی ہے لیکن میرا دوست اور میرا مریض اٹھ کر چل پھر نہیں سکتا۔ تم فیل ہوجاؤ گے عدالت میں۔''

''میں پاس ہی رہوں گا، ڈاکٹر!'' انسپکٹر عمران نے الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔ ''بعض مریضوں اور انسانوں کی قوتِ ارادی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ وہ جلدی صحت یاب ہوجاتے ہیں۔''

''یہ ثبوت تو نہ ہوا۔'' ڈاکٹر برس پڑا۔

''ثبوت بھی حاضر کرتا ہوں۔'' انسپکٹر عمران نے سب پر ایک ڈرامائی نگاہ ڈالی اور پھر مسکرا کر بولا۔ ''شہزاد علی کے اسٹڈی روم کی کھڑکی کے سامنے ایک نوجوان لڑکا تنہا اپنی کوٹھی میں رہتا ہے۔ وہ رات کو جاگتا رہتا ہے، آج کل کے نوجوانوں کی طرح۔ اس نے رات کے وقت اپنی کھڑکی سے شہزاد علی کو وہیل چیئر سے اٹھ کر چلتے پھرتے دیکھا ہے لیکن دن کے وقت وہ اپنے آپ کو معذور ہی ظاہر کرتے ہیں۔ ملازموں کی زبانی اسے واردات کا پتا چلا تو اس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ پھر آج صبح میں نے خود ایک ثبوت حاصل کیا، جسے عدالت جھٹلا نہیں سکتی۔

''شہزاد علی صاحب باغ میں سوئمنگ پول کی طرف نکل گئے۔ وہ ایک خوبصورت لیبن کو گھور رہے تھے جس میں وہ اور نیلوفر خوشگوار لمحات گزارا کرتے تھے۔ اسی وقت ایک گھنی پھول وا... جھاڑی سے دو سانپ نکلے اور ان کی طرف پھنکارتے ہوئے بڑھے۔ اگر یہ معذور ہوتے تو بیٹھے رہتے لیکن یہ اپنی کرسی سے اٹھے اور انہوں نے ایک ٹوٹی ہوئی شاخ پکڑ کر سانپوں کو ڈرایا۔ وہ سانپ ریموٹ کنٹرول اور مصنوعی کھلونے تھے جو میں نے درخت کے پیچھے چھپ کر چھوڑے تھے۔ میں ان کے قریب ہی موجود تھا اور موبائل کیمرے میں فلم بنا چکا ہوں۔'' ڈاکٹر کھسیانا ہوکر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' متعدد افراد نے سوال کیا۔

اس نے انسپکٹر عمران کو مخاطب کیا۔ ''انسپکٹر صاحب! میں کیا کرتا۔ وہ مجھے بری طرح دھوکا دے رہی تھی۔ اس نے جس بے رحمی اور سنگ دلی سے ازدواجی زندگی کو کچلا، اس سے میری محبت کی شرر گٹ گئی۔ میں خون کے گھونٹ بھرتا رہا۔ وہ لڑکا اس کا عاشق ہی تھا جس نے کار سے مجھے ٹکر ماری تھی۔ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا تھا لہٰذا میں نے اپنی ٹانگوں کی صحت یابی کو چھپایا اور سنگ دل بن کے اس بے وفا کا خون بہا دیا۔'' شہزاد علی کا سر جھک گیا۔ ڈرائیور شیر خان سر اٹھا کر اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

⌘⌘⌘

اس دن موسم شدید گرم تھا۔ گو کہ اس قصبے کے رہنے والے اس گرمی کے عادی تھے لیکن بڑے بوڑھے بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ماضی قریب میں اتنی شدید گرمی پڑی ہو اور درجۂ حرارت سو درجہ فارن ہائیٹ کو چھو رہا ہو۔

اس روز صبح میں شیرف کے دفتر آنے والی پہلی عورت سلویا کی ماں کارمن البا تھی۔ شیرف ولیم دفتر میں نہیں تھا، اس کا واسطہ پہلے ہی دو مصیبت زدہ افراد سے پڑ گیا۔ ان میں ایک جوان عورت تھی جو اپنی لانڈری میں کام کرتے ہوئے

لازوال محبت

شاہ زین رضوان

کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو کسی کے دل پر نقش ہو جائیں تو بڑے سے بڑا طوفان بھی اس نقش کو مٹا نہیں پاتا... اس کے جذبات بھی کچھ ایسی ہی کہانی سناتے تھے مگر... سائے کے پیچھے بھاگتے لوگ اس جذبے کی گہرائی کو کیا جانیں۔

مسائل کا شکار ایک باوقار لازوال محبت کا اچھوتا قصہ

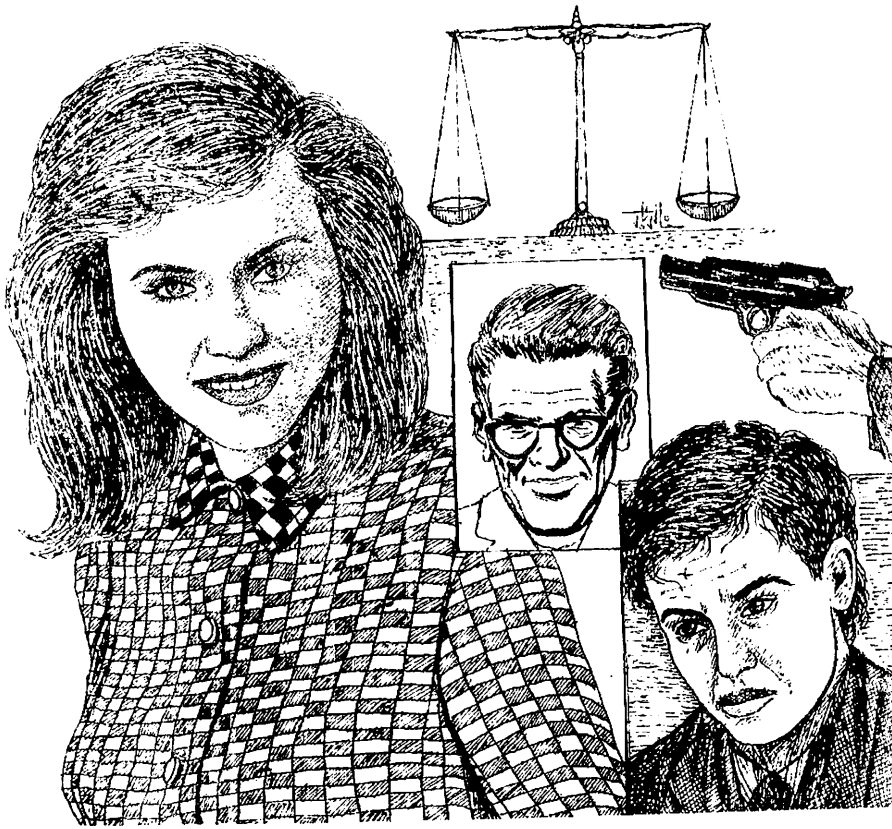

بے ہوش ہوگئی۔ دوسرا ایک درمیانی عمر کا کسان تھا جو اپنے بچھڑے کا تعاقب کرتے ہوئے چکرا کر گر پڑا اور اب سڑک کے کنارے بیٹھ کر پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ ولیم اسے قصبے کے واحد کلینک میں لے گیا۔ اس کے بعد واپس آکر اس کے بچھڑے کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگا۔ اس دوڑ دھوپ میں وہ خود خاصا تھک گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کار کا دروازہ کھول کر جوس کی بوتل منہ سے لگائی اور کار کا ائرکنڈیشنر چلا دیا۔

شیرف کی غیر موجودگی میں اس کے دو نائبین اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انہوں نے سلویا کی ماں سے پوچھا کہ وہ اس کی کیا خدمت کرسکتے ہیں؟ کارمن البا نے انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ میں انتظار کرلوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ شیرف کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ولیم کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر میز پر رکھے ہوئے چھوٹے سے پنکھے کا رخ اپنی جانب کیا اور مسز البا کی جانب متوجہ ہوگیا۔ گو کہ وہ پُرسکون انداز میں بول رہی تھی لیکن ولیم محسوس کرسکتا تھا کہ اس کے لہجے میں غصہ، مایوسی اور بے بسی جھلک رہی ہے۔

''ہمارے گھر سے باہر جانے والا راستہ بند کردیا گیا ہے۔'' مسز البا نے کہا۔ ''اور اسے بند ہوئے پانچ دن ہوگئے ہیں۔''

وہ کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی بلکہ وہاں کے مکین اس راستے سے گزر کر مرکزی سڑک تک جاتے تھے۔ گو کہ یہ راستہ رافیل ایکویڈو کی زمین سے گزرتا تھا لیکن قانون کے مطابق وہاں کے مکین اسے استعمال کرسکتے تھے۔ جزیرے کے دیہی علاقوں اور اس قصبے میں ایسے کئی راستے بنے ہوئے تھے۔ ایکویڈو کی زمین سے گزرنے والا راستہ بھی بہت قدیم تھا اور کبھی کسی نے اسے بند کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔

''ایکویڈو ایک ٹرک میں کچھ سامان لے کر آیا تھا، پھر میں نے ایک زوردار آواز سنی۔ شاید وہ کوئی درخت گھسیٹ رہا تھا۔ اگلے روز مجھے گروسری اسٹور جانا تھا، تب میں نے دیکھا کہ وہاں ایک درخت نہیں بلکہ اس راستے کو بڑے بڑے پتھروں اور نصف درجن درختوں سے بند کردیا گیا تھا۔ میرے لیے ان رکاوٹوں کو عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔''

''کیا تم نے ایکویڈو سے بات کی؟'' ولیم نے پوچھا۔

''اس نے کہا کہ جب اس کی مرضی ہوگی تو وہ یہ راستہ کھول دے گا۔ اگر میں چاہوں تو وہ مجھے ایک بیلچہ اور کلہاڑی دے سکتا ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ اس نے یہ مسئلہ کھڑا کیا ہے اور وہی اسے حل کرے۔''

''ان راستوں کی دیکھ بھال اور مرمت بلدیہ کی ذمے داری ہے۔'' ولیم نے کہا۔

''ایکویڈو نے کہا کہ وہ اپنی زمین پر بلدیہ کو کام کرنے نہیں دے گا۔''

ولیم نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں۔

''اس راستے کے بند ہوجانے سے مجھے مرکزی سڑک تک جانے کے لیے جنگل سے گزرنا پڑتا ہے اور یہ ایک گھنٹے کی مسافت ہے۔'' مسز البا نے کہا۔ ''اور اس کے بعد اسٹور تک پہنچنے میں مزید ایک گھنٹا لگ جاتا ہے، یعنی اگر میں ایک دودھ کا ڈبا لینے جاؤں تو اس کے لیے چار گھنٹے درکار ہیں۔''

''کیا تمہارے مرحوم شوہر نے اس زمین پر رہنے کے لیے کوئی معاہدہ کیا تھا؟''

شیرف کو یہ سوال کچھ نامناسب لگا۔ وہ جانتا تھا کہ مسز البا نے ایک غریب شخص سے محبت کی شادی کی تھی اور وہ اسے لے کر اپنے والدین کے گھر چلا گیا۔ اس کا خاندان کئی نسلوں سے وہاں رہ رہا تھا اور یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ پہلے یہ خاندان اس زمین پر کاشت کرتا تھا لیکن بعد میں اسے آبادکار کا درجہ مل گیا۔ قانون کی رو سے آبادکار کو وہاں رہنے کا حق حاصل ہے، اگر وہ خاندان برسوں سے وہاں رہ رہا ہو۔ خاص طور پر اس صورت میں جب آبادکار نے زمین پر محنت کی ہو اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ماریو البا نے زمین کو بہتر بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور اس کا خاندان برسوں سے وہاں رہ رہا تھا لیکن ایسے کسی معاہدے کے بارے میں کارمن لاعلم تھی۔

''نہیں۔'' کارمن نے کہا۔

شادی کے چند سالوں بعد ماریو کا انتقال ہوگیا اور اسے کاغذات مکمل کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کی موت کو دس سال ہوگئے تھے اور شیرف کے علم میں تھا کہ چند سال پہلے ہی کارمن نے اس جگہ کا کرایہ دینا شروع کردیا تھا کیونکہ ایکویڈو کا باپ بھی مرچکا تھا اور زمین اس کے نام منتقل ہوگئی تھی۔ اس نے کارمن کے معمولی رقم کے چیک کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور مطالبہ کیا کہ وہ مارکیٹ ریٹ

کے مطابق کرایہ ادا کرے ورنہ یہ جگہ خالی کردے۔ یہ تنازعہ ابھی چل رہا تھا۔

شیرف نے سلویا کی طرف دیکھا۔ اس کی عمر تقریباً بارہ سال تھی۔ ''کیا تمہیں اپنا باپ یاد ہے؟'' شیرف نے پوچھا۔ یہ سوال اچانک ہی اس کے ذہن میں آیا تھا۔

لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا اور اپنا ناخن کاٹنے لگی۔

''وہ اچھا آدمی تھا۔'' ولیم نے کہا۔ ''محنتی اور مخلص۔''

لڑکی کا چہرہ روشن ہوگیا۔ وہ آگے کی طرف جھکی جیسے کچھ اور سننا چاہ رہی ہو۔ ولیم نے اس کی خواہش پوری کردی۔ ''اس کی آنکھیں اور ناک بالکل تمہاری طرح تھیں۔ وہ بہت خوبصورت، ذہین اور بہادر تھا اور کبھی مشکلات سے نہیں گھبرایا۔ وہ تم سے بہت محبت کرتا تھا۔''

لڑکی کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا لیکن وہ بدستور فکرمند اور پریشان نظر آرہی تھی۔

''میں اس معاملے کو دیکھوں گا۔'' ولیم نے کہا۔ ''اس سلسلے میں میئر اور ایکویڈو سے بھی بات کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ ''آؤ۔ میں تم دونوں کو اپنی کار میں گھر تک چھوڑ دوں۔'' کارمن کے گھر جانے والا راستہ بند تھا اس لیے انہیں ایک لمبا چکر کاٹ کر جانا پڑا جس میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ اس جھونپڑی نما مکان کی دیواریں پلائی وڈ اور جست کی چادروں کی چھت تھی۔ اس مکان کی مرمت اور دیکھ بھال کارمن کے لیے بہت مشکل تھی کیونکہ وہاں تک پہنچنے کے لیے کوئی پختہ سڑک نہیں تھی اس لیے وہاں کوئی ٹرک نہیں آسکتا تھا اور تمام تعمیراتی سامان لے کر پیدل ہی چڑھائی چڑھنا ہوتی تھی۔

شیرف ولیم مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔ کارمن نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''دو ہفتے بعد سلویا کا اسکول کھل رہا ہے۔ اگر مرکزی سڑک تک جانے والا راستہ صاف ہوجائے تو اسے بس اسٹاپ تک پہنچنے میں بیس منٹ لگیں گے ورنہ وہ نوّے منٹ میں مرکزی سڑک تک پہنچ پائے گی۔''

اسے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس راستے کی صفائی ضروری ہے۔ تاہم اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں نے اس جنگل میں شادی کی اور اپنی زندگی یہیں گزار دی لیکن سلویا بہت اسمارٹ ہے۔ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گی۔ وہ کالج میں داخلہ لے گی تاکہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکے اور کبھی یہاں واپس نہیں آئے گی۔''

''اگر وہ واپس آنا چاہے؟''

''یہاں؟''

''میں نہیں جانتا۔ ممکن ہے کہ وہ اس گھر میں آنا چاہے جہاں وہ پلی بڑھی۔'' ولیم نے کہا۔

''اگر اس نے کبھی ایسی بات کی تو میں اس گھر کو آگ لگادوں گی۔''

ولیم اس کی بات کا جواب دینے والا تھا لیکن ایک فائر کی آواز سن کر رک گیا۔ اس نے فوراً ہی جھک کر اپنا ریوالور نکال لیا لیکن کارمن نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

''یہ گولی ایکویڈو نے چلائی ہے۔'' وہ بولی۔ ''کیونکہ اس کی بکریوں کو تنگ کرنے کے لیے کتے آتے رہتے ہیں۔''

ولیم نے ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیا اور پگڈنڈی کے اس حصے کا جائزہ لینے لگا جسے تباہ کردیا گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی اندازہ لگالیا کہ اس کی صفائی کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں بلکہ میونسپل کمیٹی کے عملے کو بھی اس کام میں ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ اس نے دیکھا کہ اس راستے کو نصف درجن بڑے بڑے پتھر اور درختوں سے بند کیا گیا تھا، تب ہی اس نے اپنے عقب میں ایک آواز سنی۔

''تمہیں کافی فاصلہ طے کرکے یہاں آنا پڑا، شیرف۔'' ایکویڈو نے کہا۔

ولیم نے پلٹ کر دیکھا۔ ایکویڈو اس سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ درمیانہ قد، سرمئی آنکھیں، پتلے ہونٹ اور طوطے کی طرح مڑی ہوئی ناک۔

''میں یہاں سرکاری کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔'' ولیم نے کہا۔ ''لہٰذا تم اپنا ہتھیار زمین پر رکھ دو۔''

ایکویڈو کے ہاتھ میں ایک شاٹ گن تھی لیکن اس نے کوئی حرکت نہیں کی اور بولا۔ ''یہ میری جگہ ہے اور گن بھی قانونی ہے۔''

''میرے پاس پولیس کے اختیارات ہیں اور میں تمہیں حکم دے رہا ہوں۔''

''تم اپنی گن کیوں نہیں نکال لیتے؟'' ایکویڈو بولا۔ ''اس طرح ہم دونوں برابر ہوجائیں گے اور تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''یقین کرو، اگر میں نے اپنا ہتھیار نکال لیا تو تمہیں سنبھلنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔'' ولیم نے کہا۔

ایکویڈو آہستہ سے آگے بڑھا اور اس نے اپنی شاٹ گن قدموں میں ڈال دی پھر وہ دونوں ہاتھ باندھ کر

سیدھا کھڑا ہوگیا۔

''اس راستے کو صاف کرنے کے لیے بلدیہ کا عملہ پیر کو آسکتا ہے۔'' ولیم نے کہنا شروع کیا لیکن ایکویڈو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔'' ایکویڈو نے کہا۔ ''جیسا ہے، اسے ویسا ہی رہنے دو۔ میرا ارادہ ہے کہ اگلے برس یہاں مالٹے کے درخت لگاؤں گا۔''

''لیکن یہ ایک عام گزرگاہ ہے۔''

''بالکل نہیں۔'' ایکویڈو نے کہا۔ ''میرا کوئی پڑوسی یا کرایہ دار نہیں ہے اور عدالت یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ اگر اس جگہ کسی کی رہائش نہ ہو تو عام گزرگاہ کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن کارمن اور سلویا یہاں رہ رہی ہیں۔''

''انہوں نے اس جگہ پر غیر قانونی قبضہ کیا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی غلط فہمی ہو لیکن عدالت پہلے ہی میرے حق میں فیصلہ دے چکی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ میں ایک دو ہفتے بعد شہر جاؤں تو سٹی ہال میں یہ قبضہ چھڑانے کے لیے ضروری کاغذات جمع کرادوں گا پھر تمہیں اس جگہ کو خالی کرانے میں میری مدد کرنا ہوگی۔''

''کارمن اور سلویا قانونی طور پر کرایہ دار ہیں، جب تک عدالت انہیں بے دخل کرنے کے احکامات جاری نہیں کرتی۔'' ولیم نے کہا۔ ''لہٰذا پیر کے روز بلدیہ کا عملہ اس راستے کی صفائی کرنے آئے گا۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔'' ایکویڈو نے کہا۔

''ہم بھی دیکھیں گے۔'' ولیم نے کہا اور وہاں سے چل دیا۔

جب وہ واپس آیا تو کارمن نے پوچھا۔ ''وہ کیا کہہ رہا تھا.....؟''

ولیم نے اسے ایکویڈو کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''وہ کل شہر گیا تھا۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ بلدیہ کا عملہ اس راستے کی صفائی نہیں کرے گا تو اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' ولیم نے کہا۔

''میئر ریمیز سے اس کی پرانی جان پہچان ہے۔ شاید وہ پہلے ہی اس سے بات کرچکا ہے۔''

''ریمیز قانون پر عمل کرے گا۔'' ولیم نے کہا۔ ''بعض اوقات اس سے کام کروانا مشکل ہوتا ہے لیکن وہ قانون شکن نہیں ہے۔''

کارمن اس کی یقین دہانی سے مطمئن نہیں ہوئی۔ ولیم نے بھی اسے قائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے پیر کا انتظار تھا جب بلدیہ کا عملہ اس راستے کی صفائی کرنے کے لیے آتا۔ وہ جانے کے لیے مڑا لیکن اچانک ہی اس نے ایک سوال کردیا۔

''تمہارے خیال میں اس راستے کو بند کرنے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

''وہ ہمیں اس گھر سے نکالنا چاہتا ہے۔'' کارمن نے کہا۔

''وہ تو ایک عرصے سے تمہیں نکالنا چاہ رہا ہے لیکن اب اس نے راستہ کیوں بند کیا؟ کیا کوئی بات ہوئی ہے یا تم دونوں میں کوئی جھگڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس نے یہ حرکت کی؟''

کارمن کچھ دیر زمین کو دیکھتی رہی، پھر آہستہ سے بولی۔ ''وہ مجھ سے شادی کرنا چاہ رہا ہے۔ میں نے انکار کردیا۔''

ولیم نے سر ہلایا۔ یہ انکشاف سننے کے بعد اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد وہ سیدھا میئر کے دفتر گیا۔ اس وقت ریمیز گھر جانے کی تیاری کررہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ولیم کو کچھ کہنے سے روک دیا اور بولا۔ ''میں نے سنا ہے کہ البا کی بیوی تم سے ملنے آئی تھی۔ تم اس معاملے میں مت پڑو۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایکویڈو کو پورا حق ہے کہ وہ اپنی زمین کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ البا کی بیوی کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''لیکن عدالت نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ جب تک جج یہ نہ کہہ دے کہ کارمن کا اس جگہ پر کوئی حق نہیں، تب تک ہمیں یہ فرض کرلینا چاہیے کہ وہ اعتراض کرسکتی ہے۔''

''کس بنیاد پر؟''

''کیونکہ وہ وہاں برسوں سے رہ رہی ہے۔''

''اور ایکویڈو بھی ماریو کے مرنے کے بعد اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کررہا ہے۔ بہرحال اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے پاس افرادی قوت کی کمی ہے۔ ہمارے آدمی اگلے ہفتے دوسری جگہ مصروف ہوں گے۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میرے

آدمی اس راستے کو صاف نہیں کریں گے۔''

ولیم جانتا تھا کہ ریمیز جب ایک فیصلہ کر لے تو اسے بدلنے پر مجبور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے اسے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ یہی سوچ کر اس نے ماریا گارسیا کے گھر کا رخ کیا۔ وہ اس شہر کی کامیاب ترین وکیل تھی۔ وہ ایک بڑے اور عالی شان مکان میں تنہا رہتی تھی۔ جب ولیم وہاں پہنچا تو وہ دوسری منزل کی بالکونی میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''اوپر آجاؤ۔'' اس نے آواز لگائی۔ ''دروازہ کھلا ہوا ہے۔''

وہ کرسی پر جھول رہی تھی۔ اس نے سفید بلاؤز، سفید پتلون اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ ''میں جشن منا رہی ہوں۔''

''کس بات کا؟''

''اپنے ایک پرانے دشمن کی موت کا۔''

''کیا وہ کوئی جرائم پیشہ تھا؟''

''نہیں، وکیل جرائم پیشہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ تم بھی پیو۔''

ولیم نے اپنے لیے ایک گلاس بنایا لیکن ایک ہی گھونٹ لینے کے بعد اسے میز پر رکھ دیا اور بولا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''تھوڑی سی چینی اور واڈکا۔''

''معاف کرنا، میں یہ ڈرنک نہیں لے سکتا۔ اس وقت میں ڈیوٹی پر ہوں۔''

''پھر تو تمہیں واقعی یہ ڈرنک نہیں لینی چاہیے۔'' ماریا نے کہا۔ ''کیسے آنا ہوا؟''

ولیم نے اسے کارمن البا اور ایکویڈو کے تنازعے کے بارے میں بتانا چاہا لیکن ماریا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''مجھے اس کیس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے کیونکہ دو سال پہلے میں کارمن کی وکیل رہ چکی ہوں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کارمن ایک ایسے کاغذ پر دستخط کر چکی ہے جس میں لکھا ہے کہ وہ کچھ رقم کے عوض اس جگہ کو خالی کر دے گی۔ میرے حساب سے یہ ایک اچھا سودا نہیں تھا کیونکہ ایکویڈو نے اسے بہت کم رقم دی تھی اور میں کبھی اس کا مشورہ نہ دیتی۔ جہاں تک میرے علم میں ہے وہ یہ رقم خرچ کر چکی ہے اور اب اس کے لیے اسے واپس کرنا ممکن نہیں۔ ویسے بھی ایکویڈو اتنا بے وقوف نہیں کہ ... رقم کی واپسی کا تقاضا کرے۔ اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ دونوں ماں بیٹی وہ جگہ خالی کر دیں۔''

ولیم کے لیے یہ ایک نئی اطلاع تھی۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

ماریا کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ ''اس نے اپنی زبان بند رکھی ہوئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے بھی یہ بات نہیں بتائی۔ مجھے ایکویڈو کے وکیل سے پتا چلا۔ یہ کتنے شرم کی بات ہے کہ مخالف پارٹی کے وکیل سے ہمیں یہ بات معلوم ہوئی۔''

ولیم نے قرب و جوار کا جائزہ لیا۔ وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ ایکویڈو نے اسے شادی کی پیشکش کی ہے۔''

''وہ خوبصورت عورت ہے۔'' ماریا نے کہا۔ ''اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ ایکویڈو اس سے ایک سال میں طلاق مانگ لے گا۔''

''اور تم اس کی مدد کرو گی تاکہ اسے ایکویڈو کی آدھی جائداد مل جائے۔''

''میں یہ خدمت بلا معاوضہ انجام دوں گی۔''

''کیا تم ایکویڈو کو پسند نہیں کرتیں؟''

''میں ایک وکیل ہوں اور میرے نزدیک پسند یا ناپسند کی کوئی اہمیت نہیں۔''

ماریا نے مشروب کا ایک اور گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔
''لیکن میں اسے پسند نہیں کرتی۔ البتہ اس کا باپ اچھا آدمی تھا لیکن اس کا بیٹا پکا شیطان ہے۔''
اس رات گھر پر ڈنر کرتے ہوئے ولیم نے اپنی بیوی کو کارمن کے مسئلے کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اسے اس معاملے میں آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔
''تمہیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔'' میری نے کہا۔
''بالکل، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کی کس طرح مدد کی جائے۔ اس نے پیسے لے کر گھر خالی کرنے کے معاہدے پر دستخط کردیے ہیں۔ یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔''
''کیا تم نے وہ معاہدہ دیکھا ہے؟ ممکن ہے اس میں کوئی قانونی سقم ہو، بعض اوقات دوسری پارٹی سے بھی غلطی ہوسکتی ہے۔'' میری نے کہا۔
اس رات بستر پر لیٹ کر ولیم اپنی غلطیوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے اس بارے میں ماریا سے بات کرنی ہوگی تاکہ وہ خود اس دستاویز کو دیکھ سکے۔
پیر کی صبح وہ کارمن البا سے ملنے گیا تو وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ ''میں نے اس راستے کی صفائی کے لیے کسی کو کام کرتے نہیں دیکھا۔''
''میں تم سے اس کاغذ کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں جس پر تم نے دستخط کیے تھے۔''
وہ ایک سادہ سی تحریر تھی جس میں کارمن نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پانچ ہزار سات سو ڈالرز کے عوض ایک سال کے اندر یہ جگہ خالی کردے گی۔ رقم کی ادائیگی معاہدے پر دستخط کے بعد ہونی تھی۔ اس کاغذ پر درج تاریخ کے مطابق کارمن کو تین سال پہلے یہ جگہ خالی کردینی چاہیے تھی۔
''کیا اس نے رقم ادا کردی تھی؟'' ولیم نے پوچھا۔
اس کے خیال میں یہی واحد قانونی سقم ہوسکتا تھا۔ اگر ایکویڈو نے ابھی تک رقم ادا نہیں کی تو کارمن کے پاس وہاں رہنے کا جواز موجود تھا۔
''ہاں، اس نے ادائیگی کردی تھی۔ میں بے وقوف نہیں ہوں۔''
''اور وہ رقم.....؟'' کارمن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''کیا وہ رقم خرچ ہوگئی؟'' ولیم نے پوچھا۔
''کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں نے وہ پانچ ہزار ڈالرز اس مکان میں چھپا رکھے ہیں؟''
ولیم نے غیر ارادی طور پر اس مکان اور وہاں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیا۔ ان سب کی مالیت شاید ایکویڈو کی دی ہوئی رقم کے نصف سے بھی کم تھی۔
''اس کے علاوہ تم کچھ اور جاننا چاہتے ہو؟'' کارمن نے پوچھا۔
ولیم نے نفی میں سر ہلایا اور جانے کے لیے کھڑا ہوگیا، پھر اچانک اس نے کہا۔ ''پانچ ہزار سات سو..... کیا یہ عجیب وغریب نمبر نہیں ہے؟''
''ماریو نے بلوں کی ادائیگی نہیں کی تھی پھر اس کے علاج اور تدفین پر بھی کافی اخراجات ہوئے۔ ہمارے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔'' بولتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی اور آنسو تیزی سے بہنے لگے۔
''اگر تم کچھ کہنا چاہو.....''
ولیم نے کہا، لیکن کارمن نے اسے جملہ پورا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ''تم چلے جاؤ۔'' وہ دروازے کی طرف اشارہ کرکے چلائی۔
اس کے بعد شیرف ایک بار پھر میئر سے ملنے گیا لیکن اس نے اپنا ذہن تبدیل کرنے سے انکار کردیا البتہ ماریا گارسیا کا رویہ قدرے ہمدردانہ تھا۔
''میں اس معاملے کو دیکھ سکتی تھی اگر معاہدے میں کوئی قانونی سقم ہوتا۔ کارمن کو چاہیے تھا کہ وہ معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرلیتی۔ اب ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔''
اگلے روز ولیم نے ایک بار پھر میئر ریمیز سے ملنے کی کوشش کی لیکن میئر نے اسے ملاقات کا وقت نہیں دیا۔ ماریا گارسیا کسی جنازے میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئی ہوئی تھی اور ولیم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کے لیے کیا کرسکتا ہے لیکن اس کے دماغ میں کوئی بات نہیں آئی۔
اختتامِ ہفتہ اس نے ایک حکمتِ عملی طے کرلی کہ وہ کم از کم صبح کے وقت سلویا کو اسکول چھوڑنے جاسکتا ہے۔ اس کی بیوی نے سنا تو بولی۔ ''تم کب تک ایسا کرسکو گے؟ کیونکہ ایکویڈو اس راستے کو ہمیشہ کے لیے بند رکھ سکتا ہے۔''
ولیم کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسکول کھلنے میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ ولیم پیر والے دن کارمن کو بتانے گیا کہ فی الحال وہ سلویا کو اسکول چھوڑنے جایا کرے گا۔ کارمن گھر پر ہی تھی لیکن اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔

ولیم نے اپنی بات شروع ہی کی تھی کہ اس عورت نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

''ہم شادی کررہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

ولیم یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کیوں! تم یہ شادی کیوں کررہی ہو؟''

''سلویا کو اسکول اور مجھے اپنے کام پر جانا ہے۔ اگر یہ راستہ صاف نہ ہوا تو ہم کہیں بھی نہیں جاسکیں گے۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔'' کارمن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ تم سے کیوں شادی کرنا چاہتا ہے۔ پچھلے ہفتے تک یہی لگ رہا تھا کہ وہ تم دونوں کو یہاں سے نکالنا چاہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے اپنا ذہن کیسے تبدیل کرلیا۔''

کارمن نے ایک بار پھر اپنے کندھے اچکائے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے جنہیں اس نے اپنی ہتھیلیوں سے صاف کرلیا۔

''یہ کیا ہے؟'' ولیم نے پوچھا۔

کارمن نے نفی میں سر ہلایا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے ماریو کی ایک بات یاد آگئی جو اس نے مرتے وقت کہی تھی کہ ہماری محبت لافانی ہے اور ہم جنت میں بھی ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے۔''

''کیا وہ شاعر تھا؟''

''نہیں، لیکن اسے لفظوں کے استعمال کا ہنر آتا تھا۔ وہ مرنے کے بعد بھی مجھ سے محبت کررہا ہے اور میں ایک دوسرے شخص سے شادی کرکے اس سے بے وفائی کررہی ہوں۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''میں یہ سب سلویا کے لیے کررہی ہوں۔ ایکویڈو میرے لیے اہم نہیں ہے اور نہ کبھی ہوگا۔''

''شادی کب ہے؟'' ولیم نے جاتے ہوئے پوچھا۔

''اس کی کسے پروا ہے۔'' کارمن نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

منگل کی دوپہر میئر ریمیز یہ بتانے شیرف کے دفتر آیا کہ گری کی وجہ سے بلدیہ کے دفتر میں چھٹی کردی گئی ہے۔ ''تم رافیل ایکویڈو کی زمین پر سے گزرنے والے راستے کی صفائی کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟'' میئر نے پوچھا۔ ''اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج صبح کارمن البانے ایکویڈو سے شادی کرلی ہے۔ میں خود اس تقریب میں موجود تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس کے لیے فائدے کا سودا ہے۔''

اسی روز سہ پہر میں ماریا گارسیا، شیرف کے دفتر میں آئی۔ شیرف اس کی غیر متوقع آمد پر حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''اس وقت میرے آنے کی وجہ کچھ اور ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہاری مدد کرسکتی ہوں۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم نے وکیل لوئیس مارٹن کا نام سنا ہے؟''

ولیم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' ماریا بولی۔

''گزشتہ ہفتے اس کا انتقال ہوگیا۔ میں جمعے کے روز اس کی تدفین میں گئی تھی۔ جج فرنانڈس نے مجھے بتایا کہ وہ وکیل اپنا دفتر بے ترتیب حالت میں چھوڑ کر مرا ہے۔ مشکوک مالیاتی ریکارڈ، نامکمل معاہدے اور وصیتیں وغیرہ۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے رکی، پھر اس نے کہا۔ ''ان میں کم از کم تین وصیتیں ایسی ہیں جنہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ جان بوجھ کر بنا دی گئی ہیں کیونکہ لوگوں نے ایسا کرنے کے لیے اسے

میڈیا

میں نے میڈیا سے پچھلے چند سالوں میں یہ باتیں سیکھی ہیں۔

☆ ہر ٹوتھ پیسٹ نمبر 1 ہے اور ڈاکٹر کا تصدیق شدہ بھی۔

☆ موبائل کمپنیاں پیسے لے کر بھی آپ کو فری انٹرنیٹ اور ایس ایم ایس مہیا کرتی ہیں۔

☆ کھانے میں گھی استعمال کرتے ہوئے ناچنا ضروری ہے ورنہ کھانا مزے کا نہیں پکے گا۔

☆ انسان کی رنگت اس کی صلاحیتوں اور خوبیوں سے زیادہ اہم ہے اس لیے بیوٹی کریم استعمال کرنا بہت ضروری ہے۔

☆ جتنے بھی موبائل نیٹ ورک ہیں، سب کے سب نمبر ون نیٹ ورک ہیں۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

رشوت دی تھی۔''

ولیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔''اگر اس کی موت واقع نہ ہوئی تو اس کے لیے مشکل ہوسکتی تھی۔''

''ایکویڈو سینئر نے بھی اس سے ایک وصیت تیار کروائی تھی جسے کبھی کسی نے نہیں پڑھا۔'' ماریا نے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ ہم یہ لڑائی جیت سکتے ہیں۔''

ولیم نے لمحہ بھر اس کے الفاظ پر غور کیا، پھر کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف لپکا۔

''کیا ہوا؟'' ماریا نے پوچھا۔

''انہوں نے آج شادی کرلی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رافیل ایکویڈو کا مکان سڑک سے ایک ہزار فٹ کے فاصلے پر تھا لیکن وہاں تک جانے کے لیے تارکول کی سڑک بنی ہوئی تھی۔ وہ مکان ستونوں پر کھڑا تھا اور اس کے نیچے گاڑیاں کھڑی کرنے کی جگہ تھی۔ ولیم نے اپنی کار وہیں کھڑی کی اور لیونگ روم کی طرف بھاگا۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ولیم نے کئی مرتبہ آواز لگائی لیکن گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ واپس پلٹا، تبھی اسے مکان کے عقب سے ایک چیخ سنائی دی۔ وہ تیزی سے اس جانب گیا۔ وہاں کارمن کیچڑ میں بیٹھی ہوئی تھی۔''وہ اسے لے گیا..... سلویا کو'' وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔''اس کے پاس گن بھی ہے۔''

ولیم لمحہ بھر کے لیے ہچکچایا۔ وہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر دور پہاڑی سے آنے والی چیخ نے اسے فوری فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ اس نے اسی جانب دوڑ لگادی۔ وہاں ایک باڑا تھا جہاں ایکویڈو کا باپ مویشی باندھتا تھا۔ اس میں ایک بالائی کمرا بھی تھا جو کبھی وہاں کے ملازموں کی رہائش کے لیے استعمال ہوتا ہوگا۔

ولیم باڑے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک چیخ اور پھر ایکویڈو کے چلّانے کی آواز سنی تو اس نے اپنا ہتھیار نکال لیا اور دوسرے ہاتھ سے دروازے پر دستک دی۔

''رافیل! دروازہ کھولو۔ میں شیرف ولیم ہوں۔''

تبھی ایک فائر ہوا اور شاٹ گن کے تمام چھرے ولیم کے سینے پر لگے۔ اس کا پاؤں پھسلا اور وہ کمر کے بل زمین پر گر گیا تاہم بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی البتہ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ اس کا سر بری طرح زمین سے ٹکرایا تھا جس کی وجہ سے اسے چکر آرہے تھے۔

رافیل ایکویڈو اس کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

''میں نے تمہیں اس جگہ سے دور رہنے کے لیے کہا تھا۔ یہاں آنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔''

اس نے دوبارہ فائر کرنے کے لیے شاٹ گن کا رخ ولیم کی طرف کیا لیکن اسے ٹریگر دبانے کا موقع نہیں ملا۔ سلویا باڑے سے دوڑتی ہوئی آئی اور ایکویڈو کی پشت سے ٹکرا گئی۔ وہ آگے کی جانب گرا اور کیچڑ میں لت پت ہوگیا۔ وہ اپنے قدموں پر اچھلا اور اس نے شاٹ گن کا رخ سلویا کی جانب کردیا۔ لڑکی کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹی۔ اس کے بجائے وہ تن کر کھڑی ہوگئی اور اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

''میں تم سے ڈرنے والی نہیں۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''بے وقوف لڑکی..... میرے پاس گن ہے۔''

ایکویڈو نے کہا، پھر وہ اس کی جانب بڑھا اور گن کا رخ اس کی جانب کردیا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے وہ اسے گولی ماردے گا لیکن پھر وہ نرم پڑ گیا اور اس نے اپنی گن نیچے کرلی۔

''میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا، سلویا۔'' اس نے کہا۔ ''صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اس کاغذ پر دستخط کردو۔''

''میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔'' سلویا نے جواب دیا۔

ایکویڈو کے چہرے سے مایوسی جھلکنے لگی۔ اس نے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور گردن کا پچھلا حصہ سہلانے لگا۔ ولیم نے بھی زمین پر لیٹے لیٹے کروٹ بدلی اور پیٹ کے بل رینگتے ہوئے اپنا ریوالور تلاش کرنے لگا۔ ایکویڈو پلٹا اور اس کی جانب ایک قدم بڑھایا۔

''تم تو پہلے ہی مرچکے ہو۔'' وہ چلّایا اور ولیم کی پشت پر گولی چلادی۔ اس کے کچھ چھرے ولیم کے دائیں کندھے پر لگے اور وہ کیچڑ میں لت پت ہوگیا۔ سلویا نے ایکویڈو کو دھکا دینا چاہا لیکن اس نے اس کا بازو پکڑا اور باڑے کی طرف گھسٹنے لگا۔ ولیم نے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن وہ بری طرح زخمی تھا۔ اس کی نظر بھی دھندلا گئی تھی اور اسے اپنا ریوالور بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک بار پھر چیخنے کی آواز سنائی دی۔ ایکویڈو اور سلویا ایک دوسرے پر چلّا رہے تھے۔ ولیم نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ وہ کامیاب ہوگیا۔ اس نے دروازے پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ اس کی گن بیلٹ میں پسی

دل پزیر مضامین سے سجا اکتوبر 2020ء کا متاثر کن شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

نایاب جیلانی، افشاں آفریدی اور سعدیہ رئیس کی قسط وار پراثر کہانیاں

پڑھیے مکمل ناول پریوں کا دیس ...... مدیحہ شاہد کا دلنشیں فنِ تحریر

عورت کہانی میں فرحین اظفر لائی ہیں ایک اور بہترین کہانی ...... ع عورت؛ ق قفل

پاکیزہ کے مہمان میں

شائستہ زریں متعارف کرواتی ہیں

کھانا گھر کی منتظم پروین سعید سے

شمع ہدایت ......

اختر شجاعت کا تحقیقی مقالہ ......

حب مال ...... آزمائش الٰہی

اس کے علاوہ

فرح بھٹو، دُردانہ نوشین خان، شمیم فضل خالق اور پروین عذرا تشنہ

کی دل رُبا تحریروں کے ساتھ ساتھ مزید پڑھیے نئے قلم کاروں کے حسین نثر پارے

آپ جیسے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعر و شاعری، خوش ذائقہ، حسن کے نکھار کے لیے

معلومات سے پُر تراشے اور گوشۂ ظرافت جیسے خوب صورت سلسلے

ہوئی مرچوں کا ایک چھوٹا سا کنستر بندھا ہوا تھا۔ اگر وہ قریب جا کر ایکویڈو پر مرچوں کا اسپرے کرتا تو سلویا اس کے چنگل سے آزاد ہو سکتی تھی۔ جیسے ہی ولیم نے باڑے کا دروازہ کھولا، ایکپ اور چیخ سنائی دی۔ یہ ایکویڈو کی تھی اور سلویا بارش میں بھیگتی ہوئی باہر آ گئی۔

''اپنی ماں کے پاس جاؤ۔'' ولیم نے کہا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ سلویا نے اس کی آواز سنی ہے یا نہیں۔ وہ مسلسل بھاگ رہی تھی۔ ایکویڈو کی چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔ اس مرتبہ وہ جھلّایا ہوا تھا۔ ولیم نے باڑے میں جھانکا، وہاں ایک چھوٹی میز اور کرسی رکھی ہوئی تھی۔ برسوں پہلے بوڑھا ایکویڈو اس میز پر بیٹھ کر دودھ کی پیداوار اور جانوروں کے علاج معالجے کی تفصیل لکھا کرتا تھا۔ اب اس کا بیٹا اس میز پر ہتھیلی جمائے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے شاٹ گن پھینک دی تھی لیکن قلم ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''تمہیں میری مدد کرنی چاہیے۔'' اس نے ولیم سے کہا۔

ولیم نے مرچوں سے بھرا کنستر اس کے سامنے کیا اور اس کی آنکھوں میں مرچیں جھونک دیں۔ ایکویڈو پیچھے ہٹا اور گھٹنوں کے بل جھک کر دونوں ہاتھوں سے آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ولیم نے آگے بڑھ کر ایک بار پھر اس کے چہرے پر مرچوں کا اسپرے کیا۔ اسے یقین تھا کہ اب ایکویڈو کچھ دیر تک حرکت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔

''تم یہیں رک کر انتظار کرو۔'' شیرف نے کہا۔ ''میں کسی کو بلاتا ہوں تاکہ تمہیں باضابطہ گرفتار کیا جائے۔''

اس نے آگے بڑھ کر ایکویڈو کی شاٹ گن اٹھائی اور باڑے سے باہر چلا گیا۔ بارش رک چکی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ کیچڑ میں اپنا ریوالور تلاش کر لے گا۔ وہ چند قدم ہی گیا تھا کہ ایکویڈو نے اسے پکارا۔

''میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ باڑے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ولیم کا پستول تھا۔

''کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا.....'' ولیم نے کہا لیکن اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی ایکویڈو نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ شاید وہ اپنے بھیانک جرائم کے ساتھ گرفتاری نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس واقعے کے ایک ہفتے بعد سلویا، شیرف کے دفتر آئی اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔'' اس نے کہا۔ ''بوڑھے ایکویڈو نے اپنی وصیت میں آدھی زمین میرے نام کر دی تھی لیکن اس کے بیٹے نے وکیل کو رشوت دے کر اسے دبا دیا تاکہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔''

ولیم نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وکیل نے اس وصیت کو ضائع نہیں کیا، پھر اس کا انتقال ہو گیا اور یہ وصیت بھی منظر عام پر آ گئی۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔

''لہٰذا اس نے میری ماں سے شادی کی اور وہ چاہتا تھا کہ میں اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤں۔''

''تمہاری ماں سے شادی کر کے یہ حقیقت تبدیل نہیں ہوئی کہ تم آدھی زمین کی مالک ہو۔''

''کیا اس نے یہ سوچا تھا کہ میری ماں سے شادی کرنے کے بعد وہ مجھ سے کاغذ پر دستخط کروا لے گا؟''

ولیم نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے اس نے سوچا ہو کہ تم شادی کے بعد ایک فرماں بردار بیٹی کی طرح اس کی بات مان لوگی یا اس کا خیال ہو کہ تمہارا قانونی سرپرست بننے کے بعد وہ پوری زمین کا مالک بن جائے گا۔ ممکن ہے کہ بعد میں اسے اندازہ ہوا ہو کہ وہ غلطی پر تھا۔''

''کیا مجھ سے دستخط کروانے کے بعد وہ مجھے قتل کر دیتا؟'' سلویا نے پوچھا۔

''میرا یہی خیال ہے۔'' ولیم نے کہا۔ ''اگر تم عدالت میں جا کر کہہ دیتیں کہ اس نے گن پوائنٹ پر تم سے دستخط کروائے ہیں تو وہ کاغذ اس کے لیے بے کار ہو جاتا۔ اس لیے وہ تم دونوں ماں بیٹی کو قتل کر کے بھاگنے کا الزام لگا دیتا اور مجھ سمیت سب لوگ اس کی بات پر یقین کر لیتے۔''

اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری ماں نے یہ شادی منسوخ کر دی تھی؟''

سلویا اس بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی، البتہ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اس کی ماں نے کبھی وہ انگوٹھی نہیں پہنی جو ایکویڈو نے اسے دی تھی۔

اس رات کارمن البا اپنے مکان کی بالکونی میں کھڑی آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایکویڈو کے مرنے کے بعد یہ مکان اس کی ملکیت تھا۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور زیرِ لب بولی۔ ''اے ستارو! گواہ رہنا۔ میں کارمن البا، اپنے مرحوم شوہر ماریو البا کی بیوی ہوں اور ہمیشہ اسی کی رہوں گی۔ ساری دنیا کی دولت بھی مجھے اس سے بے وفائی پر مجبور نہیں کر سکتی۔''

⌘⌘⌘

باپ کا باپ

منظر امام

جس پر سچ کا گمان گزرے عملی طور پر ایسا جھوٹا ڈراما رچانے والا فنکار ہی تو ہوتا ہے مگر... جھوٹ اور سچ کا درمیانی فاصلہ وہ کبھی عبور نہیں کرپاتا... وہ دونوں بھی تو اسی فاصلے کے مابین دوڑیں لگا رہے تھے اور... تھکن پال رہے تھے۔

نہلے پہ دہلا کی عملی تفسیر......اور مصنف کا دلچسپ انداز

وہ مجھے ایک دکان پر دکھائی دے گیا تھا۔

بہت ہی طرح دار نوجوان تھا۔ میں اس محلے کے اسٹور پر پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔

میں خود اس اسٹور میں جا کر اس نوجوان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک بڑا سپر اسٹور تھا۔

میں نے دیکھا کہ اس نوجوان نے ڈھیر ساری شاپنگ کر رکھی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم دس بارہ ہزار کی شاپنگ تو ہوگی۔ اسٹور والا اس کی خریداری

دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ میں سکتے کے عالم میں اس نوجوان کو دیکھے جا رہا تھا۔

اس نوجوان نے میری طرف بھی دیکھا تھا لیکن سرسری نگاہوں سے۔ اس کے بعد وہ کاؤنٹر والے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں اپنی آنکھیں پونچھتا ہوا اسٹور سے باہر آ گیا۔

لیکن میں کہیں گیا نہیں بلکہ ایک طرف جا کر کھڑا ہو گیا۔ دس منٹ بعد وہ نوجوان اسٹور سے باہر نکلا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ چند لمحوں تک سوچتا رہا، پھر تیزی سے میرے پاس آ گیا۔

''خیریت تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''آپ نے مجھ میں ایسا کیا دیکھ لیا ہے کہ میری ہی طرف متوجہ ہیں؟''

اب مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر رونا شروع کر دیا۔ ''بیٹے! میں تم میں اپنے مرحوم بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ بالکل تمہاری طرح تھا۔ خدا اس کی مغفرت فرمائے، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا اور میں بیٹے کے پیار کو ترس گیا ہوں۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھے بابا کہہ کر پکارے۔''

''میں اگر بابا کہہ کر پکاروں تو آپ کو بُرا تو نہیں لگے گا؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''بُرا لگے گا؟ بیٹا! یہ کہا کہہ رہے ہو۔ میرے لیے تو یہ خوشی کی بات ہوگی۔ مجھے اور کیا چاہیے؟''

نوجوان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ ''بابا! اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے یاد کر لیجیے گا۔ میں درخشاں میں رہتا ہوں۔ میرا وہاں ایک گارمنٹ اسٹور ہے۔''

''ضرور۔''

وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

میں بوجھل قدموں سے اپنے گھر واپس آنے لگا۔ اچانک کسی طرف سے آواز آئی۔ ''ارے منیر صاحب! ذرا ادھر تو آئیں۔''

میں اس دکاندار کے پاس چلا گیا۔ ''منیر صاحب! وہ کون نوجوان تھا آپ کے ساتھ؟ میں نے اسے روبی اسٹور میں دیکھا تھا۔''

''وہ..... وہ میرا بیٹا تھا بھائی۔''

''جی ہاں۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ آپ جس انداز سے اس سے مل رہے تھے، اسے پیار کر رہے تھے، وہ ایک باپ ہی کر سکتا ہے لیکن میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

''ہاں۔ وہ ملک سے باہر تھا۔ بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہے۔''

''چلیں مبارک ہو۔''

میں گھر واپس آ گیا۔ اب میں کس کو بتاتا کہ اس نوجوان سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے اور ویسے بھی کون اس دور میں اوروں پر اتنا دھیان رکھتا ہے۔ دکاندار نے سرسری انداز میں پوچھ لیا تھا، اتنا ہی بہت تھا۔

میری بھی کیا زندگی ہے۔ ایک عرصہ پہلے ریٹائر ہو چکا ہوں۔ بیوی کا انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔ اس کی موت کے بعد پھر شادی نہیں کی۔ اس سے صرف ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام شہروز تھا۔

ہے نا خوبصورت نام؟ ویسے وہ خود بھی خوبصورت ہی تھا، کسی شہزادے کی طرح۔

میں نے اس سے بہت پیار کیا تھا۔ یہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے۔ ہر باپ اپنے بیٹے سے پیار تو کرتا ہی ہے لیکن میں نے اس کے لیے تو اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا، اسی لیے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا تھا، جتنی میں نے کی تھی۔

لیکن شہروز میرا نہیں رہا تھا۔ وہ غیر ملک جا کر آباد ہو گیا تھا۔

میں گھر واپس پہنچا تو علیم صاحب دروازے پر کھڑے تھے۔

وہ میرے پڑوسی ہیں۔ بہت نیک آدمی۔ ان کو اس بات کی بے فکری تھی کہ انہوں نے رشوت کے پیسوں سے بہت سی جائدادیں بنالی تھیں جو کرائے پر تھیں اور اچھا خاصا مہینا آیا کرتا تھا۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں ملک سے باہر تھے۔ وہ بھی ہر ماہ بہت کچھ بھیجا کرتے تھے، یعنی مزے ہی مزے تھے۔ ویسے دوست قسم کے آدمی تھے.....

ان کا ایک زبردست شوق تھا..... وہ تھا کھانا بنانے کا۔ وہ اپنے کھانے خود ہی بنایا کرتے اور کیا ٹیسٹ تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ان کی محبت تھی کہ وہ جب بھی کوئی خاص ڈش بناتے تو میرے پاس ضرور لے آتے تھے۔

اس وقت بھی وہ ایک بڑے سے برتن میں کچھ لے کر آ گئے تھے۔

''ارے بھائی! کہاں رہ گئے تھے۔ میں تو دو بار دیکھ کر جا چکا ہوں۔ یہ میں نے مچھلی کا سالن بنایا تھا۔ میں نے سوچا کہ تم کو بھی شامل کر لوں۔''

''علیم صاحب! یہ آپ اتنا تکلف کیوں کرتے ہیں؟''

''ارے بھائی! اس میں تکلف کی کیا بات ہے؟''

میں نے ان کے لائے ہوئے برتن پکڑ لیے۔ وہ برتن دے کر چلے گئے۔ سالن کھا کر دل خوش ہوگیا۔ واقعی ان کے ہاتھ میں بہت لذت تھی۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو کسی کو کھلا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ علیم صاحب ان ہی لوگوں میں سے تھے۔

دوسری صبح جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔ ''ہاں بھئی منیر صاحب! کیسا لگا سالن؟''

''کیا کہنے ہیں..... آپ تو اچھا ہی بناتے ہیں۔ تھوڑا سا خود کھایا تھا، باقی اپنے بیٹے کے لیے رکھ لیا ہے۔''

''بیٹا؟'' علیم صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ''میں نے تو نہیں دیکھا۔''

''ہاں۔ وہ کہیں باہر تھا۔ واپس آ گیا ہے لیکن کچھ دنوں کے لیے کسی اور شہر میں ہے۔ آج کل وہ میرے ہی پاس ہے، رات کو آجاتا ہے۔ بہت ہی سمجھ دار اور فرماں بردار قسم کا نوجوان ہے۔ میری تو دعا ہے کہ خدا ہر ایک کو ایسی اولاد دے۔''

علیم صاحب کے لیے یہ ایک جذباتی موضوع تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے اور دونوں ہی نالائق۔ ایک بیٹی تھی جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ رشتے کے لیے پریشان تھے۔ مجھے ان کی باتیں سن کر افسوس بھی ہوا کرتا تھا۔

دوسری صبح میں جب گھر سے نکلا تو ایک حیرت انگیز منظر سامنے تھا۔ وہی نوجوان جو مجھے اسٹور پر ملا تھا، وہی میرے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں نہال ہوگیا۔

میں جلدی سے اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے مجھے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ''ارے آپ یہاں کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

''اس طرح نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے مجھے بابا کہہ کر پکارا تھا۔ اب بھی کہو۔''

''ہاں بابا! آپ یہاں کہاں؟''

''بیٹا! میں یہیں رہتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن تم کہاں آ گئے؟''

''میں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ وہ نہیں ملا واپس جا رہا ہوں۔''

ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ علیم صاحب بھی آ گئے۔ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئے۔ ''منیر صاحب! یہ نوجوان کون ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''یہ..... یہ میرا بیٹا ہے۔''

یہ میں بے دھڑک ہو کر اس لیے کہہ سکتا تھا کہ میں اس محلے میں نیا نیا آیا تھا۔ علیم صاحب نے میرے بیٹے شہروز کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔

علیم صاحب نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

مجھے اس وقت ایک خیال آیا اور شرمندگی بھی محسوس ہوئی کہ میں نے ابھی تک اس نوجوان کا نام ہی نہیں پوچھا تھا۔ اب کوئی معلوم کر لیتا تو میں کیا بتاتا۔ بہرحال اس نے اپنا گھر تو بتا ہی دیا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں شام ہی کو اس کی طرف چلا جاؤں گا۔ سب سے پہلے اس کا نام ہی معلوم کروں گا۔

شام کے وقت میں اس علاقے میں چلا گیا جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ ایک اچھی سوسائٹی تھی۔ وہاں سلیقے کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق پیسے والے لوگ ہی رہتے ہوں گے۔

ایک بار پھر وہی الجھن کہ اس کا نام معلوم ہی نہیں تھا۔ میں اسے تلاش کرتا تو کس نام سے کرتا۔

لیکن قسمت نے پھر ساتھ دیا۔ وہی نوجوان نہ جانے کس طرف سے نکل کر سامنے آ گیا۔ جس طرح میں اسے اپنے محلے میں دیکھ کر حیران ہوا تھا، اسی طرح وہ بھی مجھے اپنے محلے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ارے بابا! آپ یہاں کہاں؟'' اس نے پوچھا۔

اس بات کی خوشی ہوئی تھی کہ اس نے مجھے بابا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ ''بیٹے! میں تمہاری تلاش میں آیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''میری تلاش میں؟ خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں خیریت ہے۔ بات یہ ہے کہ اب دل چاہنے لگا ہے کہ ہر دم تم کو دیکھتا رہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم سے ایک انجانی سی انسیت ہوگئی ہے۔ پتا نہیں کون سی کشش ہے جو مجھے تمہاری طرف کھینچ کر لے آئی ہے۔''

''ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ والد صاحب کی موت کے بعد تو میں کسی کی شفقت کے لیے ترس ہی گیا تھا۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آئیں میرے ساتھ۔ یہ سامنے میرے دوست کی دکان ہے۔ چل کر بیٹھتے ہیں۔''

میں اس کے ساتھ اس دکان تک چل پڑا۔ راستے میں، میں نے پوچھا۔ ''بیٹا! تم اپنا نام تو بتاؤ۔''

''بابا! میرا نام خورشید ہے۔'' اس نے بتایا۔

''جیتے رہو۔ تم ہو بھی خورشید۔''
دکان آگئی۔ دکان والے نے خورشید کو دیکھتے ہی آواز لگائی۔ ''ہاں خورشید بھائی! کہاں ہو آج کل؟''
''بھائی میں کسی کام سے شہر سے باہر چلا گیا تھا۔'' پھر میرا تعارف کروایا۔ ''یہ میرے ابا ہیں۔''
دکان والے نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔
''میں کچھ دیر کے لیے انہیں تمہاری دکان پر بٹھا کر جارہا ہوں، تم ان کے لیے چائے منگوا دینا۔''
''خورشید بھائی! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''آئیں جناب! تشریف رکھیں۔''
اس نے دکان کے اندر سے ایک کرسی نکال کر چبوترے پر رکھ دی۔ میں اس کرسی پر بیٹھ گیا۔
خورشید اجازت لے کر چلا گیا۔ دکان دار نے دکان میں کام کرنے والے ایک بچے کو چائے کے لیے بھیج دیا تھا۔
دکان دار نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''جناب! اب سے پہلے خورشید نے کبھی آپ سے نہیں ملوایا تھا۔''
اب میں اسے نہیں بتا سکتا تھا کہ اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے، بلکہ اس کا نام بھی آج ہی معلوم ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ خود ہی بول پڑا۔ ''ہاں۔ وہ بتا تو رہے تھے کہ آپ لاہور میں رہتے ہیں۔''
''ہاں بھائی! میں لاہور میں تھا۔''
اس دوران میں چائے اور بسکٹ وغیرہ آگئے تھے۔ دکان دار ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
میں کچھ دیر تک اسی دکان میں بیٹھا رہا لیکن خورشید واپس نہیں آیا۔ میں نے دکان دار سے معذرت کی اور اس دکان سے باہر آگیا۔ دکان دار مصروف تھا، اس نے دھیان بھی نہیں دیا ہوگا کہ میں کس طرف جارہا ہوں۔
مجھے گھر جانا تھا۔ خورشید کے لیے ایک اسکیم ذہن میں تھی۔ بہت مناسب اسکیم۔
میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے کو طول دیا جائے۔ کب تک محبت کی داستان بیان کی جائے۔ اپنا پھر بھی اپنا ہوتا ہے۔
میں نہیں جانتا تھا کہ خورشید لوٹ کر دکان کی طرف آیا یا نہیں۔ کم از کم اسے جا کر دیکھ تو لوں۔ میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں تھا۔ واپس ہی جانا پڑتا۔ میں اسی محلے میں واپس چلا گیا جہاں خورشید رہتا تھا۔
دکان دار جیسے میرے انتظار ہی میں تھا۔ ''ارے جناب! کہاں چلے گئے تھے؟ خورشید آپ کو پوچھ کر گیا ہے اور ایک خط آپ کے نام لکھا ہے۔''
''کیسا خط؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔
''یہ لیں۔'' دکان دار نے میز کی دراز سے خط نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔
اس نے خط میں لکھا تھا۔ ''پیارے ابا جان! میں تو اسی وقت ملا تھا جب آپ پہلی بار مجھ سے آکر ملے تھے۔ میں آپ کی اداکاری کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کون یقین کر سکتا تھا کہ آپ میرے باپ نہیں ہیں اور میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ واہ واہ...... مزہ آگیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں ایک بار آپ کو آپ کے محلے میں ملا تھا...... مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کہاں رہتے ہیں اسی لیے میں سیدھے آپ کے گھر کے سامنے پہنچ گیا تھا۔ میں نے کچھ لوگوں سے آپ کے بارے میں معلومات بھی حاصل کیں اور پتا چلا کہ یہ آپ کا پرانا دھندا ہے۔ آپ اسی طرح لوگوں کو اپنا بیٹا بنا کر لوٹ لیتے ہیں۔ فراڈ کرتے ہیں۔ ثابت کر دیتے ہیں کہ آپ فلاں نوجوان کے واقعی باپ ہیں۔ پھر اپنی مظلومیت کا رونا رو کر اس کے محلے والوں یا دوستوں سے پیسے لے کر غائب ہو جاتے ہیں لیکن اس بار آپ کی بیڈ لک رہی۔ اس کا اندازہ آپ کو بعد میں ہوگا اور پتا چلے گا کہ میں باپ کا بھی باپ ہوں کیونکہ خود میرا بھی یہی کام ہے۔ خدا حافظ۔''
میں بہت شرمندہ ہو کر خط پڑھ رہا تھا۔ عجیب بے بسی سی تھی۔ اس نوجوان نے میری ساری اسکیم غارت کر دی تھی۔ میں دراصل اس کے محلے والوں سے اس کا باپ بن کر رقم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے تو ساری بساط ہی الٹ دی تھی۔
گھر واپس پہنچا تو دروازے پر علیم صاحب مل گئے۔ ''ارے صاحب! طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟''
''جی علیم صاحب! میں ٹھیک ہوں، لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''
''ارے بھائی! آپ کے صاحبزادے نے آکر بتایا تھا کہ آپ کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ آپ اسپتال میں ہیں۔ بے چارہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ مجھ سے بیس ہزار بھی مانگ کر لے گیا تھا۔ خیر، یہ بتائیں وہ پیسے آپ کے کام آئے یا نہیں؟''
میں اپنا سر تھام کر بیٹھ گیا۔ .... چل گیا تھا کہ باپ کا باپ کیا ہوتا ہے۔
⌘⌘⌘

حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمۃ اللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

ولیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ہر سانس اللہ کی یاد میں بسر ہوتی ہے چاہے زندگی کا کوئی بھی دور ہو اللہ کے احکامات اور خوشنودی کے خلاف نہیں جاتے... جنید بغدادی نے بھی بچپن سے لے کر آخری لمحات تک انتہائی کٹھن مراحل میں بھی اللہ کو ناراض نہیں کیا۔

حصولِ علم کے لیے مسلسل محوِ سفر رہنے والے اللہ کے
نیک بندے کا زندگی نامہ

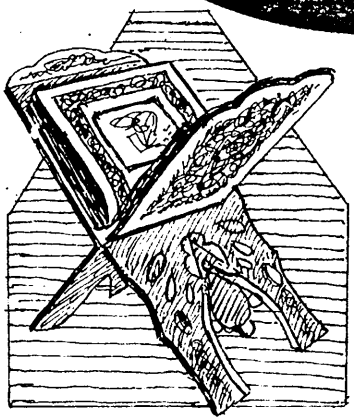

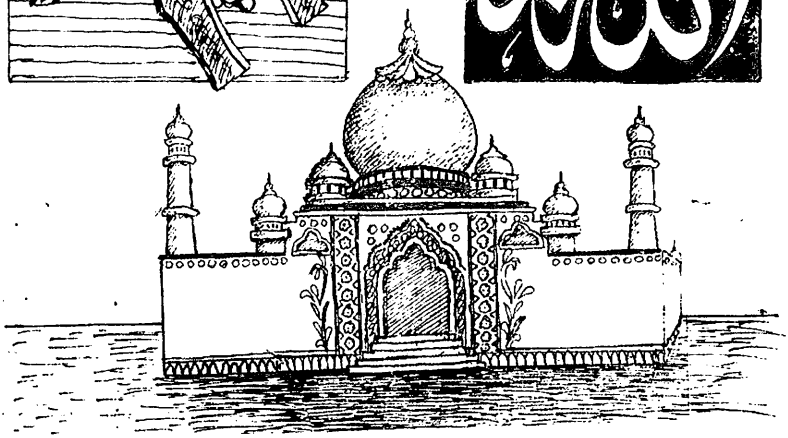

ایران کے صوبہ جبال میں شہر نہاوند کو اس حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل ہے کہ یہاں کی سرداری پر ابوبکر شبلیؒ فائز رہ چکے تھے اور جنید بغدادی کا خاندان یہیں سے ہجرت کر کے بغداد پہنچا تھا۔ جنیدی خاندان میں سب ہی تاجر تھے۔ جنید کے والد شیشے کے پیالوں کا کاروبار کرتے تھے۔ خود جنید خام ریشم کی سوداگری کرتے تھے اور ان کے ماموں سری سقطی مسالا فروش تھے۔ بغداد میں جنید 210ھ میں پیدا ہوئے۔

تاجر باپ اپنے کمسن بیٹے جنید کی ذہانت اور فراست سے لاعلم، دین اور دنیا کے کاموں میں مشغول تھا۔ شعائر دینی کی انجام دہی میں باپ نہایت محتاط اور مستعد تھا۔ ان دنوں برادر نسبتی سری سقطی کی کاروباری حالت سقیم تھی۔ جنید کے والد نے سال بھر کا مالی حساب کر کے زکوٰۃ کی رقم نکالی اور سوچنے لگے کہ یہ رقم کس مستحق کو پہنچائی جائے۔ انہیں اچانک سری سقطی کا خیال آ گیا۔ سری سقطی زہد و تقویٰ اور علمی فضیلت میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ جنید کے والد زکوٰۃ میں سے کچھ رقم لے کر ان کی خدمت میں پہنچ گئے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''بھائی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ان دنوں کچھ پریشان ہیں اور کاروبار میں خسارے نے آپ کی کمر توڑ دی ہے۔ کیا یہ درست ہے؟''

سری سقطی نے خجل ہو کر جواب دیا۔ ''میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔''

جنید کے والد نے پوچھا۔ ''زکوٰۃ کے مسئلے میں اگر یہ نہ ہوتا کہ پہلے اپنوں میں اس کے مستحقین تلاش کرو تو میں آپ کے پاس ہرگز نہ آتا۔''

سری سقطی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، بولے۔ ''میں رقم نہیں لوں گا۔''

وہ مایوس ہو کر باہر نکلے تو انہیں اپنے پیر من من بھر کے محسوس ہونے لگے۔ ان کو سری سقطی کی حالت زار کا خوب اچھی طرح علم تھا۔ سری سقطی شاید کئی وقتوں کے بھوکے ہیں، اس احساس نے انہیں ہلکان کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے گھر واپس جانے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ سر پکڑ کر سر راہ بیٹھ گئے۔ حساس دل نے ان کی آنکھوں تلے تاریکی کی سیاہ چادر تان دی۔ یہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر رونے لگے۔ ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ سری سقطی نے مڑ کر انہیں روتے دیکھا اور گھبرا کے اندر واپس چلے گئے۔ راہ گیر انہیں روتا دیکھ کر خاموش کرواتے رہے۔ مکتب کی چھٹی ہو چکی تھی۔ سات آٹھ سالہ جنید بھی مکتب سے نکلے اور زار و قطار روتے ہوئے باپ کے پاس سے گزرے۔ بیٹے نے باپ کو پہچان لیا۔ ادب سے باپ کے روبرو پہنچے اور چپ چاپ باپ کی حالت پر غور کرنے لگے۔ آخر پاس بیٹھ کر باپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور پوچھا۔ ''باوا جان: آپ رو کیوں رہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟''

دین دار باپ نے حسرت سے بیٹے کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ ''بیٹے جنید! تو ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکے گا جن کے کرب نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا ہے۔''

جنید نے اصرار کیا۔ ''باوا جان! کچھ بتایئے تو سہی، ممکن ہے میں آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔''

باپ نے بیٹے کو کچھ لمحے بغور دیکھا، پھر پورا واقعہ سنا کے افسوس سے کہا۔ ''بیٹے جنید! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تیرے ماموں نے زکوٰۃ کی رقم نہ لے کر اپنے آپ پر بھی ظلم کیا ہے اور ہم سب پر بھی، کیونکہ سری سقطی کی مصیبت ہماری اپنی مصیبت ہے۔ اگر سری سقطی پریشان ہوں گے تو ہم سب بھی پریشان ہوں گے، وہ خوش ہوں گے تو ہم بھی خوش ہوں گے۔''

سات آٹھ سالہ جنید نے عزم و استقامت سے کہا۔ ''باوا جان! وہ رقم میرے حوالے کیجیے، میں ابھی ماموں کے حوالے کر کے واپس آتا ہوں۔''

باپ نے افسوس سے کہا۔ ''بیٹے! جس شخص نے تیرے باپ کی بات نہیں مانی، وہ تیری بات کس طرح مان لے گا؟''

بیٹے نے اسی عزم سے کہا۔ ''اس کی آپ فکر کیوں کریں۔ آپ وہ رقم مجھے دیجیے تو سہی اور یہیں میرا انتظار فرمائیں۔''

باپ نے بے یقینی کی کیفیت سے وہ رقم جنید کے حوالے کر دی۔ جنید سیدھے ماموں کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ جنید نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے سری سقطی نے سوال کیا۔ ''کون؟''

جنید نے جواب دیا۔ ''آپ کا بھانجا جنید! دروازہ کھولیے۔''

سری سقطی نے بے نیازی سے پوچھا۔ ''کس لیے آئے ہو؟''

جنید نے کہا۔ ''دروازہ تو کھولیے۔ اندر آ کے جواب دوں گا۔''

سری سقطی نے اپنے معصوم بھانجے کی آواز پر دروازہ کھول دیا۔ یہ اندر داخل ہو گئے۔ ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ کی رقم کی تھیلی تھی۔ سری سقطی نے تھیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

جنید نے جواب دیا۔ ''زکوٰۃ کی رقم اور اسے میں آپ کے لیے لایا ہوں۔''

سری سقطی نے غصے میں کہا۔ ''جنید! کیا تمہارے باپ نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ میں نے یہ رقم لینے سے پہلے ہی انکار کر دیا ہے؟''

جنید نے کہا۔ ''مجھے سب کچھ معلوم ہے اور میں اس کے باوجود یہ رقم آپ کی خدمت میں لے کر حاضر ہوا ہوں۔''

سری سقطی نے نفرت سے کہا۔ ''میں یہ رقم نہیں لے سکتا۔ اسے واپس لے جاؤ۔''

جنید نے جوش سے کہا۔ ''ماموں جان! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر فضل اور میرے باپ کے ساتھ عدل کیا ہے۔ یہ رقم آپ کو لے لینی چاہیے۔ اگر آپ اس قسم کے بعد بھی یہ رقم نہیں لیتے تو آپ کو اختیار ہے۔ میرے والد کو یہ حکم ملا تھا کہ وہ زکوٰۃ کی رقم اس کے مستحق کو پہنچا دیں۔ انہوں نے حکمِ خداوندی کی تعمیل کر دی، اب وہ بری الذمہ ہو چکے ہیں۔''

سری سقطی نے حیرت سے اپنے ذہین اور کمسن بھانجے کو دیکھا اور فرطِ محبت میں اپنے سینے سے لگا لیا۔ بولے۔ ''جنید! میں زکوٰۃ کی رقم سے پہلے تجھے قبول کرتا ہوں۔ اب تو میرے ہی پاس رہے گا۔''

جنید نے جواب دیا۔ ''میں آپ ہی کے ساتھ رہوں گا لیکن والد صاحب کے پاس تو ہو آنے دیجیے، اس کے بعد آ جاؤں گا۔''

ماموں نے اجازت دے دی۔ یہ سر راہ بیٹھے ہوئے باپ کے پاس پہنچ گئے۔ باپ نے بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا بیٹے؟ کیا وہ تھیلی تیرے ماموں نے قبول کر لی؟''

بیٹے نے جواب دیا۔ ''جی ہاں باوا جان! نہ صرف تھیلی بلکہ تھیلی سے پہلے مجھے قبول کر لیا۔''

اس کے بعد انہوں نے پورا واقعہ سنا کے عرض کیا۔ ''اب آپ بھی مجھے ان کے ساتھ رہنے کی اجازت عطا فرما دیں کیونکہ میں ان سے وعدہ کر آیا ہوں کہ آپ سے اجازت لے کر واپس آ رہا ہوں۔''

باپ کو 'ہاں' کہنے میں تامل ہوا لیکن یہ دیکھ کر کہ بیٹا خود جانے کو آمادہ ہے، جنید کو ماموں کے پاس رہنے کی اجازت عطا کر دی۔ بولے۔ ''سری سقطی کے علم و فضل کا کوئی ٹھکانا ہے، خدا تجھے بھی سری سقطی جیسا علم اور زہد و تقویٰ عطا فرمائے۔'' جنید ماموں کے پاس چلے آئے اور انہی کے ہو رہے۔

سری سقطی انہیں تعلیم و تربیت دینے لگے۔ ان دنوں لوگ حج کرنے جا رہے تھے۔ جنید سے کہا۔ ''جنید بیٹے! کیا تم بھی میرے ساتھ حج پر جانے کو آمادہ ہو؟''

جنید نے جواب دیا۔ ''جب میں آپ کے قدموں میں زندگی گزارنے آ ہی گیا ہوں، تب پھر آپ جہاں بھی لے جانا چاہیں گے، میں بے چون و چرا چلا جاؤں گا۔''

سری سقطی ہنستے ہوئے بولے۔ ''جنید! تم سے مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔''

یہ حجاج کے قافلے میں شامل ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر بہ مشکل آٹھ سال رہی ہوگی۔ مکہ معظمہ میں حج سے فراغت کے بعد آپ نے ایک جگہ چند درویشوں کو مصروفِ گفتگو دیکھا۔ وہ سب شکر کے مسئلے پر گفتگو کر رہے تھے۔ سری سقطی بھی اس بحث کو سنتے رہے۔ آخر میں انہوں نے درویشوں کو مخاطب کیا، بولے۔ ''کیا تم میں سے ایک بھی ایسا ہے کہ شکر کے مسئلے پر کوئی تقریر کر سکے؟''

درویشوں نے بیک زبان کہا۔ ''شاید نہیں، ہمارا علم اور شعور آپ سے کمتر ہی ہے۔''

آپ نے نظر بھر کے آٹھ نو سالہ جنید کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ ''جنید! شکر کے مسئلے پر تقریر کرو۔''

جنید نے فرماں برداری سے سر جھکا دیا اور تقریر کرنے لگے۔ جنید نے کہا۔ ''شکر کی تعریف یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو کوئی نعمت عطا کرے تو اس نعمت کے شکرانے میں اپنے مالک کی نافرمانی نہ کرے۔ یہی شکر ہے۔''

درویشوں نے اس خوبصورت فیصلے کو بہ دل و جان قبول کر لیا۔ اس دوران سری سقطی نے سوال کیا۔ ''بیٹے جنید! تم نے ایک دن یہ کہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ پر فضل اور میرے باپ کے ساتھ عدل کیا۔ میں اس بات کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

جنید نے جواب دیا۔ ''ماموں جان! مطلب صاف ہے۔ خدا نے آپ پر فضل کیا، کا یہ مطلب ہے کہ اس نے آپ کو درویشی اور ترکِ دنیا عطا فرمائی اور میرے باپ سے عدل اس طرح کیا کہ انہیں دولتِ دنیا سے مالا مال کر ڈالا۔''

سری سقطی نے خوشی سے جنید کو گلے سے لگا لیا، بولے۔ ''خدا تجھے نظرِ بد سے بچائے۔ تو اتنی ذرا سی عمر میں کیسی عقل مندی کی باتیں کرتا ہے۔''

جنید ایک مدت تک ماموں سری سقطی سے تربیت حاصل کرتے رہے۔ اس دوران انہوں نے فقہ اور حدیث کی تعلیم مکمل کر لی تھی لیکن وہ مزید تعلیم کی حصولیابی کے لیے بے چین تھے۔ ماموں کے پاس سے رخصت ہونے لگے۔ سری سقطی نے دریافت کیا۔ ''جنید! اب کس کی مجلس میں جانے کا ارادہ ہے؟''

جنید نے جواب دیا۔ ''حارث المحاسبی کی مجلس میں۔''
سری سقطی نے کہا۔ ''جاؤ اور اس سے بھی علم حاصل کرلو لیکن کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ وہ معتزلی ہے اور نظری بحث و استدلال میں الجھا رہتا ہے؟''
جنید نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اس بات سے واقف ہوں۔''
''بس تو پھر اس کے معتزلی افکار و نظریات سے بچے رہنا۔''
اس کے بعد جب جنید وہاں سے جانے لگے تو سری سقطی نے انہیں دعا دی۔ ''جنید! میں خدا سے دعا کررہا ہوں کہ وہ تمہیں صوفی محدث بنائے اور محدث صوفی بننے سے محفوظ رکھے۔''
بعد میں کسی نے جنید سے پوچھا۔ ''آپ کے ماموں کا اس سے کیا مطلب تھا؟''
جنید نے جواب دیا۔ ''اس سے ماموں کا یہ مقصد تھا کہ میں حدیث اور سنت کو مقدم سمجھوں اور زہد و اتقا کو مؤخر جانوں کیونکہ حدیث اور سنت کے صحیح علم کے بغیر زہد و اتقا کی ریاضت اپنے صحیح اثر سے محروم رہتی ہے۔''
جنید نے سری سقطی کے بعد حارث محاسبی اور ابوسفیان ثوری سے درس و تربیت حاصل کی۔ جنید فرمایا کرتے تھے۔ ''جس شخص نے قرآن حفظ نہیں کیا اور باقاعدہ طور پر حدیث بھی نہیں پڑھی اور فقہ کا علم بھی نہیں حاصل کیا، ان تینوں کے فقدان میں وہ تصوف کی طرف بھی مائل ہوگیا تو یہ سمجھو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جسے کبھی بھی راہنمائی کا حق نہیں حاصل ہوسکتا۔''
تعلیم و تربیت سے فراغت حاصل کرچکنے کے بعد جنید پھر ماموں سے ملے تو سری سقطی نے انہیں حکم دیا۔ ''جنید! اب تم علوم ظاہر و باطن کی تکمیل کرچکے ہو اس لیے اس کا اظہار بھی ہونا چاہیے، یعنی تمہیں وعظ و نصیحت شروع کردینا چاہیے۔''
لیکن جنید نے یہ حکم ماننے سے انکار کردیا، کہا۔ ''میں آپ کی موجودگی میں وعظ و نصیحت کے لیے زبان نہیں کھول سکتا۔ اسے میں گستاخی تصور کرتا ہوں۔''
سری سقطی نے کہا۔ ''یہ گستاخی نہیں، دین کی خدمت ہوگی۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم وعظ و تلقین شروع کردو۔''
لیکن جنید نے ان کا یہ حکم نہیں مانا۔
اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ ایک رات جنید انتہائی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا۔ آپ ﷺ جنید کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ جنید آپ ﷺ کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکے۔ گردن جھکالی اور ادب سے سوال کیا۔ ''یارسول اللہ! کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے؟''
''آپ ﷺ نے جواب دیا۔ ''نہیں تو..... تو وعظ کیوں نہیں کہتا جنید؟''
جنید نے عاجزی سے کہا۔ ''یارسول اللہ ﷺ! میں اپنے ماموں سری سقطی کی موجودگی میں لب کشائی کی ہمت نہیں محسوس کرتا۔''
آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''جنید! خدا نے تمہاری زبان میں بڑی تاثیر رکھی ہے۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ تم وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کردو۔ خدا بھی یہی چاہتا ہے۔''
صبح کی نماز سے فراغت کے بعد یہ سیدھے اپنے ماموں کے پاس پہنچے۔ سری سقطی مکان کے باہر دروازے پر کھڑے گویا ان کا انتظار ہی کررہے تھے۔ انہوں نے استقبال کے لیے چند قدم چل کر اپنے بھانجے سے کہا۔ ''جنید! کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ لوگوں سے کلام کرو، لیکن تم ہمیشہ منع کرتے رہے لیکن اب کس طرح انکار کروگے؟ کیا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے بعد بھی تم میں انکار کی ہمت ہے؟''
جنید نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے سلسلے میں کیونکر علم ہوا؟''
سری سقطی نے جواب دیا۔ ''جب رسول اللہ ﷺ تم سے کلام کرنے کے لیے ارشاد فرمارہے تھے، میں وہیں موجود تھا۔'' پھر ذرا ٹھہر کر کہا۔ ''تیری زبان میں بڑا اثر ہے جنید، خدا تجھ سے بڑے کام لے گا۔''
جنید نے شرمسار لہجے میں کہا۔ ''مجلس کا اہتمام کیجیے، میں ان سے کلام کرنا چاہتا ہوں۔''
سری سقطی نے ایک مجلس منعقد کی جس میں چالیس آدمی جمع ہوئے۔ جنید نے انہیں مخاطب کیا اور دیر تک وعظ فرماتے رہے۔ پوری مجلس وجد و حال میں مبتلا ہوگئی۔ ان کے دلوں میں آگ سی لگ گئی۔ دیوانوں کی طرح سر پٹخنے لگے۔ گریبان چاک کرلیے اور ہوش و خرد کی ساری علامتیں ان سے چھن گئیں۔ پوری مجلس بے ہوش ہوگئی۔ سری سقطی کھڑے ہوگئے۔ ہاتھ کے اشارے سے جنید کو خاموش ہوجانے کا اشارہ کیا۔ جنید خاموش ہوگئے۔

سری سقطی مجلس کے ہر بے ہوش شخص کے پاس گئے اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ کئی گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد یہ معلوم ہوا کہ چالیس میں سترہ تو جاں بحق ہو چکے ہیں اور بقیہ تیئس اپنے ہوش وحواس کھو چکے ہیں اور انہیں اللہ بس باقی اس کے علاوہ کچھ یاد ہی نہیں۔

☆☆☆

جنید کی شہرت پھیلتی چلی گئی۔ جتنی جتنی آپ کی شہرت بڑھی، دوسرے ہم عصر ماند پڑتے چلے گئے۔ کسی نے سری سقطی سے پوچھا۔

''حضرت! کیا کسی مرید کا مرتبہ اپنے مرشد سے بڑھ سکتا ہے؟''

سری سقطی نے جواب دیا۔ ''ہاں، ایسا ممکن ہی نہیں بلکہ یہ واقعہ ہے۔ تم جنید ہی کو دیکھ لو۔ وہ میرا مرید ہے لیکن وہ مرتبے میں مجھ سے بہت بلند ہے۔''

جنید ابلیس کے انکارِ سجدہ کے واقعے سے بہت متاثر تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ کسی میں اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے معبود کا حکم نہ مانے۔ اس فکر نے انہیں اتنا پریشان کیا کہ وہ ابلیس کے ملنے کا اشتیاق کرنے لگے۔ وہ اکثر سوچتے اے کاش میں ابلیس سے مل سکتا۔ سری سقطی نے کہا۔ ''جنید! جس سے خدا کے نیک بندے پناہ مانگتے ہیں، تم اس سے ملنے کی خواہش کر رہے ہو۔ یہ کیا بات ہے؟ تم بھی شیطان ملعون سے خدا کی پناہ مانگو۔''

جنید نے ماموں کو کوئی جواب تو نہیں دیا لیکن ابلیس سے ملاقات کی خواہش کو دل سے نہیں نکال سکے۔

ایک دن یہ جمعے کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تو سامنے سے ایک بوڑھا آتا دکھائی دیا۔ یہ بوڑھا ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور انہیں حسرت و اشتیاق سے دیکھنے لگا۔ آپ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور کترا کے نکل جانے کی کوشش کی۔ بوڑھا پھر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ آپ نے زچ ہو کر پوچھا۔ ''تو کون ہے اور میرے راستے میں کیوں حائل ہو رہا ہے؟''

بوڑھے نے جواب دیا۔ ''انسان کی یہ عجیب سی فطرت ہے کہ پہلے تو یہ کسی سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے لیکن جب وہ شخص مل جاتا ہے تو یہ خود ہی اس سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کرتا ہے۔''

جنید نے کہا۔ ''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا؟''

بوڑھے نے جواب دیا۔ ''کیا تم مجھ سے ملنے کی خواہش نہیں رکھتے تھے؟''

جنید نے پھر سوال کیا۔ ''لیکن تم ہو کون؟''

بوڑھے نے جواب دیا۔ ''ابلیس۔''

جنید نے اسے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور کہا۔ ''ہاں! میں تجھ سے واقعی ملنا چاہتا تھا۔''

ابلیس نے پوچھا۔ ''لیکن کیوں؟ خدا کے پاک بندے تو مجھ سے خدا کی پناہ مانگتے رہتے ہیں؟''

''ہاں، یہ بھی صحیح ہے۔'' جنید نے کہا۔ ''تو ملعون ہے اور میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے یہ لعنت کا طوق اپنے گلے میں کیوں ڈلوایا؟ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر وہ کیا چیز تھی جس نے تجھے آدم کو سجدہ کرنے سے روک دیا تھا؟''

ابلیس نے ایک سرد آہ بھری، بولا۔ ''اللہ ایک ہے اور میں نے یہ گوارا نہ کیا کہ خدا کے سوا بھی کسی کو سجدہ کروں۔ میں خدا کی ذات میں کسی اور کو کسی طرح شریک کر سکتا تھا۔ میں نے خدائے واحد کی وحدانیت کے لیے خدا کا حکم نہیں مانا، میں سب سے بڑا موحد ہوں۔''

جنید اس کے جواب سے نہ صرف مطمئن ہو گئے بلکہ پریشان بھی ہو گئے۔ انہیں لگا جیسے شیطان کو راندۂ درگاہ قرار دیا جانا کسی برا انصاف فیصلہ نہیں تھا۔ ابھی وہ فکر اور تردد ہی میں تھے کہ اچانک دل میں القا ہوا۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ''جنید! تو کس کی باتوں میں آ گیا۔ یہ جھوٹا ہے، اس سے پوچھو، یہ کس کا بندہ ہے؟''

جنید نے اس سے پوچھا۔ ''تو کس کا بندہ ہے؟''

ابلیس نے جواب دیا۔ ''خدائے وحدہٗ لاشریک کا۔''

القائے جنید سے جواب دلوایا۔ ''تو جھوٹا ہے۔ خدا کے کسی بندے کی یہ مجال نہیں کہ وہ اپنے معبود کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔ تو اپنی آزادی کو جبر کا نام دے رہا ہے۔ تو اگر واقعی اللہ وحدہ لاشریک کا اتنا ہی عاشق ہوتا تو ایک عاشق میں اتنا ہوش کہاں باقی رہتا ہے کہ اپنے محبوب کے حکم کی خلاف ورزی کرے۔''

ابلیس نے ایک دردناک چیخ بلند کی، بولا۔ ''جنید! تم نے مجھے جلا ڈالا۔''
جنید نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ اب وہاں ابلیس کا پتا و نشان تک نہ تھا۔

☆☆☆

ایک دن آپ کی صحبت میں رہنے والوں میں سے دو مرید کم ہو گئے۔ ان میں سے ایک مرید نے بصرے میں رہنا شروع کر دیا۔ جنید کی دوری نے اس کے دل میں وسوسے پیدا کرنا شروع کر دیے اور گناہوں نے اس کے دل و دماغ پر شب خون مارنا شروع کر دیا۔ پھر اس مرید نے محسوس کیا جیسے اس کا چہرہ سیاہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا چہرہ واقعی سیاہ ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً کوشش شروع کر دی کہ اس کے چہرے کی سیاہی دور ہو جائے لیکن وہ دور نہ ہوئی۔ اسی حال میں تین دن گزر گئے پھر اچانک اسے سیاہی دور ہوتی محسوس ہوئی۔ اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب اس کا چہرہ نورانی ہو چکا تھا۔ وہ ابھی اس رمز کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اسے جنید کا خط موصول ہوا۔ اس میں آپ نے لکھا تھا۔ ''اے شخص! تو بارگاہِ رب العزت میں کیوں نہیں رہتا؟ ذرا میری پریشانی پر بھی غور کر۔ میں کئی دن سے دھوبی کا کام انجام دے رہا ہوں اور تیرے چہرے کی سیاہی دھونے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہ مشکل اس سیاہی کو دور کر سکا ہوں اور اب خدا کے لیے اس سفیدی کو برقرار رکھنے کی کوشش کر۔''
مرید نے آبدیدہ نظروں سے خط کو کئی بار پڑھا اور پھر آنکھوں سے لگا لیا۔
آپ کے دوسرے مرید نے آپ کی صحبت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ایک ویرانے میں سکونت اختیار کی اور وہیں اللہ اللہ کرنے لگا۔ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ مراقبہ و ریاضت نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ خود کو یگانۂ دہر سمجھنے لگا۔ جنید بھی اسے اپنے سے کمتر ہی نظر آئے۔
ایک رات کو اس کے در پر ایک اونٹ والا اونٹ لیے حاضر ہوا اور اونٹ کو باہر کھڑا کر کے اس شخص کے روبرو ادب سے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اونٹ والے سے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''
اونٹ والے نے جواب دیا۔ ''بارگاہِ رب العزت کا ایک معمولی فرشتہ!''
اس نے پوچھا۔ ''کس لیے حاضر ہوئے ہو؟''
جواب ملا۔ ''اس لیے کہ آپ کی عبادتوں کے صلے میں آپ کو بہشت بریں کی سیر کرا دی جائے۔''
جنید کے مرید نے کہا۔ ''میں بہشت بریں کی سیر تو بعد میں کر لوں گا، پہلے مجھے برزخ کی سیر کرا دو۔''
اونٹ والا اسے اونٹ پر بٹھا کر ہوا کی طرح ایک ایسی جگہ لے گیا جس کے ایک طرف اجسامِ کثیف کی دنیا آباد تھی اور دوسری طرف ارواحِ مجرد رہ رہی تھیں۔ یہ شخص ان دونوں عالموں کے بیچ کی دنیا میں کھڑے ہو کر دونوں طرف کا مشاہدہ کرنے لگا۔ اس نے یہاں سے اپنے پیر و مرشد جنید کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں نظر آئے۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''میں اپنے مرشد جنید کو دیکھنا چاہتا ہوں، وہ کہاں اور کدھر ہیں؟''
اونٹ والے نے جواب دیا۔ ''تیرے ہوش و حواس تو ٹھکانے ہیں؟ کہاں تُو اور کہاں جنید۔ تُو عبادت و ریاضت میں ان سے کہیں زیادہ آگے نکل گیا ہے۔ اب تُو ان کا اپنے دل سے خیال نکال دے۔''
مرید کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے دل میں خیال کیا، میں نے اپنی محنتوں کا ثمر پا لیا۔
مرید نے دوسری رات پھر اپنے روبرو ایک دوسرے شخص کو مؤدب کھڑے دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''میں بھی فرشتہ ہوں اور اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ تم جہاں جانا چاہو، لے چلوں۔''
مرید نے کہا۔ ''میں بہشت کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔''
اس شخص نے اشارے سے باہر چلنے کو کہا۔ ''آؤ، اونٹ حاضر ہے۔''
مرید باہر نکلا تو پچھلی رات کی طرح اونٹ کھڑا دیکھا۔ یہ اونٹ پر بیٹھ گیا۔ اونٹ ہوا میں پرواز کرنے لگا..... بالکل کسی طاقتور پرندے کی طرح۔ وہ کچھ دیر بعد ایک ایسی دنیا میں داخل ہو گیا جہاں ہر طرف پھول ہی پھول کھلے تھے۔ صاف شفاف چشمے رواں تھے۔ پیاری پیاری شکلیں غم و اندوہ اور فکروں سے عاری ادھر ادھر محوِ خرام تھیں۔ مرید رات بھر اس پُرفضا مقام کی سیر کرتا رہا۔ اس نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ''کیا یہ جگہ جنید نے بھی دیکھی ہے؟''
اونٹ والے نے جواب دیا۔ ''اس کا امکان تک نہیں۔ کہاں جنید اور کہاں یہ پُرفضا مقام۔ ابھی وہ اتنا بڑا آدمی نہیں ہوا

ہے کہ اسے یہاں کی سیر کرائی جائے۔''

صبح سے پہلے ہی مرید پھر اپنی جگہ واپس آ گیا۔ اب وہ جس بلند مقام پر فائز ہو چکا تھا، گویا جنید اس کا خیال تک دل میں نہ لا سکتے تھے۔

جنید نے اپنے چند مریدوں کو اس جگہ کی خبر گیری کے لیے بھیجا۔ وہ اپنے پرانے ساتھی کے در پر کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کرنے لگے۔ جو شخص جنید ہی کو خاطر میں نہ لاتا ہو، وہ ان مریدوں کو کیا سمجھتا۔ اس نے پوچھا۔ ''تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

مریدوں نے جواب دیا۔ ''ہم تمہاری خیریت معلوم کرنے آئے ہیں۔''

اندر سے خود سر مرید نے کہا۔ ''جاؤ، جنید سے کہہ دینا ہم خیریت سے ہیں اور خدا نے ہماری محنتوں کا یہ صلہ دیا ہے کہ ہر رات اس کے فرشتے خادموں کی طرح حاضری دیتے ہیں اور ہمیں عالمِ برزخ اور بہشت بریں وغیرہ کی سیر کراتے ہیں اور جنید ابھی تک اس منصبِ بلند سے محروم ہیں۔ ہمارا ان کا کیا مقابلہ!''

مریدوں نے باہر سے عرض کیا۔ ''اے گمراہ شخص! تو یہ کیا بک رہا ہے۔ اپنے ہوش میں تو ہے یا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے؟''

اندر سے مرید نے غصے میں کہا۔ ''تم لوگ یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں جلا کر خاک کر دیں گے۔''

مریدِ جنید کی خدمت میں واپس گئے اور انہوں نے جو سوال جواب کیے تھے، مرشد کے سامنے دہرائے۔ جنید نے نہایت تحمل سے کہا۔ ''اب میں خود اس کے پاس جاؤں گا۔''

مریدوں نے حیرت سے پوچھا۔ ''حضرت! اس نالائق متکبر کے پاس آپ خود تشریف لے جائیں گے جو اپنی سیاہ بختی سے آپ کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔''

جنید نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اس کے پاس جاؤں گا اور اس کی سیاہ بختی دور کرنے کی کوشش کروں گا۔''

مرید چپ ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگے۔ ظاہر ہے وہ جنید کی باتیں کہاں سمجھ سکتے تھے۔

جنید اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس شخص نے ایک نگاہِ غلط انداز سے جنید کی طرف دیکھا اور اکڑا بیٹھا رہا۔

جنید نے اس سے پوچھا۔ ''آخر وہ کون سی چیز ہے جس نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''جنید! ادب سے بات کرو۔ یہ درست ہے کہ میں تمہارا مرید رہ چکا ہوں، لیکن جس طرح تم عبادت، ریاضت اور محنتِ شاقہ کے سبب اپنے ماموں اور پیر و مرشد سری سقطی سے بڑا منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہو، اسی طرح میں نے بھی تم سے زیادہ ریاضت کر کے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ فرشتے میرے در کی چاکری کرنے لگے ہیں۔''

جنید نے تحمل سے دریافت کیا۔ ''آخر مجھے بھی تو اپنے بلند منصب کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتاؤ۔''

مرید نے سب کچھ تفصیل سے بتایا اور آخر میں کہا۔ ''اب ہر روز ایک فرشتہ اونٹ لیے میرے دروازے پر آ کھڑا ہوتا ہے اور عاجزی سے پوچھتا ہے کہ آج کہاں کی سیر کرنی ہے؟ پھر میں جس جگہ کا نام لیتا ہوں، وہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر وہیں پہنچا دیتا ہے اور میں وہاں خوب گھوم پھر کر صبح ہوتے ہوتے واپس آ جاتا ہوں۔''

جنید مسکرا کر بولے۔ ''بس اتنی سی بات پر تم نازاں ہو؟ یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔''

مرید نے رعونت سے جنید کو دیکھا اور منہ بنا کر کہا۔ ''ہونہہ، یعنی یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہوئی۔ کہیں تم میرے اس بلند منصب سے جلنے تو نہیں لگے؟''

جنید نے جواب دیا۔ ''حسد اور رشک کو میں کب کا اپنے دل سے نکال چکا۔''

مرید نے کہا۔ ''پھر تمہیں میری باتوں کا یقین کیوں نہیں آتا؟''

جنید نے کہا۔ ''مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم اب تک جن خوشنما اور خوبصورت مناظر کا نظارہ کرتے رہے ہو، وہ ویسے نہیں ہیں جیسے تمہیں نظر آئے۔''

مرید نے پوچھا۔ ''پھر وہ کیسے ہیں؟''

جنید نے کہا۔ ''اگر تم انہیں واقعی ان کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے ہو تو آج رات تم وہاں پہنچ کر تین بار لاحول پڑھ لینا۔ اس کے بعد تمہیں جو نظر آئے اس سے مجھے مطلع کرنا۔''

مرید نے آہستہ سے کہا۔ ''خوب! بظاہر تو تم یہ کہتے ہو کہ تم نے اپنے دل سے جذبۂ رشک و حسد کو فنا کر دیا ہے لیکن باتوں

سے صاف پتا چلتا ہے کہ تمہارے دل میں ان دونوں جذبوں کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں ہے۔''

جنید نے کہا۔''اچھا، اب میں چلتا ہوں، کل پھر آؤں گا۔''

وہ چلے گئے اور مرید کراہیت سے منہ بنا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

حسب معمول اونٹ والا اندر داخل ہوا اور درخواست کی۔''حضرت! اونٹ حاضر ہے، جہاں فرمائیں لے چلا جائے۔''

مرید تمکنت سے دامن سنبھالتا ہوا اٹھا اور حکم دیا۔''آج مجھے بہشت کے اس حصے کی سیر کراؤ جو میرے لیے مخصوص کیا جا چکا ہے۔''

اونٹ والے نے کہا۔''اونٹ پر بیٹھ جاؤ۔ ابھی لیے چلتے ہیں۔''

مرید اونٹ پر بیٹھ گیا۔ اونٹ پرندے کی طرح خلا میں پرواز کرنے لگا اور چشم زدن میں ایک ایسی دلکش جگہ پر جا اترا جس کے حسن اور خوبصورتی کا بیان لفظوں میں ناممکن ہے۔ مرید ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہ جنید پر ہنسا کہ سمجھانے آئے تھے اور آخر منہ بنا کر واپس چلے گئے۔ کافی دیر بعد معلوم نہیں کیوں بار بار اس کے دل میں لاحول پڑھنے کا خیال آنے لگا۔ وہ اس خیال سے پیچھا چھڑانے کی جتنی کوشش کرتا، یہ اتنا ہی شدید ہونے لگتا۔ پھر اسے اپنی بے بسی کا احساس ہونے لگا اور اس نے عاجز آ کر بے اختیار تین بار لاحول پڑھی۔ سارے حسین مناظر سیمیائی نمود کی طرح نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ مرید صاف دیکھ رہا تھا کہ ماحول کی دلکشی دھوئیں کی طرح زائل ہوتی جا رہی ہے اور لمحوں میں سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور چاروں طرف تاریکی پھیل گئی، پھر چاروں طرف سے بدبو نے یلغار کر دی اور اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس نے ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کے پیر ٹھوکریں کھا کھا کے زخمی ہونے لگے۔ پھر ہلکی ہلکی روشنی نے اس جگہ کی ہر شے کو مرید کے سامنے کر دیا۔ مرید کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ چاروں طرف دور دور تک جانوروں کے پنجروں کے ڈھیر تھے اور ان پنجروں کے نیچے غلاظت کا انبار تھا۔ وہ خود غلاظت کی دلدل میں دھنسا کھڑا تھا۔ اس کا آدھا جسم غلاظت میں تھا اور ناک اور منہ کے سامنے غلاظت بھبکے چھوڑ رہی تھی۔ مرید کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے نکلے کس طرح؟ اس عالم میں کہیں دور سے اسے جنید کی آواز سنائی دی۔ جنید پوچھ رہے تھے۔''تو نے اس جگہ کی سیر کر لی، جو تیری خوش فہمی اور تکبر نے تیرے لیے مخصوص کر دی ہے؟''

مرید نے پناہ مانگی۔''حضرت! مجھے خدا کے لیے اس جگہ سے نکالیے ورنہ بدبو سے میرا دماغ پھٹ جائے گا اور میں اس ناپاک ترین جگہ مر جاؤں گا۔''

جنید نے کہا۔''صدق دل سے استغفار پڑھ۔''

مرید نے آنکھیں بند کر کے استغفار پڑھ لی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد جب آنکھ کھولی تو اس نے خود کو اپنے مکان میں پایا۔ اب اس کا اس جگہ ایک لمحہ رکنا بھی محال تھا۔ وہ بھاگ کر جنید کی خدمت میں پہنچ گیا اور ان کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ سارے مرید یہ عجیب و غریب تماشا دیکھ رہے تھے لیکن جنید نے اس سلسلے میں اپنے مریدوں کو بھی کچھ نہ بتایا۔

اس کے بعد اس مرید نے خود کو توبہ و استغفار کے لیے وقف کر دیا۔

اس دوران جنید کے ایک اور مرید کا دماغ خراب ہوا اور وہ سینہ تان کر چلنے لگا۔ اسی تکبر میں اس سے جنید کی شان میں کوئی گستاخی سرزد ہو گئی۔ اس تکبر میں بھی ندامت نے غلبہ کیا اور وہ شرمندہ ہو کر آپ کے پاس سے چلا گیا۔ آپ نے اسے کئی بار بلایا لیکن وہ نہیں آیا۔ اتفاق سے ایک دن اس کی راستے میں جنید سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ گستاخ مرید کے دل میں اپنی بڑائی کا ہُل ہُلا اٹھا اور مرید نے جنید کو نظر انداز کر دیا۔ جنید نے مرید کو مخاطب کیا۔''ٹھہر جا! کیا تو نہیں جانتا کہ عزازیل کو کس شے نے قیامت تک کے لیے ذلیل و خوار کر دیا؟''

مرید نے جواب دیا۔''میں کچھ بھی جاننا نہیں چاہتا۔''

آپ نے غصے سے کہا۔''لیکن میں تجھے اس شے سے مطلع کر دینا چاہتا ہوں۔ عزازیل معلم الملکوت تھا لیکن اس کے تکبر نے اسے ذلیل و خوار کر دیا۔''

تکبر عزازیل را خوار کرد..... کہ زندانِ لعنت گرفتار کرد

مرید پر آپ کی ہیبت طاری ہو گئی۔ وہ خوفزدہ ہو کر گر گیا۔ سر پتھر سے ٹکرایا اور اس سے خون جاری ہو گیا۔ مرید نے اس

موقع پر بھی اپنے روحانی کمال کا اس طرح اظہار کیا کہ زخم سے جو خون بہا اس سے زمین پر لفظ 'اللہ' لکھ گیا۔

جنید نے جوش میں کہا۔ ''اچھا تو کبر و رعونت کے اظہار سے باز نہیں آئے گا اور اس کی میرے سامنے جلوہ گری کرے گا؟ ذرا فاصلے پر کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ جس درجے اور مقام کا تو اظہار کر رہا ہے، یہ سب تیرے برابر ہیں۔''

جنید کی بات مرید کے دل میں زہریلے تیر کی طرح پیوست ہوگئی اور وہ اسی وقت جاں بحق ہوگیا۔

آپ ایک مرید پر بہت مہربان رہتے تھے۔ دوسرے مرید اس پر رشک کرنے لگے۔ آپ نے ان کے رشک کو محسوس کرلیا اور ایک دن ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ''میرے دل میں جس کا جو مقام ہے، وہ اس کی حیثیت اور فراست کے سبب سے ہے۔ تمہیں اس پر رشک نہیں کرنا چاہیے۔''

لیکن مریدوں کے دل سے رشک نہیں نکلا۔ ایک دن جنید نے سب کو ایک ایک مرغ دیا اور کہا۔ ''تم سب ان کو الگ الگ ایسی جگہوں پر لے جاؤ جہاں کوئی نہ ہو۔ انہیں وہاں ذبح کر کے میرے پاس لے آؤ۔''

تھوڑی دیر میں سارے مرید مرغوں کو ذبح کر کے لے آئے۔ مرید خاص زندہ مرغ لیے واپس آگیا۔

آپ نے سب کے سامنے اس سے سوال کیا۔ ''تم نے اسے ذبح نہیں کیا؟''

مرید نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں جہاں بھی گیا وہاں خدا کی موجودگی کو محسوس کیا اس لیے مجبوراً مرغ واپس لے آیا۔''

آپ نے اپنے دوسرے مریدوں کی طرف دیکھا۔ ان سب نے شرمندہ ہو کر اپنے سر جھکا لیے۔

کسی شخص نے آپ سے سوال کیا۔ ''حضرت! دل کس وقت خوش ہوتا ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ جس وقت دل میں خدا جلوہ گر ہو۔''

آپ وعظ فرما رہے تھے۔ مجلس میں ایک آتش پرست بھی مسلمان کے بھیس میں شامل تھا۔ دورانِ وعظ اس نے کھڑے ہو کر آپ سے سوال کیا۔ ''حضرت! رسول مقبول ﷺ کا قول ہے کہ مسلمان کی فراست سے بچتے رہو کیونکہ یہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟''

آپ نے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر جواب دیا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے مسلمان ہو جانا چاہیے۔''

آتش پرست گھبرا گیا اور بعد میں مسلمان ہوگیا۔

ایک دن حسین ابنِ منصور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ''میں آپ کی مریدی کا شرف حاصل کرنے آیا ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تم نے عمر بن عثمان اور سہیل بن عبداللہ تستری سے کنارہ کشی کیوں اختیار کی؟''

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ ''میں ان کے غلبۂ حال سے بیزار ہو کر یہاں آیا ہوں۔''

جنید نے کہا۔ ''ابنِ منصور! تم نے ان دونوں حضرات سے جو سلوک کیا ہے، میں اس سے خوش نہیں ہوں۔''

ابنِ منصور نے عرض کیا۔ ''حضرت! میری ان سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ ایک انسان اپنی ہوشیاری اور مستی کی وجہ سے ہمہ وقت صفاتِ الٰہی میں فنا نہیں رہ سکتا۔''

آپ نے افسوس سے جواب دیا۔ ''ابنِ منصور! تیرے خیالات کا انجام نیک نہیں دکھائی دیتا۔''

کچھ عرصے بعد ابنِ منصور 'انا الحق' کہنے اور اپنے تند و تیز افکار اور عقائد کی وجہ سے دار پر چڑھا دیے گئے۔

جنید کے ایک دوسرے نامی گرامی مرید ابوبکر شبلی نے آپ سے کہا۔ ''حضرت! اگر خدا مجھے یہ اختیار دے دے کہ میں جنت و دوزخ میں سے کسی ایک کا انتخاب کروں تو میں جہنم کو پسند کرلوں گا۔''

آپ نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

ابوبکر شبلی نے جواب دیا۔ ''میں ایک مدت سے نفس کشی کرتا چلا آرہا ہوں۔ جنت میری پسندیدہ شے ہے، اسی لیے میں ازراہِ نفس کشی دوزخ کو پسند کرلوں گا۔''

آپ نے نرمی سے کہا۔ ''شبلی! ابھی تم غلطی پر ہو۔ ایک بندے کی حیثیت سے تم صاحبِ اختیار ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتے اس لیے سعادت مندی، اطاعت گزاری..... کا تقاضا یہ ہے کہ تم سب کچھ اپنے خدا پر چھوڑ دو۔ وہ تمہیں جنت میں داخل کرے یا جہنم میں۔ اس کی مرضی ہے اور تمہیں اس کی مرضی کا پابند ہو جانا چاہیے۔''

ابوبکر شبلی سناٹے میں آگئے۔

آپ نے ایک درویش کی علالت کی خبر سنی تو اس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ اس وقت درویش علالت کی تکلیف

سے رو رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''تم رو کیوں رہے ہو؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''مرض کی شدت پر۔''
آپ نے پھر سوال کیا۔ ''مرض اور اس کی شدت کس طرف سے ہے؟''
درویش نے جواب دیا۔ ''اللہ کی طرف سے۔''
آپ نے کہا۔ ''تب پھر کیوں روتا ہے؟'' پھر پوچھا۔ ''یہ جبر کا تعلق کس کے ہاتھ ہے؟''
درویش نے عاجز آ کے کہا۔ ''عجیب مشکل ہے کہ نہ رونے کی اجازت ہے اور نہ صبر کی قوت۔''
آپ سوئے ہوئے تھے کہ گھر میں ایک چور داخل ہو گیا۔ اسے اور تو کچھ نہیں ملا، آپ کا کرتہ ہی لے کر فرار ہو گیا۔ دوسرے دن جب آپ بازار سے گزر رہے تھے تو آپ نے اس چور کو اپنا کرتہ بیچتے دیکھ لیا۔ ایک گاہک اس کرتے کو خریدنا تو چاہتا تھا لیکن اس پر مصر تھا کہ تو اس کرتے کا ایک ایسا گواہ لے آ جو میرے سامنے یہ کہہ دے کہ کرتہ تیرا ہی ہے تو میں تجھ سے اسی وقت یہ کرتہ خرید لوں گا۔''
جنید نے یہ باتیں سن لیں، آگے بڑھے اور گواہی دی کہ یہ کرتہ اسی کا ہے، تم خرید سکتے ہو۔
خریدار نے کرتہ خرید لیا۔ چور نے رقم سنبھالی اور اپنے گھر کی راہ لی۔
مشہور صوفی سہل بن عبداللہ تستری نے سن رکھا تھا کہ جنید رات کو سوتے بھی ہیں۔ انہوں نے جنید کو خط لکھا۔
''جنید! خوابِ غفلت سے بچ کیونکہ سونے والا اپنا مقصد نہیں پا سکتا۔''
آپ نے جواب میں لکھ دیا۔ ''اے ابن عبداللہ! خدا کی یاد میں بیدار رہنا ہمارا ذاتی فعل ہے لیکن ہمارے سونے کا تعلق خدا کے فعل سے ہے اور خدا کا فعل ہمارے فعل سے بدرجہا بہتر ہے۔ خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ نیند ایک بخشش ہے خدا کی طرف سے اپنے دوستوں پر۔''
ایک دن آپ جیسے ہی گھر سے نکلے، ایک عورت کو گھر کے دروازے پر گریہ وزاری کرتے دیکھا۔ آپ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو عورت نے جواب دیا۔ ''حضرت! میرا بچہ گم ہو گیا ہے، آپ اس کی بازیابی کی دعا کیجیے۔''
آپ نے کہا۔ ''عورت! صبر سے کام لے۔''
عورت خاموشی سے واپس چلی گئی۔ کچھ عرصے بعد پھر حاضر ہوئی اور گڑگڑا کر عرض کیا۔ ''حضرت! میرا بچہ ابھی تک نہیں ملا، دعا کیجیے۔''
آپ نے پھر وہی حکم دیا۔ ''ذرا صبر کر، گھبرا مت۔''
وہ عورت پھر چلی گئی لیکن کچھ عرصے بعد وہ پھر حاضر ہوئی اور کہا۔ ''حضرت! وہ بچہ ابھی تک نہیں ملا۔''
آپ نے پھر کہا۔ ''صبر کر، گھبرا مت۔''
عورت نے رو رو کر عرض کیا۔ ''اب مجھ سے صبر نہیں ہو گا۔ میں مجبور ہو گئی ہوں۔''
آپ نے حیرت سے عورت کی شکل دیکھی اور پوچھا۔ ''تو نے جو کچھ کہا، کیا یہ درست ہے؟''
عورت نے جواب دیا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔'' اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔
آپ نے کہا۔ ''جا، اپنے گھر واپس جا۔ تیرا بیٹا تجھے مل گیا۔''
عورت بھاگی بھاگی گھر پہنچی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بیٹا گھر میں موجود ہے۔

☆☆☆

پانچ سو دینار کی تھیلی ان صاحب کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے لے کر جنید کی خدمت میں پہنچ گئے اور ادب سے عرض کیا۔
''حضرت! یہ دینار میں آپ کے لیے لایا ہوں، انہیں قبول فرمائیے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''تیرے پاس اور رقم بھی ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''بہت ساری رقم ہے..... کیوں؟''
آپ نے پھر سوال کیا۔ ''میں اس رقم کو لے کر کیا کروں؟''
اس نے جواب دیا۔ ''اسے مستحقین میں تقسیم کرا دیجیے۔''
''لیکن تو ایک بات اور بتا دے۔''

''کیا؟ پوچھیے۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو نے ابھی بتایا تھا کہ تُو اور رقم کا خواہش مند ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ تُو مجھ سے دولت کے اضافے کی دعا چاہتا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں عرصے سے اس دعا کا طالب ہوں۔''

آپ نے وہ تھیلی اس کی طرف بڑھادی۔ کہنے لگے۔ ''تب پھر یہ تھیلی لیتا جا کیونکہ ان دیناروں کا تجھ سے زیادہ مستحق نہیں ملے گا۔''

اس شخص نے پوچھا۔ ''آخر آپ ان دیناروں کو رکھتے کیوں نہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میرے پاس کچھ بھی نہیں لیکن مجھے ان کی حاجت نہیں اور تیرے پاس ان کے سوا بھی رقم موجود ہے اور مزید کی حاجت ہے۔ چنانچہ ثابت ہوا کہ تُو ان دیناروں کا زیادہ مستحق ہے۔''

آپ بغداد سے باہر کسی سے ملنے جارہے تھے۔ ساتھ چند مرید تھے۔ گرمی شدت سے پڑ رہی تھی۔ ایک مرید گرمی برداشت نہیں کرسکا۔ اس کی نکسیر پھوٹ گئی اور وہ خون پونچھتا جاتا اور گرمی کی شکایت کرتا جاتا۔ آپ اس سے ناراض ہوگئے۔ اس سے کہا۔

''تم میری صحبت میں بیٹھنے کے لائق نہیں ہو کیونکہ تم خدا کی شکایت کرتے ہو۔ موسم خدا کا تابع ہے، اس کی شکایت کیا معنی؟''

آپ دنیا کی بے ثباتی اور نفس کی ہلاکت پر وعظ فرما رہے تھے۔ ایک نوجوان پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ مجلس سے اٹھ کر گھر چلا گیا اور اپنا سارا سامان راہِ خدا میں دے دیا۔ بس ایک ہزار دینار جنید کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بچا لیے۔ وہ یہ دینار لیے آپ کی خدمت میں آرہا تھا کہ راستے میں جنید کا ایک مرید مل گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''یہ ہزار دینار لیے کہاں جارہے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جنید کی خدمت میں۔ میں دنیا سے بالکل بیزار ہوگیا ہوں۔''

مرید نے کہا۔ ''خوب! جس شخص نے اپنے بچپن ہی سے دنیا کو لات مار دی، تم اس کے لیے دینار لے کر جارہے ہو۔ میاں تمہارا دماغ تو درست ہے؟ وہ ایک دین دار انسان ہیں۔ انہیں دنیا میں الجھانے کی کیوں کوشش کرتے ہو؟''

اس شخص نے وہ دینار ایک ایک کرکے دریائے دجلہ میں پھینک دیے۔ وہ ایک دینار پھینکتا اور حسرت سے اسے دیکھتا رہتا۔ اس طرح اس نے پورے ہزار دینار دجلہ میں ڈال دیے اور ادھر سے فارغ ہوکر سیدھا آپ کی خدمت میں پہنچ گیا اور اپنی پوری روداد سنا کر گزارش کی کہ اسے حلقے میں بیٹھنے کی اجازت عطا کی جائے۔

آپ نے جواب دیا۔ ''تم ابھی میرے حلقے میں بیٹھنے کے اہل نہیں ہو۔''

دوسرے مریدوں کو اس جواب پر حیرت ہوئی، پوچھا۔ ''کیوں حضرت؟ اس نے تو اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں دے ڈالا اور وہ ہزار دینار، جو آپ کی خدمت میں لا رہا تھا، ایک ایک کرکے سارے ہی دجلہ میں پھینک دیے۔''

جنید نے جواب دیا۔ ''اس کے دل میں اب بھی ذرا سی مال و زر کی محبت باقی ہے۔ اس سے کہو اسے بھی اپنے دل سے نکال باہر کرے۔''

ایک مرید نے اس نوجوان کی ہمدردی میں کہا۔ ''حضور والا! کچھ تو رحم فرمائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر اس کے دل میں دیناروں کی محبت نہ ہوتی تو یہ سارے دینار ایک ہی بار دجلہ کے حوالے کردیتا لیکن اس نے ایک ایک دینار دریا میں پھینکا جس کا مطلب یہ ہوا کہ دیناروں کی محبت برابر اس کے دل کو پکڑتی رہی ہے۔''

آپ نے اس نووارد کو اپنی مجلس میں بیٹھنے دیا اور اسے حکم دیا کہ دل سے طمع نکال کے شیشۂ دل کو جلا دو، اس کے بعد میرے پاس آنا۔

وہ شخص آپ کے حکم کی بجا آوری میں وہاں سے چلا گیا۔

گیلان سے ایک شخص آپ کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے پوچھا۔ ''تمہارا نام؟''

اس نے جواب دیا۔ ''سید ناصری۔''

''کہاں جارہے ہو؟''

''حج کرنے۔''

آپ نے کہا۔ ''سید ناصری! تمہارے جدِ اعلیٰ حضرت علیؓ نفس اور کفار دونوں ہی سے جہاد کرتے تھے۔ میں یہ جاننا

چاہتا ہوں کہ تم نے ان دو میں سے کس کے خلاف جہاد کیا ہے؟''

سید ناصری پر رقت طاری ہوگئی۔ وہ دیر تک روتا رہا۔ آپ نے دریافت کیا۔ ''تم رو کیوں رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میرا جج تو یہیں ہوگیا۔ اب میں آگے جا کر کیا کروں گا؟ آپ مجھے ہدایت فرمائیں۔''

جنید نے کہا۔ ''سید ناصری! تمہارا دل خانۂ خدا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو ہرگز جگہ نہ دو۔''

جنید نے یہ بات جس انداز اور لب و لہجے میں کہی تھی، اس نے سید ناصری کو ہلا ڈالا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور پھر کبھی بھی نہ اٹھ سکا۔

آپ کے اقوال اور مواعظ نے بہتوں کو آپ کا دشمن بنا دیا جن میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو آپ سے بڑی نفرت کرتا تھا۔ اسے کسی معاملے میں فتوے کی ضرورت پیش آئی۔ بغداد کے قاضی اور علماء اس کی نظر میں جچتے ہی نہ تھے۔ اسی فکر میں وہ ایک رات سویا تو خواب میں دیکھا کہ سامنے رسول مقبول ﷺ تشریف فرما ہیں۔ آپ ﷺ کے سامنے جنید بھی موجود ہیں۔ اسی عالم میں ایک اور شخص حاضرِ خدمت ہوا اور رسول مقبول ﷺ سے کسی معاملے میں فتویٰ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے جنید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''فتویٰ جنید سے طلب کرو۔''

☆☆☆

خلیفہ بغداد کے پاس آپ کے خلاف شکایات پہنچ رہی تھیں۔ چغل خور خلیفہ سے کہہ رہے تھے کہ جنید جو کچھ کہتے ہیں وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ خلیفہ نے جنید کے کسی مرید کو جھڑک دیا اور کہا۔ ''تم بے ادب ہو۔''

مرید نے جواب دیا۔ ''سبحان اللہ! میں کس طرح بے ادب ہو سکتا ہوں۔ نصف دن حضرت جنید کی خدمت میں گزارتا ہوں۔''

جب آپ کی شکایات کی بھرمار ہوگئی تو خلیفہ نے شکایت کرنے والوں سے پوچھا۔ ''آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟''

چغل خوروں نے جواب دیا۔ ''جنید نے پورے بغداد میں افکار و خیالات کا فتنہ پھیلا رکھا ہے۔ اگر اس فتنے کو روکا نہ گیا تو ہر طرف بے دینی پھیل جائے گی۔''

خلیفہ نے پوچھا۔ ''تو اس سلسلے میں مجھے کرنا کیا چاہیے؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''اس فتنہ انگیز کو درمیان سے ہٹا دینا چاہیے۔''

خلیفہ نے بے بسی سے کہا۔ ''لیکن حجتِ شرعی کے بغیر میں یہ نہیں کر سکتا۔''

لیکن خلیفہ، جنید کے خلاف عملی قدم اٹھانے کے لیے حیلے ضرور تلاش کرنے لگا۔ آخر اس کے ذہن میں ایک عجیب و غریب ترکیب آئی۔ خلیفہ کے پاس ایک نہایت حسین و جمیل کنیز آئی تھی۔ اس نے اس کا خوب بناؤ سنگھار کر کے اس سے کہا۔ ''میں تجھ سے ایک نہایت اہم کام لینا چاہتا ہوں۔''

کنیز نے ادب سے عرض کیا۔ ''میں امیر المومنین کی کنیز ہوں، جیسا حکم کریں گے، عمل کر گزروں گی۔''

خلیفہ نے کہا۔ ''تم جنید کے پاس بھیجی جا رہی ہو۔ جنید کے خلاف بڑی سازشیں ہو رہی ہیں اور لوگ بضد ہیں کہ اس فتنہ انگیز شخص کو کوئی سخت سزا دی جائے لیکن میں اس وقت تک جنید کے خلاف کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکتا جب تک حجتِ شرعی موجود نہ ہو۔''

کنیز نے پوچھا۔ ''پھر مجھے کیا کرنا ہے؟''

خلیفہ نے کہا۔ ''تو جنید کے پاس جا اور اسے کسی بھی طرح حرص و ہوس میں گھیر لے۔''

کنیز مسکرائی اور پوری خود اعتمادی سے بولی۔ ''آپ بے فکر رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جنید شکار ہو جائیں گے۔''

کنیز نے ایک خادمہ کو ساتھ لیا اور بڑے طمطراق سے آپ کے پاس گئی۔ باہر سے جنید کو مطلع کیا گیا کہ ایک امیر زادی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔

آپ نے مریدوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا۔ جب بالکل تخلیہ ہوگیا تو کنیز، خادمہ کے ساتھ آپ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ لاکھوں میں یکتا، شباب سے آراستہ، ہونٹوں میں مسکراہٹ کا سحر، آواز میں کھنک لیے وہ جنید کے روبرو جا کھڑی ہوئی۔ آپ نے نظریں جھکا لیں اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟''

کنیز نے سرتاپا اشتیاق سے کہا۔ ''ادھر میری طرف تو دیکھیے، پھر کچھ عرض کروں۔''

جنید نے کہا۔ ''تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔ میں نظروں سے نہیں، کانوں سے سن لوں گا۔''

کنیز نے سوچا حسن و شباب کا سحر اس وقت تک اپنا کام نہیں کرے گا جب تک جنید کی نگاہیں دو چار نہ ہوں۔ اس نے

کہا۔ ''شیخ! آپ ذی علم انسان ہیں اور اس نکتے سے ضرور واقف ہوں گے کہ جہاں باتیں اثر نہیں کرتیں، نظریں متصادم ہو کر مروت اور رعایت پر مائل کر دیتی ہیں۔''

جنید نے کہا۔ ''عورت! زیادہ باتیں نہ بنا، مطلب بیان کر۔''

کنیز نے کہا۔ ''حضرت! میں ایک بیوہ امیر زادی ہوں۔ بے انتہا مال اور املاک پر حق تصرف رکھتی ہوں لیکن زمانے نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ہر شخص مطلب سے ملتا ہے۔ جس حسن پر میں کبھی ناز کرتی تھی، اب وہی میرے حق میں مصیبت اور آزمائش بن گیا ہے۔ میں نے نہایت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اپنی بقیہ زندگی آپ کے قدموں میں گزار دوں اور اپنا سب کچھ آپ کے حوالے کر دوں۔''

''عورت! اپنا مطلب صاف صاف بیان کر۔ میں سمجھا نہیں کہ تو چاہتی کیا ہے؟''

کنیز نے خوشامد سے کہا۔ ''جب تک آپ میری طرف دیکھیں گے نہیں، میں اپنی زبان بند رکھوں گی۔''

جنید نے کنیز کو سرسری نظروں سے بھی نہ دیکھا، بولے۔ ''مجھے دیکھنے پر مجبور نہ کر۔ جو کچھ مزید کہنا ہے کہہ ڈال۔''

کنیز اپنی جگہ سے اٹھی اور آپ کے قریب آ بیٹھی۔ اس کے لباس سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے جنید کو اپنے جلوۂ جہاں سوز سے جلا دینا چاہا۔ اس نے آپ کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے، بولی۔ ''ان پیارے پیارے ہاتھوں کو میرے ہاتھوں میں دے دیجیے۔''

جنید ذرا پیچھے ہٹ گئے، بولے۔ ''عورت! ہوش میں آ اور ان جسارتوں سے پرہیز کر۔''

کنیز نے کوئی پروا کیے بغیر جنید کے شانے پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ بولی۔ ''مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے دل کی کثافت آپ کے ہم آغوش ہو کے دھو ڈالوں۔''

جنید نے افسوس سے کہا۔ ''عورت! تو اپنی دشمن معلوم ہوتی ہے۔''

کنیز نے کوئی پروا نہ کی اور ایک کھنک دار قہقہے سے اپنی جارحانہ روش کی ابتدا کی۔ اس نے آپ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ آپ نے چند قدم پیچھے ہٹ کر تین بار ''آہ، آہ، آہ'' کی۔ خادمہ نے دیکھا ہر آہ کے ساتھ آپ کے منہ سے چنگاریاں نکلیں اور ان چنگاریوں نے کنیز کے کپڑوں کو پکڑ لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کنیز جلنے لگی۔ وہ کرب و اذیت سے چیخی چلائی لیکن اس کی مدد کون کرتا۔ دیکھتے دیکھتے وہ راکھ ہو گئی۔ خادمہ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی اور خلیفہ کو کنیز کے عبرت ناک انجام سے رو رو کر مطلع کیا۔ خلیفہ اس کنیز کو بہت پسند کرتا تھا، فوراً ہی محل سے باہر نکلا اور جنید کی خدمت میں پہنچ گیا۔ جنید نے اس کو سرد مہری سے دیکھا اور گردن جھکا لی۔

خلیفہ نے پوچھا۔ ''شیخ! میری کنیز کہاں ہے؟''

آپ نے راکھ کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میری چالیس سالہ ریاضت پر ڈاکا مارنے آ گئی تھی لیکن خود اپنے انجام کو پہنچ گئی۔''

خلیفہ نے افسوس سے کہا۔ ''شیخ! یہ کنیز مجھے بے حد پسند تھی، آپ نے اس پر بڑا ظلم کیا۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تم دونوں نے میرے خلاف سازش کی۔ اگر میں رحم و شفقت سے کام لیتا تو یہ میرے حق میں ظلم عظیم ثابت ہوتا۔''

خلیفہ بہ حسرت و یاس واپس چلا گیا۔

آپ فرمایا کرتے تھے۔ ''جو آنکھ خدا کی قدرت اور حکمت نہ دیکھ سکے، اس کا اندھا ہو جانا بہتر ہے۔ جو زبان ذکرِ حق میں مصروف نہ ہو، اس کا گنگ ہو جانا اچھا ہے۔ جو کان حق بات نہ سنے، اس کا بہرا ہو جانا بہتر ہے اور جو بدن اس کی خدمت نہ کرے اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔''

کسی نے آپ سے سوال کیا۔ ''حضرت! کس شخص کی صحبت اختیار کی جائے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جو تیرے ساتھ نیکی کر کے بھلا دے۔''

اس شخص نے دوسرا سوال کیا۔ ''اور بندہ کسے کہتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''جو اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی سے آزاد ہو۔''

انہوں نے ایک شخص کو سرِ بازار ننگا دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا جسے وہ کسی کسی لمحہ دانت سے کاٹ کر کھا لیتا۔ جنید نے نفرت سے اپنا منہ پھیر لیا اور کہا۔ ''ابلیس! تجھے لوگوں سے شرم نہیں آتی؟''

اس نے کہا۔ ''جنید! تمہارے خیال میں اس روئے زمین پر ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جس سے شرم کی جائے۔ جن کو شرم آتی تھی وہ خاک کے نیچے ہیں، انہیں مٹی کھا گئی۔''

آپ سے پوچھا گیا۔ ''حضرت خالص توحید کسے کہتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''خالص توحید کا مطلب ہے بندے کا آخر اس کے اول کی طرف لوٹ جائے اور ویسا ہو جائے جیسا ہونے سے قبل تھا۔''

آخر عمر میں کسی نے شکایتاً کہا۔ ''حضرت! آپ کا وعظ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''ستّر سال کی عبادت قدموں کے نیچے رکھ کر سرنگوں ہو جا، اس کے بعد بھی اگر میرا وعظ تیری سمجھ میں نہ آئے تو میں خود کو قصوروار سمجھوں گا۔''

☆☆☆

آپ کی عمر نوّے سال کی ہو چکی تھی اور آثارِ رحلت ظاہر ہونے لگے تھے۔ آپ نے لوگوں سے کہا۔ ''مجھے وضو کرا دو۔'' لوگ وضو کرانے لگے تو انگلیوں میں خلال کرانا بھول گئے۔ آپ نے انہیں یاد دلایا کہ خلال کرانا باقی رہ گیا ہے۔ لوگوں نے خلال کرا دیا۔ اس کے بعد آپ سجدے میں گر کر زار و قطار رونے لگے۔ کسی مرید نے کہا۔ ''آپ اس قدر عابد و زاہد ہونے کے باوجود رو رہے ہیں، آخر کیوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''لوگو! میں اس وقت سے زیادہ کبھی بھی محتاج نہ ہوا تھا۔''

اس کے بعد آپ قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے اور فرمایا۔ ''اس وقت قرآن پاک سے زیادہ میرا کوئی مونس و ہمدم نہیں اور اس وقت میں اپنی عمر بھر کی عبادت و ریاضت کو ہوا میں اس طرح معلق دیکھ رہا ہوں کہ تند و تیز ہوا کے جھونکے اسے اڑا دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ یہ ہوا فراق کی ہے یا وصال کی۔ دوسری طرف فرشتۂ اجل ہے، پلِ صراط ہے اور میں عادل قاضی پر نظریں جمائے اس کا منتظر ہوں کہ دیکھیے صحیح کدھر جانے کا حکم ملتا ہے۔''

اس موقع پر ابو محمد جریری نامی بزرگ آپ کے پاس گئے اور پوچھا۔ ''کوئی کام ہو تو ارشاد فرمایئے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''جب میں مر جاؤں تو مجھے غسل دینا، کفنانا اور نمازِ جنازہ پڑھانا۔''

جریری رونے لگے۔ آپ نے انہیں روتے دیکھا تو بولے۔ ''ہاں ابو محمد! ایک کام اور ہے۔''

جریری نے پوچھا۔ ''وہ کیا؟''

آپ نے کہا۔ ''میرے دوستوں کے لیے ولیمے کا کھانا تیار کرانا اور جب وہ میری تجہیز و تکفین اور تدفین سے فارغ ہو جائیں تو انہیں ولیمے کا کھانا کھلانا۔''

جریری نے روتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! یہ کیوں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تاکہ ان کے دلوں کا انتشار اور پراگندگی دور ہو جائے۔''

سنیچر کے دن 27 رجب 297ھ کو آپ نے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آپ کی زبان پر آخری الفاظ تھے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

آپ بغداد ہی میں دفن ہوئے۔ کہتے ہیں جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو ایک سفید کبوتر معلوم نہیں کدھر سے آپ کے جنازے پر بیٹھ گیا۔ لوگوں نے اسے اڑانا چاہا لیکن وہ نہیں اڑا۔ کبوتر کے پاس سے ایک آواز آئی۔ ''لوگو! تم مجھے اور خود کو پریشان نہ کرو۔ میرے پنجے عشق کی میخوں سے جنازے کے گوشوں پر جما دیے گئے ہیں۔ تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ جنید کا جنازہ تم لوگ لیے جا رہے ہو۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ آج جنید کا قالب فرشتوں کے دوش پر ہے۔ اگر یہاں تمہارا شور و غل نہ ہوتا تو جنید کا جسم سفید باز کی طرح ہمارے ساتھ ہوا میں محوِ پرواز ہوتا۔''

جب جنازہ قبر میں اتارا گیا تو کبوتر کہیں غائب ہو چکا تھا۔

ماخذات

الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب۔ جنید بغداد، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر۔ خزینتہ الاصفیاء، مفتی غلام سرور لاہوری۔ انوار الصفا، خصلت حسین صابری۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار۔ انوار اولیاء، رئیس احمد جعفری۔ انوار اصفیاء، شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ سفینتہ الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ

"سو جا گڑیا سو جا.....
میری راج دلاری سو جا.....
لال پری پھر آئے گی.....
کھلونے، تحفے لائے گی....."

لوری کے الفاظ اس کے ذہن میں ایک تسلسل کے ساتھ رواں تھے..... بالکل ایسے ہی جیسے بارش کی بوندیں مسلسل کھڑکی، دروازے اور چھت پر برس رہی تھیں۔

یہ وہ لوری تھی جو وہ اپنی تین یا چار سال کی بیٹی اینا کو سنایا کرتی تھی۔ اب یہ الفاظ جیسے اس کے دماغ سے چپک گئے تھے اور بار بار ہی اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ پچیس سال قبل کی یاد اب بھی پوری شدت سے باقی تھی جب وہ اپنے آبائی مکان کے باورچی خانے میں اپنی بیٹی کو یہ گیت سنایا کرتی تھی۔ لیزا اپولیمس..... ایک جوان ماں اور بیوی، جو کچن ٹیبل پر کام کرتے ہوئے اپنی بیٹی کو لوری سنا رہی تھی۔ کمانا آسان بالکل نہیں تھا..... اسے ایک ایک پائی کے لیے محنت کرنا پڑتی تھی۔

پسِ منظر

مظہر سلیم ہاشمی

بعض اوقات نظر کا دھوکا بڑا بھیانک منظر دکھاتا ہے حالانکہ پس منظر میں کچھ اور چھپا ہوتا ہے... وہ بھی جو نظر آتے تھے وہ نہ تھے اور جو نہ تھے ویسے نظر آنے کی تگ و دو میں لگے اپنے خوابوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے... ہاں وہ بھی تو ان کا خواب تھی جس کی تعبیر ان کی توقع کے برخلاف نکلی۔

نفرتوں کے حصار میں زندگی سے نبرد آزما ماں اور بیٹی کی عجیب روداد

اس کی بیٹی محویت کے ساتھ اس کی سریلی آواز میں لوری سنتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو تک رہی تھی جو تیزی سے چل رہے تھے۔

''چندا گیت سنائے گا.....
تارے گانے گائیں گے.....
لال پری کے جادو سے.....
سب بچے سو جائیں گے.....''

لیزا کے دائیں بازو میں ایک ٹیس سی اٹھی تو وہ چونک گئی۔ اس پر آنے والا زخم آج تک صحیح طرح نہ بھر پایا تھا۔ درد کی اس لہر نے ہی اسے احساس دلایا کہ وہ ابھی تک فون کا ریسیور تھام کر کھڑی ہے۔ فون پر ملنے والی اطلاع اتنی ہی حیران کن اور حواس باختہ کر دینے والی تھی کہ وہ ریسیور واپس کریڈل پر رکھنا ہی بھول گئی تھی۔ اس کی بیٹی اس سے ملنے آرہی تھی۔

وہ بیٹی جس نے تین، چار سال سے زائد کا عرصہ بیت جانے کے باوجود اس سے کلام تک نہ کیا تھا۔

لیزا نے جب آخر کار تھک کر فون رکھا تو خون کی تیز روانی اپنے بازو میں محسوس کی۔ رواں، تازہ خون اس کے بازو میں الگ ہی طرح کی سنسناہٹ اور چبھن پیدا کر رہا تھا۔ وہ منقش کاؤچ پر بیٹھ کر اپنا بازو مسلنے لگی۔ بازو میں درد کے ساتھ ساتھ یکلخت ہی اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا اور چکر سے آرہے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ وہ فون پر سن چکی ہے وہ حقیقت بھی ہے یا اس کا کوئی بُرا خواب۔

کوئی بھی بُرا خواب دیکھنے کے لیے اس کا نیند میں ہونا ضروری تھا اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ جاگ رہی ہے اور جاگتی آنکھوں کے ساتھ انسان سپنے نہیں دیکھتے۔ بقول اینا، وہ راستے میں کبھی اور زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں اس کے دروازے پر پہنچ جاتی۔

بارش اب بھی ہلکی رفتار کے ساتھ ہو رہی تھی۔ اس گھر میں منتقل ہوئے اسے ایک ڈیڑھ سال ہونے کو آیا تھا۔ قریبی شہر سے دور یہ جگہ نہایت پُرسکون تھی۔ بہت سے لوگوں کو یہ گھر چھوٹا یا شہر سے دور لگتا تھا لیکن لیزا کے لیے یہ کسی جنت سے کم نہیں تھا۔

پچاس پچپن سالہ اس دبلی پتلی بیوہ کے لیے یہ ایک بہترین جگہ تھی۔ وہ ایک مصروف زندگی گزار رہی تھی اور اس میں گھر کی دیکھ بھال کے لیے بہت زیادہ وقت نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اس چھوٹے سے گھر کو وہ لمحوں میں صاف کر لیتی تھی اور اس کے بعد واپس اپنا کام جاری رکھتی۔ جنگل کے بیچ میں واقع ہونے کی وجہ سے، وہ اپنے پڑوسیوں کی مداخلت سے بھی محفوظ تھی۔

مختصر سا گھر اسے اپنے 'مرد دوستوں' کی ایسی ویسی فرمائشوں سے بھی بچاتا تھا جو اس کے ساتھ منتقل ہونے کے خواہش مند تھے۔ وہ بڑے آرام سے گھر کی جانب اشارہ کر کے کہہ دیتی تھی۔

''اتنے چھوٹے سے گھر میں اگر دو لوگ اکٹھے رہنے لگ جائیں گے تو سانس لینا بھی دشوار ہو جائے گا۔''

اس کا یہ بہانہ ہمیشہ ہی کامیاب رہتا تھا۔ شوہر کی موت کے بعد اس نے بہت سی دوستیاں پالی تھیں لیکن کبھی پھر سے شادی کرنے کا خیال اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ ویسے بھی پچھلی شادی سے اینا جیسی اولاد نے اس کا دل ہی خراب کر دیا تھا۔

اس کی سوچوں کا رخ اپنے آنجہانی شوہر جم کی جانب مڑ گیا۔ جم کی موت سے کئی سال قبل ہی ان کی بیٹی اینا نے اپنے خاندان کے ساتھ تعلقات منقطع کر دیے تھے اور گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ لیزا کو اس بات کی ہمیشہ سے ہی بہت تکلیف رہی تھی کہ اینا نے اپنے باپ کے جنازے میں شمولیت تو دور کی بات، ایک فون کال کر کے بھی اظہارِ تعزیت کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس سانحے پر اپنی بیٹی کا رویہ یاد آتے ہی اس کا خون کھول اٹھا لیکن اس نے فوراً ہی ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا۔

وہ اب اپنا دماغ اس جانب لگا رہی تھی کہ جب اینا یہاں آئے گی تو کیا کہے گی؟ تب شاید ان تلخیوں کو یاد کرنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ ماں بیٹی کی ان سب کڑوی باتوں کو یاد کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی پلین کریش کے ملبے میں سے معدوم زندگی کو تلاش کرنا۔

دیوار گیر گھڑی پر نگاہ پڑی تو اینا کی فون کال کو آئے دس منٹ گزر چکے تھے۔ لیزا کی تشویش میں یکلخت ہی کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

پریشانی کی حالت میں چہل قدمی کرتے ہوئے وہ نشست گاہ سے اپنے سلائی والے کمرے میں پہنچ گئی۔ یہ اس گھر کا سب سے بڑا کمرا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ سوئی دھاگوں کے خوبصورت نمونوں سے کی گئی تھی جو لیزا اور اس کی ماں کی نشانیوں پر مشتمل تھے۔ ایک جانب رنگ برنگے دھاگوں کی ریلوں سے ریک سجے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا دنیا کے ہر رنگ کا دھاگا وہاں موجود ہو۔ بکسوں میں کپڑوں کے ڈیزائن والے میگزین بھرے ہوئے تھے۔

کمرے کے بیچوں بیچ ایک سلائی مشین موجود تھی جسے پیڈل کی مدد سے چلایا جا سکتا تھا۔ اس میں جدید دور والی کوئی خوبی نہ تھی..... نہ ہی اس میں جدید فینسی روشنیاں لگی ہوئی تھیں اور نہ ہی اس کے کل پرزوں کو جدت کا رنگ دینے کے لیے ان پر نقش نگاری کی گئی تھی۔ مشین کئی سال..... پرانے دور کی یادگار تھی جس پر سیاہ رنگ چڑھا ہوا تھا۔ شاید لیزا کی ماں کے پاس بھی ایسی ہی سلائی مشین تھی۔

لیزا بارہ سال کی تھی جب اس نے سلائی کا کام سیکھا تھا۔ زندگی کے مشکل ادوار میں اس ہنر نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اسے سلائی کے کام سے جیسے عشق تھا۔ کپڑا خریدتے ہوئے تھان کھلنے کی آواز اس کی سماعتوں کے لیے موسیقی سے کم نہ ہوتی تھی۔ لیزا صرف اس آواز کی بنا پر کامیاب اندازہ لگا لیتی تھی کہ کتنے گز کپڑا تھان سے کھل چکا ہے۔ پھر کپڑے میں سوئیاں ٹانکنا اور اس کو قینچی سے کاٹنا..... سلائی مشین کو تیل دے کر تیار کرنا اور پھر سوئی میں دھاگا ڈالنا..... یہ سب کام کرتے ہوئے اسے بہت لطف آتا تھا۔

سلائی کا یہ کام جیسے اس کو تسکین پہنچاتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی تو حیران رہ جاتی تھی کہ زمین سے حاصل ہونے والی کپاس اور جانوروں سے ملنے والی اون..... اور ان کو ملا کر بالکل ہی ایک نئی چیز وجود میں لے آنا کتنا حیرت انگیز و خوش گوار تجربہ تھا۔ دائیں بازو پر کئی سال پہلے لگنے والے زخم کی تکلیف تو اپنی جگہ تھی لیکن اس کا ایک اور اذیت ناک پہلو یہ بھی تھا کہ اسے تین ماہ سلائی مشین سے دور رہنا پڑا تھا۔

سلائی سے ملنے والی تسکین اپنی جگہ لیکن یہ اس کے پیشے کا اہم حصہ تھا اور زندگی میں ترقی کے زینے طے کرنے کا موجب بھی۔ ساتھ والے شیلف میں کئی ڈیزائنر ڈریس پڑے تھے جو اس کے ہاتھوں کی مہارت کے منتظر تھے۔ جن ملبوسات پر کام مکمل ہو چکا تھا وہ ہینگر میں لٹکے اپنی منزل پر ترسیل کے منتظر تھے۔ اس کی نگاہ پھر گھڑی پر پہنچی تو ابھی پندرہ منٹ ہی گزرے تھے۔

''ہاہ.....'' اس کے حلق سے ایک تکلیف بھری آہ نکل گئی۔

پچیس سال قبل کی اینا کا تصور پوری وضاحت کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے عیاں تھا۔ وہ اپنی کرسی پر پاجامہ پہنے جھول رہی تھی جبکہ لیزا اس کے لیے گانا گا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں تیزی سے کام نمٹانے میں مگن تھیں۔

''سوجا گڑیا سوجا.....
میری راج دلاری سوجا.....''

اس یاد کے ساتھ ہی کئی اور یادوں کا طوفان اس کے ذہن میں امڈ آیا۔ جذبات کی شدت سے اس کا جی ایسے بھر آیا جیسے بارش کے بعد اس کے گھر کے عقبی جانب بہنے والی ندی میں طغیانی آ چکی تھی۔

''ایسے مت بیٹھی رہو..... کچھ کر لو'' اس نے خود کو سرزنش کی۔ ''مصروف کرو خود کو.....''

اس نے الماری سے ایک نیلی جیکٹ برآمد کی اور اسے لے کر سلائی مشین پر بیٹھ گئی۔ وہاں پاس موجود ایک ٹوکری کو اس نے کریدا تو ایک ہم رنگ اونی کپڑا مل گیا۔ اس نے جیکٹ کی جیب بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

لیزا پورے ارتکاز کے ساتھ کام میں مگن ہو گئی۔ کپڑا سیدھا کر کے اس نے نیلے چاک کی مدد سے نشان لگائے اور قینچی تلاش کر کے اسے کاٹا۔ اگرچہ وہ پوری طرح کام میں منہمک تھی لیکن یہ سب اس کا ذہن بٹانے کے لیے ناکافی تھا۔ کئی سال پہلے کی یادوں کی برات کا سلسلہ تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔

چوری کا واقعہ اس کے ذہن میں جاگ اٹھا۔ اس وقت اینا محض بارہ سال کی تھی۔

لیزا کو یاد تھا کہ کیسے اس نے فون پر واقعے کی ساری تفصیل سنی تھی۔ جیولری اسٹور کے سیکیورٹی انچارج نے خود کال کر کے بتایا تھا کہ اینا تقریباً ہزار ڈالرز سے زائد مالیت کے سامان کے ساتھ پکڑی گئی ہے جو اس نے ایک کاغذی لفافے میں چھپایا ہوا تھا۔ لیزا اور جم اپنی بیٹی کا یہ کارنامہ سن کر انگشت بدنداں ہی رہ گئے تھے۔

اسٹور پر پہنچنے کے بعد ان دونوں نے خوب منتیں کر کے منیجر سے درخواست کی تھی کہ وہ پولیس میں رپورٹ نہ کرے۔ یہ واقعہ ان کے خاندان کی بدنامی کے ساتھ ساتھ خود اینا کے مستقبل پر بھی سوالیہ نشان چھوڑ جاتا۔

''شاید غلطی سے اس نے کچھ اٹھا لیا ہو۔'' جم نے کہا۔

''خیر.....'' سیکیورٹی انچارج نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے اسے پانچ گھڑیوں کے ساتھ پکڑا ہے۔ ایک نیکلس بھی تھا اور یہ سب ایک گروسری کے لفافے میں بند تھا۔ اب مجھے کہیں سے یہ کوئی غلطی یا غلط فہمی تو نہیں لگتی۔''

کئی وعدوں، منتوں اور درخواستوں کے ساتھ ساتھ جب اس بات کی یقین دہانی کرائی گئی کہ اینا کبھی آئندہ ان کے اسٹور میں قدم بھی نہیں رکھے گی، تب کہیں جا کر معاملہ

رفع دفع ہوا تھا۔ منیجر نے پولیس میں رپورٹ نہیں کی تھی اور یوں مشکل صورتِ حال سے وہ بال بال بچے تھے۔

اسٹور سے باہر نکلتے ہی۔۔۔۔۔ وہ لوگ سب سے علیٰحدہ ہوئے تو لیزا شدید غصے میں اینا کی جانب مڑی۔

''یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' وہ آواز دباتے ہوئے بولی۔ ''کیوں کیا ایسا؟''

''کیوں نہ کرتی؟'' اینا نے متوقع جواب دیا۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''نری بے وقوفی تھی یہ۔۔۔۔۔'' لیزا نے کہا۔

''مجھے تو جیسے اس بات کی پروا ہے۔'' اینا نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''اینا۔۔۔۔۔'' لیزا ایک گہرا سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''آخر تم یہ سب کیوں کرتی ہو؟''

''کیا کرتی ہوں؟'' اینا نے ایسی معصومیت سے پوچھا جیسے اس کے جواب میں کچھ خاص سننے کی متمنی ہو۔

لیزا اپنا سر پیٹ کر ہی رہ گئی۔ اس نے ٹی وی اور کتابوں سے سیکھا تھا کہ کیسے اپنی اولاد کے ساتھ مختلف مسائل پر مکالمہ کرنا نتیجہ خیز ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے بات چیت کی راہ اپنائی لیکن اینا نے اس کی ہر کوشش پر پانی پھیر دیا۔ آخر کار زچ ہو کر اس نے آئندہ کسی ایسی حرکت پر سخت کارروائی کی تنبیہ کی لیکن اینا نے ایسا ہی ردِعمل دیا جیسے اسے کسی بات کی پروا ہی نہ ہو۔

لیزا اب سوچ رہی تھی کہ آپ جب جیکٹ یا کوئی بھی اور لباس سینے کی کوشش کرتے ہیں تو کم و بیش ویسا ہی تیار ہوتا ہے جیسا آپ کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔۔۔۔۔ لیکن ایک بچے کی تربیت کرتے ہوئے آپ اس کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ محنت کرتے ہیں اور نتیجہ آپ کی توقع کے برعکس ہی نکلتا ہے۔ آپ کے خواب اور امیدیں آپ کی اولاد ایسے توڑتی ہے کہ آپ قدرت کی اس ناانصافی پر تڑپ کر ہی رہ جاتے ہیں۔

لیزا کی سرمئی آنکھیں اونی جیکٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے سوئیوں کی مدد سے جیب کے کپڑے کو ایک جگہ پر ٹانک دیا تھا تاکہ سلائی کے دوران وہ اِدھر اُدھر نہ نکل جائے۔ اس نے ایک لمحے کے لیے وقفہ لیا اور کھڑکی سے باہر کی جانب دیکھنے لگی۔ چیڑ کے درختوں پر برستی بارش اور ان سے ٹپکنے والے قطروں کو دیکھنے کے بجائے ایک بار پھر اس کا ذہن یادوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

اینا بہت ہی بدزبان واقع ہوئی تھی۔ وہ اپنے باپ یا ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھہر جاتی اور جو اس کے دل میں آتا، انہیں بول دیتی تھی۔

''مجھے کوئی مائی کا لال آپ کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کرسکتا۔'' وہ ایسا کچھ کہہ دیتی تھی یا پھر۔۔۔۔۔ ''آپ کو کسی بات کی سمجھ بھی آتی ہے یا جان بوجھ کر بے وقوف بنے رہتے ہیں؟''

شاید انہیں اینا کی تربیت ذرا سختی کے ساتھ کرنی چاہیے تھی۔ لیزا کے خاندان میں تو گالیاں دینے، بڑوں کو منہ پر جواب دینے یا پھر ان کا کہنا نہ ماننے پر بچوں کو پٹائی کی صورت میں سزا ملتی تھی۔ اس نے یا جم نے کبھی بھی اینا پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا لیکن اب وہ سوچتی تھی کہ ایک آدھ تھپڑ لگانے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔

ایک بار جم کے آبائی پیشے والے قدیمی ویئر ہاؤس میں ایک کارکن بیماری کی وجہ سے غیر حاضر تھا تو اس نے اپنی مدد کے لیے اینا سے کہہ دیا۔

''میں مر جاؤں گی لیکن اس گند میں قدم نہیں رکھوں گی۔'' اس نے تڑخ کر جواب دیا۔

جم اس کے رویّے پر افسردہ سا ہو کر خاموش ہو گیا لیکن لیزا اپنے غصے پر قابو نہ پاسکی۔

''تمیز بھول گئی ہو؟'' وہ برہمی سے بولی۔ ''اپنے باپ سے اب ایسے بات کرو گی؟''

''اچھا۔۔۔۔۔'' اینا نے طنزاً کہا۔ ''آپ ہی بتا دیں میں کیسے بات کروں ان سے؟ کیا میں ان بادشاہ سلامت کی کنیز بن جاؤں جو ان کے ہر حکم کی تعمیل کے لیے حاضر رہے؟ شاید آپ کی یہی خواہش ہو لیکن میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔'' اس نے اپنا پرس اٹھایا اور باہر جانے کے لیے چل پڑی۔

''کہاں جارہی ہو؟'' لیزا نے اس کی حرکت پر جزبز ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''دوستوں کے پاس۔۔۔۔۔'' اینا نے بے پروائی سے کہا۔

''تم کہیں نہیں جارہیں۔۔۔۔۔ ابھی کے ابھی واپس اپنے کمرے میں جاؤ۔'' لیزا نے سختی سے کہا۔

دھڑ کی زوردار آواز نے اس کی بات کا جواب دیا۔ جم نے اس کے پیچھے جانے کی کوشش کی لیکن وہ آن کی آن میں ہی غائب ہو گئی تھی۔ پیچھے صرف مشی گن شہر کی برف پر اس کے قدموں کے نشان ہی رہ گئے تھے۔

اور اس کے ''دوست''۔۔۔ لیزا منہ بنا کر ہی رہ گئی۔ ٹریسا، ایرک اور شون۔۔۔۔۔ وہ ایسے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کی روایات اور طور طریقے لیزا اور جم سے

بالکل مختلف تھے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی تھی کہ وہ ان دوستوں سے اپنا کا میل جول ختم کروا سکیں لیکن اس لڑکی پر کسی بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔

''آپ کو مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں کس سے تعلق رکھوں اور کس سے نہ رکھوں۔'' اینا نے غصے میں چلّاتے ہوئے کہا تھا۔

اینا اس وقت اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی اور اس کا قد اپنی ماں سے چند انچ بڑھ ہی گیا تھا۔ برہم حالت میں جب وہ لیزا کی جانب بڑھی تھی تو ایک لمحے کے لیے وہ خائف ہو کر پیچھے ہو گئی۔

''اور آپ میرے دوستوں کے بارے میں جانتی ہی کیا ہیں؟'' اینا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارے دوست تمہاری طرح مجھے اور جم کو پسند نہیں کرتے..... کیا اتنا جاننا کافی نہیں ہے؟ اور یہ ٹوڈ اور جینی کے لڑکوں میں کیا برائی ہے؟ ان کے ساتھ گھوما پھرا کرو..... جم ان لوگوں کو برسوں سے جانتا ہے۔'' لیزا نے کہا۔

''کیا برائی ہے ان میں..... ہا ہا ہا۔'' اینا استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ''ان جیسا نکما، نکھٹو اور کمینہ پورے علاقے میں کوئی نہیں ہوگا اور آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ ان میں برائی کیا ہے؟''

اینا نے اس بار اپنے پرس کے ساتھ ساتھ سگریٹ کی ڈبیا بھی اٹھائی اور ایک بار پھر ڈرامائی انداز میں گھر سے نکل گئی۔ وہ بنا کسی شرم و حیا کے ماں باپ کے سامنے ہی سگریٹ نوشی شروع کر چکی تھی۔

لیزا نے یہ سب سوچتے ہوئے اپنا داہنے پیر کا زور سلائی مشین کے پیڈل پر رکھا تو مشین ایک زوردار آواز کے ساتھ چل پڑی۔ اس کی سوئی ایک تواتر کے ساتھ اوپر نیچے ہونے لگی اور کپڑے میں سے دھاگا گزرتے ہوئے جیکٹ پر بنا خاکہ سلنے لگا۔

مڈل اسکول میں تعلیم کے دوران اینا شام سات آٹھ بجے تک گھر واپس نہیں آتی تھی اور ہائی اسکول میں داخلے کے بعد تو اس کی واپسی کا کوئی وقت ہی طے نہیں رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ راتیں بھی باہر گزارنے لگی تھی۔ اختتام ہفتہ پر تو وہ ایسے غائب ہو جاتی جیسے اس کا اس خاندان سے کوئی تعلق واسطہ ہی نہ ہو۔ شاید وہ اپنے ان اقدامات کے ذریعے یہی احساس دلانا چاہتی تھی کہ وہ اس خاندان کا حصہ بننے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔

سلائی مشین کی آواز لیزا کے اعصاب کو قدرے سکون دے رہی تھی لیکن اس کا دماغ ایک بار پھر سے جھنجھنا اٹھا جب اس کی نگاہ دیوار گیر گھڑی پر گئی۔ اس کی بیٹی کسی بھی لمحے وہاں پہنچنے والی تھی۔

اس کی گڑیا رانی..... اس کی راج دلاری بیٹی کسی بھی پل اس کے سامنے موجود ہوتی۔

جیسے ہی اس کے دل میں بیٹی کے لیے پیار امڈا اسی وقت وہ بھیانک سوال اس کے دماغ میں پیدا ہوا جسے وہ بڑی دیر سے دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آخر غلطی کہاں پر ہوئی؟''

وہ گھنٹوں اپنی اور اپنی بیٹی کی تربیت میں گزارے وقت کو اپنے ذہن میں دہراتی رہتی تھی تاکہ اس بات کا سراغ مل سکے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ اس کی بیٹی نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ توجہ دینے والی، خیال کرنے والی ماں تھی۔ تمام گھر والوں کے لیے روزانہ کھانا بنانا، کپڑے دھونا اور استری کرنا اس کا معمول تھا۔ اس کی ضرورت کی ہر چیز وہ اسے مہیا کرتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ یہ سب کرنے کے باوجود وہ شاید نرم مزاج نہیں تھی اور ہر کام ایک لگے بندھے معمول میں کرنے کی وجہ سے وہ سخت مزاج ہو گئی تھی۔ اس کی بیٹی بھی شاید ایسے مزاج کی تھی اس لیے وہ ماں سے دور ہوتی چلی گئی۔

لیزا کے نزدیک ایسا سخت مزاج ہونا کوئی جرم نہیں تھا اور اینا کو کب کسی کے مزاج کی پروا رہی تھی۔ وہ اپنے نرم مزاج باپ پر ایسے ہی غصہ کرتی رہتی تھی۔ جم نے بیٹی کو خراب کرنے کی حد تک اس کی فرمائشیں پوری کرنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ ہر معاملے میں تو وہ بیٹی کا ہی ساتھ دیتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی اور اس کے دوستوں کو اسکول کا کام کروانے میں مدد کرتا تھا..... اور اسکول لانے، لے جانے کی ذمے داری بھی ادا کرتا تھا۔ لیزا کے کام کے دوران وہ اینا کو سوتے وقت کہانیاں بھی سناتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کے لیے 'خصوصی کھیل' بھی ایجاد کیے تھے۔ یہ ایسا تعلق تھا جس کی بیشتر مغربی تہذیب میں پلنے والی اولادیں دلی تمنا کرتی ہیں۔

اینا کو ان سب باتوں کی قطعاً پروا نہیں تھی۔ وہ غصہ کرتی اور ناراض ہو جاتی تھی۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ باپ کے ساتھ بھی کم سے کم وقت گزارے اس لیے اس سے بچ کر باہر نکل جایا کرتی تھی۔

لیزا کے ذہن میں کوئی ایسا حادثہ، ایسا کوئی صدمہ یا بُرا واقعہ نہیں تھا جو اینا کے بچپن میں پیش آیا ہو اور وہ ساری عمر کے لیے اپنے والدین سے باغی ہو گئی ہو۔ آخر کار وہ یہ

سب سوچتے سوچتے ایک بار پھر اس نتیجے پر پہنچی جو وہ کئی برس قبل اخذ کر چکی تھی۔ یہ بات کتنی ہی ظالمانہ اور بے رحمانہ محسوس ہو لیکن اینا کے معاملے میں اسے یہی سچ لگتی تھی کہ وہ پیدائشی طور پر ہی لیزا سے مختلف تھی۔ کوئی ایسا پیدائشی نقص اس کے وجود میں شامل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے وہ باغیانہ رویہ رکھتی تھی۔

جیکٹ کے کپڑے پر اپنی لمبی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک اور خیال بھی لیزا کے ذہن میں پوری شدت کے ساتھ گونجنے لگا۔

''کیا وہ صرف باغی ہے یا وہ تمہارے لیے خطرہ بھی ہے؟''

لیزا کو اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہ تھا کہ اپنی بھگوڑی بیٹی کی آمد کا سن کر وہ بے چین ہو گئی تھی۔ اس بے چینی کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ ان کی ملاقات کئی سال کے وقفے کے بعد ہو رہی تھی بلکہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے خوفزدہ تھی۔

اس نے جیکٹ سے نظریں ہٹائیں اور کھڑکی کے پار باہر کی جانب دیکھنے کی کوشش کرنے لگی لیکن مسلسل ہونے والی بارش کے چھینٹوں نے باہر کا منظر دھندلا دیا تھا۔ اس کے داہنے بازو میں ٹیس اٹھی تو کئی سال پہلے کا سماں اس کی نگاہوں کے سامنے ایسے گردش کرنے لگا جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اس بُرے دن کی یادیں اس کے دماغ میں جیسے کھب کر رہ گئی تھیں جس کی وجہ سے اسے ڈیٹرائیٹ شہر کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنا پڑا تھا۔ آج بھی اس واقعے کی یادیں اس کے بدن میں لرزہ طاری کر دیتی تھیں اور وہ راتوں کو بھیانک خواب کی صورت میں اسے جگا دیتی تھیں۔

لیزا اس دن ایک جیولری اسٹور میں داخل ہوئی..... اور وہاں اس کا سامنا ایک پستول بردار سے ہوا تو جیسے گنگ ہو کر رہ گئی۔ اپنے خوفناک پستول کی نال وہ اس کی جانب تان کر کھڑا تھا..... اس کی تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے ہی رہ گئی۔ پیلی روشنی کا اچانک ہی ایک جھماکا ہوا تھا جب پستول بردار نے ٹریگر پر اپنی انگلی کا دباؤ ڈالا۔ ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا اور سن کر دینے والی تکلیف دہ گولی لیزا کے بازو میں پیوست ہو گئی۔ وہ درد کی شدت سے فرش پر گر کر کراہنے لگی۔ خوف اور تکلیف سے جیسے اس کا دماغ ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔

اس حادثے سے اس کی بیٹی کا کوئی تعلق نہیں تھا..... پھر بھی لیزا کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ڈکیتی کے دوران جس طرح پستول بردار شخص نے اس پر وار کیا تھا، اسی طرح اس کی بیٹی اینا بھی کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس پر گولی چلانے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے پاس پکا ثبوت تھا کہ اینا ایک خطرناک عورت ہے۔

چند سال قبل جب اینا کو گھر چھوڑے کافی عرصہ ہو چکا تھا تو لیزا اپنے شوہر کی قبر پر گئی اور وہاں اسے موجود پا کر ششدر رہ گئی۔ وہ ایک دھند آلود دن تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا..... لیزا جب کتبے کے پاس پہنچی تو وہاں کسی کو پہلے سے موجود پا کر بہت حیران ہوئی۔ اس کے لیے یہ شدید اچنبھے کی بات تھی کہ اینا وہاں اپنے باپ کی قبر پر آئی تھی۔

دھند کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لیزا وہاں سے چپکے سے کھسک لی۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔ قبرستان سے باہر آ کر بھی وہ گومگو کی کیفیت میں تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ اینا کا سامنا کیا جائے، اس سے بات کی جائے..... دماغ تاویلیں دے رہا تھا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ جب اس کی سوچوں کے ساتھ ساتھ ہمت بھی جواب دے گئی تو اس نے بات چیت کے بجائے ایک پرچے پر ہی پیغام لکھ کر اینا کے لیے چھوڑ جانے کا فیصلہ کیا۔

وہ اینا کی شیورلیٹ تک پہنچی..... اتفاق سے اس کا دروازہ لاک نہیں تھا۔ اس نے اینا کے ہینڈ بیگ میں جھانکا تاکہ کاغذ قلم تلاش کر کے اس کے لیے کوئی پیغام لکھ ڈالے۔ وہاں کاغذوں کے پلندے اور دیگر سامان کے بیچ میں ایک پستول دیکھ کر لیزا کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

''اینا کے پاس اب گن بھی ہوتی ہے؟'' لیزا نے خود کلامی کی۔

وہ اینا کے ہینڈ بیگ میں ایک بار پھر جھانکنے لگی تو سفید سفوف کی بہت سی چھوٹی چھوٹی پلاسٹک کی تھیلیاں بھی موجود تھیں۔ لیزا کو یہ اندازہ لگانے میں ذرہ برابر بھی دقت نہ ہوئی کہ وہ منشیات تھی۔

ان سب چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اس کا شک یقین میں بدل گیا کہ اینا کسی کو بھی قتل کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جو بھی اس کے راستے میں آئے گا وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

لیزا نے سلائی مشین کے پیڈل سے اپنا پاؤں ہٹایا تو اس کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے جیکٹ کو اٹھایا اور مشین سے جڑے دھاگوں کو قینچی کی مدد سے کاٹ دیا۔ جیکٹ کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اس نے جیکٹ کی جیب میں کچھ چیزیں ڈالیں اور جائزہ لینے کے لیے آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ بغور معائنہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس

نے ایک بار پھر سے بہترین کام کیا تھا۔

آئینہ دیکھتے ہوئے جیکٹ سے جب اس کی نظریں اپنے مدھم عکس پر پہنچیں تو وہ اپنی صورت دیکھ کر ہی چونک گئی۔

''بھاگ جاؤ.....'' اس کا عکس اسے تنبیہ کر رہا تھا۔

''چلی جاؤ یہاں سے..... اینا تمہارے لیے بری خبر سے زیادہ کچھ نہیں ہے..... اس کے آنے سے قبل بھاگ جاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں.....''

''ہاہ.....'' چند لمحوں تک خود اپنے ہی عکس سے بحث کرنے کے بعد لیزا ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

اس علاقے میں منتقل ہونے کی جہاں اور بہت سی وجوہات تھیں وہاں ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ لیزا کو معلوم ہوا تھا کہ اینا بھی یہیں آس پاس ہی کسی علاقے میں رہتی ہے۔ اس کا پورا ارادہ تھا کہ اپنی ناخلف بیٹی کا کسی طرح سراغ لگا لے لیکن ایک اندرونی اضطراب تھا جو اس کے ارادوں کو ڈانواں ڈول کر دیتا تھا۔ اپنی بیٹی سے محبت کے باوجود وہ اب اس سے ملنے میں ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

''نہیں..... مجھے رکنا چاہیے۔ مجھے اپنی بیٹی سے ضرور ملنا ہوگا۔'' وہ مصمم ارادہ کر کے اپنی جگہ سے اٹھی۔

وہ اپنے خوف کا سامنا کرنا چاہتی تھی۔ ڈکیتی کے بعد سے اس نے جان لیا تھا کہ جب تک آپ اپنے خوف کا سامنا نہیں کرتے تب تک وہ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

لیزا نے جیکٹ کو ہینگر میں لٹکایا اور الماری کی جانب بڑھی۔ الماری کھول کر اس نے جیکٹ دیگر ملبوسات کے ساتھ لٹکا دی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھایا اور سب سے اوپر والے خانے میں سے ایک گتے کا ڈبا اٹھا لیا۔ جب اس نے ڈبا کھول کر دیکھا تو اس کے اندر اس کی مطلوبہ چیز موجود تھی۔

ایک چھوٹا سا سیاہ رنگت والا پستول ڈبے میں سے جھانک رہا تھا۔

''یہ ایک زنانہ پستول ہے.....'' لیزا کو اپنے لاشعور میں اپنے مرحوم شوہر جم کی آواز گونجتی محسوس ہوئی.... ''تمہارے لیے بالکل مناسب رہے گا۔''

جم نے کئی سال پہلے وہ پستول بطور تحفہ اسے دیا تھا۔

لیزا سکون سے پستول پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''سوجا گڑیا سوجا..... میری راج دلاری سوجا.....''

لوری اس کے دماغ میں ایک بار پھر سے گونجنے لگی لیکن اب الفاظ کا مفہوم بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اپنی معصوم بچی کو میٹھی نیند کے بجائے ہمیشہ کی نیند سلانے کا سوچ رہی تھی۔

''نہیں.....'' وہ کپکپا کر رہ گئی۔ اسے اپنی سوچ پر گھن محسوس ہوئی۔ بھلا وہ اپنی ہی اولاد کے خلاف کیسے یہ ہتھیار استعمال کر سکتی تھی؟ یہ تو نہایت ہی بُری سوچ تھی..... جیسی بھی سہی وہ اس کی اپنی اولاد تھی۔

اپنی اولاد کو اپنے ہی ہاتھوں ختم کر دینے کا تصور ہی ناقابلِ عمل تھا۔

''لیکن کیا واقعی؟'' ایک بار پھر اس کے لاشعور نے سوال کیا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

اگر اسے اپنی یا اپنی بیٹی کی زندگی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو وہ کسے ترجیح دے گی؟ اینا کے دل میں اپنی ماں کے خلاف جو نفرت تھی، کیا وہ بھی ایسے موڑ پر پہنچ سکتی ہے جہاں اسے دونوں کی زندگی میں سے کسی ایک کا چناؤ کرنا پڑے؟

''کیا میں اپنی زندگی بچانے کے لیے اینا کی جان لے سکتی ہوں؟'' لیزا نے خود سے سوال کیا۔

''ایک ماں کو کبھی بھی ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں ہونا چاہیے.....'' اس کے ذہن سے تھکا ہارا جواب آیا۔

کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد آخر کار لیزا ایک فیصلے پر پہنچ ہی گئی۔ اس نے پستول واپس رکھنے میں ہی بہتری سمجھی تھی۔ وہ ابھی الماری کی جانب بڑھی ہی تھی کہ گاڑی کی ہیڈ لائٹ سے منعکس ہونے والی روشنی کا جھماکا دیکھ کر رک گئی۔ گھر کے سامنے والے احاطے میں پیلی روشنی پھیل چکی تھی اور کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو کر اس کے سلائی والے کمرے کو منور کر رہی تھی۔

لیزا نے ایک نگاہ پستول پر ڈالی اور اسے الماری میں واپس رکھنے کے بجائے دروازے کے ساتھ والی تپائی پر رکھ دیا۔ وہاں سے ہٹتے ہوئے اس نے پستول پر ایک کپڑا بھی ڈال دیا تاکہ اسے پہلی نظر میں کوئی نہ دیکھ پائے۔

لیزا نشست گاہ میں پہنچی تو کھڑکی سے باہر احاطے کا منظر پوری طرح سے واضح تھا۔ وہ ایک کار کو بخوبی دیکھ سکتی تھی جو کہ رکی ہوئی تھی لیکن بارش کی وجہ سے اس کے وائپر مستقل حرکت میں تھے۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس جل رہی تھیں لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آنے والے کو نیچے اترنے کی کوئی جلدی نہ ہو۔ لیزا کو محسوس ہوا کہ اس کی بیٹی کے نیچے اترنے میں خراب موسم کے علاوہ بھی کوئی اور چیز مانع ہے۔

''شاید وہ بھی اتنے عرصے بعد ماں کا سامنا کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہے.....'' لیزا کے ذہن میں سوچ ابھری۔

ایک طویل وقفہ بیت گیا..... کافی انتظار کے بعد آخر گاڑی کی ہیڈ لائٹس بجھ گئیں۔

''اچھا سوچو لیزا.....'' وہ خود سے مخاطب ہوئی۔ ''کیا پتا اینا اب بدل گئی ہو۔ کیا پتا اس کے آنے کا مقصد معافی مانگنا ہو۔ اتنا عرصہ ماں باپ کی خوشیوں کو روندنے اور دھوکا دینے کے بعد اب اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہو۔ ہم ماں بیٹی ایک دوسرے کے ساتھ نئے انداز میں اپنے تعلق کا آغاز کریں گے۔''

یہ سب سوچنے کے باوجود دل میں کوئی خلش باقی تھی۔ اس نے مڑ کر دروازے کے ساتھ پڑی تپائی کو دیکھا جہاں اس کا پستول موجود تھا۔

''اٹھا لو اسے لیزا..... تمہیں اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' دماغ نے سرگوشی کی۔

''نہیں..... اسے واپس الماری میں رکھ دو۔'' دل نے صدا لگائی۔

لیزا نے دل و دماغ دونوں کو نظر انداز کیا۔ پستول تپائی پر ہی کپڑے کے نیچے پڑا رہا۔ وہ آگے بڑھی اور گھر کا دروازہ کھول دیا۔ ٹھنڈی پھوار نے اس کے چہرے پر برس کر موسم کی خنکی کا احساس دلایا۔ دروازہ کھول کر وہ نشست گاہ کے درمیان میں آ کر ٹھہر گئی۔

سامنے سے آتا سایہ ایک دبلی اور لمبی عورت کا تھا۔ وہ اینا ہی تھی..... دروازے پر آ کر وہ یکلخت ٹھٹک کر رک گئی۔ چند لمحوں تک کچھ سوچا اور پھر لیزا کی جانب دیکھتے ہوئے نشست گاہ میں داخل ہو گئی۔ کمرے میں داخلے کے بعد اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

لیزا کمرے کے وسط میں خاموشی سے کھڑی یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اندرونی اضطراب کے باعث وہ تیزی سے اپنے ہاتھ مل رہی تھی۔

اینا نے اپنی جیکٹ کی ٹوپی سر سے ہٹائی اور چہرے سے بارش کا پانی صاف کیا۔ اس کا چہرہ موسمیاتی اثرات کا غماز تھا..... جہاں دیدہ اور مزاج آشنا۔ چہرے سے سادگی بھی عیاں تھی کیونکہ اس نے کوئی میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔

لیزا جانتی تھی کہ اس کی بیٹی اٹھائیس سال کی ہے لیکن وہ چہرہ اپنی عمر سے کہیں بڑا تھا۔ اینا نے بال تراش کر چھوٹے رکھ لیے تھے جس کی وجہ سے کانوں کی بالیاں نمایاں ... ہو رہی تھیں۔ لیزا ایک بار انہیں دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی کہ کیا یہ اینا کو تحفے میں ملی تھیں یا پھر اس نے خود اپنے لیے خریدی تھیں۔

اس نے محسوس کیا کہ جس طرح وہ خاموشی سے اینا کا جائزہ لے رہی ہے اسی طرح وہ بھی اس کا معائنہ کرنے میں مصروف ہے۔

''کیسی ہو گڑیا؟'' آخر کار لیزا نے نشست گاہ میں پھیلا ہوا سکوت توڑا۔

''ٹھیک ہوں..... ماں۔'' مختصر جواب آیا۔

لیزا ایک لمحے کے لیے ہچکچا گئی لیکن پھر ہلکی سی کھلکھلاہٹ کے ساتھ مخاطب ہوئی۔ ''تم تو مجھے مام کہہ کر پکارا کرتی تھیں۔''

''کیا واقعی؟'' اینا کے انداز میں بے یقینی تھی۔

''ہاں تو اور کیا..... '' لیزا بولی۔ ''تمہیں یاد نہیں ہے؟''

اینا نے زبانی جواب دینے کے بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔

لیزا کو ایسا لگا کہ اینا نے جان بوجھ کر انکار کیا ہو.....

اسے سب یاد تھا لیکن اپنی تند مزاجی کے سبب وہ اس بات کی ہامی نہیں بھر سکتی تھی کہ وہ غلط ہے اور اس کی ماں صحیح کہہ رہی ہے وہ بڑی احتیاط سے اپنی بیٹی کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگی۔

اینا بھی سرسری انداز میں نشست گاہ کی تزئین و آرائش دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی اپنی اور اپنے والد کی تصویر دیکھ کر وہ چونک گئی۔ دیوار پر لگی وہ تصویر ان کے مشی گن والے مکان کے باہر موجود باغ کی تھی۔ اینا کے باپ جم کا ہاتھ اپنی بیٹی کے کندھے پر تھا اور وہ دونوں موسم سے حظ اٹھاتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ وہ تصویر اینا کے بچپن کے چند اچھے لمحات کی ایک بہترین یادگار تھی۔

''تم فون پر کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کسی نے بتایا ہے کہ میں یہاں پر رہ رہی ہوں.....'' لیزا نے پوچھا تو خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ''کون تھا وہ جس نے تمہیں میرے بارے میں اطلاع دی؟''

''تھا کوئی.....'' اینا نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''ویسے بھی اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون تھا..... ...آپ یہاں تب سے رہ رہی ہیں جب.....'' اس کی آواز جیسے حلق میں ہی کہیں پھنس گئی۔

''تقریباً دو سال سے یہاں ہوں.....'' لیزا نے اس کی بات سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم کچھ لو گی؟''

''نہیں.....'' اینا نے اختصار سے کام لیتے ہوئے انکار کیا۔

لیزا کے ذہن میں ایک اور یاد چکرانے لگی.....

اینا ابھی سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ فریج سے چوری چھپے بیئر کی بوتلیں نکال کر پی جاتی تھی۔

کچھ عجب نہیں کہ اس لڑکی کو لت لگ گئی ہو اور

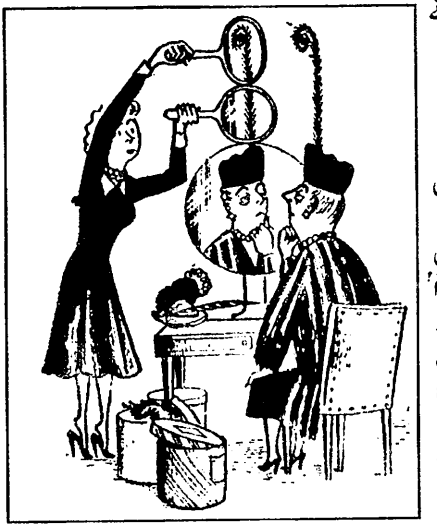

سادی زندگی کی شراب نوشی کے بعد اب اسے ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہو' لیزا کے ذہن میں سوچ ابھری۔

''چائے...... کافی؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں......''

''کچھ بھی نہیں؟'' لیزا حیران ہوئی۔

''آپ کیسے جانتی تھیں کہ میں اس علاقے میں منتقل ہوچکی ہوں؟'' اینا نے موضوع بدلنے کے لیے سوال کیا۔

یہ لڑکی آج بھی ہٹ دھرم ہے اور کسی قسم کی خوش مزاجی کو اپنے رویے سے برباد کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ لیزا' نے سوچا لیکن الفاظ اس کی زبان پر نہ آنے پائے۔ وہ بولی۔ ''گھر سے بھاگنے...... میرا [illegible] ہے کہ [illegible]۔ جب بھی کہیں تم نے منتقل ہونے کی بات کی تو ہمیشہ اسی علاقے کا ذکر کرتی تھیں۔ جب تم گھر چھوڑ کر چلی گئیں تو تمہاری کچھ ڈاک گھر پر ہی موصول ہوئی تھی...... بھیجنے والے کا پتا سیاٹل (Seattle) کا ہی تھا۔''

اینا نے سر ہلا دیا۔ اس کے چہرے پر یہ سن کر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے اپنی بے وقوفی پر پیچ و تاب کھا رہی ہو۔ جیسے اسے اس بات کا افسوس ہو کہ وہ اپنے پیچھے اتنا اہم سراغ کیسے چھوڑ آئی؟

''اور آپ نے پورٹ لینڈ منتقل ہونے کا فیصلہ اس لیے کیا تاکہ آپ میرے آس پاس رہ سکیں؟'' اینا کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

لیزا اس کی بات سن کر مسکرا دی اور پھر بولی۔ ''شاید ہاں...... پہلے میں نے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن پھر تمہارا رویہ یاد آیا تو میری ہمت جواب دے گئی۔''

لیزا کی آواز یہ کہتے ہوئے رندھ گئی...... آنسو جیسے آنکھوں سے چھلک جانے کو بے تاب ہو گئے تھے۔ اینا اس کی کیفیت سے بے پروا مکان کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔

مکان واقعی چھوٹا تھا لیکن بہترین فرنیچر سے لے کر شاندار الیکٹرونک مصنوعات کی بھرمار اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ یہاں آمد کے بعد سے لیزا کڑی محنت کر رہی ہے۔ لیزا اس وقت سوچ کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک جانب تو وہ پُرامید تھی کہ ماں کی دولت دیکھ کر اینا کا دل اس کی جانب مائل ہوجائے گا جبکہ دوسری جانب وہ اپنی بیٹی کی ناگفتہ بہ حالت پر افسوس بھی کر رہی تھی...... اینا کا لباس اور سستی جیولری اس بات کی غماز تھی کہ وہ ابھی تک اپنی زندگی میں آسائشات کے بجائے ضروریات پوری کرنے کی کوششوں میں ہی مصروف تھی۔

کمرے میں چھایا سکوت لیزا کا اضطراب بڑھا رہا تھا۔ اینا کی جانب سے خاموشی اسے کاٹ رہی تھی۔ ایسی آگ میں جلا رہی تھی جو اس کے دل کے ساتھ ساتھ اس کی روح کو بھی خاکستر کر دے۔

اینا نے جب اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی تو لیزا اس کی شادی کی انگوٹھی دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ایک نازک سی طلائی انگوٹھی میں ننھا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ لیزا جو اتنی دیر سے اپنے آنسو آنکھوں میں روکے ہوئے تھی خود پر قابو نہ پاسکی۔ نمکین پانی اس کے رخساروں پر بہہ نکلا۔

''تم...... تم نے؟'' الفاظ نے زبان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

اینا نے اپنی ماں کی نگاہوں کا پیچھا کیا تو اپنے ہی ہاتھ کی انگوٹھی پر نظر پڑی۔ اس نے تفصیلی جواب دینے کے بجائے اقرار میں سر ہلا دیا۔

'میرا داماد کیسا ہوگا؟' لیزا کے ذہن میں خیال آیا۔ 'کیا وہ جم جیسا نرم خو ہوگا تاکہ اینا کے آتشیں مزاج کو سنبھال سکے؟ یا پھر اینا کی طرح ہی سخت گیر ہوگا؟'

''تمہارے بچے بھی ہیں؟'' لیزا نے پُراشتیاق انداز میں پوچھا۔

''آپ کو یہ جاننے کی ضرورت نہیں......'' اینا نے ناگواری سے کہا۔

''تم...... تم کوئی کام کرتی ہو؟'' لیزا نے اس کی بدتمیزی نظرانداز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''ماں..... سیدھا سیدھا پوچھیں نا جو آپ پوچھنا چاہتی ہیں.....'' اینا کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔ ''آپ جاننا چاہتی ہیں کہ میں بدل گئی ہوں یا اب بھی ویسی کی ویسی ہی ہوں؟''

لیزا اس سوال کا جواب نہیں جاننا چاہتی تھی اس لیے اینا کے لہجے کو نظر انداز کر کے اپنا مدعا بیان کرنے لگی۔

''دیکھو، میں سوچ رہی تھی کہ.....'' اس کا لہجہ یکلخت ہی بھک منگوں جیسا ہو گیا تھا۔ ''کہ میں بھی سیاٹل شفٹ ہو سکتی ہوں۔ ہم ایک دوسرے سے میل ملاقات بھی رکھ سکتے ہیں..... بلکہ اس سے بڑھ کر ہم پارٹنر شپ کر کے اکٹھے کام بھی کر سکتے ہیں۔ منافع آدھا آدھا..... کتنا مزہ آئے گا۔ میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ ہم دونوں مل کر کام کریں۔ میں چاہتی ہوں.....''

''میں اور آپ..... اور اکٹھے کام کریں؟'' اینا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ اب سلائی والے کمرے کی جانب دیکھ رہی تھی..... اس نے سلائی مشین کی جانب اشارہ کیا۔ ''اس سب کی میری زندگی میں ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں..... کبھی بھی نہیں تھی اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ اتنے سال بیت گئے..... آپ کو ابھی تک یہ بات بھی سمجھ نہیں آئی ہے؟''

الفاظ تھے کہ زہر میں بجھے ہوئے تیر جو لیزا کو گھائل کرتے جا رہے تھے۔ اینا کے جواب اور اس پر مستزاد اس کا کٹیلا لہجہ لیزا کے ذہن میں ابھرنے والے سوال کا بخوبی جواب دے رہے تھے۔ ''نہیں..... اینا بالکل بھی نہیں بدلی۔''

''پھر تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟'' لیزا غصے سے پھٹ پڑی۔ ''یہاں آنے کا مقصد کیا ہے تمہارا؟''

''مجھے لگتا ہے کہ اس کا جواب بھی آپ بخوبی جانتی ہیں۔'' اینا نے رسان سے جواب دیا۔

''نہیں اینا! میں نہیں جانتی.....'' لیزا کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ ''کیا کوئی پرانا بدلہ لینے آئی ہو مجھ سے؟''

''آپ چاہیں تو ایسا سمجھ سکتی ہیں.....'' اینا نے کمرے پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں بہت ہو گیا، اب چلنا چاہیے۔''

''کیوں..... آخر کیوں؟'' لیزا کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ ''میں نے اور تمہارے باپ نے جو بھی کیا تمہاری بہتری کے لیے ہی کیا۔''

''ہاہاہا.....'' اینا کے حلق سے قہقہہ نکل گیا۔ ''میرے لیے نہیں کیا بلکہ جو بھی کیا میرے ساتھ کیا۔''

اینا کے ہاتھ میں اب ایک گن نظر آنے لگی تھی جس کی سیاہ نال کا رخ لیزا کی جانب تھا۔

''باہر چلیں۔'' اس نے سرگوشی کی۔

''نہیں.....'' لیزا کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ''اوہ میرے خدا..... نہیں۔''

وہ ایک بار پھر اس خوفناک دن میں پہنچ گئی تھی..... جیولری اسٹور میں ہونے والی فائرنگ کی یاد نے لیزا کو سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بازو میں درد پھر سے عود آیا اور آنکھوں سے آنسو قطار در قطار بہہ نکلے۔

اسے تپائی پر رکھے اپنے زنانہ پستول کا خیال آیا۔

''سوجا گڑیا سو جا.....'' دماغ کے نہاں خانوں میں لوری ایک الگ ہی مطلب کے ساتھ گونجنے لگی تھی۔

''میں کہیں نہیں جا رہی.....'' لیزا نے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''غلط فہمی ہے آپ کی.....'' اینا ہنسی۔ ''باہر نکلیں.....'' اس نے گن لہرائی۔

''تم آخر کرنا کیا چاہتی ہو؟'' لیزا نے تڑخ کر پوچھا۔

''وہی جو مجھے آج سے کئی سال پہلے کر لینا چاہیے تھا۔'' اینا بولی۔

یہ سن کر لیزا کو شدید دکھ ہوا اور وہ ڈھے سی گئی۔ اس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے کرسی کا سہارا لے لیا۔

اینا کی نگاہیں اپنی ماں کی ایک ایک حرکت پر تھیں اس لیے جیسے ہی اس کا ہاتھ ٹیلی فون کی جانب بڑھا، وہ چلا اٹھی۔

''خبردار..... فوراً سے پہلے دور ہو جائیں اس فون سے۔''

لیزا نے ناامیدی سے فون کے ریسیور کو دیکھا اور اس وقت کو کوسا جب اس نے موبائل کے بجائے لینڈ لائن کو ترجیح دی تھی۔ وہ اینا کے کہنے پر فون سے ہٹ کر ذرا فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

''میرے ساتھ چلیں.....'' اینا نے اگلا حکم صادر کیا۔

''ابھی؟ بارش میں.....'' لیزا نے حیرت کا اظہار کیا۔

اینا نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''مجھے اوپر اوڑھنے کے لیے کوئی کوٹ وغیرہ تو لینے دو۔'' لیزا نے درخواست کی۔

''یہ دروازے کے پاس جو ہینگر پر لٹکا ہوا ہے یہی پہن لیں۔'' اینا نے بیزاری سے کہا۔

''یہ والا اتنا گرم نہیں ہے..... اور باہر بہت ٹھنڈ ہے۔'' لیزا نے کہا۔

اینا ایک لمحے کے لیے ہچکچا سی گئی..... جیسے کہنا چاہتی ہو کہ کوٹ کی گرمی کی کوئی اہمیت نہیں رہنی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ پھر نجانے اس کے ذہن میں کیا

آیا کہ اس نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

''ٹھیک ہے..... لیکن فون کو ہاتھ لگانے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں سب دیکھ رہی ہوں۔'' اینا نے گن لہرائی۔

سلائی والے کمرے میں داخل ہو کر لیزا نے نیلی جیکٹ اٹھائی جس پر وہ کچھ دیر قبل ہی کام کر رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے جیکٹ پہنی..... اس کی نگاہیں تپائی پر رکھے کپڑے پر تھیں جس کے نیچے پستول کا ابھار نمایاں ہو رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے کھلے دروازے سے اینا کی جانب دیکھا جو اب دیوار پر لگی ایک اور تصویر کی جانب متوجہ تھی..... اس تصویر میں اینا، لیزا اور جم تینوں ہی مسکراتے ہوئے ایک خوش باش خاندان کا تاثر دے رہے تھے۔

اس نے بہ سرعت حرکت کی اور تپائی سے کپڑا ہٹا کر پستول اٹھا لیا۔ وہ تیزی سے مڑ کر پستول کا رخ اینا کی جانب کر سکتی تھی اور چیخ کر اسے اپنی گن پھینکنے کا حکم دے سکتی تھی۔

''سوجا گڑیا سو جا..... میری راج دلاری سو جا.....'' لوری اس کے دماغ میں گونجنے لگی۔

'لیکن اگر اینا نے اپنی گن پھینکنے سے انکار کر دیا.....؟' ایک اور سوچ دماغ میں ابھری۔' اور اس نے گن پھینکنے کے بجائے اگر فائر کرنے کا سوچ لیا تو؟'

''تب کیا کرو گی؟'' دل سے آواز آئی۔ ''اپنی جان بچانے کے لیے اپنی بیٹی کی جان لے لوگی؟''

اینا ابھی تک تصویر دیکھنے میں محو تھی۔ لیزا بہ آسانی مڑ کر اس پر گولی چلا سکتی تھی۔ اس کے بازو میں درد بڑھتا جا رہا تھا اور وہ اپنے پستول کا وزن پوری شدت سے محسوس کر پا رہی تھی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا..... زندگی یا موت!

اس نے ایک سرد آہ بھری..... فیصلہ ہو گیا تھا۔

جواب نفی میں تھا..... ایک واضح اور صاف انکار۔ وہ اپنی بیٹی کی جان نہیں لے سکتی تھی۔ آگے باہر بارش میں کیا پیش آنے والا تھا، وہ نہیں جانتی تھی..... لیکن ایک بات سے وہ بخوبی واقف تھی کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اپنی بیٹی کو قتل کرنا تو دور کی بات زخمی بھی نہیں کر سکتی۔

اس نے اپنا زنانہ پستول واپس رکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اینا کے پاس پہنچ گئی۔

''چلیں.....'' اینا نے اپنی گن جینز کی بیلٹ میں اڑستے ہوئے مختصراً کہا اور لیزا کا جواب سنے بغیر اسے لے کر باہر آ گئی۔ اس نے اپنی ماں کے بازو کو سختی سے جکڑا ہوا تھا۔ لیزا کو احساس ہوا کہ چار سال میں ماں بیٹی کا یہ پہلا جسمانی رابطہ تھا۔

''تم نے یہ سب کیا تو تم بڑا پچھتاؤ گی.....'' وہ احاطے میں رکے تو لیزا اپنی بیٹی کی جانب گھومی اور کہا۔ ''تمام عمر یہی روگ لگا رہے گا تمہیں.....''

''نہیں.....'' اینا کے اعصاب یکلخت ہی تن گئے اور اس نے سختی سے کہا۔ ''میں پچھتاوے اپنی زندگی میں بہت پیچھے چھوڑ آئی ہوں..... مجھے اب کسی چیز کا کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا۔''

لیزا نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ یہ بات سنی۔ اب وہ اپنے چہرے پر اشکوں کی نمی کے ساتھ ساتھ بارش کی پھوار بھی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اینا کے چہرے پر نگاہ دوڑائی۔ اس کا چہرہ بھی نم اور سرخ ہو چکا تھا..... لیکن لیزا بخوبی جانتی تھی کہ اس کا جذبات سے کوئی واسطہ نہیں..... ایسا صرف بارش کی وجہ سے ہوا تھا۔ اینا کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہیں تھا۔

''میں نے آخر تمہارے ساتھ ایسا کیا کیا ہے جو تم مجھ سے اتنی زیادہ نفرت کرتی ہو؟'' لیزا نے بے اختیار ہو کر

بزرگ پالنا

☆ جو بندہ ہاتھوں اور پاؤں کا کام زبان سے لینے لگے، اسے بزرگ کہتے ہیں۔

☆ کہتے ہیں ہر بزرگ کے اندر ایک بچہ ہوتا ہے جو کھیلنا چاہتا ہے۔

☆ بچہ جب بولتا ہے تو سب خوش ہوتے ہیں اور بزرگ جب چپ ہوتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔

☆ بچوں کے چہروں پر گلاب کھلا ہوتا ہے جبکہ بزرگوں کی آنکھوں میں موتیا۔

☆ بچے شادی کی بات کریں تو گھر والے خوش ہوتے ہیں، بزرگ شادی کی بات کریں تو ہمسائے۔

☆ بچوں کو توجہ نہ دیں تو وہ آدھے رہ جائیں گے اور بزرگوں کو توجہ نہ دیں تو آپ آدھے رہ جائیں گے۔

☆ بچوں کو اٹھانے کے سو طریقے ہیں اور بزرگوں کو اٹھانے کا صرف ایک طریقہ کہ ان سے کہو لیٹے رہیں۔

از ڈاکٹر یونس بٹ مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

سوال کیا جو وہ نجانے کب سے دل میں دبائے بیٹھی تھی لیکن اس کی آواز کسی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

اینا نے اس کا سوال جیسے سنا ہی نہیں اور اسے لیے مزید آگے بڑھی۔

''آخر تم جواب کیوں نہیں دیتیں؟'' لیزا بے اختیار ہو کر اس پر چیخ پڑی۔

اینا نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا اور اس سے قبل کہ لیزا غصے میں آکر کچھ اور پوچھتی، اچانک ہی وہاں دو تین گاڑیاں سائرن بجاتی آن پہنچیں۔ ان پر لگی نیلی سرخ بتیاں ایسے جگمگا رہی تھیں جیسے کسی نے یوم آزادی پر آتش بازی کا آغاز کر دیا ہو۔

ایک تیس بتیس سالہ مرد سیاہ رنگ کی جیکٹ پہنے پہلی کار سے اترا۔ اس نے سینے پر ایک بیج لگا رکھا تھا اور وہ چلتا ہوا لیزا کے گھر کی جانب آیا۔ وردی میں ملبوس دو اہلکار اس کے پیچھے ہی گاڑی کے پاس رک گئے جبکہ دیگر اپنی اپنی گاڑیوں میں ہی بیٹھے رہے۔

''میں ڈین ہیتھر ہوں..... اوریگن پولیس ڈیپارٹمنٹ سے۔'' اس نے اینا کی جانب دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔

اینا نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ ''میں ڈیٹیکٹو اینا پولیمس .....سیاٹل پولیس ڈیپارٹمنٹ سے۔''

''پورٹ لینڈ میں خوش آمدید.....'' ڈین نے خوش مزاجی سے کہا۔

اینا نے اپنے مزاج کے عین مطابق کندھے اچکائے اور آفیسر سے ہتھکڑی لے کر احتیاط سے اپنی ماں لیزا کو پہنا دی۔

☆☆☆

''الزبتھ پولیمس عرف لیزا..... تمہیں قتل، اقدام قتل، تشدد، مسلح ڈکیتی اور چوری کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔''

بارش سے ہونے والی خنکی نے جہاں اس کے اعصاب کو سن کر رکھا تھا، وہیں پر اینا کو جذباتی حوالے سے آج جن باتوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ بھی کم تکلیف دہ نہیں تھیں۔ وہ تقریباً بے حسی کے عالم میں ڈین ہیتھر کو سن رہی تھی جو کہ الزامات عائد کرنے کے بعد اب اس کی ماں کو اس کے حقوق سے آگاہ کر رہا تھا۔

الزامات کی تفصیل کے بعد اب وہ لیزا کو بتا رہا تھا کہ اسے فی الحال اوریگن کی جیل میں رکھا جائے گا جہاں اس پر مقامی جرائم کے حوالے سے مقدمہ چلے گا جبکہ دیگر مقدمات کی سماعت کے لیے اسے واپس مشی گن بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ دیگر مقامی جرائم کے مقابلے میں قتل کی واردات کی بہت زیادہ اہمیت تھی جو کہ لیزا نے مشی گن میں کی تھی۔

اینا نے اس نوجوان آفیسر کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا جو اسے ائرپورٹ پر ملا تھا۔ اینا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ دوسری ریاست میں اپنی گن ساتھ لانے کے لیے کاغذی کارروائی مکمل کر پاتی چنانچہ اس نے آفیسر سے اس کی گن مستعار لے لی تھی۔ گن واپس کرنے کے بعد اس نے دوسرے اہلکار کی جانب دیکھا جو اس کی ماں کی جامہ تلاشی لینے کا آغاز کر رہا تھا۔

''اینا.....'' لیزا نے رندھی ہوئی آواز میں اسے پکارا جیسے وہ اسے اس عمل سے بچا لے گی۔

اینا نے اس کی پکار کو نظر انداز کیا جبکہ ڈین نے اس اہلکار کو اپنا کام جاری رکھنے کا اشارہ کر دیا۔ اہلکار جب تلاشی مکمل کر کے لیزا کو پولیس کار میں بٹھانے کے لیے لے کر جا ہی رہا تھا تو اینا نے اسے روک لیا۔

''ایک منٹ رک جاؤ.....'' وہ تیزی سے بولی۔ ''اچھی طرح سے ایک بار پھر تلاشی لو۔''

اہلکار نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ وہ ایک کمزور بڑھیا کی پھر سے تلاشی کے حکم پر محو حیرت تھا کیونکہ وہ اسے کسی معصوم بچے کی طرح بے ضرر محسوس ہو رہی تھی..... لیکن جب اس کے انچارج ڈین نے بھی اینا کی تائید کی تو اس نے تلاشی کے لیے اپنی ایک ساتھی کو بلا لیا تاکہ وہ اسے اچھی طرح تھپتھپا کر دیکھ سکے۔

اس پولیس والی نے.... جب لیزا کی کمر پر ہاتھ پھیرا تو اس کے ماتھے پر تیوری چڑھ گئی۔ لیزا نے قہر آلود نظروں سے اپنی بیٹی اینا کی جانب دیکھا جب پولیس والی نے اسے نیلی جیکٹ اتارنے کا حکم دیا۔ جیکٹ کی پشت میں ایک خفیہ جیب کی سلائی کی گئی تھی۔ اچھی طرح ٹٹولنے پر اس میں سے ایک کھٹکے سے بند ہو جانے والا چاقو اور ایک ماسٹر کی برآمد ہوئی جو کسی بھی ہتھکڑی کا قفل کھول لیتی۔

''اوہ میرے خدا.....'' پولیس اہلکار بے ساختہ بلبلا اٹھا۔

اس نے اپنی ساتھی پولیس والی کو مزید اچھی طرح تلاشی لینے کا کہا۔ تیسری بار کی کوشش میں کوئی سامانِ حیرت برآمد نہ ہوا۔

''یہ میری ماں کا پرانا حربہ ہے اور نہایت کارگر بھی.....'' اینا نے کہا۔ ''مجھے یاد ہے، بچپن میں یہ اپنے

کپڑوں میں ایسے ہی خفیہ جیبیں سی دیا کرتی تھیں تاکہ چوری کا مال اور ہتھیار چھپانے میں آسانی رہے۔''

وہ سرد انداز میں ہنسی اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''سلائی اور چوری..... میری ماں کے دو بہترین ٹیلنٹ۔'' پھر مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ''اور ہاں..... قتل کرنا بھی ان کا ایک ٹیلنٹ ہی ہے۔''

''تم اپنی ماں کے ساتھ یہ سلوک کیسے کرسکتی ہو؟'' لیزا نے ترش لہجے میں کہا۔ ''نافرمان..... ناخلف اولاد۔''

اس کے علاوہ بھی اس نے اینا کو بہت کچھ کہا لیکن وہ بے پروائی سے اس کا چیخنا چلانا دیکھتی رہی..... یہاں تک کہ پولیس والے اسے وہاں سے لے گئے اور اسکواڈ کار میں بٹھادیا۔

ڈین اور اینا گھر کے اندر داخل ہوگئے۔ نشست گاہ اپنی مالکن کے بغیر ویران سی دکھائی دینے لگی تھی۔ لوٹ کا قیمتی مال اپنی پوری آب وتاب سے استعمال کا منتظر تھا۔ اینا ایک بار پھر اس چوری شدہ مال ومتاع کو گہری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''بہت شکریہ، ڈیٹیکٹیو اینا..... میں جانتا ہوں کہ آپ کے لیے یہ سب کرنا آسان نہیں تھا لیکن ہم آپ کی والدہ کے ساتھ ایک بار پھر خونیں قسم کا پولیس مقابلہ نہیں چاہتے تھے جس کے آخر میں لاشیں اٹھانی پڑیں۔'' ڈین کے لہجے میں شکرگزاری اور احترام تھا۔

لیزا پولیس کو پکڑنا واقعی مشکل تھا اور اس کو پکڑنے کی کوشش میں لاشیں گر سکتی تھیں..... وہ بہت خطرناک عورت تھی..... ایسا پہلے بھی ہوچکا تھا۔

کئی سال قبل لیزا اور اس کے عاشق بریڈ سیلبٹ نے این آربر میں ایک جیولری اسٹور لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں پر لیزا کا غیر متوقع طور پر ایک سیکیورٹی گارڈ سے سامنا ہوگیا تھا۔ گارڈ کی فائرنگ نے لیزا کو زخمی کردیا لیکن یہ زخم اسے روکنے پر قادر نہ تھا۔ لیزا نے اپنا پستول اٹھایا اور گارڈ کے ساتھ ساتھ اسٹور میں موجود ایک گاہک کو بھی جان سے مار دیا۔ بعد ازاں اس ڈکیتی کو روکنے کی کوشش میں آنے والی پولیس پر بھی لیزا نے بے دریغ اسلحے کا استعمال کیا جس سے ایک اہلکار موقع پر ہی دم توڑ گیا۔

لیزا کے لیے یہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی واردات تھی۔ کئی قتل کرنے کے بعد اس کا اب مشی گن میں رہنا محال ہوچکا تھا۔ پولیس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ ان کی نظروں سے روپوش ہوجائے۔ وہ اپنے عاشق نامدار بریڈ سیلبٹ کے ساتھ فرار ہوکر پورٹ لینڈ میں آگئی۔ ان کی یہ دونوں اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے۔ جیولری اسٹور اور ڈیزائنر بوتیک ان کے پسندیدہ ہدف تھے..... لیزا اپنی سلائی کی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے قیمتی ملبوسات میں ایسی تبدیلیاں کردیتی تھی کہ انہیں دوسری ریاستوں میں فروخت کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا تھا۔

ایک مخبر نے اوریگن پولیس ڈیپارٹمنٹ کو مطلع کیا کہ ریاست میں ہونے والی حالیہ وارداتوں کے پیچھے لیزا کا ہاتھ ہے۔ اس نے ہی مخبری کی تھی کہ وہ یہاں جنگل کے بیچ میں ایک پوشیدہ مکان میں نام بدل کر رہ رہی ہے۔ وہاں کے سراغ رسانوں نے تفتیش کے دوران پتا چلالیا کہ لیزا کی ایک بیٹی ہے جو کہ سیاٹل میں ڈیٹیکٹیو کے عہدے پر کام کر رہی ہے۔ کسی بھی قسم کے خون خرابے سے محفوظ رہنے کے لیے انہوں نے اینا کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہیلی کاپٹر سے وہ پورٹ لینڈ ائرپورٹ پر اتری۔ اس کے بعد وہ ایک کار رینٹ پر لے کر اکیلی آئی تاکہ پُرامن طریقے سے لیزا کو گرفتار کرسکے۔

''وہ دو ریاستوں میں ''موسٹ وانٹیڈ'' کی فہرست میں شامل تھی..... اور میں نے سنا ہے کہ اس نے کیلیفورنیا میں بھی اپنا نام بنانا شروع کردیا تھا۔ ذرا سوچو کہ آپ کی اپنی ماں اس طرح کی وارداتوں میں مطلوب تھی۔'' ڈین کی آواز بتدریج کم ہوتی چلی گئی کیونکہ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ جو اینا سے اس کی ماں کے بارے میں کہہ رہا ہے، وہ کسی حد تک نامناسب محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اینا کو لیکن اس بات کی مطلق پروا نہیں تھی۔ وہ جیسے خودکلامی کے انداز میں بولی۔

''میرا سارا بچپن انہی تماشوں میں گزر گیا..... چوری ڈکیتی، نقب زنی..... میرے والد کا ایک بہت بڑا ویئر ہاؤس تھا جہاں یہ سب مال جمع ہوتا اور چور بازاری کی جاتی تھی۔ اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ ویئر ہاؤس کا دکھاوا کرنا بہت ضروری تھا کیونکہ اسے وہ اپنے آبائی پیشے کے طور پر متعارف کرواتے تھے۔ ویسے میرے والد کا یہ دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا..... انہیں یہ سب کام ان کے باپ نے ہی سکھایا تھا۔''

''یعنی تمہارے دادا بھی.....؟'' ڈین نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن اینا سمجھ گئی۔

''ہاں، وہ بھی ایسے ہی تھے..... جرائم پیشہ۔'' اینا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''وہ ویئر ہاؤس تو جیسے

میری یادداشت پر نقش ہے۔ اس کی بُو اور خنکی میں آج بھی محسوس کرسکتی ہوں..... حالانکہ میں وہاں زندگی میں فقط ایک بار ہی گئی ہوں۔ شاید تب میں آٹھ سال کی تھی۔ وہ پورا گودام چوری کے مال سے بھرا ہوا تھا۔ میرے والد نے مجھے آفس میں بیٹھنے کو کہا تھا۔ چند لمحے تو سکون سے گزرے لیکن پھر میں نے بور ہوکر باہر جھانکنا شروع کردیا تھا۔ کیا ہی خوفناک نظارہ تھا..... میرے والد اپنے ساتھی غنڈوں کے ساتھ مل کر ایک شخص پر تشدد کررہے تھے..... بے پناہ مار پیٹ کے بعد نیم مردہ حالت میں اسے چھوڑا تھا۔''

ڈین اس کی بات سن کر ایک جھرجھری لے کر رہ گیا..... پھر بولا۔

''لگتا ہے آپ کے والدین کو اس بات کی بالکل بھی پروا نہیں تھی کہ آپ سے کوئی چیز خفیہ بھی رکھنی ہے؟''

''خفیہ.....؟'' اینا بے ساختہ ہنسی۔ ''ان دونوں نے پوری کوشش کی تھی کہ کسی طرح مجھے بھی اس 'کاروبار' میں گھسیٹ سکیں۔ میرے والد نے انوکھے کھیل ایجاد کیے ہوئے تھے۔ میرے ذمے وہ یہ کام لگاتے تھے کہ اپنے امیر دوستوں کے گھر کی جاسوسی کروں اور انہیں آکر بتاؤں کہ وہ لوگ اپنا قیمتی سامان کہاں رکھتے ہیں..... اور اس سب کو انہوں نے باپ بیٹی کے درمیان تفریح کا نام دیا ہوا تھا۔ کبھی دوستوں کے گھر کے وی سی آر اور ٹی وی کے بارے میں پوچھتے اور کبھی ان کے گھروں میں استعمال ہونے والے قفل کے بارے میں معلومات درکار ہوتی تھیں۔''

ڈین انگشت بدنداں اس کی کہانی سن رہا تھا پھر اس نے اچانک ہی سوال کیا۔ ''لیکن کبھی آپ قانون کی گرفت میں تو نہیں آئیں؟''

''ایک بار اسٹور سے چیزیں چوری کرنے کے الزام میں پکڑی گئی تھی۔'' اینا نے کہا۔

ڈین نے سر ہلا کر جیسے اس کی تائید کی اور بولا۔ ''میں بھی جب چودہ سال کا تھا تو سگریٹ چوری کرتے پکڑا گیا۔ میرے والد نے بیلٹ سے جو پٹائی لگائی تھی وہ آج بھی اپنی پشت پر محسوس کرتا ہوں۔''

''ارے نہیں..... نہیں۔'' اینا ہنسنے لگی اور پھر بتایا۔ ''ایک بار میں اپنی والدہ کی کارگزاری یعنی چوری شدہ مال اسٹور پر واپس کرنے گئی تھی تو پکڑی گئی۔''

''کیا.....؟'' ڈین کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''میری ماں مجھے اسٹور میں ساتھ لے جاتی تھیں۔ تم جانتے ہی ہو کہ ایک اکیلی عورت کے مقابلے میں ماں بیٹی کم مشکوک لگتے ہیں۔ میں نے انہیں کچھ گھڑیاں اور ایک نیکلس چوری کرتے دیکھ لیا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے وہ سارا سامان ایک بیگ میں ڈالا اور اسٹور واپس کرنے پہنچ گئی۔ گارڈ کو لگا کہ میں مشکوک ہوں..... اور ساری چیزیں واپس رکھنے سے قبل ہی اس نے مجھے پکڑ لیا۔ میں نے الزام قبول کرلیا..... میرے والدین کو اس بات کی کیا پروا ہوسکتی تھی؟ میری ماں اس بات پر سخت ناراض ہوئیں..... انہیں اس بات کا زیادہ غصہ تھا کہ میں سامان واپس رکھنے کیوں گئی؟ انہیں ہمیشہ افسوس ہوتا تھا کہ میں ان کی ہم مزاج کیوں نہیں ہوں۔'' اینا نے تفصیل بتائی۔

''اوہ..... آپ کو تو کسی نفسیاتی معالج کے ساتھ وقت گزارنا چاہیے تاکہ ان تلخ یادوں سے نجات مل سکے۔'' ڈین نے اظہارِ افسوس کیا۔

''کافی وقت گزار چکی ہوں.....'' اینا مسکرائی اور پھر گویا ہوئی۔ ''اب بھی گزار رہی ہوں۔''

''ایسے والدین کے ساتھ گزارہ کرنا واقعی مشکل ہے.....'' ڈین نے کہا۔

اینا نے اثبات میں سر ہلا کر اس کی بات کی تائید کی..... یادوں کا ریلا جیسے اس کے ذہن میں چلا آیا تھا، سو اس نے بولنا شروع کردیا۔

''میں بارہ یا تیرہ سال کی تھی جب اپنے والدین کی حرکات کے پیشِ نظر میں نے ان سے دور رہنا شروع کردیا تھا۔ میری حتیٰ الامکان یہی کوشش ہوتی تھی کہ جتنا زیادہ وقت اسکول میں گزار سکوں وہیں پر رہوں۔ میں نے تو ویک اینڈ پر بھی اسپتال میں خدمت کے لیے رضا کاروں میں نام لکھوایا ہوا تھا۔ میرے دوستوں نے میری بہت مدد کی۔ وہ بہترین دوستی کی مثال تھے۔ میں نے شاید ان کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کیونکہ وہ میرے والدین کے جرائم پیشہ احباب کے بالکل الٹ تھے۔ میرا تعلق اسکالرز اور ذہین ترین طالب علموں سے بن گیا تھا۔ میں زیادہ وقت اپنے دوستوں کے ساتھ ان کے گھر پر گزارتی تھی یا پھر لائبریری میرا ٹھکانا ہوتی تھی۔ میں کوئی بہت ذہین طالبہ نہیں تھی لیکن اچھی صحبت نے مجھے محنت کرنے پر مجبور کردیا۔ نتیجتاً مجھے کالج کے لیے وظیفہ ملا اور ایسے والدین سے چھٹکارا.....''

''کہاں داخلہ لیا تھا؟'' ڈین نے پوچھا۔

''این آربر میں..... کرمنل جسٹس کے مضامین کے ساتھ۔ میں نے مقابلے کا امتحان دیا اور پولیس ڈیپارٹمنٹ میں منتخب ہوگئی۔ پہلے زیادہ تر میں نے انسدادِ منشیات پر کام

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

کیا تھا پھر وہاں سے میں سیاٹل منتقل ہوگئی اور وہاں کی پولیس میں شمولیت اختیار کرلی۔'' اینا نے تفصیلاً بتایا۔

''اور وہاں آپ کو سراغرساں کا گولڈن بیج مل گیا.....'' ڈین نے ڈیٹیکٹیو بیج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو اینا نے اب اپنی جیکٹ پر ٹانک لیا تھا۔ ''بڑی جلدی ترقی کی منازل طے کی ہیں.....''

''ہاں، کڑی محنت کے بعد وقت کم ہی لگتا ہے۔'' اینا مسکرادی۔

''آپ کی ماں یہاں اکیلی رہتی تھی؟'' ڈین نے مکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے والد کہاں ہیں؟''

''اوپر.....'' اینا نے کہا۔ ''اور انہیں اس دنیا سے رخصت کرنے کا فریضہ بھی میری ماں نے ہی سرانجام دیا تھا۔''

''کیا.....؟'' ڈین حیرت سے اچھلا۔

''حیران مت ہو.....'' اینا نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''ذرا جب تم ان کی کیس فائل پڑھنا تو کئی انکشافات ہوں گے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تو میرے والد کی موت ایک حادثہ ہی تھی لیکن کچھ عرصہ قبل ایک کرائے کے قاتل نے مشی گن کی جیل میں انکشاف کیا کہ اسے میری ماں نے میرے باپ کو قتل کرنے کے لیے معاوضہ دیا تھا۔ میری ماں کو پتا چل گیا تھا کہ میرا باپ چوری کے مال میں ہی نقب لگا رہا ہے اور وہ پیسا اپنی محبوبہ پر اڑا رہا ہے۔ اس نے اجرتی قاتل کو اس کام کے لیے معاوضہ دیا کہ میرے باپ کی موت ایک حادثہ ہی معلوم ہو۔''

''مجھے..... مجھے بہت افسوس ہے ڈیٹیکٹیو.....'' ڈین یہ ساری معلومات سن کر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کہے۔

اینا نے ایسے کندھے اچکائے جیسے اسے پروا ہی نہ ہو۔ ''میں ہمیشہ سوچتی رہی کہ کیا میں اپنی زندگی میں بھی انہیں معاف کرسکتی ہوں؟ مجھے یاد ہے کہ میں جب منشیات والے کیسز پر کام کررہی تھی تو ایک مرتبہ مجھے ایک مفرور مجرم کا پندرہ بیس کلومیٹر تک پیچھا کرنا پڑا۔ اس کے پاس سے کافی زیادہ کوکین کی پڑیاں ملی تھیں۔ میں یہ سب ثبوت آفس جمع کروانے جا رہی تھی جب مجھے وہ قبرستان نظر آیا جہاں میرے والد دفن ہیں۔ میں وہاں بھی نہیں گئی تھی..... ان کی وفات پر بھی نہیں۔ پھر نجانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں گاڑی روک کر ان کی قبر پر چلی گئی اور انہیں معاف کرنے کی کوشش کرنے لگی..... لیکن نہیں کر پائی۔ آپ اپنی زندگی برباد کردینے والوں کو کیسے معاف کرسکتے ہیں؟ اس دن مجھے احساس ہوا کہ میں شاید اپنی ماں اور باپ کو کبھی معاف نہیں کرپاؤں گی۔ تب ہی میں نے مشی گن چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور سیاٹل آگئی۔''

''آپ کی ماں نے پھر شادی نہیں کی؟'' ڈین نے اینا کو افسردہ ہوتے ہوئے محسوس کیا تو بات کو لیز اپر لے آیا۔

''وہ بریڈ سلیٹ کے ساتھ ہی انگیج ہوگئی تھیں لیکن پھر کبھی شادی نہیں کی..... تم نے بریڈ کو اب تک پکڑا یا نہیں؟'' اینا یکلخت چونکی اور سوال کیا۔

''نہیں.....'' ڈین نے جواب دیا۔ ''وہ ہے تو اسی علاقے میں لیکن کہیں روپوش ہوگیا ہے..... امید ہے ہم جلد ہی اس تک پہنچ جائیں گے۔'' ڈین نے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا۔

''میں جب آئی تو میری ماں نے کسی کو فون کرنے کی کوشش کی تھی.....'' اینا نے لینڈ لائن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید وہ بریڈ سلیٹ کے لیے کوئی پیغام چھوڑنا چاہتی تھی..... میں تمہاری جگہ ہوتی تو پورا فون ریکارڈ چیک کرتی۔''

''اچھا آئیڈیا ہے ڈیٹیکٹیو..... میں آج ہی وارنٹ نکلواتا ہوں اس سلسلے میں۔'' ڈین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

اینا نے برستی بارش میں باہر جھانکا جہاں چند لمحے قبل اسکواڈ کار اس کی ماں کو لے کر چلی گئی تھی۔

''پتا ہے اس سارے معاملے میں عجیب ترین بات کیا تھی ڈین؟'' اینا اس سے مخاطب ہوئی۔ ''میری ماں کو احساس تک نہیں تھا کہ اس نے کچھ غلط کیا ہے۔ اپنے ہر جھوٹ..... اپنی ہر غلطی سے انہوں نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کرلی تھیں کہ یہ سب وہ میری بہتری کے لیے کررہی ہیں۔ مجھے بھی زبردستی اس کام میں گھسنے کی کوشش اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ وہ مجھے بھی اپنے جیسا ہی سمجھتی تھیں۔ میرے والدین میں کوئی پیدائشی نقص تھا جو وہ جرم کو جرم نہیں سمجھتے تھے..... اور وہ مجھے خاندان کا گندا انڈا شمار کرتے تھے۔ ان کی سمجھ سے بالاتر تھا کہ میں برائی کو برائی کیوں سمجھتی ہوں اور ان کے جیسی کیوں نہیں بن جاتی۔''

''تمہاری کوئی اور فیملی نہیں ہے؟'' ڈین نے تشویش سے پوچھا..... اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اینا پر اس کی ماں کی گرفتاری نے کافی اثر ڈالا ہے۔

''میرا شوہر..... وہ ہومی سائیڈ ڈیپارٹمنٹ میں سارجنٹ ہے۔'' اینا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور جلد ہی

ہم والدین بننے والے ہیں۔''

''واہ..... پھر تو بہت مبارک ہو۔'' ڈین نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''میں بس جون تک ہی کام کروں گی..... اس کے بعد دو سال کی چھٹی لے کر ماں بن کر گھر، شوہر اور اپنے بچے کو سنبھالوں گی۔'' اینا نے کہا..... وہ مزید کہنا چاہتی تھی ''کیونکہ ماں باپ کے لیے ان کی اولاد سے بڑھ کر کچھ نہیں ہونا چاہیے'' لیکن موجودہ حالات کے پیشِ نظر اس نے وضاحت کرنا ضروری نہ سمجھا۔

''کرائم سین والے اب اس ساری جگہ کو سیل کر دیں گے۔'' ڈین بولا۔ ''آپ مکان کا جائزہ لے لیں..... اگر کوئی فوٹو یا کوئی اور یادگار اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔''

''یہاں پہلے ہی اتنا کچھ بھرا ہوا ہے کہ مزید کسی یادگار کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی.....'' اینا نے اپنے سر کو انگلی سے بجاتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہو گیا.....'' ڈین نے کہا۔

اینا نے جیکٹ کی زپ بند کی اور ٹوپی سر پر پہن لی..... پھر اچانک ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔

ڈین کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''جانتے ہو میرے بچپن کی سب سے پہلی یاد کیا ہے؟'' اینا نے پوچھا۔

''کیا ہے.....؟'' ڈین نے نفی میں سر ہلایا۔

''میں بچن میں تھی..... وہاں بڑی میز کے سامنے آرام کرسی پر جھول رہی تھی اور میری ماں میرے لیے گانا گا رہی تھی۔'' اینا نے بتایا۔

''گانا..... اور وہ بھی آپ کی ماں.....؟'' ڈین کے لہجے میں استعجاب نمایاں تھا۔

اینا پھر ہنسنے لگی۔ ''ہاں، وہ گانا ہی تھا کوئی لیکن اب بول مجھے یاد نہیں ہیں..... میری ماں بس میری توجہ ہٹانے کے لیے ہی گا رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں میز پر بکھری چیزوں کو چھیڑوں اس لیے رشوت میں گانا گایا جا رہا تھا۔''

''وہ کیا کام کر رہی تھیں؟ سلائی.....؟'' ڈین نے پرانی سلائی مشین کو دیکھ کر اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔ وہاں پر بہت سے ڈیزائنر سوٹ بکھرے ہوئے تھے جو کہ یقیناً مالِ مسروقہ تھے۔

''نہیں.....'' اینا نے جواب دیا۔ ''وہ بارود سے گولیوں کے خالی خول بھر رہی تھی۔''

''آپ مذاق تو نہیں کر رہیں؟'' ڈین نے سٹپٹا کر پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں.....'' اینا نے کہا۔ ''مجھے بڑے ہونے کے بعد ہی معلوم ہوا تھا کہ درحقیقت وہ کیا کر رہی تھیں۔ میرے والدین کے پاس تب زیادہ پیسا نہیں تھا تو وہ یہ کام بھی کرتے تھے۔ مجھے یہ سب اس لیے یاد ہے کیونکہ گولیوں کے خول بڑے چمکدار ہوتے تھے اور میں ان کے ساتھ کھیلنے کی شدت سے خواہش رکھتی تھی۔ میری ماں کہتی تھی کہ اگر میں نے انہیں ہاتھ نہ لگایا تو وہ مجھے گانا سنائیں گی..... اور تب ہی میرے لیے وہ گیت گاتی تھی۔''

ڈین یہ سن کر خاموش ہو گیا..... اینا نے بھی اب چپ رہنا مناسب سمجھا۔ ماں کی گرفتاری نے دل کے ان زخموں کو کرید دیا تھا جس پر وہ جانے کب سے مرہم رکھ رہی تھی۔ دونوں آفیسر اب خاموشی سے بارش کی ٹپ ٹپ سن سکتے تھے۔

''ٹھیک ہے.....'' آخر اینا نے کافی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ ''مجھے اب گھر جانا چاہیے۔''

ڈین گھر کے باہر تک اس کے ساتھ آیا اور اسے الوداع کہا۔ اینا نے رینٹ پر لی ہوئی کار اسٹارٹ کی اور کیچپر والے راستے پر چلاتے ہوئے ہائی وے کی جانب موڑ لی۔

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ ہر برا کام کرتے ہیں اور اپنے فائدے کے لیے کسی کا بھی نقصان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اینا کی ماں بھی ایسی ہی تھی..... لیکن یہی لوگ جب مکافاتِ عمل یا انتقام کی زد میں آتے ہیں تو اپنے ہر عمل کو بھول جاتے ہیں۔ ان کو ایسا لگتا ہے جیسے انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں اور ان کے ساتھ ہونے والا سلوک ظلم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنی مظلومیت کا پرچار کرنے کے بعد ہمدرد بھی مل جاتے ہیں جیسے اس کی ماں کو بریڈ سیلیٹ مل گیا تھا۔ پیدائشی طور پر ایسے دماغ خراب لوگوں کا یہی علاج تھا کہ انہیں ان کے سیاہ کرتوتوں کی کڑی سے کڑی سزا ملے۔

اینا کے ذہن کے نہاں خانوں میں ایک آواز گونجنے لگی تھی لیکن الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے۔

''سو جا گڑیا سو جا..... لال پلنگ پر سو جا.....''

اس نے سر کو جھٹکا اور ریڈیو آن کر کے خبریں سننے لگی..... اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ جماتے ہوئے اس نے گاڑی کی رفتار بڑھانا شروع کر دی تاکہ جلد از جلد ائرپورٹ تک پہنچ سکے۔

ماضی کا باب ہمیشہ کے لیے بند کرنا ہی مناسب تھا۔

⌘⌘⌘

زندان

کبیر عباسی

رب کائنات نے خالق اور مخلوق کے بعد دنیا میں سب سے خوبصورت رشتہ والدین اور اولاد کے درمیان تخلیق کیا ہے۔ سب سے زیادہ قابل بھروسا اور قابل احترام مگر صد افسوس کہ اسی رشتے میں سب سے زیادہ دراڑیں پڑجاتی ہیں۔ وہ بھی تو ایسی ہی محبتوں کا ترسا ہوا تھا۔ سگے رشتوں کے ذرا سے پیار کے لیے سوتیلوں کی نفرتوں کو بھی محبت سے سہہ رہا تھا لیکن ... جب خود اس رشتے پر فائز ہوا تو مسلسل برسات بن کر اپنے اس پیارے رشتے کو بہت بے چین رکھا۔ کھلے موسم کا لطف اسے لینے ہی نہیں دیا۔ انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا مگر پیروں میں بیڑیاں ڈال کر... اور جان نہ سکا کہ وہ تو متوالا تھا آزاد فضاؤں کا، پنچھی بن کر اڑنا چاہتا تھا... عجیب صیاد تھا کہ زمانے کی تکلیفوں سے بچانے کی خاطر اس کے پیر ہی کاٹ ڈالے... پھر محبتوں کی اتنی شدتوں میں وحشتیں تو مقدر بن ہی جاتی ہیں۔

محبت کی زنجیروں میں قید ایک خوبصورت رشتے کے نکھرتے مان کی عبرت اثر داستان

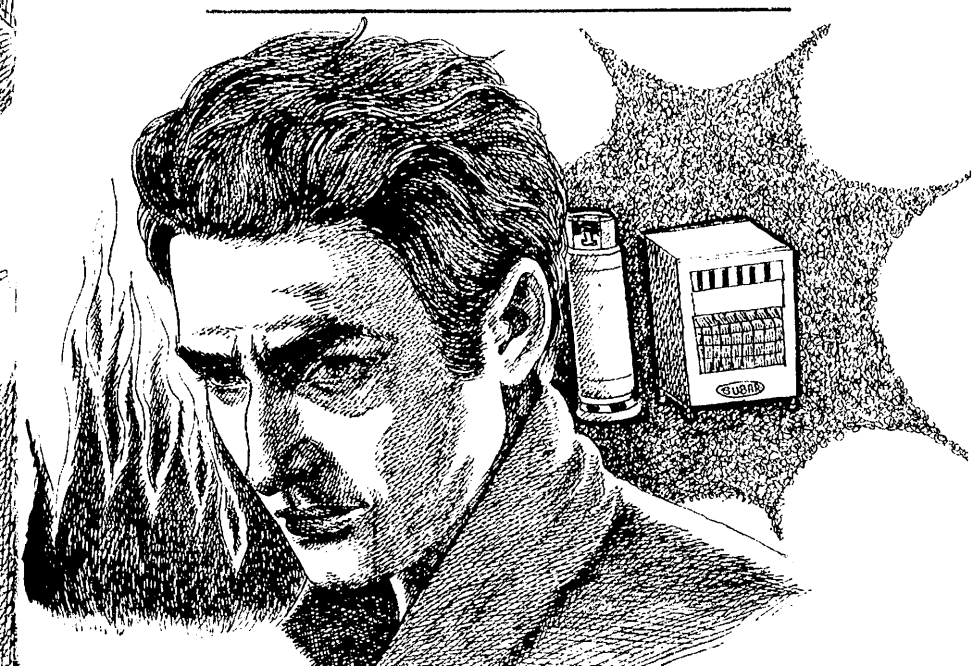

تنویر نے لیٹے ہوئے سائڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر وقت دیکھا۔ رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔

''ایک تو یہ زرینہ جانے کدھر مر گئی ہے؟'' اس نے جھنجلا کر بیوی کے متعلق سوچا۔

آج ہفتہ تھا۔ صبح اس کی دفتر سے چھٹی تھی۔ وہ بے چینی سے اپنی بیوی کا انتظار کر رہا تھا جو شاید گھر کے کام کاج میں مشغول تھی۔ اس کی آنکھ لگنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلا۔ دروازے پر اس کی بیوی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر معذرت خواہانہ تاثرات تھے۔

''سوری، کچن سمیٹتے سمیٹتے کچھ زیادہ وقت گزر گیا۔'' وہ تنویر کے غصیلے تاثرات دیکھتے ہی تیزی سے بولی۔

تنویر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ کال بیل بجی۔ ''اس وقت کون آ گیا؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''ایک منٹ..... میں دیکھتی ہوں۔'' زرینہ پلٹی ہی تھی کہ وہ تیزی سے بولا۔

''رکو، میں دیکھتا ہوں۔'' زرینہ رک گئی۔

تنویر نے قمیص پہنی اور باہر نکل گیا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے آواز لگائی۔

''کون ہے بھئی؟'' اس کے لہجے میں بیزاری صاف محسوس کی جا سکتی تھی جو اس نے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

''تنویر بھائی، میں ہوں نوید..... آپ کا پڑوسی۔'' باہر سے نوید کی آواز سنتے ہی اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے غصے سے دروازہ کھولا۔ سامنے ملگجے سے حلیے میں نوید کھڑا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد مدقوق چہرہ..... یہ وہ نوید تو لگ رہا ہی نہیں تھا جسے تنویر جانتا تھا۔ اسے دیکھ کر تنویر لمحے بھر کے لیے چونکا، لیکن اگلے ہی پل اس کا غصہ عود آیا۔

''کیا ہے بھئی، کسی کے گھر جانے سے پہلے وقت تو دیکھ لیا کریں۔'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے پر دنیا جہاں کی بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ نوید کی پریشانی جیسے اس کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتی تھی۔

''میں معذرت چاہتا ہوں تنویر بھائی۔ دراصل، اسد ابھی تک گھر نہیں پہنچا۔ میں اس کے متعلق معلوم کرنے آیا ہوں کہیں وہ آپ کے بیٹے کے ساتھ تو موجود نہیں؟'' نوید چہرے پر شرمندگی کے تاثرات سجائے دھیمے سے بولا۔ اسد نوید کا چودہ پندرہ سالہ بیٹا تھا جو بعض اوقات اس کے بیٹے عثمان سے ملنے ان کے گھر آ جاتا تھا۔ عثمان بھی ان کے گھر جاتا رہتا تھا لیکن اس وقت اسد کے متعلق استفسار اسے تپا گیا۔

''نہیں ہے، وہ ادھر۔'' تنویر نے رکھائی سے کہا۔

''آپ پلیز، عثمان سے پوچھ لیں۔ وہ اس سے ملنے آج آیا تھا؟'' نوید مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگا۔

''آج وہ ادھر نہیں آیا۔ میں سات بجے سے گھر پر ہی ہوں۔ عثمان بھی اتنی دیر سے گھر میں ہے۔'' وہ بیزاری سے بولتے ہوئے دروازہ بند کرنے ہی لگا تھا کہ نوید لجاجت سے بولا۔

''سوری تنویر بھائی، اگر آپ عثمان کو بلا دیں تو میری تسلی ہو جائے گی۔''

تنویر کی کنپٹی کی رگیں پھول گئیں۔ یہ اس کے انتہائی غصے کی نشانی تھی۔ وہ زور سے دروازہ مارنے ہی لگا تھا کہ نوید نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''پلیز تنویر بھائی.....'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

تنویر نے خود پر قابو پایا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔ عثمان کے کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ اس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''جی کون؟'' عثمان کی آواز آتے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ عثمان کتاب کھولے بیٹھا تھا۔ اپنے باپ کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نوید اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھنے آیا ہے۔ تم سے ملنا چاہتا ہے۔'' وہ بیزاری سے کہہ کر دروازے سے ہی پلٹ گیا۔

عثمان نے چپل پہنی اور باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے سے تاثرات تھے۔

''اسد دن میں مجھ سے ملا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ دل چاہ رہا ہے گھر سے بھاگ جاؤں۔'' اس نے اپنے باپ سے کہا۔

''اچھا.....'' تنویر کے چہرے پر سوچ کے گہرے تاثرات ابھرے۔ ''تم ایسا کرنا کہ اس کے باپ کو یہ نہ بتانا۔ وہ ایسے ہی تفتیش میں وقت برباد کرے گا۔'' عثمان کے چہرے پر اچنبھے کا تاثر ابھرا۔

''ابو، میرے خیال میں تو انہیں یہ بات بتا دینی چاہیے۔ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے، اگر وہ اپنی مرضی سے گھر سے بھاگا ہے تو شاید وہ اسے کہیں سے ڈھونڈ لیں۔'' وہ دھیمے سے تنویر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ تنویر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''میرا باپ بننے کی کوشش نہ کرو، جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔''

اپنے باپ کو غصے میں دیکھ کر عثمان نے نظریں جھکا لیں۔ ''اوکے ابو۔'' اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

گیٹ پر نوید بے چینی سے عثمان کا انتظار کر رہا تھا۔

اسے دیکھتے ہی وہ بے چینی سے بولا۔

''عثمان بیٹا، اسد سے تو آج تمہاری ملاقات نہیں ہوئی؟''

''انکل، میں جب اسکول سے آیا تو وہ ہمارے گیٹ پر کھڑا تھا۔ ادھر ہی اس سے ہیلو ہائے ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہوئی تھی تمہاری اس سے؟'' نوید ایک پاؤں سے دوسرے پر وزن ڈالنے لگا۔ اس کے پریشان تاثرات دیکھ کر عثمان اسے سب سچ سچ بتانے ہی لگا تھا کہ اس کے پیچھے قدموں کی چاپ ابھری۔ اس نے اپنے عقب میں مڑ کر دیکھا۔ اس کا باپ کھڑا اسے غصے سے گھور رہا تھا۔

''نہیں انکل، میری اس سے زیادہ بات نہیں ہوئی۔ بس ہم نے ایک دوسرے سے حال احوال دریافت کیا اور وہ اپنے گھر چلا گیا۔'' عثمان نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ نوید کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات نمودار ہوئے۔

''سوری بیٹا، آپ کو بے وقت زحمت دی۔'' وہ پریشانی سے کہتے ہوئے پلٹنے ہی لگا تھا کہ عثمان کی آواز سن کر رک گیا۔

''انکل، آپ اسے تھوڑی ''اسپیس'' دیا کریں۔ وہ اب بڑا ہو رہا ہے اور آپ کی طرف سے اس پر لگائی گئی پابندیاں اسے آپ سے دور کر رہی ہیں۔'' اس کے لہجے میں جھجک تھی۔ نوید کا چہرہ لال بھبھو کا ہو گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ تنویر تیزی سے بولا۔

''وہ ان کا بیٹا ہے، وہ بہتر سمجھتے ہیں کہ انہیں اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ تم زیادہ بڑے مت بنو۔''

''سوری ابو، میں تو بس.....''

''چلو اندر چلو اب۔'' تنویر اس کی بات کاٹ کر غصے سے بولا تو عثمان اندر کی طرف بڑھ گیا۔

تنویر نے ایک اچٹتی نظر بے چین کھڑے نوید پر ڈالی اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔

نوید دکھ بھری نظروں سے گیٹ کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

تنویر اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کی بیوی ڈریسنگ روم کے سامنے کھڑی اپنی لپ اسٹک درست کر رہی تھی۔ وہ اسے آئینے میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کون تھا، بڑی دیر لگا دی آپ نے؟''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''نوید تھا، آج پھر اس کا بیٹا گھر لوٹ کر نہیں آیا اور اسے ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے ہمارا ہی گھر یاد آیا۔ کتنی بار کہا ہے عثمان سے کہ اس سے بات چیت ہی چھوڑ دے مگر وہ ہے کہ.....'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر قمیص اتارنے لگا۔

''.....'' زرینہ کے لہجے میں تاسف تھا۔ ''کبھی کبھی مجھے بڑا ترس آتا ہے دونوں باپ بیٹے پر۔'' اس نے لپ اسٹک رکھی اور خود پر پرفیوم اسپرے کرنے لگی۔

''بیٹے پر تو ترس بنتا ہے، باپ پر کیوں ترس آتا ہے؟'' تنویر نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

''وہ کیا کرے..... اسے اپنے بیٹے سے محبت ہی اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔''

''محبت..... ہونہہ..... وہ تو پاگل ہے۔''

''ہاں پاگل تو ہے، مگر اپنے بیٹے کی محبت میں۔'' زرینہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اچھا، چھوڑو اس باپ بیٹے کی محبت کو..... فی الحال تو میں پاگل ہو رہا ہوں تمہاری محبت میں۔'' وہ اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے رومانوی انداز میں بولا۔

''آپ بھی نا.....'' وہ شرماتے ہوئے اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی، لیکن اس کے ذہن میں نوید کے بیٹے کی گمشدگی کھٹک رہی تھی۔

☆☆☆

نوید اپنے گھر کی بتیاں بجھائے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ملگجے سے اندھیرے میں ہر چیز ہیولوں کے مانند دکھ رہی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اپنے گھر کے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ گردو نواح کے تمام گھروں کی کم از کم باہر کی بتیاں روشن تھیں۔ واحد گھر اس کا تھا جو مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس کے گھر کی طرح اس کے دل میں بھی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گہرا تاریک اندھیرا..... اس کا اکلوتا بیٹا، اس کا واحد دوست، اس کی زندگی کا حاصل..... آج اس گھر میں نہیں تھا تو پھر اس گھر میں بھلا روشنی ہو سکتی تھی؟

اس کا اپنے بیٹے کے ساتھ رشتہ روایتی باپ بیٹے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے اپنی زندگی تج دی تھی۔ اس کے لیے اس نے اپنا کاروبار، اپنے دوست، اپنے رشتے ناتے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ پچھلے پندرہ سال سے اس کی زندگی ایک ہی محور کے گرد گھوم رہی تھی..... اور وہ محور اس کا بیٹا تھا۔

اس سے اگر کوئی محبت کا مفہوم پوچھتا تو اس کا جواب ہوتا۔ ''میرا بیٹا اسد.....''

اس سے اگر کوئی پوچھتا کہ زندگی کا حاصل کیا ہے، تو بے اختیار اس کے دل کی طرح اس کے لبوں سے بھی نکلتا۔ ''میرا بیٹا اسد.....''

اور اب وہی اسد جو اس کی آنکھوں کا نور تھا، جو اس کے

دل کا سکون تھا، آج گھر میں موجود نہیں تھا۔ آج اس کا گھر کیسے روشن رہ سکتا تھا۔ تاریکی تو اس گھر کا مقدر بن چکی تھی۔ اس گھر کی روشنی اسد ہی کے مرہونِ منت تھی۔ وہ نہیں تھا تو کچھ بھی تو نہیں تھا۔

وہ آس پاس کے تمام گھروں میں اسد کے متعلق پوچھ چکا تھا مگر کہیں سے اسے اسد کے متعلق معلوم نہ ہوا تھا۔ تقریباً سب کا رویہ اس کے ساتھ خراب ہی تھا۔ ایسا اس کے ساتھ آج پہلی بار ہوا تھا۔ اس کے پڑوسی اس کے سامنے اس کی بہت عزت کیا کرتے تھے، وہ کیوں نہ اس کی عزت کرتے، وہ اس علاقے کا سب سے متمول فرد تھا۔

آج اسی نوید کو ہر گھر سے دھتکار دیا گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ہر شخص کے چہرے پر عجیب سی بیزاریت، نفرت اور طنزیہ تاثرات چھا گئے تھے۔ وہ اس وقت جس گہرے دکھ سے دوچار تھا، اس کے مقابلے میں لوگوں کا یہ رویہ تو انتہائی معمولی چیز تھا۔ وہ لوگوں کے اس رویے پر انہیں حق بجانب سمجھ رہا تھا۔

آج تیسرے ماہ میں یہ تیسری بار ہوا تھا کہ وہ اسد کے متعلق اپنے پڑوسیوں سے استفسار کر رہا تھا۔ پہلی بار تو اس کے غیاب کے بارے میں جان کر وہ انتہائی پریشان ہو گیا تھا۔ نہ صرف وہ بلکہ اس کے پڑوسی بھی اس کی پریشانی میں اس کے ساتھ شریک تھے۔ وہ اس کی اسد سے محبت کے بارے میں جانتے تھے۔ یہ اسد ہی تھا جس کی وجہ سے وہ ان سب سے کٹ گیا تھا، مگر اس کے باوجود وہ اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس دن محلے کی سب سے اہم خبر اسد کی گمشدگی ہی تھی۔

جو بھی اسد کی گمشدگی کے بارے میں سنتا یہی سوچتا۔ اب نوید کا کیا ہوگا۔ وہ نہ ملا تو نوید تو جیتے جی مر جائے گا۔ پہلی بار اس کے پڑوسیوں نے اسد کی تلاش میں ہر ممکن اس کی مدد کی تھی لیکن اسد کہیں نہ ملا تھا۔ پڑوسیوں سے پوچھ گچھ کے بعد وہ تھانے جا پہنچا تھا، اس کے محلے کے تین لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ پولیس کے عملے نے اس کی گمشدگی کی ایف آئی آر کاٹنے سے تو انکار کر دیا تھا تاہم اسے تسلی دے دی تھی کہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔

وہ مایوس لوٹ آئے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو الوداع کہہ کر وہ رات کو بارہ بجے گھر پہنچا تو اسد تاریک گھر کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ جیسے جی اٹھا تھا۔ وہ اسے ساتھ لپٹاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا تھا۔

''اسد میرے بچے! کہاں چلے گئے تھے تم؟ تم جانتے تو ہو تمہارے بغیر میں ایک پل بھی نہیں گزار سکتا۔ پھر کیوں اپنے باپ کو تنگ کرتے ہو؟'' وہ ساتھ ہی اسے چومتا جا رہا تھا۔

اسد سپاٹ کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا۔ نوید نے گیٹ کھولا تو اسد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں جاتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''اسد! دروازہ کھولو۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' اسد کا پراسرار رویہ اسے پریشان کر گیا تھا۔

''مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونا چاہتا ہوں۔'' وہ سپاٹ سے انداز میں بولا تھا۔ نوید کا دل کٹ کر رہ گیا۔

اسد کا رویہ اسے کھل رہا تھا۔ وہ اس کے کمرے کے دروازے پر ہی بے چینی سے ٹہلنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اسد کو کچھ دیر بعد اپنے رویے کا احساس ہوگا تو وہ دروازہ کھول دے گا مگر اس کا خیال باطل ثابت ہوا تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے اس کی ٹانگیں شل ہو گئیں تو وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن اسد کے رویے کی توجیہہ تلاش کر رہا تھا لیکن کوئی بھی وجہ حتمی نہ تھی۔ اس کا ذہن ہر دلیل بودی قرار دیتا رہا اور ہر مفروضہ مسترد کرتا رہا۔

آج زندگی میں شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے بیلوسے چھ گھنٹے اسد کے بغیر گزارے تھے۔ یہ وقت اس نے کس کرب میں گزارا تھا یہ وہ جانتا تھا یا اس کا دل۔

اگر اسد لوٹ کر نہ آتا تو.....؟ یہ خیال اس کے لیے روح فرسا تھا۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

اس کے رویے نے اس کا دل پارہ پارہ کر دیا تھا۔ پہلے اس کی آنکھیں بھرائیں، پھر وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ اس کی ہچکیوں کی آواز بتدریج بلند ہوتی جا رہی تھی... جو پورے گھر میں پھیلتی جا رہی تھی۔ یہ آواز اسد تک بھی پہنچی۔

وہ ہچکیوں کی بلند ہوتی آواز سن کر اندر سے چلایا۔

''پلیز، مجھے سونے دیں۔ اگر آپ نے رونا ہی ہے تو گھر سے باہر نکل جائیں۔'' الفاظ کے برعکس اس کے لہجے میں لجاجت تھی، بے بسی تھی۔

نوید بے یقینی سے دروازے کو دیکھنے لگا۔ اس کی ہچکیوں کے درمیان لمحے بھر کا وقفہ آیا تھا۔ یہ ادراک کا لمحہ تھا۔ اس لمحے میں آہستہ آہستہ اس جملے کا مفہوم اس پر کھلا تھا۔ اس کے دل پر چرکا لگا۔ اس کی آہ وزاری میں شدت آ گئی۔ اندر سے ایک بار پھر ایک آواز ابھری۔ اس بار آواز میں بے بسی تو تھی مگر نرمی نہ تھی۔ اس بار اس کی آواز وحشت سے بھرپور تھی۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

''خدا کے لیے خاموش ہو جائیں۔ اگر آپ خاموش نہ ہوئے تو میں اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا اور پھر کبھی

واپس نہیں آؤں گا۔''

نوید کے رونے کو جیسے یکلخت ہی بریک لگ گیا۔ اس کی ساری محبتوں کا صلہ اسے ان الفاظ کی صورت میں ملے گا اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اس لمحے اسے جو تکلیف ہوئی تھی، وہ تین ماہ گزرنے کے بعد بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ اس تکلیف کو یاد کرتے ہوئے آج اندھیرے میں سیڑھیوں میں بیٹھے نوید کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے تھے۔

پندرہ سال تک وہ میرے قریب رہا مگر تین ماہ .....صرف تین ماہ میں..... وہ مجھ سے کتنا دور چلا گیا۔ روتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

نوید کے ذہن کے نہاں خانوں میں آج بھی وہ لمحہ پوری آب و تاب کے ساتھ محفوظ تھا، جب پہلی بار اس نے اسد کا ذکر سنا تھا۔ وہ دھڑکتے دل سے گائنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہراس چھایا ہوا تھا۔ اس کے برعکس اس کی بیوی پرسکون لگ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے چند لمحات تک رپورٹ دیکھنے میں لگا دیے تھے۔ اس کے سپاٹ تاثرات نوید کو خوفزدہ کیے دے رہے تھے۔

دفعتاً اس نے سر اٹھایا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔

''مبارک ہو نوید صاحب۔ آپ کی مسز امید سے ہیں۔''

وہ یہ خبر تقریباً ہر روز ہی کسی کو سناتی تھی۔ عام طور پر لوگ یہ خبر سن کر خوش ہی ہوا کرتے تھے لیکن نوید کے تاثرات اس کے لیے نئے تھے۔ بالکل نئے اور اچھوتے..... وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس وقت ایک باپ کو محض ایک بچے کی امید نہیں دلا رہی بلکہ اسے ایک ایسے ہم جولی کی امید دلا رہی ہے جس کا پیکر اس نے بچپن سے اپنے خیالوں میں تراشا ہوا تھا۔ اس نے ہر شخص میں اپنے اس ''خیالی پیکر'' کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جب اس کی یہ محرومی کہیں سے دور نہ ہوئی تو اس نے اس کی امید اپنے بچے کی صورت میں ہی لگا لی تھی۔ یہ بچہ اس کے لیے محض ایک بچہ نہ تھا بلکہ اس کا ادھورا سپنا تھا جسے وہ اپنے بچپن سے سینچ رہا تھا۔

گائنی ڈاکٹر کا جملہ سن کر پہلے اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر جاگا تھا جو آہستہ آہستہ خوشی میں بدلنے لگا۔ پھر اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی تو اس کے ہونٹ جیسے تھرا کر رہ گئے۔

''بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحبہ۔'' خوشی سے اس کی آواز اب بھی لرز رہی تھی۔ نسخہ تھامتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی لرز رہے تھے۔ اس سے جیسے خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

''چلو ثوبیہ۔'' وہ لرزاں آواز میں بیوی سے بولا تو وہ بھی شرماتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا مگر جو تاثر نوید کا تھا؛ ایسی خوشی اس نے کبھی کسی مرد کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔

اگلی صبح جب نوید کام پر جانے کے لیے نہیں اٹھا تو ثوبیہ نے اس سے پوچھا۔

''آج آپ آفس نہیں جائیں گے؟''

''نہیں۔'' اس کے چہرے پر پُرسوچ تاثرات تھے۔

''کیوں خیریت، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا...'' وہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشویش سے بولی تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں، فیکٹری بیچ دوں۔'' اس کا جملہ سن کر ثوبیہ ششدر رہ گئی۔ وہ ایسا ہی تھا یکدم بڑے بڑے فیصلے کرنے والا۔ اس کے فیصلے اکثر اسے ایسے ہی حیران کر دیتے تھے۔

''یہ خیال کیوں آپ کے ذہن میں آیا؟'' وہ تحیر زدہ انداز میں بولی۔

''ڈاکٹر نے کہا تھا کہ میں ہر وقت تمہارا خیال رکھوں۔ اب ایسے میں، میں فیکٹری تو نہیں جا سکتا۔ گیا بھی تو تمہاری فکر ستاتی رہے گی۔ کام کیا خاک ہوگا۔'' وہ اسے محبت سے دیکھنے لگا۔

''اوہو، آپ کیوں میری اتنی فکر کرتے ہیں۔ میں کوئی پہلی عورت تو نہیں جو ماں بننے جا رہی ہوں۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

''پہلی عورت نہ سہی، پہلی بار تو ماں بننے لگی ہو نا... ایسے میں، میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ثوبیہ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ گو کہ وہ اسے جانتی تھی کہ وہ ایسے ہی اچانک اور اٹل فیصلے کرنے کا عادی ہے مگر اس کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی صرف اس کی خاطر فیکٹری بیچ کر گھر بیٹھنا چاہتا ہے۔

''میں تنہا کہاں ہوتی ہوں۔ پورا دن تو پاس پڑوس کی عورتوں میں گھری رہتی ہوں۔'' اس بار وہ بولی تو اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

نوید نے اسے چونک کر دیکھا۔ ''کیا تمہیں یہ سب پسند نہیں؟''

''پسند تو ہے، لیکن پرائیویسی بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا... ادھر تو اس کا کوئی تصور ہی نہیں۔'' اس کے لہجے میں تلخی ہنوز برقرار تھی۔ نوید اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ ''تم نے تو پوری زندگی ہی یہاں گزاری ہے پھر بھی.....'' اس کی آنکھوں میں شکوے مچل رہے تھے۔

''ہاں گزاری ہے مگر ضروری تو نہیں باقی ماندہ زندگی بھی یہیں بسر کروں۔'' اس نے سوچتے ہوئے نوید کی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ دکھ کے تاثرات چھائے ہوئے تھے۔ اس کے تاثرات دیکھ کر اس نے اپنی سوچ خود تک ہی محدود رکھنے کا فیصلہ کیا۔

کچھ عرصہ پہلے ہی وہ شہر کے ایک پوش علاقے میں بنی ایک وسیع و عریض کوٹھی میں رہتے تھے۔ یہ کوٹھی نوید کے باپ کی ملکیت تھی جو اس کے بعد نوید ہی کے حصے میں آئی تھی۔ نوید اس کوٹھی میں تنہا رہتا تھا۔ ثوبیہ بیاہ کر اسی کوٹھی میں آئی تھی۔ وہ ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جو اس کی فیکٹری میں پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کرتی تھی۔ وہ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی کوئی ایسی اپسرا نہ تھی مگر اس کے باوجود نوید اس پر بری طرح مرمٹا تھا۔

نوید نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو وہ مشین پر کام کر رہی تھی۔ بجلی گئی ہوئی تھی اور وہ سخت گرمی میں کام میں مگن تھی۔ جب وہ پسینے سے شرابور ہوگئی تو اس نے دوسری عورتوں کی طرح چادر اتار کر رکھ دی۔ ایسے میں اچانک نوید کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر باقی عورتیں تو اسی حلیے میں کام میں مگن رہی تھیں مگر ثوبیہ فوراً چادر کی طرف لپکی تھی۔ وہ چادر اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر پھر سے کام کرنے لگی تھی۔ نوید کی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ وہ اس کے پاس آگیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' وہ یکدم ہی بولا تھا۔

ثوبیہ نے نروس انداز میں اپنا نام بتایا۔ وہ اس کا گریز دیکھ کر اس سے مزید کچھ نہ بولا۔ اس کے جانے کے بعد اس کی حالت دیکھ کر باقی عورتیں ہنسنے لگیں۔

''کیا ہوا، تم لوگ کیوں ہنس رہی ہو؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''تمہارا رنگ تو ایسے ہلدی ہورہا ہے۔ جیسے مالک کے بجائے کسی ببر شیر سے تمہاری ملاقات ہوگئی ہو۔'' ایک عورت نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔

''تمہارے لیے وہ مالک ہوگا۔ میرے لیے وہ صرف ایک غیر مرد ہے۔ مجبوری میں، میں نوکری کرنے تو آگئی ہوں مگر ہرگز نہیں چاہوں گی کہ مالک مجھ سے فری ہونے کی کوشش کرے۔'' وہ خفا لگ رہی تھی۔

''بھئی تمہیں کیسے گارنٹی دیں کہ مالک انتہائی شریف انسان ہے۔ اس نے آج تک کبھی کسی عورت سے فری ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے تم سے بس نام ہی تو پوچھا ہے۔'' وہ بیزاری سے بولی تو ثوبیہ اسے دیکھنے لگی۔

اس موٹے بے ہنگم وجود کے ساتھ کوئی کیسے فری ہوسکتا ہے؟ اس نے اپنی ساتھی عورت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

اس فیکٹری میں مجموعی طور پر دس کے قریب عورتیں کام کرتی تھیں مگر وہ سب کی سب شادی شدہ تھیں۔ ان میں سے بھی بیشتر تو ادھیڑ عمر تھیں۔ ثوبیہ واحد لڑکی تھی جو غیر شادی شدہ ہونے کے علاوہ کم عمر بھی تھی۔ اس کا باپ بھی ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ وہاں اس کا پاؤں ایک مشین میں آگیا تو عمر بھر کی معذوری اس کا مقدر ٹھہری۔ ثوبیہ کی عمر بیس سال تھی۔ وہ اپنے پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس کا بھائی ایک ہی تھا اور اس کی عمر محض دس سال تھی۔ اس کی ماں کی طبیعت بھی ٹھیک نہ رہتی تھی۔ ایسے میں گھر کی ذمے داری اسی کے کاندھوں پر آپڑی۔ وہ میٹرک تک تعلیم حاصل کرچکی تھی لیکن گھر کے قریب کوئی کالج نہ ہونے کی وجہ سے وہ آگے تعلیم جاری نہیں رکھ سکی تھی۔

اسے نوکری کی ضرورت پڑی تو اس کی ایک پڑوسن نے اسے اس فیکٹری میں ملازمت دلوادی۔

اسے یہاں کام کرتے دو ماہ ہونے کو آئے تھے۔ وہ اپنی نوکری سے خوش تھی کہ آج پہلی بار اس کی ملاقات فیکٹری کے مالک سے ہوگئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اتفاقی ٹکراؤ آئندہ نہیں ہوگا مگر اگلے دن اس کے پاؤں سے گویا زمین ہی سرک گئی جب کام پر پہنچتے ہی سپروائزر نے اسے بتایا کہ مالک اس کا اپنے دفتر میں انتظار کررہے ہیں۔

یہ پیغام سن کر دوسری عورتوں کے چہروں پر معنی خیز مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ ان کا انداز دیکھ کر وہ مزید نروس ہوگئی۔

''وہ مجھے کیوں بلا رہے ہیں... مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی؟'' وہ مضطرب انداز میں انگلیاں چٹخانے لگی۔

''یہ تو میں نہیں جانتی وہ آپ کو کیوں بلا رہے ہیں۔ البتہ وہ کہہ رہے تھے کہ جلد از جلد آپ کو بھیج دوں۔'' سپروائزر کا جواب سن کر وہ اپنے دھڑدھڑاتے دل کو سنبھالتے دفتر کی طرف روانہ ہوگئی۔

یہ فیکٹری بنیادی طور پر بچوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں جیسے ٹافیاں، بسکٹس، جیلیز وغیرہ بناتی تھی۔ فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹس کی بلڈنگز الگ الگ تھیں۔

دفتر کے قریب پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔

''کم ان۔'' اندر سے بلند ہونے والی آواز نوید ہی کی تھی۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ نوید ایک وسیع میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھا تھا۔ میز پر فائلز کا انبار لگا تھا۔ اس وقت بھی وہ ایک فائل اٹھائے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر بال گرے ہوئے تھے۔ اس انداز میں وہ انتہائی معصوم لگ رہا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال کے قریب ہی لگ رہی تھی۔

وہ دروازے کے قریب ہی کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ آگے بڑھنے کی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔ نوید نے ابھی تک سر اٹھا کر اسے دیکھا ہی نہ تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر وہ مزید نروس ہونے لگی۔

''دروازہ بند کرو اور اندر آ کر بیٹھ جاؤ۔'' وہ اسی طرح سر جھکائے تحکمانہ انداز میں بولا۔

ثوبیہ مضطربانہ انداز میں انگلیاں چٹخاتے اس کے سامنے آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ کمرے میں اے سی کی خنکی پھیلی ہوئی تھی مگر اس کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔

اس کے بیٹھتے ہی اس نے فائل رکھی اور اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پسینا دیکھ کر اس نے انٹر کام پر دو لیمن جوس لانے کا کہا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''مس ثوبیہ، میں اگر آپ کو اس نوکری سے نکال دوں تو.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔

آج ایک بار پھر اس نے ثوبیہ کو حیران کر دیا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔ نوید دلچسپی سے اس کی حیرانی ملاحظہ کر رہا تھا۔

ثوبیہ اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے اس کے جملے کے مفہوم و وجہ پر غور کرنے لگی۔

'یہ مجھے نوکری سے نکالنے کی دھمکی دے کر اپنا مطلب حاصل کرنا چاہ رہا ہے۔' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ پہلے سے بدگمان تھی، اس لیے ایسا خیال آنا فطری تھا۔ اس نے چند لمحات سوچنے کے بعد گلا کھنکھار کر صاف کیا۔ وہ بولنے ہی لگی تھی کہ اس کے عقب میں دروازہ کھلا۔ ملازم جوس لے کر آیا تھا۔ اس کا گلہ خشک ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں جوس کا گلاس خالی کر دیا۔ جوس پینے کے بعد اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ اب وہ کسی قدر پُراعتماد تھی۔

''آپ مالک ہیں، جب چاہیں نوکری سے نکال سکتے ہیں مگر میرا قصور کیا ہے؟'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

نوید اس کے تاثرات دیکھ کر نرمی سے بولا۔ ''دراصل میں آپ کو کوئی اور نوکری دینا چاہتا ہوں۔''

'ہوں..... تو یہ اس طرح مجھے چارا ڈال رہا ہے۔' اس نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''میں مردوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔'' کچھ سوچ کے وہ سنبھلے تلے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے بولی۔

''مردوں کے ساتھ تو نہیں البتہ ایک مرد کے ساتھ آپ کو کام کرنا پڑے گا۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔

''پھر میری طرف سے معذرت۔ میں مجبوری میں یہ نوکری کر رہی ہوں لیکن میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے میری یا میرے خاندان کی عزت پر حرف آئے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ اسے بہت توہین محسوس ہو رہی تھی۔

نوید کی آنکھوں میں تحیر جاگا۔ ''ارے، آپ سے کس نے کہہ دیا کہ دوسری نوکری سے آپ کی عزت پر حرف آئے گا... دراصل اس جاب سے تو آپ کی عزت میں اضافہ ہی ہوگا۔''

''آپ کھل کر بات کریں گے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

نوید نے تھوک نگلا۔ ''میں اس بھری دنیا میں تنہا رہتا ہوں۔ میرے پاس کوٹھی ہے، گاڑی ہے، بینک بیلنس ہے بس اگر نہیں تو میری تنہائی کا رفیق کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنا رفیق حیات بنانا چاہتا ہوں۔'' وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا تھا۔ ثوبیہ نے اتنی گاڑھی اردو کبھی نہیں سنی تھی۔ اس نے ''رفیق حیات'' کا غلط مطلب ہی نکالا۔ وہ لال بھبوکا چہرے کے ساتھ اٹھی اور اس کی طرف انگلی کرتے ہوئے بولی۔

''میرے پاس غربت ہے، میرے والد معذور ہیں، مجھ پر چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمے داریاں ہیں، لیکن میرے نزدیک سب سے اہم میری عزت ہے۔ جہاں میری عزت خریدی جا رہی ہو وہاں ایک لمحہ بھی کام نہیں کر سکتی۔ میں جا رہی ہوں یہ نوکری چھوڑ کر۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں غصے سے بولی۔ نوید اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ردعمل کی اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کس بات پر اتنا سیخ پا ہو رہی ہے۔

''ارے، آپ اتنا غصہ کیوں کر رہی ہیں۔ میں نے ایسا کچھ غلط نہیں کہا آپ سے۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دروازے کے قریب پہنچ کے پلٹی۔ ''آپ کے لیے کسی کی عزت کی بولی لگانا غلط نہیں ہوگا مگر میرے لیے یہ زندگی موت کا معاملہ ہے۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ کر نوید کو ششدر چھوڑ کر باہر نکل گئی۔

وہ روتی ہوئی جب پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں پہنچی تو.... اس کی حالت دیکھ کر تمام خواتین اپنا اپنا کام چھوڑ کر اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

وہ اپنی جس پڑوسن کی سفارش سے نوکری پر لگی تھی اس سے بولی۔ ''میں جا رہی ہوں گھر۔''

''کیوں نوید باؤ نے کچھ کہا ہے؟ وہ تو بہت شریف آدمی ہیں۔'' نسرین نے تعجب سے کہا۔

''تمہارے لیے شریف ہوں گے وہ۔ میرے لیے تو میری عزت کے لٹیرے ہیں وہ۔'' نسرین کے جملے نے اسے بھڑکا دیا۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں ان کے باپ کے زمانے سے یہاں کام کر رہی ہوں۔ انہوں نے تو کبھی کسی ملازمہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی، بلکہ عورتوں کا ڈیپارٹمنٹ الگ ہی انہوں نے کیا تھا۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ حیرانی تھی۔

''تم موٹیوں کے ساتھ وہ کیا چھیڑ چھاڑ کرتے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولی تو اس کے ایک جملے سے ساری رائے عامہ اس کے خلاف ہوگئی۔

ایک عورت بھڑک کر بولی۔ ''ہم موٹیاں ہیں تو تم کون سا حور پری ہو۔''

''میں نے کب کہا کہ میں حور پری ہوں مگر اس عیاش رئیس زادے نے میری قیمت لگائی ہے۔''

نسرین جھنجلا گئی۔ ''وہ عیاش نہیں ہے۔ وہ انتہائی شریف انسان ہے تم یہ تو بتاؤ اس نے تم سے کہا کیا ہے؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے رفیقِ حیات بنانا چاہتا ہے۔'' وہ بم پھوڑنے والے انداز میں بولی۔ ایک لمحے کے لیے کمرے میں موجود تمام عورتوں کو جیسے سکتہ ہوگیا۔ وہ سب نا سمجھی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ پھر کمرے کے ایک کونے سے ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اسے ہنستے دیکھ کر باقی عورتیں بھی نا سمجھی سے ہنسنے لگیں۔ جس عورت نے قہقہہ بلند کیا تھا وہ اب پیٹ پکڑ کر دہری ہو رہی تھی..... ثوبیہ انہیں اچنبھے سے دیکھنے لگی۔

اس عورت کی ہنسی رکی تو وہ لال سرخ چہرے کے ساتھ بولی۔ ''ارے پگلی.....'' وہ پھر ہنسنے لگی۔ ثوبیہ نے اسے ناگواری سے دیکھا تو وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''ارے پگلی، وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے جیسے بم پھوڑا۔ کمرے میں موجود تمام عورتیں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ وہ خود سکتہ زدہ انداز میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کی نظر کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکتے اپنے عکس پر پڑی۔ وہ انتہائی دبلی پتلی تھی۔ گندمی رنگت کے حامل چہرے پر کوئی چیز قابلِ توجہ تھی تو بس اس کی آنکھیں تھیں۔ بولتی ہوئی آنکھیں.....

اور وہ کہہ رہی تھی کہ فیکٹری کے مالک نے اسے شادی کی آفر کی ہے۔ وہ حیران نہ ہوتی تو کیا کرتی؟

☆☆☆

ثوبیہ نے شادی کے بعد یہ سارا واقعہ اسے سنایا تھا۔ وہ یہ سب سن کر خوب ہنسا تھا۔ آج بھی یہ واقعہ یاد کر کے اس کے لبوں پر پھیکی سے مسکان آگئی تھی۔

''کیا اب میں زندگی بھر کھل کر مسکرا سکوں گا؟'' اس نے سوچا۔ بے اختیار اس کا سر نفی میں ہلا۔

''نہیں، اب بھلا کسی خوشی پر میرا کیا حق۔ میری زندگی میں تو ایک ہی خوشی تھی۔ واحد خوشی..... میرا بیٹا۔ وہ ہو کر بھی اب میرا نہیں رہا۔ اس کے بغیر میرے لیے خوشی کے کیا معنی؟''

اسے یکدم اس گھر سے وحشت ہونے لگی۔ وہ سیڑھیوں سے یکدم اٹھا تو اس کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ اسی چکراتے دماغ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ تیزی سے اس گھر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ جاتے سے اس نے گھر کا گیٹ بند کرنے کا تکلف بھی نہ کیا تھا۔ اب ہوا میں گیٹ کے پٹ جھول رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گیٹ کے پٹ بھی گھر کی ویرانی پر ماتم کناں ہوں۔

☆☆☆

ثوبیہ نے اگلے دن خرابیٔ طبیعت کا بہانہ بنایا اور کام پر ہی نہ گئی۔ شام کو وہ سو رہی تھی کہ ''گھر میں کسی کے بولنے کی'' آواز آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''یہ تو فیکٹری کے مالک نوید کی آواز لگ رہی ہے۔'' وہ حیرانی سے سوچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کچن میں آئی تو اس کی ماں ٹرے میں چائے کے ساتھ کچھ دیگر لوازمات رکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

''امی کوئی آیا ہے؟''

''ہاں تمہاری فیکٹری کا مالک آیا ہے۔'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولی تو ثوبیہ اس سے نظریں چرانے لگی۔

''وہ تمہاری عیادت کرنے آیا ہے۔'' اس کی ماں بولی تو وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ ''فیکٹری کا مالک ایک معمولی ملازمہ کی عیادت کے لیے آیا ہے۔ آخر کیوں؟''

''یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔'' اس کی ماں چائے لے کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔ ثوبیہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ ان کے گھر میں پردے کا رواج تھا۔ وہ اپنے رشتے دار مردوں کے سامنے نہیں جاتی تھی۔ اس لیے نوید کے سامنے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ وہ اس کے باپ کے پاس بیٹھا تھا پھر وہ نوید کے جانے کے بعد ہی باہر نکلی۔

اس کی امی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''کیا ہوا امی، ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟'' وہ ان سے نظریں چرا کر بولی۔

''تم جانتی ہو تمہاری فیکٹری کے مالک نے ہم سے کیا بات کی ہے؟'' ان کا انداز سپاٹ تھا۔

''میں بھلا کیسے جان سکتی ہوں، آپ بتائیں۔'' اس نے دھڑ دھڑاتے دل کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اس نے تمہارے رشتے کی بات کی ہے۔" اس کی ماں نے جیسے کوئی دھماکا کیا۔ گو کہ یہ خبر متوقع تھی مگر اس کے باوجود ثوبیہ کے چہرے پر حیرت پھیلتی چلی گئی۔

"میرا رشتہ......" اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "آپ کو سمجھنے میں غلطی تو نہیں ہوئی۔"

"غلطی کیسے ہو سکتی ہے اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ وہ اکیلا رہتا ہے۔ اس کا کوئی بزرگ نہیں ورنہ وہ خود نہ آتا۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ہم اس کے بارے میں جتنی چھان بین کرنا چاہیں کرا سکتے ہیں۔ وہ پھر آئے گا ہمارا جواب جاننے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ نہ صرف تم سے شادی کرنا چاہتا ہے بلکہ ہمارا بیٹا بن کر رہنا چاہتا ہے۔"

"ابو نے کیا جواب دیا اسے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"وہ کچھ نہیں بولے۔ انہیں تو اس کے سوال سے چپ لگ گئی ہے۔ اس کے جانے کے بعد بھی وہ بالکل گم صم سے ہو کر رہ گئے ہیں۔" ثوبیہ کے چہرے پر شرمندگی جھلکی۔ وہ اپنے باپ کو جانتی تھی۔ حساس تو وہ پہلے بھی تھا مگر معذوری نے اسے ضرورت سے زیادہ ہی زود رنج بنا دیا تھا۔ وہ جوان ہوتی بیٹیوں کا باپ تھا اور ہر وقت ان کے متعلق عدم تحفظ کا شکار رہتا تھا۔ اب بھی ثوبیہ کا خیال تھا کہ وہ نوید کے ساتھ ساتھ ثوبیہ کے متعلق بھی منفی انداز میں سوچ رہا ہے۔

وہ یہ سب سوچتے ہوئے اپنی ماں سے بولی۔ "امی، میرا اس شخص سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ ابو کو یہ سمجھا دیجیے گا۔" اس کی ماں نے اسے بے یقینی سے دیکھا تو وہ کٹ کر رہ گئی۔

"امی، اگلی بار وہ آئے تو..... آپ لوگ اسے رشتے سے انکار کر دینا۔" ماں کا انداز دیکھ کر اسے یہی مناسب لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا دو تو ہو سکتی ہے... اس کا باپ اس رشتے کے لیے ہاں نہیں کرے گا مگر اس کا خیال غلط نکلا۔ اس کے باپ نے اگلے ہی دن اس کا رشتہ نوید سے طے کر دیا تھا۔

ہفتے بھر بعد ہی ان کی سادگی سے شادی ہو گئی۔ نوید نے شادی کا جوڑا اور زیورات خود بھیجے تھے۔ اسے تیار کرنے کے لیے اس نے بیوٹیشن بھی بھیجی تھی۔ تیار ہونے کے بعد اس نے آئینہ دیکھا تو خود کو پہچان ہی نہ پائی تھی۔ اس کی بہنیں بے حد خوش تھیں۔ خوش تو اس کی ماں بھی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی... لیکن اس کے چہرے سے پریشانی ہویدا تھی۔

"ماشاءاللہ میری بیٹی بہت پیاری لگ رہی ہے۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔" وہ اپنے لہجے میں نمی چھپا کر بولی تھی۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ اس کا انداز دیکھ کر ثوبیہ کے دل پر بھی جیسے بھاری پتھر آن گرا۔ دل میں چھپے وسوسے جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے۔

نوید کے ساتھ برات کے طور پر محض فیکٹری کے چند ملازمین ہی آئے تھے۔ اس کے ماں باپ نے فکرمند چہروں اور ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا تھا۔

ثوبیہ نوید کے بارے میں فکرمند تھی مگر شادی کے بعد اس کی ساری فکریں دور ہو گئیں۔ نوید انتہائی محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا تھا۔ اس کے خاندان کی کفالت کا ذمہ بھی اس نے لے لیا تھا۔

شادی کے تیسرے دن ہی وہ اسے ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف لے گیا تھا۔ وہاں وہ اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں رکے تھے۔ ثوبیہ اس ماحول سے ناآشنا تھی اس وجہ سے وہ خوفزدہ رہتی لیکن نوید اسے غیر محسوس انداز میں گائڈ کرتا رہتا، اس کی جھجک آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ ہنی مون پر گزارا گیا یہ ایک مہینا اس کی زندگی کا خوبصورت ترین حصہ تھا۔

ثوبیہ کو یہ ساری زندگی کسی خواب کے مانند لگ رہی تھی۔ وہ خود کو بچپن میں سنی کہانی کے کردار ایلس کی طرح محسوس کرنے لگی جو ونڈر لینڈ میں آ گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی آنکھ کھلے گی تو سب کچھ ہوا ہو چکا ہو گا مگر ہر صبح وہ نوید کو اپنے ساتھ دیکھتی تو اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا۔ نوید اس کا ایسے خیال رکھ رہا تھا جیسے وہ کانچ کی بنی گڑیا ہو۔

وہ پہلے تو اتنی خوبصورت نہ تھی مگر محبت نے اسے انوکھا سا روپ بخشا تھا۔ اب وہ خود کو آئینے میں دیکھتی، تو خود سے نظریں ہٹا ہی نہ پاتی۔ اس نے ایک بار نوید سے پوچھا تھا کہ اس نے اس میں کیا دیکھ کر اس سے شادی کی ہے مگر نوید نے اسے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔

باقی سب تو ٹھیک تھا مگر نوید اسے بہت گہرا اور پراسرار لگتا تھا۔ وہ دنیا بھر کے موضوعات پر اس سے بات کر لیتا۔ اس کے بارے میں، اس کی پسند ناپسند، اس کے ماضی .....غرض ہر چیز کے بارے میں وہ بات کرتا مگر جب بات نوید کی آتی تو یکدم جیسے اسے چپ لگ جاتی۔ ایک ماہ اکٹھا رہنے کے بعد بھی وہ نوید کے ماضی کے متعلق ایک لفظ بھی نہ جان سکی تھی۔

ہنی مون کے بعد وہ لوٹے تو وہ میکے چلی گئی۔ اسے خوش باش دیکھ کر اس کے گھر والوں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ نوید اسے میکے خود چھوڑنے آیا تھا۔ تیسرے دن نوید اسے لینے آیا تو وہ اس کے ساتھ واپس گھر آ گئی۔

نوید فیکٹری جانے لگا۔ اس کے جانے کے بعد ثوبیہ نے

وی کے آگے بیٹھ جاتی۔ اسے ڈرامے دیکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اسے تو اپنی زندگی بھی ڈراموں کے کرداروں کی طرح لگتی تھی جو اتنی تیزی سے بدل گئی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بھی کبھی ایسے ''بیگم صاحبہ'' بن کر اتنے بڑے گھر میں گھوما پھرا کرے گی۔ ڈراموں کے کرداروں جیسے قیمتی لباس زیب تن کرے گی۔ نت نئے کاسمیٹکس اس کے ڈریسنگ ٹیبل پر دھرے ہوں گے، جن کے استعمال تک سے وہ ناواقف تھی۔

شروع شروع میں اس نئے ماحول نے اسے احساسِ کمتری کا شکار کردیا تھا۔ اسے خوف تھا کہ وہ نوید کے سرکل میں کیسے ''موو'' کرے گی لیکن نوید کی تنہائی پسند طبیعت کی وجہ سے اسے کسی سے ملنا ہی نہیں پڑتا تھا۔ اس نے ثوبیہ کے پوچھنے کے باوجود نہ کبھی اسے اپنے کسی رشتے دار کے بارے میں بتایا تھا اور نہ ہی کبھی کسی پڑوسی سے ملوایا تھا۔ بس ہفتے میں ایک آدھ بار وہ اسے باہر گھومنے پھرنے یا شاپنگ کے لیے لے جاتا۔ اس کے باوجود اسے احساس تھا کہ وہ نوید کے قابل نہ تھی۔ وہ خود کو جلد از جلد اس کے قابل بنانا چاہتی تھی۔

گھر میں دو میاں بیوی ملازم تھے جو ساتھ ہی بنے سرونٹ کوارٹر میں رہائش پذیر تھے۔ مرد گیٹ سنبھالنے کے علاوہ باہر کے کام کاج سنبھالتا تھا جبکہ عورت گھر کا کام کاج کرتی تھی۔ کسی سے میل جول تھا نہیں، ڈرامے وہ آخر کتنی دیر دیکھتی۔ وہ بور ہونے لگی۔ اس نے ایک دن نوید سے اپنی بوریت کا ذکر کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر گہری سوچ میں غرق رہنے کے بعد بولا۔

''بات تو تمہاری ٹھیک ہے، یہاں کا ماحول تمہارے علاقے سے بہت مختلف ہے، بہرحال جلد ہی تمہارے اس مسئلے کا کچھ حل نکالتے ہیں۔'' وہ آخر میں عجیب سے انداز میں مسکرایا تھا۔ ثوبیہ کا دل ہولنے لگا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اس نے شکایت کا بُرا مانا ہے۔ وہ شکایت کر کے پچھتانے لگی مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اس کا خیال رکھتا تھا۔ قدم قدم پر اس کی راہنمائی کرتا تھا۔ آج تک اس نے کبھی اسے غصے سے دیکھا تک نہ تھا مگر اس کے باوجود اس میں کوئی عجیب سی چیز تھی، جس کی وجہ سے وہ اس سے خوفزدہ رہتی تھی۔

تین دن بعد ہی نوید فیکٹری سے جلدی لوٹ آیا۔ آتے ہی اس نے ثوبیہ سے تیار ہونے کا کہا۔

''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' ثوبیہ نے اٹھلا کر کہا۔

''تم چلو تو سہی، پتا لگ جائے گا تمہیں۔'' وہ خوش لگ رہا تھا مگر اس کے باوجود ثوبیہ کو اس کے رویے میں کوئی عجیب سی بات محسوس ہوئی۔

خیر وہ تیار ہو کر باہر آئی تو نوید اسے لے کر چل پڑا۔ اس کی گاڑی کا رخ ثوبیہ کے میکے کی طرف تھا۔ اپنے میکے کی طرف گاڑی مڑتے دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ وہ ان دنوں گھر والوں کو بہت مس کرنے لگی تھی۔ وہ ان سے ملنے جانا چاہتی تھی مگر ابھی تک اسے نوید سے جھجک ہوتی تھی۔ اس جھجک کے باعث وہ اس سے میکے جانے کی فرمائش نہیں کرسکی تھی مگر لگتا تھا کہ آج اسے خود خیال آ گیا ہے۔

ثوبیہ نے نوید کی طرف دیکھا۔ وہ مگن سے انداز میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس لمحے ثوبیہ کو بہت ٹوٹ کر اس پر پیار آیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگی کہ اسے نوید جیسا شوہر ملا۔

گاڑی ان کے محلے میں داخل ہوتے ہی ایک دو منزلہ مکان کے سامنے رک گئی۔ نوید گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔

''آجاؤ۔''

ثوبیہ بھی الجھتے ہوئے گاڑی سے اتر آئی۔ نوید گیٹ کھول کے اندر داخل ہوگیا۔ اس کے انداز میں استحقاق تھا۔ ثوبیہ باہر ہی کھڑی گھر کو دیکھ رہی تھی۔ گھر نیا تعمیر شدہ لگ رہا تھا اور یہ اس گلی کیا بلکہ شاید اس محلے کا سب سے شاندار مکان تھا۔

نوید گیٹ میں کھڑے ہو کر اسے پکارنے لگا۔ ''آجاؤ نا...'' وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔

''یہ کس کا گھر ہے؟'' اس کی آواز میں انجانے خدشے لرز رہے تھے۔ نوید اسے بغور دیکھنے لگا۔

''تم اتنے بڑے گھر میں بور ہو جاتی تھیں، دوسرے علاقے کا ماحول بھی تمہارے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ گھر تمہارے لیے لیا ہے۔ اب ہم یہیں رہیں گے۔ یہاں نہ تمہیں تنہائی ستائے گی اور نہ ہی بوریت کا احساس ہوگا۔'' وہ نرمی سے کہتا چلا گیا تھا۔

ثوبیہ ہکا بکا رہ گئی۔ اگر کچھ عرصہ پہلے اسے یہ گھر ملتا تو وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی مگر چند دن ہی سہی ایک وسیع و عریض کوٹھی میں رہنے کے بعد یہ گھر اسے بہت چھوٹا لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ''بیگم صاحبہ'' کے رتبے سے گر کر ''ثوبیہ'' کے رتبے پر فائز ہوگئی ہے۔

وہ نوید سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ وہاں..... اس بڑے گھر میں خوش ہے مگر نوید کے چہرے پر چھائی خوشی دیکھ کر اسے ہمت ہی نہ ہوئی کہ وہ اس سے اس بابت بات کرتی۔

اگلے ہی دن انہوں نے اپنا سامان اس نئے گھر میں شفٹ کرلیا تھا۔ پرانے گھر کے دونوں ملازم بھی یہیں شفٹ

ہو گئے تھے۔ اس علاقے کا ماحول ثوبیہ کا دیکھا بھالا تھا۔ سب سے بڑی بات اس کا میکا قریب تھا۔ وہ جب چاہے اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے ان کے گھر جا سکتی تھی۔

چند دن اس گھر میں گزارنے کے بعد وہ سوچنے لگی کہ کسی طرح نوید کو واپس کوٹھی میں منتقلی پر راضی کرے گی۔

ایک دن نوید کا موڈ معمول سے زیادہ خوشگوار دیکھ کر وہ بولی۔ ''جب سے ہم نئے گھر میں شفٹ ہوئے ہیں پرانے کو تو بھول ہی گئے ہیں۔ کیا خیال ہے کسی دن ادھر سے نہ ہو آئیں؟ ویسے بھی گھر زیادہ عرصہ بند رہے تو سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔'' اس نے اپنے خیال میں انتہائی سبھاؤ سے بات کی تھی مگر نوید کا جواب اسے حیران کر گیا تھا۔

''تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔ وہ گھر تو میں نے بیچ دیا ہے۔'' وہ ہلکا سا مسکرا کر بولا تھا۔ وہ شاکڈ رہ گئی۔ بڑی مشکل سے وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''آپ نے مجھے بتایا نہیں۔'' اس کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔

''کیا بتاتا بھئی، تمہیں کون سا وہ گھر پسند تھا، یا اس گھر سے تمہاری کوئی یادیں وابستہ تھیں۔'' وہ دھیرے سے مسکرا کر بولا تھا۔

''ایسے تو نہ کہیں، اس گھر میں ہی تو میں بیاہ کر گئی تھی، اس گھر کو میں بھلا کبھی بھول سکتی ہوں۔'' وہ اداسی سے بولی تھی۔

''اوہ، آئی ایم سوری جان! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ گھر تمہارے لیے اتنی اہمیت رکھتا ہے۔'' اس کے لہجے میں حقیقی شرمندگی تھی۔ ثوبیہ اسے شرمندہ دیکھ کر جلدی سے بولی۔

''کوئی بات نہیں۔ وہ گھر نہ سہی آپ تو میرے ساتھ ہیں نا ہمہ۔''

تو یہ تھا نوید..... اس کا وجود محبت اور خیال کی مٹی سے گندھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کی بوریت کے پیش نظر وہ گھر بیچ دیا تھا جس میں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ وہ علاقہ چھوڑ دیا تھا جہاں اس نے عمر گزاری تھی۔ اس کے برعکس اس نے اپنی بیوی کی خوشی کی خاطر ایک متوسط علاقے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی بیوی تو خوش نہ ہوئی تھی مگر وہ اس علاقے میں شفٹ ہونے کے بعد انتہائی خوش تھا۔ یہاں پڑوسی ایک دوسرے سے باخبر رہتے تھے۔ سب ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔

آج جب نوید نے فیکٹری بیچنے کی بات کی تو ثوبیہ حیران رہ گئی تھی۔ اس نے نوید کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''آپ میری فکر نہ کریں، میں فوزیہ کو بلا لوں گی۔'' اس نے اپنی بہن کا نام لیا۔

''کیوں بھئی تم نہیں چاہتیں کہ میں ہر وقت تمہارے آس پاس موجود رہوں۔؟'' وہ خفا سے انداز میں بولا۔

''نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ نوید مزید خفا نظر آنے لگا۔

''آپ جب کام پر گئے ہوتے ہیں تو آپ کے انتظار میں مجھے بڑا لطف محسوس ہوتا ہے۔ آپ کی واپسی پر مجھے بے پناہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اس خوشی سے محروم ہو جاؤں؟'' آخر میں وہ اپنی آواز میں محبت بھر کے معصومیت سے بولی تھی۔

نوید سوچ میں پڑ گیا۔ ''بات تو تمہاری ٹھیک ہے، مگر مجھے تمہاری بہت فکر رہے گی۔'' یہ فکرمندی اس کی محبت کا ایک انداز تھی مگر ثوبیہ اب اس سے کسی قدر چڑنے لگی تھی۔ اس کے فیکٹری بیچنے کا سن کر تو وہ ہول اٹھی تھی۔ بڑے طریقے سے اس نے نوید کو فیکٹری بیچنے سے باز رکھا تھا۔

اگلے دن ہی اس نے اپنی بہن کو بلا لیا۔ وہ ہمہ وقت اس کے پاس رہتی۔ نوید کسی قدر مطمئن ہو گیا۔ ثوبیہ اس کی فکرمندی، اس کی تشویش دیکھ کر حیران ہوتی رہتی۔ اسے اس تشویش میں خوف چھپا محسوس ہوتا۔

ایک دن اس نے اس بارے میں نوید سے استفسار کر ہی لیا۔ ''آپ میری اتنی فکر کیوں کرتے ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ اس فکر کے پیچھے بھی کوئی خوف ہے۔''

''ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''میں واقعی خوفزدہ ہوں۔ مجھے اپنے مقدر سے ڈر لگتا ہے۔''

''مقدر سے؟'' وہ بھویں اچکا کر حیرت سے بولی۔

''آپ تو بہت مقدر والے ہیں۔ ایسا کیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ میں تو دعا کرتی ہوں کہ اللہ ہر ایک کا مقدر آپ جیسا کرے۔''

وہ ایک دم جیسے تڑپ گیا۔ ''خدا کے لیے ایسی دعا نہ کرنا۔ تم نہیں جانتی ہو یہ دعا نہیں بددعا ہے۔''

اس کے چہرے سے جیسے خون نچڑ گیا تھا۔ وہ اس کے ایک جملے سے ہی انتہائی خوفزدہ نظر آنے لگا تھا۔ ثوبیہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ اس کے تاثرات دیکھ کر چونکا۔ اگلے ہی پل وہ نارمل ہو کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

''تم نے بچے کا نام سوچا؟'' بچے کا ذکر کرتے ہی اس کے چہرے پر الگ سے تاثرات چھا جاتے تھے۔ بچے سے متعلق اس کی محبت، اس کی وارفتگی دیکھ کر ثوبیہ حیران ہوتی رہتی۔

''ابھی تو بہت وقت ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، نام کے اثرات ہوتے ہیں

شخصیت پر؟'' وہ سنجیدہ ہی رہا۔

''یقیناً، میرے خیال میں تو انسان کا جیسا نام ہوتا ہے ویسی ہی اس کی شخصیت ہوتی ہے۔'' وہ وثوق سے بولی۔

''اچھا، میں تو اسم بامسمّیٰ نہیں۔ مجھے تو کبھی خوشی راس ہی نہیں آئی۔'' اس کے لہجے میں عجیب سا حزن تھا۔

ثوبیہ کو دکھ سا ہوا۔ ''آپ اسم بامسمّیٰ ہیں، آپ سب کے لیے باعثِ نوید ہی ہیں۔ میری زندگی میں آپ نہ آتے تو شاید ساری زندگی مجھ سے خوشیاں روٹھی رہتیں۔ آپ کے آتے ہی میرے پورے خاندان کے دکھ خوشیوں میں بدل گئے۔ آپ کو پھر بھی اپنے نام سے شکایات ہیں؟'' آخر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں شکوہ در آیا۔

''تمہیں تو وکیل ہونا چاہیے تھا۔ تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر تم نے تو مجھے قائل ہی کرلیا۔'' وہ کھل کر مسکرایا۔

''مجھے لڑکے کے لیے اسد نام بہت پسند ہے۔'' اس کا کھویا کھویا انداز دیکھ کر نوید کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔

''آج کل کی لڑکیوں کو تو ''یونیک'' سے نام پسند ہوتے ہیں، اسے اسد جیسا ''بیک ورڈ'' نام کیوں پسند ہے؟'' بے اختیار اس کے ذہن میں ایک خیال سرسرایا۔ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا نہ وہ اس سے پوچھ کر اپنی ازدواجی زندگی میں شک کی گنجائش بھر سکتا تھا، تاہم وہ اپنی اولاد کا نام تو خود سے رکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

جوں جوں ڈلیوری کا وقت قریب آتا جارہا تھا، نوید کے خوف میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر اکثر ثوبیہ ہنسنے لگتی۔

''آپ تو ایسے خوفزدہ ہورہے ہیں جیسے بچہ آپ کے بطن سے پیدا ہوگا۔'' ثوبیہ ہنسنے لگا۔

''تم خوفزدہ نہیں ہو؟'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگا۔

''نہیں..... میں کوئی پہلی عورت تو نہیں جو ماں بننے والی ہوں۔ ویسے بھی آپ جیسا خیال رکھنے والا شوہر ہو تو خوفزدہ ہونے کی کیا ضرورت۔'' اس کی آنکھوں میں محبت بھرا مان تھا۔

''پتا نہیں کیوں، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' نوید بے بسی سے بولا۔ وہ اکثر اس خوف کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ ثوبیہ کو لگتا تھا کہ اس خوف کی جڑ دور کہیں ماضی میں پیوست ہے۔ وہ جب بھی اس بارے میں پوچھتی، وہ یکدم ہی اپنے خول میں بند ہوجاتا۔

اس دن وہ گھر آیا تو اس کی سالی فوزیہ چھوٹے سے لان میں بیٹھی کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے سلام کا جواب دے کر وہ اس سے ثوبیہ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

''باجی، اپنے کمرے میں سو رہی ہیں۔'' وہ اس کا جواب سن کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ واش روم کی لائٹ روشن تھی اور اندر سے پانی کے گرنے کی آواز آرہی تھی۔

''لگتا ہے وہ غسل کررہی ہے۔'' نوید نے اندازہ لگایا۔ جوتے اتارنے کے بعد وہ بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔ اس کے پردۂ تصور میں آج کل ہر وقت بچے کی قلقاریاں گونجا کرتی تھیں۔ اس بچے کے متعلق اس کے ذہن میں بہت سے خواب تھے۔

کافی دیر بعد وہ یکدم چونکا۔ شاور سے ابھی تک پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ حیران ہوا۔ اس نے ثوبیہ کو آواز دی۔ وہ جانتا تھا کہ ثوبیہ غسل کرتے ہوئے بولتی نہیں۔ وہ انتظار کرنے لگا۔

اس نے غور کیا۔ شاور سے پانی ایک ہی لے میں بہہ رہا تھا۔ اگر وہ غسل کررہی ہوتی تو آواز کی لے تو تبدیل ہوتی۔ اس نے سوچا۔

اچانک خوف سے اس کا چہرہ پیلا پڑنے لگا۔ وہ لرزتے قدموں سے واش روم کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ دروازہ بجانے لگا۔ ساتھ ہی وہ ثوبیہ کو بلند آواز میں پکار بھی رہا تھا۔ اس کا شور سن کر دونوں ملازمین اور اس کی سالی بھی پہنچ آگئے۔ ان کے چہرے پر بھی تشویش چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ توڑ کر دیکھا تو ثوبیہ فرش پر بے ہوش حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

ثوبیہ کو اس حالت میں دیکھ کر نوید کی ٹانگوں نے اس کا وزن سہارنے سے انکار کردیا۔ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔ چوکیدار نے مڑ کر اسے دیکھا۔ نوید فرش پر چت پڑا تھا۔

☆☆☆

آخر وہی ہوا تھا جس کا اسے ڈر تھا۔ ماضی کے آسیب نے اس کا پیچھا ابھی تک چھوڑا نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنی عزیز از جان ہستی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری پوری نہیں کرسکا تھا۔

ثوبیہ کا خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دوسری طرف وہ اکیلی نہیں تھی، اس کے وجود کے اندر ایک اور وجود پرورش پا رہا تھا۔ ڈاکٹرز دونوں کو بچانے کی کوشش میں مصروف کار تھے۔

نوید جلد ہی ہوش میں آگیا تھا۔ ڈاکٹرز نے اس سے ثوبیہ کے آپریشن کی اجازت طلب کی تھی۔ اس نے اجازت تو دے دی تھی مگر وہ مایوس ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ماضی

یہاں پہلے سے بھی بدترین انداز میں خود کو دہرائے گا۔

وہ سر جھکائے ویٹنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی نظر اپنی ساس اور سسر پر پڑی۔ اس کے سسر بیساکھی کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے اسی کی طرف آرہے تھے۔ ان کی بیوی بے چینی سے ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں ہراس تھا۔ اس کے پاس پہنچتے ہی اس کے سسر بولے۔ ''کہاں ہے ثوبیہ، کیسی ہے اب وہ؟'' ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

نوید نے خاموشی سے آپریشن روم کی طرف دیکھا۔ ان کی نظریں بھی، اس کی نظروں کے تعاقب میں گھومیں۔ آپریشن روم پر نظر پڑتے ہی ان کی نظروں میں چھائے خوف میں مزید اضافہ ہوگیا۔ وہ دونوں اس کے پاس بنچ پر بیٹھ گئے۔

انہیں ادھر بیٹھے جانے کتنے لمحات بیت گئے۔ اچانک آپریشن روم کا دروازہ کھلا۔ اس کی ساس اور سسر یکدم اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ مایوسی سے بیٹھا رہا۔ اسے یقین تھا کہ مقدر اس بار بھی اس سے سب چھین کرلے گیا ہے، اس لیے جب ڈاکٹر آپریشن روم سے چہرے پر افسردہ تاثرات سجائے برآمد ہوا تو اس کے احساسات میں ذرہ بھر بھی جنبش نہ ہوئی۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ اندر سے مرچکا ہے۔

''آئی ایم سوری، ہم باوجود کوشش کے انہیں نہیں بچا سکے۔'' نوید نے سوچا..... اب ڈاکٹر ہی کچھ کہے گا مگر ڈاکٹر کا جملہ سن کر وہ چونک گیا۔ اس بار اس جملے میں کچھ مختلف تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ جو کچھ سن رہا ہے وہ حقیقت ہے۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ ڈاکٹر اسے تسلی دیتے ہوئے اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ وہ بے یقینی سے آپریشن تھیٹر کے بند دروازے کو گھورنے لگا۔

کچھ ہی دیر میں وہاں سے ایک نرس نمودار ہوئی۔ اس نے گود میں ایک بچہ اٹھایا ہوا تھا۔ وہ بچے کو لے کر اس کے پاس آئی۔ ''مبارک ہو۔'' وہ افسردہ انداز میں مسکرائی۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے بچے کو اٹھایا۔ اس کی پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے لرز رہی تھیں، لیکن وہ مرد تھا، ایسے کیسے اپنے آنسوؤں کو کھلی چھوٹ دے سکتا تھا۔

اس کی آنکھوں کے آگے سے آنسوؤں کا غبار چھٹا تو اس کی نظر بچے پر پڑی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اپنے بچپن کی تصویر دیکھ رہا ہو۔ بچہ ہو بہو اس کا پرتو تھا۔ اس کے دل میں بچے کے لیے بے تحاشا محبت امڈ آئی۔ وہ اسے بے اختیار چومنے لگا۔ کچھ دیر پہلے وہ خود کو مردہ محسوس کررہا تھا مگر اس بچے نے یکدم ہی اسے جیسے دوبارہ زندہ کردیا تھا۔

''میں زندگی میں جن چیزوں سے محروم رہا، وہ تمہیں ضرور ملیں گی میرے بچے اور مجھے جو محرومیاں ملیں وہ میں تمہیں نہیں ہونے دوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' وہ زیر لب اپنے بچے سے مخاطب تھا۔

☆☆☆

وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے بہت دور پہنچ گیا تھا۔ اس کی نظر ایک ویران اور اندھیری عمارت پر پڑی۔ وہ چونک گیا۔

اسد اپنے دوسری بار کے غیاب کے بعد اسے یہیں سے ملا تھا۔ اس بار وہ چلتے چلتے بہت دور نکل آیا تھا۔ نوید اسے محلے میں ڈھونڈ رہا تھا۔ محلے والے بھی اس کے ساتھ تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ رات دس بجے اس کا سیل فون بجا۔ اسکرین پر ''مائی سن'' کا چمکتا نام دیکھ کر

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں

جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1500 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 12000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 11000 روپے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں

رابطہ

مرزا ثمر عباس: 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر سید منیر حسین: 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی

مین کورنگی روڈ۔ کراچی

اس کا دورانِ خون تیز ہوگیا۔ اس نے فوراً کال ریسیو کی۔

''کہاں ہو میرے بچے! میں کتنے گھنٹوں سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ تم نے اپنا نمبر بھی بند کر رکھا تھا۔'' اسد کے ہیلو کہتے ہی وہ شروع ہوگیا تھا۔

''پاپا..... میں بہت دور نکل آیا ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میرے پاؤں میں موچ آگئی ہے، مجھ سے چلا بھی نہیں جا رہا۔'' اس کی روہانسی آواز سن کر اس کے دل پر چرکا سا لگا۔

''کہاں ہو میری جان! میں ابھی آجاتا ہوں۔'' وہ بے چینی سے بولا۔

''پتا نہیں پاپا..... میں چلتے چلتے جانے کہاں پہنچ گیا ہوں۔ یہ ایک ویران سی عمارت ہے۔ کافی دور تک کوئی آبادی نہیں۔ بہت اندھیرا ہے پاپا ادھر..... پلیز..... جلدی آئیں۔'' وہ سسکنے لگا۔

اس کی بے بسی نوید کی آنکھیں بھی نم کر گئی۔ وہ اپنے پڑوسیوں کی طرف مڑا۔ ''وہ اسی علاقے میں کسی ویران عمارت کے پاس ہے، اس سے چلا بھی نہیں جا رہا۔'' اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر ایک پڑوسی فوراً بولا۔

''ویران عمارت؟ ایسی عمارت تو شہر بھر میں ایک ہی ہے۔ پتھروں سے بنی ہوئی ہے اور بھاری بھرکم سیاہ گیٹ ہے اس کا، مگر وہ تو خاصی دور ہے یہاں سے۔''

اس دن اس نے اپنی زندگی کی سب سے تیز رفتار ڈرائیو کی تھی۔ عمارت کے آگے پڑا ہوا وجود دیکھ کر اس کا دل ہول گیا تھا۔ وہ چیختا ہوا اس کی طرف لپکا تھا۔

آج پھر وہ اس عمارت کے سامنے موجود تھا۔ اس نے عمارت کے قریب گاڑی روک لی مگر آج اسد وہاں موجود نہیں تھا۔

گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند ہوتے ہی اسے اندھیرے اور ویرانی کا شدید احساس ہوا۔ وہ یک ٹک تاریکی کے لباس میں ملبوس عمارت کو دیکھنے لگا۔

اسے اس عمارت کو دیکھ کر ایک عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے گاڑی کی اندرونی لائٹس بھی بند کر دیں۔ اب چار سُو گہری تاریکی پھیلی تھی۔

''آہ، میرا اسد، وہ کتنا ڈرتا ہے تاریکی سے..... وہ ایک بار پہلے بھی یہاں کی ویرانی اور تنہائی سہہ چکا ہے۔''

☆☆☆

ثوبیہ کی تدفین رات ہی کو کر دی گئی تھی۔ اپنی محبوب بیوی کو لحد میں اتارتے ہوئے وہ دکھی تو تھا مگر دکھ کے اس بیچ سے خوشی کی ایک کونپل کھلی تھی۔ اس کے بیٹے کی صورت میں..... اپنے بیٹے کی شکل ذہن میں آتے ہی اس کا دل جیسے خوشی سے بھر جاتا۔ تدفین کی مصروفیات کی وجہ سے وہ اس سے دور تھا۔

لوگوں کے رخصت ہوتے ہی، اس نے اپنی ساس سے بیٹے کے متعلق استفسار کیا۔

''وہ فوزیہ کے پاس ہے۔'' اپنی ساس کا جواب سنتے ہی وہ فوزیہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی اسے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ وہ تڑپ اٹھا۔

اس نے تیزی سے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلنے کی آواز سے فوزیہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ وہ شاید سو رہی تھی۔ نوید نے اپنے بیٹے کو اٹھا لیا۔ وہ اسے اٹھائے کمرے سے نکل رہا تھا کہ اسے فوزیہ کی آواز سنائی دی۔

''اسے میرے پاس رہنے دیں۔ آپ اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکیں گے۔''

وہ بھڑک کر مڑا۔ ''اس دنیا میں کوئی بھی شخص میرے بیٹے کی مجھ سے بہتر دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔'' وہ غراتے ہوئے بولا۔ فوزیہ اس کے انداز سے خوفزدہ ہوگئی۔

یہ پوری رات اس نے جاگتے ہوئے گزاری تھی۔ اس کا بیٹا جوں ہی ذرا سا کسمساتا، وہ بے چین ہو جاتا۔ وہ اسے فیڈر میں دودھ دیتا تو وہ یکدم جیسے ساکت ہو جاتا۔ وہ اس کی ایک ایک ادا نوٹ کر رہا تھا۔

اس کے دل میں اپنے بیٹے کی محبت کا سمندر موجزن تھا۔ آج اس کے سپنوں نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔

ایک دن پہلے تک اس بیڈ روم میں اس کی بیوی اس کی رفیق ہوتی تھی۔ آج وہ اپنی نشانی اس کے حوالے کر کے بہت دور جا چکی تھی۔

کیا تھا اگر میرا بیٹا بھی میرے جیسا نصیب نہ لے کر اس دنیا میں آتا۔ یہ خیال آتے ہی اداسی نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس اداسی میں پچھتاوے چھپے تھے۔

☆☆☆

سوئم کے بعد وہ لان میں اپنی ساس اور سسر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا بیٹا اس کی گود میں تھا۔ اسد کے نام سے سب سے پہلے اسے فوزیہ نے ہی پکارا تھا۔ نوید کو چونکتے دیکھ کر وہ بولی تھی۔

''باجی نے آپ کو بتایا تو ہوگا کہ وہ اپنے بیٹے کا نام اسد رکھنا چاہتی تھیں۔''

''ہاں، مگر میں اس کا نام کچھ اور رکھنا چاہتا ہوں۔'' اس کا انداز سپاٹ تھا۔

''باجی تو چلی گئی ہیں..... کیا ان کے جانے کے بعد

آپ ان کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا وجود تو محبت کی مٹی سے گندھا تھا۔ وہ کسی کو بھی تکلیف... نہیں دے سکتا تھا۔

''پلیز، روؤ مت۔ تم کہتی ہو تو اس کا نام اسد ہی رکھ دیتے ہیں۔'' فوزیہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ اسد سے بے حد پیار کرتی تھی۔ آج وہ اس کا نام اسد رکھنے پر پچھتا رہا تھا۔ کچھ بھی تھا مجھے اس کا نام خوش بخت رکھنا چاہیے تھا، کیا پتا اس کے نام سے ہی سیاہ بختی کے سائے اس سے ٹل جاتے۔ اس نے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگائے آزردگی سے سوچا۔

نوید ان تین دنوں میں مہمانوں کی آمد و رفت کی وجہ سے مصروف رہتا تھا۔ اس لیے دن بھر فوزیہ ہی اس کی دیکھ بھال کرتی۔ البتہ رات کو وہ ہوتا تھا اور اسد..... اسد کی رفاقت میں اس کی نیند ہی اڑ جاتی تھی، وہ کئی کئی گھنٹے اسے سوتا دیکھتا رہتا۔ سوتے ہوئے اسد کے لبوں پر موہوم سی مسکراہٹ نمودار ہوتی تو نوید کے دل میں بھی جیسے کلی سی چٹختی۔

تیسرے دن پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ صبح سے اسد اسی کے پاس تھا۔ فوزیہ نے کئی بار اس سے، اسد کو لینے کی کوشش کی مگر اس نے نرمی سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اسے گود میں بٹھائے اس سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کی ساس بولیں۔

''ہم آج گھر جا رہے ہیں۔'' ان کے لہجے میں افسردگی تھی۔ نوید نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''چند دن اور رک جائیں نا...'' اس نے رسمی لہجے میں کہا۔

''چند دن رکنے سے کیا فائدہ، جانا تو ایک دن ہے ہی۔'' ان کی آواز میں نمی گھلنے لگی۔ وہ دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کر کے بولیں۔ ''تم نے ثوبیہ کا بہت خیال رکھا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، مگر خدا کو شاید یہی منظور تھا۔'' وہ انہیں تعجب سے دیکھتا رہا۔

''جانے والی تو چلی گئی ہے مگر تمہارے کندھوں پر ایک ننھے وجود کی ذمہ داری چھوڑ گئی ہے۔ یہ تمہارے اکیلے کے بس کی بات نہیں سو میری مانو تو شادی کر لو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے ہوئے بولیں۔

''آپ فکر نہ کریں، میں اسے اکیلے سنبھال لوں گا۔'' غصہ آ گیا تھا مگر وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''کیسے؟ کل کو تمہیں کام پر بھی جانا ہوگا، گھر گرہستی اور بچوں کی ذمے داریاں تو عورتیں ہی بہتر طور پر ادا کر سکتی ہیں۔'' وہ رسان سے بولیں۔

لاجواب

بعض بچے بھی بڑے ذہین ہوتے ہیں۔
ماں نے اپنے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
''بیٹا! ہمیشہ سچ بولنا چاہیے کیونکہ سانچ کو آنچ نہیں۔''
بچے نے کہا۔ ''امی آپ بھی سچ سچ بتا دیں کہ کل ابو جو مٹھائی کا ڈبا لے کر آئے تھے وہ آپ نے کہاں رکھا ہے؟''

مرسلہ: ریاض حسین..... لیاقت پور

''آپ فکر نہ کریں۔ میں فیکٹری بیچ دوں گا۔ میری زندگی کا اب ہر لمحہ میرے بیٹے کے نام ہے۔'' اس نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے ادا کیا۔ وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

کیا ہر باپ کو اپنی اولاد سے اتنی ہی شدید محبت ہوتی ہے؟ نہیں۔ اس کے ذہن نے فوراً جواب تلاش لیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ساری زندگی محبت کو ترستے ہوئے نہ گزار دیتا۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد اسے اپنی محرومی یاد آئی تھی۔ اسد سکون سے لیٹا ہوا تھا، وہ بھی چت لیٹا چھت کو گھورنے لگا۔ اس کے ذہن میں یادوں کی ریل چل پڑی تھی۔

☆☆☆

اس کے ذہن میں اپنے بچپن کا جو سب سے پہلا عکس محفوظ تھا، وہ اس کی تین سال کی عمر کا تھا۔ اس کے پاپا اسے ایک پارک میں جھولے جھلا رہے تھے۔ اس کی ماما بھی اس کے ساتھ تھیں، مگر وہ ہر دم اپنے پاپا کے ساتھ رہنا پسند کرتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اپنے پاپا کو ایک لمحے کے لیے بھی خود سے دور جانے ہی نہ دیتا۔

جب وہ صبح بیدار ہوتا تو اپنی ماما کو پاس پاتا۔ وہ معصومیت سے سوال کرتا۔ ''پاپا کہاں گئے ہیں؟''

''بیٹا وہ کام پر گئے ہیں۔'' ماما پیار سے اس کا گال سہلاتے ہوئے جواب دیتیں۔

''وہ مجھے چھوڑ کر کام پر کیوں جاتے ہیں؟'' وہ ٹھنکتا۔

''بیٹا، وہ کام پر جاتے ہیں تو انہیں پیسے ملتے ہیں۔ وہ ان پیسوں سے آپ کے لیے چیز لاتے ہیں، کھلونے لاتے ہیں، کپڑے لاتے ہیں۔ آپ ان سب چیزوں کے بغیر رہ سکتے ہیں؟''

''بغیر رہنا کیا ہوتا ہے؟'' اسے اس ساری بات میں ایک

ہی لفظ کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اس نے معصومیت سے پوچھا تو اس کی ماما کا چہرہ لمحے بھر کے لیے تاریک پڑ گیا۔ یہ سوال پوچھتے وقت وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ زندگی میں اگر وہ سب سے اچھا کسی لفظ کا مفہوم جان پائے گا تو وہ لفظ ''بغیر رہنا'' ہی ہے۔

اس کی ماما اس کا معصوم سوال سن کر سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

''ابھی آپ کے پاپا ہمارے پاس نہیں نا... تو ہم ان کے بغیر رہ رہے ہیں۔'' وہ رسان سے بولی تھیں۔

شام کو پاپا بہت دیر سے گھر آتے تھے۔ وہ ان کے انتظار میں جاگتا رہتا۔ جب وہ گھر آتے تو وہ پاپا، پاپا چلاتے بھاگتا۔ وہ اسے دیکھتے تو مسکراتے ہوئے بازو وا کر دیتے۔ وہ ان کی بانہوں میں سما جاتا۔ اس لمحے اسے کتنے تحفظ کا احساس ہوتا تھا، اگر اس کے پاپا یہ جان جاتے تو شاید کبھی اسے چھوڑ کر نہ جاتے۔

اس کے پاپا اس کے رخسار چومنے کے بعد اسے کوئی کھانے پینے کی چیز دیتے۔ وہ چیز لے کر خوش ہو جاتا۔ اکثر وہ اس سے پوچھتے۔ ''آپ کو میرا انتظار رہتا ہے یا چیز کا؟''

وہ فوراً جواب دیتا۔ ''آپ کا بھی، چیز کا بھی۔''

چھٹی والے دن وہ انہیں گھر دیکھ کر بے انتہا خوش ہوتا لیکن وہ اگر کہیں جانے لگتے تو اس کی آنکھوں میں خوف سمٹ آتا۔ وہ ان کے پیچھے بھاگتا۔ وہ اسے بہلاتے، لیکن وہ بری طرح سے ان کے... ساتھ لپٹ جاتا۔

''بیٹا، میں کہیں بھی جاتا ہوں، آپ کے لیے ہی جاتا ہوں، میں اگر آپ کے پاس ہی رہوں نا... تو آپ بہت سی چیزوں سے محروم رہ جاؤ گے۔'' وہ اسے بہلاتے۔ اسے سمجھ نہ آتی۔ اس کا معصوم ذہن بس اتنا چاہتا تھا کہ اس کا باپ اس کے آس پاس موجود رہے۔

وہ باپ کے جانے سے خوفزدہ رہتا، مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جا تو وہ لوگ بھی سکتے ہیں جو ہمہ وقت آپ کے ساتھ، آپ کے پاس ہوتے ہیں۔

☆☆☆

ان دنوں اس کی ماما بہت سست رہنے لگی تھیں۔ وہ زیادہ تر لیٹی رہتیں۔ وہ چڑچڑی بھی ہو گئی تھیں۔ وہ اٹھتی بھی تو بڑی سستی سے چلتیں۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھیں۔

وہ تنہا گھر میں بولا یا بولا یا پھرتا۔ اس کے پاپا مزید دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ اس کی ماما اکثر، اس کے پاپا سے شکوہ کرتیں۔ ''احمد، اس حال میں تو کم از کم مجھے وقت دیا کریں۔''

''کیا ہوا تمہارے حال کو، سب ٹھیک تو چل رہا ہے۔'' وہ اطمینان سے جواب دیتے۔

''ڈاکٹر کی رپورٹس کے مطابق تو سب ٹھیک ہے مگر مجھے آپ کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ تنہائی مجھے خوفزدہ کرتی ہے۔''

''اوہو تم بھی نا... تم کوئی پہلی بار تو ماں بننے نہیں جا رہیں، جو ڈر رہی ہو۔'' وہ جھنجلا جاتے۔

ایک دن وہ بیڈ پر لیٹا، اپنی ماما کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ وہ بیڈ پر خوب اچھل کود کر رہا تھا، کبھی بھاگتا ہوا ایک سرے پر جاتا، کبھی دوسرے سرے پر، اس کی ماما اسے منع کر کے ہلکان ہوئی جا رہی تھیں۔ ''آرام سے بیٹھو نوید، گر جاؤ گے۔'' وہ بار بار چلاتیں مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی تھی۔ تنگ آ کر ماما نے اسے پکڑ لیا۔ وہ ہنستے ہوئے ہاتھ پاؤں چلانے لگا لیکن ماما نے اسے انتہائی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ تیزی سے ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ اسی دوران اس کی لات ماما کے پیٹ میں لگی۔ ان کے منہ سے تیز چیخ بلند ہوئی۔ انہوں نے یکدم اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بیڈ کے دوسرے کنارے کی طرف بھاگا۔ دوسرے سرے پر رک کر وہ پلٹا۔ ماما پیٹ پر ہاتھ رکھے دہری ہوئی جا رہی تھیں۔ ان کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کا معصوم ذہن صورتِ حال کا مکمل طور پر تو ادراک نہیں کر سکتا تھا مگر وہ یہ جان گیا تھا کہ ماما تکلیف میں ہیں۔

وہ چلانے لگا۔ ''ماما..... ماما۔'' مگر اس کی ماما اس سے بات ہی نہیں کر رہی تھیں۔ وہ ان سے لپٹ کے رونے لگا مگر وہ کراہتی رہیں۔

''کسی کو بلاؤ۔'' کراہتے ہوئے وہ بہ مشکل اتنا کہہ سکی تھیں۔

نوید ادھر سے ہی چلانے لگا۔ ''پاپا..... پاپا!''

''یہاں سے نہیں باہر سے۔'' وہ تکلیف دہ آواز میں بولیں تو وہ دھیرے سے باہر نکل آیا۔ باہر گھور اندھیرا چھایا ہوا تھا، آج تو اس کی ماما نے باہر کی بتیاں بھی روشن نہیں کی تھیں۔ وہ اندھیرے میں چلتا ہوا داخلی دروازے پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہینڈل تک پہنچانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے دروازہ پیٹنے لگا۔ وہ ساتھ ہی چلا رہا تھا۔ ''پاپا..... جلدی آئیں۔ ماما کو کچھ ہو گیا ہے۔'' اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے مگر نہ اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کی دستک کچھ ہی دور گیٹ پر موجود چوکیدار تک پہنچی اور نہ ہی بند دروازے کے پیچھے سے ایک معصوم پکار کی رسائی اس کے کانوں تک ہو سکی۔

اس... پاپا جب گھر پہنچے تو وہ دروازے پر کھڑا، اسی طرح چلا رہا تھا۔ اس کے چلانے کی آواز شاید ان تک بھی نہ پہنچی تھی۔ انہوں نے دروازہ دھکیلا تو وہ اس کے سر میں لگا۔ وہ لڑکھڑا

کے پیچھے گرا۔ ساتھ ہی وہ بلند آواز میں چلایا بھی تھا۔ اس کے پاپا ٹھٹک کر رک گئے۔ انہیں اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے لائٹ روشن کی تو ان کی نظر نوید پر پڑی۔ اس کے رخساروں پر مٹے مٹے آنسوؤں کے نشان پڑے تھے۔ اس کی پیشانی پر ایک گومڑ بنا ہوا تھا مگر وہ ایک ہی بات کہے جارہا تھا۔

''پاپا..... جلدی آئیں، ماما کو کچھ ہوگیا ہے۔''

انہوں نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اس نے پھر اپنا جملہ دہرایا۔ انہیں تشویش ہوئی۔ وہ بھاگے ہوئے اندر پہنچے۔ اندر ان کی بیوی بیڈ پر بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے کپڑے خون سے سرخ ہورہے تھے۔

انہوں نے نوید کو نیچے اتارا اور اس کی ماما کی طرف دوڑے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اسپتال میں موجود تھے۔ اس کے پاپا بے انتہا پریشان تھے۔ وہ بار بار ایک بند دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے جھانکتی بے چینی دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''ماما کہاں ہیں، ماما کے پاس جانا ہے۔''

انہوں نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ ''بیٹا، دعا کرو، آپ کی ماما جلدی سے ٹھیک ہوجائیں۔'' اس کی ماما بھی اس سے دعا منگوایا کرتی تھیں۔ وہ دعا مانگنا جانتا تھا، وہ اپنے ننھے منے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگا۔

وہ دعا مانگ رہا تھا کہ ان کے سامنے وہ دروازہ کھلا جس کی طرف بار بار اس کے پاپا دیکھ رہے تھے۔ اس میں سے ایک ڈاکٹر باہر نکل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور تھکن تھی۔ اس کے پاپا اسے دیکھتے ہی تڑپ کے اٹھ بیٹھے۔ وہ بھی دعا مانگنا بھول گیا۔

ڈاکٹر نے اس کے پاپا کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''آئی ایم سوری، ہم باوجود کوشش کے دونوں میں سے کسی کو نہیں بچا سکے۔''

ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا تھا مگر اس کے پاپا سکتہ زدہ ادھر ہی کھڑے رہ گئے تھے۔ وہ ان کی ٹانگ ہلا کر ان سے پوچھنے لگا۔ ''پاپا کیا ہوا، ماما ٹھیک نہیں ہوئیں؟''

پاپا نے جھک کر اسے اٹھالیا۔ وہ اسے بے طرح چومنے لگے۔ ساتھ ہی وہ روتے جارہے تھے۔ وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔ یہ پیار کا آخری اظہار تھا جو اس کے پاپا نے اس سے کیا تھا اور یہ آج تک اس کے ذہن میں نقش تھا۔ ان کے ہونٹوں کا لمس اپنے چہرے پر اسے آج بھی محسوس ہوتا تھا۔ وہ یہ سب بارہا سوچ چکا تھا مگر ہر بار یہ سب سوچتے ہوئے اسے نئے سرے سے تکلیف کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت بھی آنسو اس کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر اس کی کنپٹیوں سے پھسلتے ہوئے .... تکیے میں جذب ہوتے جارہے تھے۔ وہ ان آنسوؤں سے بے خبر، ماضی کی بھول بھلیوں میں مگن رہا۔ اب اس کی زندگی کا اصل دور شروع ہو رہا تھا۔ انتہائی تکلیف دہ دور.....

☆☆☆

چند دن وہ دوسری عورتوں کی گود میں کھیلتا رہا۔ وہ ان کے چہروں میں اپنی ماما کا چہرہ تلاش کرتا مگر جب کہیں بھی ماما کو نہ پاتا تو رونے لگ جاتا۔ اس عمر میں تو بس ایک ہی رشتہ اس کے لیے کافی تھا۔ اس کی ماں کا رشتہ.....

اور پھر ایک ایسی عورت اس کی زندگی میں آگئی جس نے کہا تھا۔ ''بیٹا، میں تمہاری ماما ہوں۔'' اس نے تڑپ کر اسے دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں مایوسی چھا گئی تھی۔ خود کو اس کی ماما کہنے والی عورت تو کوئی اور تھی۔ وہ اس کی ماما تو نہ تھی۔

''نہیں، آپ میری ماما نہیں ہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا تھا۔

''بیٹا، یہ آپ کی نئی ماما ہیں۔'' اس کے پاپا نے کہا تو وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا۔

پہلی بار اس کی آنکھوں میں تجسس جاگا تھا۔ وہ اپنی نئی ماما کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی دیکھ کر اس کے پاپا بولے۔

''چلو، اپنی ماما سے ہاتھ ملاؤ۔'' اس نے پاپا کے کہنے پر ہاتھ بڑھا تو دیا تھا مگر اس کے معصوم ذہن میں سوال گونج رہا تھا۔ ماما تو اٹھا کر پیار کرتی ہیں..... یہ کیسی ماما ہیں جنہوں نے بس ہاتھ ہی ملایا ہے؟

اس سوال کا جواب اسے روز ہی ملنے لگا۔ جب اس کی نئی ماما اسے بات بات پر دھتکار کر رکھ دیتیں۔ وہ بھوک سے بلکتا رہتا مگر اس کی نئی ماما ٹی وی کے آگے بیٹھی رہتیں۔ وہ ابھی چار سال کا پورا نہیں ہوا تھا مگر اس کی نئی ماما اسے الگ کمرے میں سلانے لگی تھیں۔ وہ تنہا کمرے میں ڈرتا رہتا لیکن اس کی نئی ماما اسے زبردستی چھوڑ کر دروازہ بند کر جاتیں۔ وہ اپنی نئی ماما کی شکایت پاپا سے لگانا چاہتا تھا مگر وہ..... وہ تو اس کے نئے کمرے میں آتے ہی نہ تھے۔

یہ کیسی ماما ہیں جنہوں نے صرف ہاتھ ملایا ہے؟ نئی ماما سے پہلی ملاقات کے وقت اس کے ذہن میں یہی سوال گونجا تھا۔ اب ہر وقت اس کے ذہن میں اس سوال کا جواب گونجا کرتا تھا۔ ''نئی ماما بہت گندی ہیں..... بہت زیادہ گندی۔''

☆☆☆

وقت کی ٹرین اپنی پٹری پر محوِ سفر رہی۔ نوید اب جوان

ہو چکا تھا، لیکن گھر کے ماحول کی وجہ سے وہ تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ وہ حساس ذہن کا مالک تھا، حالات نے اس کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ اپنے ہی خول میں بند ہو کر رہ گیا۔ اسکول میں بھی وہ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھا رہتا۔ لڑکے اسے کھیلنے کی دعوت دیتے۔ وہ انکار کر دیتا۔

اسکول سے آ کے وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔ نئی ماما سے اس کے دو بھائی بھی تھے۔ وہ دونوں اپنی ماں کی دیکھا دیکھی اس سے بے پناہ نفرت کرتے تھے۔ وہ اسے ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، مگر وہ یہ سب زیادتیاں سہنے پر مجبور تھا۔

اس کے بھائی اعلیٰ درجے کے اسکولز میں پڑھتے تھے جبکہ وہ ایک عام سے پرائیویٹ اسکول میں، اس کے باوجود اس کی کارکردگی اپنے بھائیوں سے بہتر رہی تھی، مگر اس کی یہ کارکردگی بھی اس کے باپ تک کسی اور انداز میں پہنچتی رہی تھی۔ وہ ہفتوں اپنے باپ کی شکل تک دیکھنے سے قاصر رہتا تھا۔ کبھی وہ اسے ملتے بھی تو بہت جلدی میں ہوتے تھے۔

ان سب تکالیف سے بچنے کے لیے اس نے خود کو پڑھائی میں مگن کر لیا تھا۔ وقت کے ساتھ اس نے باپ کی بے اعتنائی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ بولتا بہت کم تھا لیکن سوچتا بہت زیادہ تھا۔

نوجوانی میں اس میں ایک تبدیلی آئی تھی کہ وہ حسب ضرورت لوگوں سے بات چیت کرنے لگا تھا وگرنہ بچپن میں تو ٹیچرز کو بھی اسے بلوانے کے لیے لاکھ جتن کرنا پڑتے تھے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ دنیا سے مقابلہ کرنے کے لیے اسے اپنے اندر اعتماد پیدا کرنا ہوگا۔ اسے مشکلات کو فیس کرنا ہوگا۔

اس نے حال ہی میں بی کام کے امتحانات دیے تھے اور ان دنوں فارغ ہوا تھا۔ ان فراغت کے دنوں کو وہ کارآمد کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کے لیے اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تیار تھا۔

اب وہ سٹیج آ گئی تھی جب وہ اپنا کردار تبدیل کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس صبح وہ نک سک سے تیار ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ اس کا رخ اپنے باپ کی فیکٹری کی طرف تھا۔ وہ اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

''خیریت تو ہے، آج ادھر کیسے آنا ہوا؟'' وہ اسے دیکھتے ہی بولے تھے۔

''کیوں، کیا میں یہاں نہیں آ سکتا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں طنز در آیا تھا۔ اس کے پاپا کے ماتھے پر بل پڑے۔

''یہاں میں کام میں مصروف ہوتا ہوں، تم نے مجھ سے کوئی بات کرنی تھی تو گھر پر بھی کر سکتے تھے۔'' وہ خشمگیں لہجے میں بولے۔

''اتنے سالوں سے گھر میں آپ سے بات کرنے کو ترس رہا ہوں، وہاں بھی تو آپ مصروف ہی ہوتے ہیں۔'' اس نے تلخی سے سوچا مگر وہ یہ سب کہنے یہاں نہیں آیا تھا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''میں بھی یہاں کام کرنے ہی آیا ہوں۔ یہ میری سی وی ہے، امید ہے اس کے مطابق میرے لیے فیکٹری میں کوئی نہ کوئی جاب نکل ہی آئے گی۔'' اس نے ایک فائل آگے بڑھائی۔

''یہ فیکٹری تمہاری ہی ہے۔ تم پڑھائی سے فارغ تو ہو لو، سنبھالتے رہنا فیکٹری بھی۔'' وہ فائل کے مندرجات دیکھتے ہوئے رسان سے بولے۔ ان کے تاثرات دیکھ کر نوید کو لگ رہا تھا کہ وہ پہلی بار اس کی تعلیمی کارکردگی سے آگاہ ہو رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ اس کے لیے ستائش تھی۔

''میں ان دنوں فارغ ہی ہوں۔ آپ بہت زیادہ مصروف رہتے ہیں، اس لیے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ آپ کی مصروفیات بٹانے میں آپ کی مدد کروں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ہوں، چلو ٹھیک ہے، تم چاہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا۔'' ان کی بات سن کر اتنی دیر میں پہلی بار اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی تھی مگر وہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''شکریہ پاپا۔'' وہ بہ مشکل یہی کہہ سکا تھا۔ پاپا نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ جلدی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

یہ پورا دن اس نے فیکٹری میں ہی گزارا تھا۔ اس کے پاپا نے اسے فیکٹری کے معاملات کے متعلق تفصیل سے بریف کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ عملی زندگی میں قدم رکھ رہا تھا بلکہ اس لیے کہ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کے ساتھ اتنا وقت گزارا تھا۔ شمع بجھنے سے پہلے آخری بار تیزی سے پھڑکتی ہے۔ اس وقت یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

☆☆☆

اس دن شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ دن بھر اس کے خیالی پیکر نے اس کے ذہن پر دستک نہیں دی تھی۔ رات کو بیڈ پر لیٹتے ہی اس نے اپنے ''دوست'' کو اپنے پاس بلا لیا۔ آج اس کے پاس بہت کچھ ایسا تھا جو وہ اس سے شیئر کر سکتا تھا، آج وہ بے انتہا خوش تھا۔ وہ اپنے خیالی پیکر سے باتیں کرتے کرتے سو گیا۔

اگلے دن وہ تیار ہو کر اپنے پاپا کے ساتھ ہی ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی ماں اسے تفصیلی نظروں سے دیکھتی

رہی تھی مگر وہ نظر انداز کرتا رہا۔ جب پاپا دفتر جانے کے لیے نکلے تو وہ بھی ان کے پیچھے تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا کہ اس کی ماں بولی۔

''تم کہاں جارہے ہو؟'' وہ پاپا کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ میرے ساتھ فیکٹری کو ٹائم دیا کرے گا۔'' انہوں نے آرام سے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کردی۔ نوید نے اپنی ماں کے چہرے کو لمحے بھر میں تاریک ہوتے دیکھا۔ اب وہ پُرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

اگلی صبح ناشتے کی ٹیبل پر وہ پھر بیٹھے تھے۔ آج اس کا سوتیلا بھائی فراز بھی جلدی اٹھا تھا۔ وہ بھی ناشتے میں ان کے ساتھ شریک تھا۔ اس کی ماں یکدم بولی۔

''فراز بھی پیپر دے کر آج کل فارغ ہے۔ اسے بھی ساتھ لے جایا کریں۔''

پاپا چونکے۔ ''یہ تو ابھی کافی کم عمر ہے۔ ابھی تو اس نے میٹرک کے پیپر دیے ہیں۔''

''تو کیا ہوا، آخر بڑے ہو کر بھی فیکٹری اسی نے سنبھالنا ہے۔ ابھی سے تمام معاملات دیکھنا شروع ہوجائے تو ٹھیک نہیں؟''

نوید حیرانی سے بار بار ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے تینوں نفوس کے چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ فراز اطمینان سے ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔ اس کے تاثرات سے لگتا ہی نہ تھا کہ بات اس کے متعلق ہو رہی ہے۔

''اوہو، جب اس کی عمر ہوگی تو سنبھال لے گا نا.... ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔'' ان کے لہجے میں بے بسی کی جھلک نوید نے صاف محسوس کی۔

''اس کی کون سی بہت عمر ہوگئی ہے۔ دو سال کا ہی تو فرق ہے دونوں کی عمروں میں۔'' نوید حیرانی سے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ہمیشہ سب کے سامنے اسے فراز سے سات آٹھ سال بڑا قرار دیتی آئی تھی مگر آج اپنے مفاد کے لیے اس نے دونوں کی عمروں میں تفاوت کو کم کردیا تھا۔

''ٹھیک ہے بھئی، لے جائیں گے اسے بھی۔'' پاپا نے گویا بات ہی ختم کردی۔ کچھ ہی دیر میں دونوں بیٹے اپنے باپ کے ساتھ فیکٹری جارہے تھے۔ فراز کے چہرے پر فتح مندانہ تاثرات تھے۔ ان تاثرات کی صحیح سمجھ اسے کچھ دیر بعد ہی آگئی تھی۔

فیکٹری پہنچنے کے بعد فراز نے اپنے باپ کی ساری توجہ خود کھینچ لی تھی۔ نوید جیسے اس منظر میں کہیں تھا ہی نہیں۔ اس کی ماں نے اس کی بڑی خطرناک تربیت کی تھی، وہ لوگ شروع سے اس کے ساتھ ایسا کررہے تھے اور اس کام میں خاصی مہارت حاصل کرچکے تھے۔ نوید اب کی بار بھی کڑھنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔

اگلے چند دن نوید کے انتہائی مشکل گزرے۔ فراز بات بات پر اسے ذلیل کرتا۔ جو کام نوید کرتا، وہ اس کا بھی کریڈٹ لے لیتا۔ اس کی دیکھا دیکھی، دیگر ملازمین کا رویہ بھی اس کے ساتھ طنزیہ ہوگیا۔ ان کا باپ یہ سب دیکھ رہا تھا مگر ہمیشہ کی طرح اسے احساس تک نہ ہوا۔

نوید کا خیال تھا کہ اس کے دن پھرنے والے ہیں مگر اب اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ اس کی خام خیالی ہے جب تک یہ ماں بیٹے زندہ تھے، اس کی زندگی نہیں بدل سکتی تھی، وہ گھر چھوڑنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے ایک دو بار دبے لفظوں میں اپنے باپ سے بھی اس کا اظہار کیا مگر انہوں نے توجہ ہی نہ دی۔ قریب تھا کہ وہ گھر چھوڑنے کے فیصلے پر عمل درآمد کرلیتا کہ ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل دیا۔

☆☆☆

اس دن اس کے باپ نے اسے ایک چیک کیش کرانے ..... کے لیے دیا۔ وہ اپنے باپ کی گاڑی میں ہی بینک گیا۔ چیک پانچ لاکھ روپے کا تھا۔ اس نے چیک کیش کرایا۔ رقم کا بریف کیس لے کر وہ باہر نکلا ہی تھا کہ اس کی نظر فراز پر پڑی۔ وہ ٹیکسی سے اتر رہا تھا۔ نوید پر اس کی نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

''بھائی، جلدی گھر چلو ماما کی طبیعت سخت خراب ہے۔ انہیں ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔''

''تم ادھر میرے پیچھے آنے کے بجائے گھر چلے جاتے، اور ڈرائیور کے ساتھ انہیں ہاسپٹل لے جاتے نا ....'' نوید سپاٹ انداز میں بولا۔

''اوہو..... ڈرائیور کہیں باہر نکلا ہوا ہے۔ آفس میں ماما کی کال آئی تھی۔ وہ سخت تکلیف میں تھیں۔ پاپا بھی کہیں باہر نکلے ہوئے تھے۔ ورنہ وہ انہیں اسپتال لے جاتے۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں تفصیل بتائی۔

''چلو بیٹھو پھر۔'' وہ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

بریف کیس اس نے گاڑی کی ڈکی میں رکھا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

اس کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا لیکن چار و ناچار اس نے گاڑی گھر کی طرف موڑ دی۔ راستے میں فراز مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتا رہا اور اسے جلدی جلدی کی تلقین کرتا رہا۔

وہ گھر پہنچے تو گیٹ کھلا ہوا تھا، چوکیدار جانے کہاں غائب تھا۔ اس کی ماں پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھی کراہ رہی تھی۔ اس کے

گاڑی روکتے ہی وہ لڑکھڑاتی ہوئی گاڑی کی طرف لپکی۔ فراز نے اسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور خود بھی ساتھ بیٹھ گیا۔

''پلیز جلدی سے مجھے بلال اسپتال پہنچاؤ، میں تکلیف سے مر رہی ہوں۔'' وہ بچی ہوئی آواز میں بولی۔ بلال ہاسپٹل ایک پرائیویٹ اسپتال تھا۔ نوید اس سے پہلے کبھی بلال اسپتال نہیں گیا تھا تاہم وہ اسپتال کا پتا جانتا تھا۔

اس نے گاڑی اسپتال کی طرف موڑ دی۔ اس نے ایمرجنسی کے گیٹ پر گاڑی روکی ہی تھی کہ اس کی ماں اور فراز گاڑی سے اترے۔ ایک نرس اسے دیکھ کر وہیل چیئر لے کر اس کے پاس آگئی۔

''میڈم! آپ بیٹھیں، میں آپ کو اندر لے چلتی ہوں'' اس کی ماں وہیل چیئر پر بیٹھ گئی تو نرس اس سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ گاڑی پارکنگ میں لگا کر آجائیں، میں میڈم کو اندر لے جاتی ہوں۔'' نوید نے بغیر کچھ سوچے سمجھے گاڑی پارکنگ کی طرف موڑ دی۔

وہ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے واپس آرہا تھا تو اسے فراز تیزی سے اپنی طرف آتا نظر آیا۔ ''گاڑی کی چابی دینا، میرا پرس گاڑی میں ہی رہ گیا ہے۔'' نوید کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ فراز نے اس کے ہاتھ سے چابی لے لی اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ نوید لب بھینچ کر رہ گیا۔ اسے اس طرح اس کے ہاتھ سے چابی چھیننے پر غصہ تو بہت آیا لیکن ہمیشہ کی طرح سہہ گیا۔

وہ سر جھٹک کر اندر کی طرف بڑھا۔ نرس اسے ایمرجنسی گیٹ پر ہی مل گئی۔ وہ اسے لے کر اندر آگئی۔ ایمرجنسی ویران ہی لگ رہی تھی۔ سوائے ریسپشن پر موجود دو نرسوں کے یہاں کوئی بھی اور موجود نہیں تھا۔ ''میڈم کو آئی سی یو میں لے جایا گیا ہے۔ آپ یہاں بیٹھیں۔'' وہ ویٹنگ روم کی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

نوید ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

نرس اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ میڈم اکثر یہاں آتی رہتی ہیں۔ ان کی ساری میڈیکل ہسٹری ہمیں معلوم ہے۔ امید ہے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوگا۔''

نرس اسے تسلی دینے لگی۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر اندر گئی۔ واپسی پر وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے نوید کو بتایا۔ ''میڈم کا اپینڈکس پرابلم ہے۔ ان کو آپریشن کے لیے لے جایا گیا ہے۔''

نوید پہلی بار اسپتال آیا تھا، اسپتال کے طور طریقوں سے واقف نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ نرس اس سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ نوید بے توجہی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اسے فراز کا انتظار تھا جو جانے کہاں رہ گیا تھا۔ آخر اس سے رہا نہیں گیا تو وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''میں ذرا اپنے بھائی کو دیکھ آؤں۔''

نرس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نوید کا ہاتھ یوں پہلی بار کسی لڑکی نے پکڑا تھا۔ اس کے ہاتھ کے گداز لمس سے اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ ''اسے میں نے ادویات اور کچھ سامان لانے کے لیے بھیجا تھا۔'' وہ میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ نوید دھیرے سے بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک نرس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے ہاتھ سے نرمی و گرمی نوید کے ہاتھ میں منتقل ہو رہی تھی۔ وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ نرس مسکراتے ہوئے بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں چرانے لگا۔ وہ سدا کا شرمیلا تھا۔ وہ تو کبھی لڑکوں سے بھی اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا کجا یہ کہ ایک لڑکی اس کا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی۔

وہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ نوید کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے لیے تو بس اس کے ہاتھ کا لمس ہی زبان بنا ہوا تھا۔ وہ لمس کی زبان کا اسیر ہو کر رہ گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ اندر چلی گئی۔ نوید بے چینی سے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ فراز ابھی ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ یکا یک اسے گاڑی میں رکھے پانچ لاکھ روپے کا خیال آیا۔ وہ اچھل کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ پارکنگ میں پہنچا تو اس کی گاڑی ادھر ہی کھڑی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ لاک نہیں تھا۔ چابی ڈیش بورڈ پر پڑی تھی۔ وہ بے چینی سے ڈکی کی طرف آیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈکی کھولی۔ خالی ڈکی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ ششدر سا وہ خالی ڈکی دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

''ایکسکیوزمی۔ یہاں کچھ دیر قبل شمشاد بیگم نامی پیشنٹ لائی گئی تھیں۔ ان کا اپینڈکس کا آپریشن ہو رہا تھا۔ کیا آپ مجھے ان کے بارے میں انفارم کر سکتی ہیں؟'' کچھ دیر بعد وہ ریسپشن پر موجود نرسز سے کہہ رہا تھا۔

ریسپشنسٹ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس کا جملہ مکمل ہونے کے بعد انہوں نے اچنبھے سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک لڑکی الجھن بھرے انداز میں بولی۔

''یہاں تو پچھلے دو گھنٹے سے صرف ایک ہی مریض اندر آیا ہے۔ وہ بھی مرد تھا۔''

نوید کا چہرہ حیرت کی آماجگاہ بن گیا۔ ''میرے خیال میں آپ شاید بھول رہی ہیں۔ کائنڈلی آپ ریکارڈ چیک کر لیں۔''

اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر ابھرا۔ ''یہ لیں، آپ خود آج کے پورے دن کا ریکارڈ دیکھ لیں۔'' اس نے رجسٹر نوید کی طرف موڑا۔ نوید الجھن بھرے انداز میں رجسٹر دیکھنے لگا۔ شمشاد بیگم کی انٹری موجود ہی نہیں تھی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے سامنے تو وہ ان کو اندر لے کر آئی تھی۔'' وہ زیرلب بڑبڑایا۔ لڑکی نے اسے فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور طنزیہ انداز میں بولی۔

''ہو گئی تسلی......''

''انہیں میرے سامنے ایک نرس اندر لے کر آئی تھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھی کتنی ہی دیر مجھ سے باتیں کرتی رہی تھی۔ آپ نے اسے دیکھا تھا نا؟''

''آپ روزی کی بات کر رہے ہیں۔ وہ تو کسی مریض کو لے کر اندر نہیں آئی۔'' اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔

''یہ روزی کون ہے؟''

'' وہ ہمارے اسپتال کی نرس ہے، لیکن وہ کسی مریض کو لے کر اندر نہیں آئی۔''

''آپ اسے بلا سکتی ہیں؟''

''اس کی... ڈیوٹی تو آپ کے آنے سے پہلے آف ہو چکی تھی۔ کچھ دیر آپ کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد وہ گھر چلی گئی ہے۔''

نوید حیرانی سے بولا۔ ''وہ میرے سامنے اندر کی طرف گئی تھی۔ گھر گئی ہوتی تو میرے سامنے سے گزر کے جاتی۔''

ریسپشنسٹ کے چہرے پر طنزیہ سا تاثر جاگا۔ ''باہر نکلنے کے اور بھی راستے ہیں۔ وہ جاتے ہوئے بتا کر گئی تھی کہ وہ گھر جا رہی ہے۔''

''ان کے گھر کا ایڈریس مل سکتا ہے؟'' اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سوری، یہ ممکن نہیں۔'' اس کا انداز قطعیت لیے ہوئے تھا۔ نوید حیران پریشان باہر نکل آیا۔ اسے اس سارے چکر کی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ وہ گاڑی لے کر گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں بھی وہ اس سارے معاملے کے بارے میں سوچتا رہا، اس نے اندازہ لگایا کہ فراز کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ نوید پانچ لاکھ کی رقم لینے بینک گیا ہے۔ اس نے اور اس کی ماں نے مل کے یہ رقم ہتھیانے کا منصوبہ بنایا اور اس میں کامیاب رہے۔ اب وہ پانچ لاکھ روپے کے غیاب کے بارے میں اپنے باپ کو یہ سب بتاتا تو وہ ہرگز یقین نہ کرتا۔ یہ سب اس کے ساتھ ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ پانچ لاکھ ہتھیانے کے لیے ایسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی بھی کر سکتے ہیں... اور کوئی کیا یقین کرتا۔

وہ سارے راستے اسی ادھیڑبن کا شکار رہا۔ ''خیر گھر پہنچ کر ہی صورت حال واضح ہو گی۔'' اس نے خود کلامی کی۔

وہ گھر پہنچا تو چوکیدار اس وقت بھی گیٹ پر موجود نہیں تھا۔ اس نے خود اتر کر گیٹ کھولا۔

وہ داخلی دروازے سے اندر داخل ہوا تو پاپا لاؤنج میں غصے سے ٹہل رہے تھے۔ خلاف معمول وہ آج جلدی گھر آگئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کی طرف لپکے۔ ''تم...... ذلیل، کمینے...... مجھے دھوکا دے رہے تھے تم، اپنے باپ کو......'' وہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑ رہے تھے۔ وہ ہکا بکا انہیں دیکھتا رہ گیا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یکدم ہی انہیں ہو کیا گیا ہے۔ فراز اور اس کی ماں خاموشی سے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ گوکہ اسے توقع تھی کہ وہ گھر میں ہی ہوں گے مگر اس کے باوجود وہ انہیں گھر میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان کے تاثرات دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کی سازش کا شکار بن چکا ہے اور ان دونوں نے ہی اس کے خلاف اس کے باپ کو ورغلایا ہے۔

اسے خاموش دیکھ کر پاپا کا ہاتھ بلند ہوا اور سیدھا اس کے دائیں گال پر پڑا۔ تکلیف سے زیادہ بے عزتی کے احساس نے اس کی آنکھوں میں مرچیں بھر دیں۔ وہ رندھے ہوئے گلے کے ساتھ بہ مشکل بولا۔ ''بتائیں تو سہی، ہوا کیا ہے؟''

اس کا یہ کہنا انہیں مزید چراغ پا کر گیا۔ انہوں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ ''مجھے دھوکا دے کر پوچھتے ہو ہوا کیا ہے۔ پانچ لاکھ کی رقم لے کر گھر سے بھاگنے کا پلان بنا رہے تھے۔'' ان کے منہ سے جھاگ اڑنے لگے۔ ''کہاں چھوڑے ہیں تم نے پانچ لاکھ روپے؟ جن کی خاطر تم ہر رشتہ فراموش کر گئے......'' نوید پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ دیکھنے لگا۔ اس نے تنفر سے فراز کی طرف دیکھا، وہ فتح مندانہ نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

اس کے پاپا اسے پیٹ پیٹ کے تھک چکے تھے۔ اب وہ ہانپ رہے تھے۔ ان کی بیوی ان کے لیے پانی کا گلاس لے آئی۔ انہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے وہ غصیلی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''یہ ایسے نہیں مانے گا۔ بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے۔ آپ پولیس کو رپورٹ کریں۔'' اس کے لہجے میں اس کے لیے بے پناہ نفرت تھی۔ اس نے بھی جواباً اسے سلگتی ہوئی نظروں سے گھورا۔

''ایسے ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہے ہو۔ نظریں نیچی کرو۔'' وہ چلائی۔ ''حد ہو گئی دیدہ دلیری کی۔'' اس نے نفرت سے کہا۔ نوید اسے خاموشی سے دیکھتا رہ گیا۔

''کہاں چھوڑے تم نے پانچ لاکھ روپے؟'' کچھ دیر بعد ان کی حالت سنبھلی تو وہ سرد آواز میں بولے۔

''پیسوں کے بارے میں آپ ان سے پوچھیں۔'' اس نے اشارہ کیا۔

شمشاد تو یہ سنتے ہی بھڑک گئی۔ ''ہاتھ نیچے کرو۔'' وہ چلائی۔ ''پانچ لاکھ لے کر خود جانے کہاں چھوڑ آئے اور پوچھ ہم سے رہے ہو۔''

''میں ان سے کیا پوچھوں۔ میں نے تو چیک تمہیں دیا تھا؟'' وہ سرد نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔

''یہ بیماری کا ڈراما کر کے مجھے دھوکے سے اسپتال لے گئیں۔ وہاں فراز نے مجھ سے گاڑی کی چابی لی۔ میں نے اسے چابی دے دی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ میرا بھائی نہیں آستین کا سانپ ہے جو مجھے ایسے ڈسے گا۔ اس نے بریف کیس ڈکی سے نکال لیا، اور چابی گاڑی میں ہی چھوڑ کر یہ لوگ واپس آ گئے۔'' اس نے مختصر الفاظ میں سارا قصہ سنا دیا۔ وہ اسے بے یقینی سے گھور رہے تھے۔ شمشاد اور فراز کی آنکھوں میں طنز نمایاں تھا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی شمشاد بولی۔

''اسے کہتے ہیں، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ پیسے خود چوری کر لیے اور الزام ہم پر۔ واہ، اس ڈھٹائی پر داد تو بنتی ہے۔'' وہ باقاعدہ تالیاں بجانے لگی۔

نوید کی کنپٹی میں خون ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ چلایا۔ ''میں چور نہیں، چور تم اور تمہارا بیٹا ہیں۔'' شمشاد شکایتی نظروں سے احمد کی طرف دیکھنے لگی۔

احمد کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر زوردار تھپڑ اسے رسید کیا۔ ''یہ اپنی ماں سے کیسے بات کر رہے ہو'' ان کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا۔

نوید نے زبان پر نمکین خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''پاپا، خدا کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔ پیسے فراز نے ہی گاڑی کی ڈکی سے نکالے ہیں۔'' اس بار وہ بولا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ان کی آنکھوں میں لمحے بھر کے لیے اعتبار کی چنگاری سلگی لیکن اگلے ہی پل ان کی آنکھوں میں بیگانگی نظر آنے لگی۔

''تمہیں اگر پانچ لاکھ روپے سے اتنی ہی محبت ہے تو وہ میں تمہیں بخشتا ہوں لیکن کل صبح تم مجھے اس گھر میں نظر نہ آؤ۔'' وہ سرد لہجے میں کہہ کر اندر کی طرف بڑھ گئے۔ نوید انہیں بے یقینی سے دیکھتا رہ گیا۔

''سن لیا نا... تم نے..... صبح سے پہلے اپنا یہ منحوس تھوبڑا لے کر یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔'' فراز نیچے پڑی گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے طنزیہ انداز میں بولا جو مار پیٹ کے دوران نیچے گر گئی تھی۔

نوید نے اسے نفرت سے گھورا اور قدم گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ دروازے کے قریب ہی سوٹ کیس رکھا تھا۔ وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ 'یہ سوٹ کیس کہاں سے آیا ہے؟' اس نے اچنبھے سے سوچا۔ اس نے گھسیٹ کر سوٹ کیس سائڈ پر کیا۔ وہ بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ یکدم اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے اپنی وارڈ روب کھولی۔ وارڈ روب کا منظر دیکھتے ہی اس کی سمجھ میں ساری کہانی آ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ بیڈ پر بیٹھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنے عرصے سے وہ اپنے باپ کی نظروں میں تھا ہی نہیں، اب آیا بھی تھا، تو آتے ہی گر گیا تھا اور یہ سب کیا دھرا اس کے سوتیلے رشتوں کا تھا۔

جب سے وہ فیکٹری جانا شروع ہوا تھا اپنی سوتیلی ماں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ چلتر عورت اس سے چھٹکارے کے لیے اس حد تک جا سکتی ہے۔

اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ فراز پیسوں کے لیے ماں کی بیماری کا ڈراما کر کے اس کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہ نرس روزی بھی ان کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے جلدی جلدی کی رٹ لگا کر اس سے چابی ہتھیائی اور پیسوں سے بھرا بریف کیس لے کر گھر آ گیا۔ دوسری طرف روزی نے اسے اپنے ساتھ مصروف رکھا۔ اس دوران فراز اور اس کی ماں کو آگے کی پلاننگ کے لیے وقت مل گیا۔

گھر پہنچنے کے بعد فراز اور اس کی ماں نے اس کے کپڑے سوٹ کیس میں ڈال کر اپنی مرضی کی سچویشن ترتیب دے کر احمد..... کو بلا لیا ہوگا۔ انہوں نے جانے کیسے کیسے جھوٹ بول کے اس کے باپ کو اس کے خلاف ورغلایا تھا۔ وہ سوچتا جا رہا تھا اور کڑی سے کڑی ملتی جا رہی تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ انہوں نے یہ سب کیسے کیا۔ فرق تو نتیجے سے پڑتا تھا جو ان کی منشا کے مطابق نکلا تھا۔ ان کے منصوبے کے عین مطابق..... انہیں پانچ لاکھ روپے بھی مل گئے تھے اور دنیا میں موجود واحد خونی رشتہ بھی اس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اب اسے سوچنا یہ تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

روتے روتے آخر کار اسے چین آ گیا تھا مگر اب اس کے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ وہ پہلی بار اپنے سوتیلے

رشتوں کے علاوہ اپنے باپ کے متعلق بھی انتہائی نفرت سے سوچ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جتنا روتا، جتنا بلکتا، اس کا باپ کبھی اس کا یقین نہیں کرتا۔ وہ تو ویسے ہی اپنی بیوی سے دبتا تھا، اوپر سے جس طرح کا منصوبہ بنا کر نوید کو پھنسایا گیا اس پر اس کا باپ کیا کوئی بھی یقین نہ کرتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس طرح کا منصوبہ بنایا تھا۔ اسے باپ کی بے اعتباری سے زیادہ اس کے رویے نے دکھ دیا تھا۔

جس باپ نے زندگی بھر دو بول پیار کے مجھ سے کبھی نہ بولے، اسے مجھے مارنے کا اختیار کس نے دے دیا۔ اس کے نزدیک باقی سب قابل اعتبار ہیں، بس میں ہی ناقابل اعتبار..... میں نے اس سے پہلے کب اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی جو اس نے مجھ سے ایسا سلوک کیا۔ میری بات پر اعتبار تو دور کی بات تحقیق تک کیے بغیر مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم جاری کر دیا۔ آخر کیوں.....؟ اس کے اندر نفرت کا شعلہ جلا، وہ اسے ایندھن فراہم کرنے لگا۔

رات پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی لیکن اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یک ٹک چھت کو دیکھتے ہوئے سوچتا جا رہا تھا۔ میں ساری زندگی ان سب کی زیادتیاں خاموشی سے برداشت کرتا رہا، صرف یہ سوچ کر کہ کبھی تو انہیں احساس ہو گا، کبھی تو یہ مجھے اپنا سمجھ کر گلے سے لگائیں گے، مگر نہیں میں غلط تھا، انہوں نے میری خاموشی کو میری کمزوری سمجھا، اب میں انہیں دکھاؤں گا کہ میں کمزور نہیں.....

اس کے اندر بیدار ہونے والا نفرت کا شعلہ اب الاؤ کی شکل اختیار کر چکا تھا، اس نفرت نے اس کے چہرے کے نقوش بگاڑ دیے تھے۔ وہ اگر اس وقت خود کو دیکھتا تو خوفزدہ ہو جاتا مگر وہ اپنے آپ میں کہاں تھا۔

اچانک وہ جھٹکے سے اٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ داخلی دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ باہر بلا کی سردی تھی مگر اس کے اندر جلتی نفرت کی آگ نے ہر احساس مٹا ڈالا تھا۔ وہ دبے قدموں مکان کے عقب میں پہنچا۔ اس طرف اس کے دونوں مطلوبہ کمروں کی کھڑکیاں کھل رہی تھیں۔ وہ ایک کھڑکی کے قریب پہنچا۔ اس کی توقع کے مطابق سلائڈنگ ونڈو تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پردہ ہٹایا۔ اندر اس کے دونوں بھائی بے خبر سو رہے تھے۔ اس نے آہستگی سے کھڑکی بند کر دی۔ دوسری کھڑکی کے ساتھ بھی اس نے ایسا ہی کیا۔ یہاں کا منظر بھی اس کے منصوبے کے لیے سازگار تھا۔ وہ اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے واپسی کے راستے پر گامزن ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ گھر کے اندر تھا۔ اس نے اپنے منصوبے کو مکمل کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اگر وہ اس کے خلاف شیطانی منصوبے بنا سکتے تھے تو کیا تھا، دماغ تو اس کے پاس بھی تھا۔ اس نے بھی ان سے چھٹکارے کا منصوبہ بنا کر اس پر عمل کر ڈالا تھا۔ اب وہ نتیجے کا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

یہ رات جیسے اس نے کانٹوں پر بسر کی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا ہے یا نہیں۔ کبھی اسے خیال آتا کہ اس کا مقصد پورا نہیں ہوا اور اس کے جرم کا نشانہ بننے والے، اس کے جرم کے متعلق آگاہ ہو گئے ہیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو اس کی تباہی یقینی تھی۔

دوسرے خیال کے مطابق وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر اس سے آگے بھی بہت سے سوالیہ نشان اسے خوفزدہ کرنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

وہ باریکی سے ایسے تمام عوامل کے بارے میں سوچنے لگتا جو اسے پکڑوا سکتے تھے، بار بار سوچنے کے بعد بھی اسے چین نہ آیا۔ اس کا ذہن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایسا زندگی میں اس کے ساتھ پہلی بار ہوا تھا کہ نیند کی دیوی اس سے روٹھ گئی تھی۔ اس نے زندگی میں بہت سی تکالیف سہی تھیں، دکھ درد برداشت کیے تھے لیکن بستر پر لیٹتے ہی نیند کی دیوی اسے اپنی مہربان آغوش میں لے لیتی تھی۔ آج پہلی بار اس نے ایک جرم کیا تھا اور پہلا ہی جرم اس کے لیے وبالِ جان بن گیا تھا۔

اس وقت اسے سکون آور گولی کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی مگر اس سے قبل زندگی میں نہ کبھی اسے ایسی گولی کی ضرورت پڑی تھی اور نہ ایسی گولی یا اور کوئی شے اس کے کمرے میں موجود تھی، جس کے استعمال سے نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو جاتی۔

وقت ٹھہر ٹھہر کر گزرتا رہا، جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے خوف اور بے چینی میں مزید اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس کے باوجود اس کی خواہش تھی کہ جلد از جلد صبح کی سپیدی رات کے اندھیرے کو بھگانے کے لیے آئے اور اسے بھی اس تکلیف دہ صورتِ حال سے نجات ملے۔

فجر کی اذانیں ہوئیں تو وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر نماز پڑھنے کا سوچا۔ نماز پڑھتے وقت اپنے گناہ کی رب سے معافی مانگ سکتا تھا۔

'شاید یہی عمل مجھے سکون دے۔' اُس نے سوچا۔

وہ اس پر بھی سوچتا رہا لیکن اٹھنے کی ہمت اس میں نہیں رہی تھی، وہ نماز کے لیے اٹھنے کا ارادہ کرتے کرتے سو گیا۔ یہ

بڑی بے چین سی نیند تھی۔ نیند میں بھی وسوسے خواب کی صورت اسے ڈراتے رہے۔

اس کی آنکھ شور کی آواز سے ہی کھلی۔ آنکھ کھلتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا دروازہ زور زور سے بجایا جا رہا تھا۔ وہ ہکا بکا انداز میں دروازے کو دیکھنے لگا۔

''چھوٹے مالک.....'' یہ خانساماں تھا جو اسے آوازیں دے رہا تھا۔ اس نے شیلف پر رکھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ اس وقت تک وہ سب گھر والے اٹھ چکے ہوتے تھے۔

اس کے ذہن میں یکدم رات کے واقعات کی فلم چلنے لگی۔ تو کیا.....؟ یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔

''ایک سیکنڈ میں آیا۔'' اس کی آواز کے ابھرتے ہی یکدم سناٹا چھا گیا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر خانساماں پریشان چہرہ لیے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا، کیوں دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے؟'' وہ اپنی آواز میں غصہ بھر کے چلایا۔

خانساماں گڑبڑا گیا۔ وہ عاجزی سے بولا۔ ''وہ چھوٹے مالک..... بڑے مالک اور مالکن دروازہ نہیں کھول رہے، اور نہ ہی فراز اور ذیشان بابا اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہے ہیں۔'' وہ اضطراری انداز میں اپنے ہاتھ مل رہا تھا۔

''تو تم کیوں ان کا دروازہ کھلوا رہے ہو، جب انہوں نے اٹھنا ہوا، اٹھ جائیں گے۔'' وہ اپنے لہجے میں بے زاری ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ابھی تک کی اپنی اداکاری سے وہ مطمئن تھا۔

''وہ..... ناشتا تیار ہے، اور اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نو بجے تک کوئی بھی نہ اٹھا ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ.....'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر نوید کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے ہلکورے لے رہے تھے۔

''اچھا؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''چلو، چل کر دیکھتے ہیں۔''

اپنے والدین کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس کا دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے اس کی پسلیوں کے شکنجے کو توڑ کے باہر نکل آنا چاہتا ہو۔ دروازے پر پہنچ کے اس نے دستک دی۔ اب وہ منتظر نظروں سے خانساماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیوی بھی ادھر ہی آ گئی تھی۔

''ہم بہت زور زور سے دستک دے چکے ہیں۔ وہ اگر سو رہے ہوتے تو لازماً جاگ جاتے۔'' وہ تشویش سے بولی۔

''میرے خیال میں دروازہ توڑنا پڑے گا۔''

اس کی تجویز سن کے نوید سوچ میں پڑ گیا۔

''آپ لوگوں نے کھڑکی دیکھی؟ گیس ہیٹر چلانے کی وجہ سے ہم لوگ تھوڑی سی کھڑکی کھول کے سوتے ہیں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''نہیں..... کھڑکی تو نہیں دیکھی۔ میں جا کے دیکھتا ہوں۔''

نوید بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔ خانساماں پہلے اس کے والدین کے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی میں معمولی سی جھری کھلی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کے کھڑکی سلائڈ کی تو کھڑکی کھل گئی۔ اب اس کے والدین اور اس کے بیچ میں بس ایک پردہ حائل تھا۔ اس نے خانساماں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔

اس نے دھیرے سے پردہ ہٹایا، اندر کا منظر اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ اس کے پاپا اور 'نٹی ماما' بیڈ پر سکون سے محو استراحت تھے۔ وہ کھڑکی کے اوپر چڑھا اور اندر کود گیا، خانساماں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے بیڈ پر نظر ڈالی۔

وہ دونوں پہلو بہ پہلو، چت لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر اتنا سکون..... تھا جیسے وہ حالتِ نیند میں ہوں۔

''پاپا.....'' وہ چلایا، مگر ان کی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔

''یہ یہ.....'' اس کے کانوں میں خانساماں کی کانپتی ہوئی آواز پڑی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ گیس ہیٹر کے پاس اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ آن ہے۔'' اس کے پیچھے مڑنے پر وہ بولا۔ وہ ہیٹر کے پاس آ گیا۔ ہیٹر سے گیس نکلنے کی مدھم سی آواز آ رہی تھی لیکن کمرے میں کسی قسم کی بو نہیں پھیلی ہوئی تھی۔ گیس والے حسب معمول بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گیس میں بدبو پیدا کرنے والا کیمیکل ڈالنا بھول گئے تھے۔ نوید نے ہاتھ بڑھا کر ہیٹر کا بٹن بند کر دیا۔ اب گیس نکلنے کی مدھم آواز آنا بھی بند ہو گئی تھی۔

''میرے خیال میں انہیں گیس چڑھ گئی ہے۔'' خانساماں دھیرے سے بولا۔

وہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اٹھا۔ ''پاپا..... پاپا.....'' وہ چلاتے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر اس نے ان کے ماتھے کو چھوا۔ ان کا ماتھا یخ ٹھنڈا تھا۔ ان کے وجود سے زندگی کی حرارت یکسر نکل چکی تھی۔ وہ بے دم ہو کر ادھر ہی گر گیا۔

☆☆☆

ایک ہی گھر سے بیک وقت چار جنازے اٹھنے کی خبر پورے علاقے میں پھیل گئی تھی۔ ہر طرف سے لوگ امڈے چلے آ رہے تھے۔ قیاس کیا گیا تھا کہ رات کسی پہر گیس کی بندش سے ہیٹر بجھ گئے۔ بعد ازاں گیس واپس آنے سے گیس

خارج ہونے لگی۔ اس گیس کے باعث نوید کے والدین اور دونوں بھائی، دم گھٹنے کے باعث سوتے میں ہی موت کے منہ میں چلے گئے۔

نوید کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ وہ بار بار پاپا ..... پاپا کہہ کر اپنے باپ کے جنازے کے ساتھ لپٹ جاتا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے، میتوں کی تدفین کا ذمہ پڑوسیوں نے لے لیا تھا۔ جب ایک گھر سے چار میتیں بیک وقت اٹھیں تو ہر آنکھ اشکبار ہوگئی۔

نوید بھی قدم گھسیٹتا ہوا جنازے کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ بہت رویا تھا مگر اس کے باوجود اس وقت بھی، اس کی آنکھوں سے آنسو جھرنے کے مانند بہہ رہے تھے۔ لوگ اس سے ملتے اس سے ہمدردی اور افسوس کا اظہار کرتے، لیکن وہ صبح کے بعد ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ وہ میکانکی انداز میں سب کے ساتھ ملتا، ان کی باتیں سنتے ہوئے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھتا رہتا۔ ملنے والے لوگوں کی نظروں میں اس کی حالت دیکھ کر مزید ہمدردی جاگ اٹھتی۔

آخر کار تدفین بھی ہوگئی۔ اسے ادھر بیٹھے خاصی دیر گزر گئی تھی کہ اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ کوئی اسی کو پوچھ رہا تھا۔ کسی نے پوچھنے والے کو نوید کے متعلق بتایا۔ لوگوں کی بھن بھن کی آوازیں سن کر اسے عجیب سا احساس ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی خاص شخص آیا ہو۔ وہ بے چینی سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

دروازہ کھلا۔ اس کی نظر آنے والی ہستی پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں خوف نمودار ہوا جسے اس نے کمال خوبی سے چھپا لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ پہلے کی طرح لاتعلق انداز میں آنے والی ہستی کو گھور رہا تھا۔

آنے والی ہستی ایک پولیس انسپکٹر تھا۔ وہ دیکھنے میں ایک روایتی پولیس والا ہی لگ رہا تھا۔ چالیس سال کے لگ بھگ عمر، بھاری بھرکم وجود اور چہرے پر حشونت لیے وہ اندر قدم رکھتے ہی نوید کو گھورنے لگا۔ نوید کو اس کی نظروں سے بے چینی تو ہوئی مگر اس نے اپنے تاثرات سپاٹ ہی رکھے۔

جانے کس طرح پولیس تک حادثے کی اطلاع پہنچی تھی۔ نوید اسے خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ اندر آیا تو اس کے پیچھے ایک اور پولیس کانسٹیبل اور اس کا ایک پڑوسی بھی اندر داخل ہوئے۔

''دیکھیں جی، نوید صاحب کی حالت ابھی ایسی نہیں کہ وہ کوئی بیان دے سکیں، ان کی تو پوری فیملی اس حادثے کی نذر ہوگئی۔ آپ کو انہیں کچھ وقت دینا چاہیے۔'' اس کا پڑوسی پولیس انسپکٹر کے پیچھے چلتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔

پولیس انسپکٹر نے اپنے عقب میں مڑ کر اس کے پڑوسی کو گھورا۔ ''آپ باہر تشریف رکھیں، آپ کے مشورے کی ضرورت ہوئی تو آپ کو زحمت دے دی جائے گی۔'' انسپکٹر بھاری آواز میں ناگواری سے بولا۔

اس کا پڑوسی برا سا منہ بنا کر باہر نکل گیا۔ یہ پولیس والا کچھ زیادہ ہی نک چڑھا لگ رہا تھا ورنہ شہر کے اس پوش علاقے میں آتے ہوئے عام طور پر پولیس والے بھی محتاط ہو جایا کرتے تھے۔ نوید کو خوف ستانے لگا۔

پولیس والے کمرے میں رکھے صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔ نوید نیچے بچھی چٹائی پر ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اس نے اٹھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔

''ہاں جی باؤ جی، آپ ہمیں کچھ بتاؤ گے یا ایسے ہی ٹکر ٹکر ہمیں دیکھتے رہو گے۔'' پڑوسی کے باہر نکلتے ہی وہ بولا۔

انسپکٹر کو اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''تمہارے گھر میں سب کو گیس چڑھ گئی، تم کیسے بچ گئے؟'' اس کی سرد آواز سن کر نوید کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔

''میں سونے سے پہلے ہیٹر بند کر دیتا ہوں۔'' اس نے دھیرے سے کہا اور نظریں جھکا کر چٹائی پر بنے نقش و نگار کو گھورنے لگا۔

''ہُوں تو تمہارے گھر والے کیا اتنے احمق تھے کہ انہوں نے کمرے بند کر لیے لیکن ہیٹر بند کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی؟'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

نوید نے نظریں اٹھا کر اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ''اس بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ رات سردی بہت زیادہ تھی، اس لیے شاید انہوں نے ہیٹر بند ہی نہیں کیا۔'' اسے انسپکٹر کا انداز انتہائی ناگوار گزر رہا تھا مگر وہ کوشش کر کے سپاٹ سے انداز میں ہی بولا۔

''میں نے سنا ہے، تمہارے بھائی اور ماں سوتیلے تھے۔ کوئی دولت شولت، یا جائداد شائداد کا مسئلہ تو نہیں تھا؟'' اس کی نظریں جیسے برمے کی طرح نوید کے وجود میں گھسی جا رہی تھیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''ہمارے والد حیات تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے ایسا مسئلہ کیسے ہو سکتا تھا؟'' اس بار نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے سے ہلکی سی ناگواری کا اظہار ہو گیا۔ پولیس کانسٹیبل

اس کا انداز دیکھ کر معنی خیز نظروں سے انسپکٹر کو دیکھنے لگا۔

''جب سوتیلی ماں آجائے نا... تو باپ جیتے جی مر جایا کرتا ہے۔'' اس بار انسپکٹر بولا تو اس کے لہجے میں اداسی سی چھپی تھی۔ نوید اس کے جملے سے سو فیصد متفق تھا، لیکن وہ اس کا اظہار اس سے نہیں کرسکتا تھا۔

''مگر مجھے اپنی سوتیلی ماں سے کبھی کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوا۔ وہ سخت مزاج تو تھیں مگر میں نے ہمیشہ انہیں اپنی سگی ماں کی طرح ہی سمجھا۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔ انسپکٹر نے کندھے اچکائے۔

''ایسا کبھی سنا تو نہیں کہ سوتیلی ماں سے کسی کو مسئلہ نہ ہوا ہے۔ بہرحال ہم ابھی جاتے ہیں، تم ہماری اجازت کے بغیر شہر سے باہر نہیں جاسکتے۔'' وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی کانسٹیبل نے بھی اپنی ڈائری سمیٹی اور اٹھ گیا۔ نوید کو سکون کا احساس ہوا۔ وہ دھیرے سے اٹھا۔

''او کے جی۔ جب چاہیں مجھے تھانے بلوا سکتے ہیں۔ میں حاضر ہوجاؤں گا۔'' اس کی پیشکش سن کر انسپکٹر مسکرایا۔ اس نے اس کا کندھا تھپکا اور باہر نکل گیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی نوید صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ پتا نہیں، یہ پولیس والا میرے بیان پر یقین کرتا ہے یا مزید تفتیش کرتا ہے۔ اس نے فکرمندی سے سوچا، لیکن جانے کیوں اس کے بعد اسے پولیس والوں نے تنگ ہی نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

آج پھر وہ ایک پولیس انسپکٹر کے سامنے موجود تھا۔ رات اس نے اسی ویران علاقے میں گزاری تھی۔ رات بھر جاگنے کے باعث اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ صبح ہوتے ہی وہ ایک پولیس چوکی میں آدھمکا تھا۔

اسے دیکھتے ہی انسپکٹر کے چہرے پر ناگواری ظاہر ہوئی۔ ''آپ کا بیٹا پھر گھر سے بھاگ گیا؟'' اسے دیکھتے ہی وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''وہ بھاگا نہیں ہے۔ اسے کسی نے اغوا کرلیا ہے۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

انسپکٹر کے چہرے پر طنزیہ تاثرات نمودار ہوئے۔ ''کیوں، اغوا کاروں نے آپ سے رابطہ کیا ہے؟''

''نہیں۔'' اس کے انداز میں بے بسی تھی۔ ''لیکن اس سے پہلے وہ جب بھی گھر سے گیا بارہ بجے تک لوٹ آیا۔ اس بار یقیناً اس کے ساتھ کچھ برا ہوگیا ہے۔ آپ پلیز اس کی گمشدگی کی ایف آئی آر کاٹیں۔''

''ابھی تو آپ کہہ رہے تھے، وہ اغوا ہوا ہے اور ایف آئی آر گمشدگی کی کٹوا رہے ہو۔'' اس کے انداز میں طنز تھا۔

''وہ ابھی تک نہیں لوٹا، میں ہر جگہ اس کے بارے میں پتا کر چکا ہوں۔ وہ بہت معصوم ہے، کبھی اکیلے کہیں گیا ہی نہیں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

''تو یہ کس کا قصور ہے؟ آپ نے کبھی اسے کہیں اکیلے جانے ہی نہیں دیا ہوگا۔''

نوید نے اسے..... شکوہ بھری نظروں سے دیکھا۔

''آپ کیا جانیں کہ میں نے اسے کبھی کہیں کیوں اکیلے نہیں جانے دیا۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اس کے کھو جانے کا خوف کس بری طرح سے میرے دل پر مسلط ہے، یہ آپ نہیں جان سکتے۔''

''او بھائی، ساری دنیا کے بچے ہوئے ہیں۔ ایسے کوئی نہیں کرتا جیسے تم نے کیا۔ اب وہ بھاگے نہ تو کیا کرے۔'' اس بار انسپکٹر نے ادب واحترام کو سائڈ پر رکھا اور بیزاری سے کہا۔

''میں نے کہا نا، وہ بھاگا نہیں ہے۔'' وہ تیز آواز میں بولا۔ ''اس کے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہوگئی ہے۔ تبھی وہ لوٹ کر گھر نہیں آیا۔ آپ، ایف آئی آر کاٹیں اور اس کا پتا کرائیں۔'' اس کی آنکھیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔ اس کا انداز دیکھ کر انسپکٹر کو بھی غصہ آگیا۔

''او جا بھائی، ہمیں اور بھی بہت سے کام ہیں۔ اگر وہ آج بھی نہ آیا، تو پھر آنا۔'' انسپکٹر غصے سے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ نوید اسے بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔

واپسی کے سفر میں اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا ہی تھا کہ تنویر کی بیوی زرینہ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ تھیلے والے سے سبزی لے رہی تھی۔ اس کی نظر نوید پر پڑی تو چونک اٹھی۔ نوید کو اس کی ٹٹولتی ہوئی نظریں بہت عجیب لگیں۔ کچھ سوچ کر اس نے گاڑی روک لی۔ گاڑی سے اتر کر وہ اس کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

سوئم کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ اس نے خانسامان اور اس کی بیوی کے علاوہ باقی ملازمین کو چھٹی دے دی۔ اسے پولیس انسپکٹر کی آمد کا خوف تھا۔ اسے کسی کی آمد کی اطلاع ملتی تو اس کا ذہن جیسے خوف سے منجمد ہوجاتا۔ وہ مستقبل کے خوف سے اپنا حال خراب کررہا تھا۔

وقت گزرتا گیا، وقت کے ساتھ ساتھ اس کا خوف بھی زائل ہوتا چلا گیا۔ اس نے فیکٹری جانا شروع کردیا۔ پہلے جو لوگ اس سے طنزیہ رویہ رکھنے لگے تھے وہ بھی سنبھل گئے تھے۔ اب وہ ان کا باس تھا۔ اس کی کم گوئی اور سنجیدہ شخصیت

کی وجہ سے لوگ اس سے خوفزدہ رہتے۔ وہ ضرورت کے علاوہ کبھی کسی سے بات نہ کرتا۔

اس نے ایک بار فیکٹری کے ملازمین کو خواتین کے متعلق نازیبا گفتگو کرتے سن لیا۔ اس نے ان لوگوں کی چھٹی کر دی اور خواتین کا سیکشن ہی الگ کر دیا۔

اس کی زندگی پُرسکون تو ہو چکی تھی لیکن اسے کسی پل سکون نہیں آتا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ زندہ ہی نہ ہو۔ بس ایک لاش ہو جسے وہ گھسیٹ رہا ہو۔ سب لوگ رشتوں میں بندھے ہوئے تھے۔ ایک وہ تھا جو بھری دنیا میں تنہا تھا۔ اس تنہائی میں اس کا واحد سہارا اس کا خیالی پیکر ہی تھا۔ وہ اسی کے سہارے زندگی گزار رہا تھا لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ خیالی پیکروں کے سہارے خود کو جھوٹی تسلی تو دی جا سکتی ہے لیکن زندگی نہیں کاٹی جا سکتی۔ وہ خود کو اس خیالی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا میں حقیقی انداز میں جینے کے لیے قائل کرنے لگا۔

جب اس نے اس بارے میں سوچا تو اسے اپنی تنہائی کا واحد حل شادی ہی لگا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اپنے طبقے کی کسی بھی لڑکی کے ساتھ اسے ایڈجسٹ ہونا مشکل لگتا تھا۔ جس طرح کا اس نے بچپن گزارا تھا، اس کے اندر بہت سی تلخیاں بھر گئی تھیں۔ انہی تلخیوں نے اسے اپنے پورے گھرانے کو مارنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی نفسیات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں سے آگاہ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے اتنے قریب آئے کہ اس کے اندر تک جھانک کر اسے دیکھنے کا موقع مل جائے۔ کوئی بھی پڑھی لکھی لڑکی اس کی شریک حیات بنتی تو لازماً اس کی اسرار میں لپٹی شخصیت کا کھوج لگاتی۔ اس کے لیے تو کوئی لوئر مڈل کلاس کم پڑھی لڑکی ہی مناسب ہو سکتی تھی... جو اس کی دولت کی وجہ سے اس سے مرعوب رہتی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی تو اپنے طبقے میں بھی نہ ہونے کے برابر لوگوں سے جان پہچان تھی۔ لوئر مڈل کلاس سے مناسب رشتے کی تلاش تو اس کے لیے کارِ دشوار تھی۔ وہ کسی شادی دفتر سے رجوع کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اتفاق نے اسے ثوبیہ سے ملا دیا۔ وہ خواتین کے ڈیپارٹمنٹ میں کبھی جاتا ہی نہیں تھا۔ اس دن وہاں سے گزرتے جانے کیوں اندر جھانکنے کا خیال آیا۔ شاید قدرت ایسے ہی اپنے کیے گئے فیصلوں کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ اس پر نظر پڑتے ہی ثوبیہ نے لپک کر چادر اٹھالی تھی۔ خوفزدہ انداز میں اپنے گرد چادر لپیٹتی ثوبیہ جانے کیوں پہلی ہی نظر میں اسے اچھی لگی تھی۔ وہ واپس دفتر گیا تو یکدم اسے خیال آیا کہ وہ شریک حیات کے طور پر بھی اس کے لیے موزوں ہو سکتی ہے۔

اس نے اگلے دن اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ اس سے ہونے والی گفتگو نے اسے فوراً فیصلے پر آمادہ کر لیا۔ وہ تو ویسے بھی یکدم فیصلے کرنے کا عادی تھا۔ یہاں بھی اس نے فوری فیصلہ کیا جو اس کے لیے انتہائی مناسب رہا۔ ثوبیہ نے اس کی زندگی میں موجود خلا کو کافی حد تک پر کر دیا تھا۔

☆☆☆

اسد کی آنکھ کھلی تو اس کی آنکھوں میں تیز روشنی پڑی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ اسے کمزوری کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ کمزوری کے اس احساس نے اس کا ذہن بالکل ماؤف کر دیا تھا۔ وہ چت لیٹا گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی حالت کسی قدر سنبھل گئی۔ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ دھیرے دھیرے نظریں گھما کر اپنے گرد و پیش کا معائنہ کرنے لگا۔

یہ ایک وسیع و عریض کمرا تھا جو پوری طرح آراستہ تھا۔ کمرے کی سپاٹ دیواروں میں کوئی کھڑکی، کوئی روشندان

موجود نہیں تھا۔ بس دو دروازے تھے جن میں سے ایک چھوٹا دروازہ واش روم کا لگ رہا تھا جبکہ دوسرا..... کمرے کا داخلی دروازہ لگ رہا تھا۔

وہ ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا اپنا بیگ نظر آ گیا۔ اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کی جیب میں سے رقم اور اس کا موبائل غائب تھا۔ اس کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

'میں ادھر کیسے.....؟' اس نے ماؤف ذہن کے ساتھ سوچا۔ اس کے ذہن میں یکدم جیسے جھماکا سا ہوا اور سارا واقعہ اس کے پردۂ تصور پر ابھر آیا۔

آج پھر وہ اپنے اندر کی گھٹن سے تنگ آ کے باہر نکل آیا تھا۔ آج اس نے تہیہ کر لیا تھا کی کسی بھی صورت اس گھر میں لوٹ کر نہیں آنا۔ اس بار وہ پوری تیاری کے ساتھ باہر نکلا تھا۔ اس نے کندھے پر ایک بیگ لٹکا رکھا تھا جس میں اس کے کپڑے اور ضرورت کی دوسری اشیا موجود تھیں۔ اس کی جیب رقم سے بھری ہوئی تھی۔

اس سے پہلے وہ دو بار جذبات میں آ کر گھر سے باہر نکلا تھا مگر اس بار اس نے سوچ سمجھ کر یہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا باپ اس کی زندگی پر بری طرح سے مسلط ہو گیا تھا۔ وہ اس کی مرضی کے بغیر کہیں بھی آ جا نہیں سکتا تھا۔ وہ اپنی عمر کے دوسرے نوجوانوں کو دیکھتا تو اسے اپنی زندگی ایک قید کی صورت لگتی تھی۔ وہ بھی دوسروں کی طرح آزادی سے، اپنی مرضی سے جینا چاہتا تھا، لیکن اس کا باپ اس کی آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا تھا مگر اب..... یہ محبت بھی اسے زندان کے مانند لگنے لگی تھی جس میں وہ قید تھا۔ آج اس نے اس زندان سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ اپنے گھر سے کچھ دور ہی پہنچا تھا کہ اس کے پاس ایک گاڑی آ کر رکی۔ وہ سائڈ پر کھڑا ہو کر گاڑی کو خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ گاڑی اس کے لیے اجنبی تھی۔ اس کی طرف کا گاڑی کا شیشہ کھلا اور اس میں سے ایک چہرہ نمودار ہوا۔

اسد اسے بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ ''گاڑی میں بیٹھ جاؤ'' اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی تو وہ جیسے خودکار انداز میں گاڑی کا دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔

''تمہیں پیاس لگی ہوگی یہ لو جوس پیو۔'' اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھے بغیر جوس پکڑ لیا۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ جوس کا ڈبا کھلا ہوا تھا، اس میں اسٹرا لگا ہوا تھا۔ وہ جوس پینے لگا۔

وہ بیڈ پر لیٹا پردۂ تصور میں خود کو جوس پیتا دیکھ رہا تھا۔ جوس پیتے ہی شاید اسے نیند آ گئی تھی اور اب اس کی آنکھ کھلی تھی۔

یہ سارا واقعہ یاد آتے ہی وہ چونک کر اٹھنے لگا تو اسے جھنکار سی سنائی دی۔

بے اختیار اس کی نظریں اپنے پیروں کی طرف اٹھیں۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا، اس کی آنکھوں میں بے یقینی و ہراس کی کیفیت نمودار ہوئی۔ اس کے پیر بیڑیوں میں مقید تھے۔ وہ خوفزدہ انداز میں بیڑیوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے بیڑیوں کو چھوا۔ لوہے کے سرد لمس نے اس کے بدن میں پھریری دوڑا دی۔ اس نے زنجیر کے ساتھ ساتھ اپنی نگاہ دوڑائی۔ زنجیر کا کنڈا دیوار میں پیوست تھا۔ اس نے زور سے زنجیر کو جھٹکا دیا۔ کمرے میں زنجیر کی جھنکار گونجی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر زنجیر کی حد ختم ہو گئی۔ یہ اس کی آزادی کی حد تھی۔

اچانک اسے ایک آہٹ سنائی دی۔ دروازے کو شاید کوئی چابی سے کھول رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلا اور اس کی اوٹ سے ایک شخص کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ ہکا بکا اپنے سامنے موجود شخص کو دیکھنے لگا۔ یہ چہرہ اس کے لیے یکسر اجنبی تھا۔

☆☆☆

''اسد کا کچھ پتا چلا؟'' زرینہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ اس کے چہرے پر تفکر تھا۔

''نہیں..... ابھی تھانے سے ہو کر آ رہا ہوں۔ وہ لوگ رپورٹ ہی نہیں درج کر رہے۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔

''اوہ..... آپ..... آپ نے اسپتالوں میں پتا کیا؟'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ نوید کے چہرے پر غصیلے سے تاثرات نمودار ہوئے تاہم جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں اسے اسپتالوں میں ڈھونڈ سکوں۔''

''تنویر آتے ہیں تو میں انہیں کہتی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں، انشاء اللہ وہ مل جائے گا۔'' وہ اسے تسلی دینے لگی۔ اسے تسلیوں کی ضرورت نہیں تھی، وہ اپنے گھر آ گیا۔ اس گھر میں..... جس کے در و دیوار کے ساتھ اسد کی یادیں لپٹی ہوئی تھیں مگر یہ یادیں اسے سکون دینے کے بجائے تکلیف دے رہی تھیں۔ اسے گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ وہ زیادہ دیر ادھر رک

نہ سکا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ گاڑی میں جا رہا تھا۔ زرینہ گیٹ پر کھڑی اسے تشویش سے دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اسد کے لیے اس نے اپنی فیکٹری بیچ کے ایک شاپنگ پلازا خرید لیا تھا۔ اس سے آنے والا کرایہ اس کی ضروریات کے لیے کافی سے بھی زیادہ تھا۔ اس کا باپ فیکٹری کے کاموں کی وجہ سے اسے وقت نہیں دے پاتا تھا۔ اس نے اپنے باپ کی توجہ و محبت میں ترس ترس کے زندگی گزاری تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو اس محرومی سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

اب بس وہ ہونا تھا اور اس کا بیٹا۔ وہ اسے ہتھیلی کا پھالا بنائے رکھتا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔ اس کے دوست، اس کے سارے رشتے ناتے اس سے چھوٹ گئے تھے مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ جب سے اس کا بیٹا اس کی زندگی کا حصہ بنا تھا اس نے اپنے بچپن کے دوست اور غمگسار اپنے ''خیالی پیکر'' سے بھی رشتہ توڑ لیا تھا۔ اب اسے خیالی سہاروں کی ضرورت نہیں تھی، خدا نے اسے حقیقی سہارا عطا کر دیا تھا۔

اس کے سسرالی اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ اس کی ساس بارہا اسے دوسری شادی کا مشورہ دے چکی تھی مگر وہ سوتیلی ماں کا ڈسا ہوا تھا۔ کیسے اس کا مشورہ مان لیتا؟ اس نے اشاروں کنائیوں میں اسے کہا تھا کہ وہ اس کی بیٹی فوزیہ سے شادی کر لے۔ وہ اسد کی خالہ تھی، ماں کی طرح اس کی پرورش کر سکتی تھی مگر وہ اپنی بدنصیبی سے خوفزدہ تھا، سونہ مانا۔

اسے فطری ضرورت تنگ کرتی مگر اسد کی محبت میں وہ یہ قربانی دینے کے لیے بھی تیار تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں جو محرومیاں دیکھی تھیں، ان سے وہ اسد کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

اسد بڑا ہو رہا تھا۔ شام کو وہ اسے پارک لے جاتا۔ باقی بچے بے جھجک جھولوں پر بیٹھتے ان کے والدین کو جیسے ان کی پروا ہی نہ ہوتی مگر اسے جھولے پر بٹھاتے ہوئے اسے ہول آتے۔ اسے ڈرتے دیکھ کر اسد بھی ڈرتے ڈرتے ہی جھولوں پر بیٹھتا۔

اسد چار سال کا ہوا تو اس کی ساس نے اسے اسکول میں داخل کرانے کا مشورہ دیا۔ دن میں چند گھنٹے..... اسد کے بغیر گزارنے کا تصور کر کے ہی وہ ہول گیا۔

''خالہ، ابھی تو یہ بہت چھوٹا ہے۔'' اس نے..... احتجاج کیا۔

ان کی پوچھ گچھ سے تنگ آ کر وہ اسے ایک دن اسکول لے گیا۔

یہ شہر کا مہنگا ترین مونٹیسوری اسکول تھا۔ یہاں بچوں کو بہت پیار اور توجہ سے پڑھایا جاتا تھا۔

جب وہ پہلے دن اسد کو اسکول کے لیے تیار کر رہا تھا تو اسد بے انتہا خوش تھا جبکہ وہ بے انتہا افسردہ۔ وہ دل پر پتھر رکھ کر اسے اسکول لے گیا لیکن جب وہ اسے ٹیچر کے حوالے کرنے لگا تو اسد اس کے ساتھ چمٹ کے بری طرح رونے لگا۔ اگلے تین دن لگاتار وہ اسے اسکول چھوڑنے جاتا مگر اسد ٹیچر زکو دیکھتے ہی رونے لگتا۔

اسد کو اس طرح روتے دیکھ کر اسے عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ میرا بچہ بھی مجھ سے بے تحاشا محبت کرتا ہے، یہ بھی میری طرح میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ خیال اس کے دل کو خوشی کے احساس سے بھر دیتا۔

تیسرے دن کے بعد اس نے اسے اسکول لے جانا ہی چھوڑ دیا۔ وہ گھر میں ہی اسے خود پڑھانے لگا۔

اس کے پڑوسی جب اس بابت استفسار کرتے تو وہ انہیں اس کے رونے کے بارے میں بتاتا۔ وہ بھی اسے تسلی دیتے کہ بچے شروع شروع میں ایسا کرتے ہیں مگر وہ بے بسی سے کہتا۔

''نہیں بھئی، میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اسے روتے ہوئے اسکول چھوڑ آؤں۔'' ان کی نظروں میں طنزیہ تاثر جاگتا لیکن وہ نظر انداز کر دیتا۔ اسی طرح سال گزر گیا۔

اگلے سال داخلے کھلے تو اس کے پڑوسی اور سسرالی پھر اس کی جان کو آ گئے۔ انہوں نے جیسے طے کر لیا تھا کہ انہوں نے اسد کو اسکول میں داخل کرانا ہی کرانا ہے۔

''اسے اسکول داخل کرائیں ورنہ اس کی شخصیت مسخ ہو کے رہ جائے گی۔'' ہر شخص کی زبان پر یہی جملہ ہوتا۔

''نوید بھائی، میں جانتی ہوں آپ اسد سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، اس کے بغیر آپ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتے مگر اپنے لیے اس کے مستقبل کے ساتھ تو نہ کھیلیں، محبت ایثار مانگتی ہے۔ اس کی بہتری کے لیے آپ کو یہ قربانی دینا ہوگی۔'' اس کی پڑوسن زرینہ نے ایک بار اسے کہا تھا۔ اسے وقتی طور پر تو بہت غصہ آیا تھا مگر بعد میں ٹھنڈے دل سے اس نے غور کیا تو اسے زرینہ کی بات صحیح لگی تھی۔ اس نے یہ قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلے چند دن میں اسد اسکول میں ایڈجسٹ ہو گیا۔ وہ اسے اسکول میں چھوڑ کے واپس گھر نہ آتا بلکہ ادھر ہی گاڑی میں بیٹھا رہتا۔ اس کی بہتری کے لیے وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

ایک دن چھٹی ہوئی۔ باہر آتے بچوں میں وہ اسد کو بے چینی سے تلاش کر رہا تھا کہ اس کی نظر اسد پر پڑی۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی تھی۔ وہ روتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ایک ٹیچر نے پکڑا ہوا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر جیسے کسی نے اس کا دل

مٹھی میں لے لیا۔ وہ گیٹ سے اندر بھاگا۔ گارڈ اسے روکتا رہ گیا۔ اسد کے قریب پہنچ کر اس نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اسد اسے دیکھ کر اور رونے لگا۔ اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

''کیا ہوا میرے بچے کو؟'' وہ اسے چومتے ہوئے کہے جارہا تھا۔

''ریسیس ٹائم کھیلتے ہوئے یہ گر گیا تھا لیکن فکر کی بات نہیں، معمولی چوٹ آئی ہے۔'' ٹیچر نرمی سے بولی تو وہ بھڑک اٹھا۔

''معمولی چوٹ آپ کے لیے ہوگی۔ یہ ابھی ہے ہی کتنا سا..... آپ لوگوں نے مجھے بھی انفارم نہیں کیا۔ میں معاف نہیں کروں گا۔'' آپ لوگوں کو ٹیچر کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک جارہا تھا۔ سارے بچے ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسے اونچا بولتا سن کر پرنسپل بھی آگئی۔ اس نے نوید سے معذرت کی لیکن نوید کا غصہ کم نہ ہوا۔ وہ دن اسد کا کسی بھی اسکول میں آخری دن تھا۔

اس واقعے نے نوید کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ وہ خود کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ اس نے دوسرے لوگوں کے کہنے پر کیوں اسے اسکول میں داخل کیا تھا۔ اس کے بعد کے پندرہ سال اس نے اسد کو اکیلے گھر سے باہر تک نہ نکلنے دیا تھا۔ اس نے خود ہی اسد کو پڑھایا۔ خود ہی اس کے..... ساتھ کھیلا۔ وہ اس کا باپ بھی تھا، ماں بھی اور واحد دوست بھی۔ اس کے سوا اسد کا دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں..... اور اب اس کے پاس وہ بھی نہ رہا تھا۔

☆☆☆

اسد ایک قید سے نکل کر دوسری میں آ گیا تھا۔ اب اسے پچھتاوے کا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے باپ کی محبت چھوڑ کے اس سے دور جانے کا سوچا ہی کیوں تھا۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب پہلی بار اس نے باپ کے خلاف دل میں شکایت محسوس کی تھی۔

اس دن وہ شام کو سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاپا اندر غسل کر رہے تھے۔ سامنے گلی میں اس کے ہم عمر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ایک بچے نے شاٹ ماری تو گیند اس کے پاس آ کے لگی۔ اس نے گیند اٹھائی اور گیٹ پر آ گیا۔

''آؤ نا، کھیلتے ہیں۔'' اس کے ہاتھ سے گیند لیتے ہوئے ایک لڑکے نے اسے پیشکش کی۔ وہ شرما گیا۔ اس کے تاثرات دیکھ کر لڑکا ہنستے ہوئے چلا گیا۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ بے اختیار اس کے دل میں باہر جا کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی خواہش امڈی مگر لڑکا جا چکا تھا۔ وہ اپنا دل مسوس کے رہ گیا۔

ایک دن وہ اپنے پاپا کے ساتھ بیٹھا لڑکوں کو کھیلتا دیکھ رہا تھا کہ گیند اندر آنے لگی۔ گیٹ کھلا تھا۔ ایک لڑکا گیند لینے اندر آ گیا۔ وہ عثمان تھا۔ اسد روز انہیں کھیلتے دیکھ کر اب بیشتر لڑکوں کے ناموں سے آگاہ ہو چکا تھا۔

عثمان نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ''اسد، تم نے گیند دیکھی ہے؟'' اسد کو عجیب سا احساس ہوا۔ بہت عرصے بعد اس نے اپنے پاپا کے علاوہ کسی کے منہ سے اپنا نام سنا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس کے پاپا نے عثمان کو گیند کے متعلق بتایا تو وہ بولا۔

''انکل، اسد کو بھی ہمارے ساتھ کھیلنے دیں نا....'' اس کے پاپا نے اسے دیکھا اور بولے۔

''تم کھیلنا چاہتے ہو؟'' اس نے شرما کے اثبات میں سر ہلایا۔

انہوں نے عجیب سے انداز میں اسے دیکھا اور بولے۔ ''تمہیں گیند لگ گئی تو؟''

''انکل، یہ ٹینس بال ہے، ہم روز کھیلتے ہیں ہمیں تو کبھی نہیں لگی۔'' وہ بھی کچھ ایسا ہی جواب دینا چاہتا تھا مگر عثمان نے اس کی ترجمانی کر دی۔ اسے عثمان اور اس کا اعتماد بہت عجیب مگر اچھا لگا۔

''ٹھیک ہے بیٹا، جاؤ مگر سنبھل کے۔'' ان کے انداز میں ایسی فکرمندی تھی جیسے وہ کھیلنے نہیں بلکہ کسی محاذ پر جا رہا ہو۔

وہ خوشی کے تاثرات لیے اٹھا۔ اس کے پاپا بھی گیٹ پر آ گئے۔ اسے دیکھ کر لڑکوں کی نظروں میں تمسخرانہ سا تاثر جاگا لیکن اس کے پاپا کو دیکھ کر وہ خاموش رہے۔

لڑکے کھیلتے ہوئے ایک دوسرے سے بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے مگر وہ جھجک رہا تھا۔ فیلڈنگ کرتے ہوئے گیند اس کی طرف آئی تو وہ اناڑیوں کی طرح اسے پکڑنے کی کوشش کرتا۔ لڑکے اس کا انداز دیکھ کر ہنسنے لگتے۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ اس کے پاپا گیٹ پر کھڑے فکرمندی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سے نظریں چرا رہا تھا۔ بادلِ نخواستہ ہنستے ہوئے آہستہ سے بال پھینکی، اس نے اناڑیوں کی طرح بلا گھمایا مگر بال مس ہو گئی۔ لڑکے ہنسنے لگے۔ اس کے اندر دھواں سا بھر گیا۔ اس نے بیٹ ادھر ہی پھینکا اور اندر کی طرف بھاگا۔ لڑکوں کی ہنسی میں تیزی آ گئی۔ پاپا نے اسے سینے سے لگا لیا۔

''یہ بہت گندے لڑکے ہیں، تمہارا مذاق اڑاتے ہیں، میں اسی لیے تمہیں ان کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتا تھا۔'' وہ تنفر سے لڑکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے مگر اس کے ذہن میں سوال گونج رہا تھا۔

آپ مجھے بھی بچپن سے ان کے ساتھ کھیلنے دیتے تو آج میں بھی ان کے ساتھ اعتماد سے کھیل رہا ہوتا لیکن یہ جملہ بھی وہ اپنے باپ سے کہہ نہ سکا۔ آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس کے

ذہن میں اپنے باپ کے لیے شکایت پیدا ہوئی تھی۔

اس کے بعد یہ شکایت بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ وہ سیڑھیوں میں بیٹھا ہوتا تو بعض اوقات عثمان بھی اس سے ملنے آجاتا۔ وہ اس سے اور اس کے پاپا سے اعتماد سے باتیں کرتا تو اسے بہت حیرت ہوتی۔ اب اسے اپنی کم اعتمادی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ تنگ آکے وہ ایک دن پاپا کی نظر بچا کے گھر سے نکل گیا تھا۔ اس نے کئی گھنٹے باہر گزارے تھے، کئی لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ حسب معمول بات کرتے ہوئے جھجک جاتا۔ نتیجے میں دوسروں کا ردعمل دیکھ کے اس کا دل دکھ سے بھر جاتا۔ وہ تھک ہار کے گھر لوٹ آیا تھا۔

اس کے بعد اس کے پاپا نے اس کا مزید خیال رکھنا شروع کر دیا تھا مگر وہ ان کے خیال رکھنے سے چڑنے لگا تھا۔ دوسری بار وہ اتفاقاً گھر چھوڑ کے نکل گیا تھا۔ وہ گھنٹوں چلتا رہا تھا۔ چلتے چلتے رات ہوگئی تھی۔ وہ واپسی کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے پاس ایک گاڑی آکر رکی۔ اس میں سے ایک شخص نکلا وہ اسے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ اتنا خوفزدہ تھا کہ اس نے پیچھے مڑ کے بھی دیکھا ہی نہیں۔ بھاگتے بھاگتے اس کے پاؤں میں موچ آگئی۔ وہ لڑکھڑا کے گر پڑا۔ تاریکی اور تنہائی کے احساس نے اسے بے بس کر دیا۔ وہ اپنے پاپا کو کال کرنے پر مجبور ہوگیا۔

ان کے آنے تک وہ خوف اور تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس بار وہ ایک ہفتے تک بخار کی شدت کی وجہ سے اسپتال میں داخل رہا تھا۔

ہفتے بعد وہ اسے گھر لے آئے تھے مگر ان کا رویہ کچھ عجیب سا ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح اس کا خیال رکھتے تھے مگر اب وہ ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کی وجہ سے پریشان ہیں۔ انہیں پریشان دیکھ کر اس کا دل بھی کڑھتا، لیکن وہ بے بس تھا۔

انہی دنوں پارک میں اس کی ملاقات ایک اجنبی شخص سے ہوئی۔ وہ اسے پارک میں دیکھتا رہتا تھا لیکن اس سے کبھی بات چیت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ ایک بینچ پر اداس بیٹھا غروب ہوتے سورج کو دیکھ رہا تھا کہ اسے اپنے کندھے پر کسی کے لمس کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ ٹریکنگ سوٹ میں ملبوس ایک تیس پینتیس سالہ شخص سامنے کھڑا مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”تمہارے پاپا نے آج تمہیں کیسے اکیلا چھوڑ دیا۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

”وہ واش روم گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں گے۔“ اس کے لہجے میں موجود تلخی اس شخص نے محسوس کر لی تھی۔

”میرا نام شبیر ہے۔ اکثر تمہیں یہاں اپنے پاپا کے ساتھ دیکھتا رہتا ہوں۔ تمہارا پاپا کے علاوہ کیا دنیا میں کوئی نہیں؟“ وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”نہیں۔“ اس کے لہجے میں چھپی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے شبیر نے اس کے بازو پر تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ رکھا۔

”ایک رشتے کے سہارے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ تم جوان ہو رہے ہو، تمہیں نئے رشتے بنانے ہوں گے۔“ اسد نے اسے چونک کر دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”دیکھو، میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ کئی سال سے تمہیں بس اپنے پاپا کے ساتھ اس پارک میں آتے دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری عمر کے لڑکے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اس عمر میں ان کے نت نئے مشاغل ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کو پوری طرح انجوائے کرتے ہیں لیکن تمہیں ایک پانچ سال کے بچے کی طرح ہر وقت اپنے باپ کی گود میں دیکھ کر میرا دل بڑا کڑھتا ہے۔“ نوید نے کسی اجنبی کے منہ سے پہلی بار اپنے لیے ہمدردی کے بول سنے تھے۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی، جو کبھی زبان تک نہیں آئی تھی۔

”میں اکیلا رہتا ہوں۔ میرا بھی دنیا میں کوئی نہیں لیکن میں نے بہت سے دوست بنا رکھے ہیں۔ ان کی رفاقت میں مجھے کبھی تنہائی کا احساس نہیں ہوتا لیکن تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم باپ کے ہوتے ہوئے بھی دنیا میں بالکل تنہا ہو۔“

اسد نے اسے چونک کر دیکھا۔ ”میں بھی نئے نئے دوست بنانا چاہتا ہوں لیکن پاپا مجھے کہیں جانے ہی نہیں دیتے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر شکوہ آگیا۔

”تم ان سے چھپ کر میرے گھر آجایا کرو۔ میں تمہیں نئے نئے دوستوں سے ملواؤں گا۔“ وہ عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی عجیب سا تاثر تھا جسے اسد کوئی مفہوم نہ دے سکا۔ وہ اس سے نظریں چرا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کی نظر نوید پر پڑی جو کافی دور سے تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یکا یک شبیر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے پاپا آرہے ہیں۔ کبھی اکیلے پارک میں آنا۔ پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

”کیا کہہ رہا تھا یہ شخص؟“ نوید نے اس کے پاس پہنچ کے پوچھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے ساتھ ساتھ فکرمندی کے تاثرات بھی تھے۔

”کچھ نہیں۔ ایسے ہی حال احوال پوچھ رہا تھا۔“ اسد نے نارمل انداز میں کہا۔

''تمہیں اسے اپنے پاس بیٹھنے ہی نہیں دینا چاہیے تھا۔ تم معصوم ہو مگر یہ دنیا انتہائی عیار۔ کبھی کسی پر بھروسا نہ کرنا۔'' اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔ اسد نے اسے ناگواری سے دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ سبھی لوگ ناقابلِ اعتبار نہیں ہوتے، نہ ان کے خوف سے دنیا سے کٹ کے رہنا چاہیے، لیکن چاہنے کے باوجود اسے یہ کہہ نہ سکا۔ پارک میں شبیر روز اسے ملتا لیکن نوید کی وجہ سے وہ اسے دور سے دیکھتا رہ جاتا۔ اسد بھی اس سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن نوید اسے تنہا چھوڑتا تو وہ اس سے کوئی بات کرتا۔

ایک دن اس نے ان سے کہہ ہی دیا۔

''پاپا، آپ نہیں سمجھتے کہ ہم ایب نارمل لائف گزار رہے ہیں؟'' اس کے پاپا نے ترچھ کے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ تم نے کیوں سوچا، کیا میری محبت میں کمی آ گئی ہے؟'' ان کے لہجے میں دکھ تھا، بے یقینی تھی۔

''نہیں پاپا، آپ اتنے اچھے ہیں کہ دنیا میں کسی کے پاپا بھی اتنے اچھے نہیں ہوں گے مگر آپ کی اس محبت نے مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے، میں آپ کے بغیر دنیا کا سامنا کرنے کے قابل ہی نہیں رہا۔'' وہ انہیں شکوہ بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں باقی دنیا کی کیا ضرورت، کیا میری محبت تمہارے لیے کافی نہیں ہے؟'' وہ بھڑک اٹھے۔

''آپ کی محبت میری ضرورت ہے لیکن زندگی ایک ہی رشتے کے سہارے تو نہیں گزاری جا سکتی نا...؟'' وہ زور دے کر بولا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''میں نے تو تمہاری خاطر اپنے سارے رشتے ناتے ختم کر دیے۔ میں بھی تو پچھلے پندرہ سال سے صرف تمہارے ہی سہارے زندہ ہوں۔''

''میں مانتا ہوں، آپ نے میرے لیے بہت بڑی قربانی دی، مگر خدانخواستہ آپ نہ رہے تو کیا میں جی سکوں گا؟ مجھے دنیا کا سامنا کرنے کے لیے اعتماد چاہیے۔ پلیز..... مجھے آزادی دیں تاکہ میں آپ کے بغیر بھی جینا سیکھ سکوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ خوفزدہ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

''میں بھی چاہتا ہوں تم میں اعتماد آئے مگر میں تمہیں اکیلے باہر نہیں بھیج سکتا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔''

اس کی آنکھوں میں استعجاب ابھرا۔ ''تو کیا آپ اس ڈر سے ہمیشہ مجھے اس گھر میں قید کر کے رکھیں گے؟''

''تم نے باہر نکل کے دیکھ لیا، کیا ہوا؟ خود بھی تکلیف سے گزرے۔ مجھے بھی اتنی تکلیف دی۔'' وہ غصے سے بولے۔

''اگر آپ خود مجھے باہر نکلنے کی آزادی دیں تو آپ کو اس تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور نہ مجھے۔'' اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اور انہیں امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

''یہ ممکن نہیں، تم ایک لمحے کے لیے بھی میری نظروں سے دور ہوتے ہو تو مجھے ہول آنے لگتے ہیں۔ میرا اس دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں، میں چاہوں بھی تو تمہیں خود سے ایک لمحے کے لیے جدا نہیں کر سکتا۔'' ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔ وہ انہیں دیکھتا رہ گیا۔

عثمان کا رویہ اس کے ساتھ بہت ہمدردانہ تھا۔ وہ کبھی کبھار اس سے ملنے اس کے گھر جانے لگا۔ وہاں عثمان کے پاپا جب بھی اسے ملتے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے۔ ان کی نظروں سے اسے خوف آتا تھا، لیکن عثمان کے ساتھ وہ جب بات کرتے تو وہ اسے ایک آئیڈیل باپ لگتے۔ اس کے دل میں کسک جاگتی کہ کاش اسے بھی ایسا ہی باپ ملتا۔ جو اسے آزادی اور اعتماد دیتا۔ وہ ان سے بھی بات چیت کی کوشش کرنے لگا۔

وہ شام کو جوں ہی گھر آتے، اسد، عثمان سے ملنے کا کہہ کر ان کے گھر آ جاتا، لیکن چند منٹ بعد ہی اس کے پاپا اسے ڈھونڈتے ادھر پہنچ جاتے۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔

وہ اسے آزادی دینے کے لیے تیار نہیں تھے، جبکہ وہ اب آزاد پنچھی کی طرح اڑنا چاہتا تھا۔ وہ دنیا کو، اس کے نت نئے رنگوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اب وہ محض ان کے سہارے نہیں جینا چاہتا تھا۔ وہ نئے نئے رشتے اور تعلق کھوجنا چاہتا تھا۔

سوچ بچار کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اب اس کے پاس گھر چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ نئے نئے راستے کھوجنے کے لیے گھر سے نکل آیا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ آزادی کے اس سفر میں وہ محض چند قدم ہی اٹھا پائے گا۔ پھر اس کے پر کاٹ دیے جائیں گے۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ ایک زنداں سے نکل کر دوسرے میں گرفتار ہونے جا رہا ہے۔ اب اس کے پاؤں میں محبت کی زنجیر کے بجائے لوہے کی بیڑیاں پڑنے والی ہیں۔ سخت اور بے رحم بیڑیاں..... جن سے چھٹکارا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

دس سال بعد.....

عثمان اپنے بیڈ روم میں لیٹا فیس بک پر مشغول تھا۔ اس کی بیوی پاس بیٹھی کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی چند ہی ماہ ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کی بیوی نے ناول سائڈ پر رکھا اور بیزاری سے بولی۔

''اب رکھ بھی دیں موبائل۔''

''بس رکھتا ہوں۔'' وہ مصروف سے انداز میں بولا۔ وہ غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی طرف سے رخ پھیر کے لیٹ گئی۔ وہ اسے ناراض دیکھ کر موبائل رکھنے ہی لگا تھا کہ اسے فیس بک پر ایک فرینڈ ریکوئسٹ موصول ہوئی۔ یہ ریکوئسٹ اسد نوید نامی آئی ڈی سے تھی۔ اسے نام کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ اس نے تصویر کھول کے دیکھی۔ تصویر کی کوالٹی 'لو' تھی مگر اس کے باوجود اسے تصویر کچھ جانی پہچانی لگی۔ وہ 'زوم' کر کے تصویر دیکھنے لگا۔ لمبی زلفوں کے ساتھ ایک کمزور سا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ یکا یک وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔

''اسد نوید۔'' وہ بے یقینی سے زیر لب بڑبڑایا۔

لمحے بھر میں ہی اس کا ذہن دس سال پیچھے چلا گیا۔ اسے یاد آیا کہ اسد دس سال پہلے گھر سے غائب ہو گیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ نہیں ملا تھا۔ پھر اچانک نوید نے وہ گھر بیچ دیا تھا۔ اس کے بعد اسے آج تک نوید یا اسد کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ چند دن محلے میں اس موضوع پر لوگ بات چیت کرتے رہے مگر پھر وہ بھی بھول بھال گئے تھے۔

آج دس سال بعد اس اسد نوید کی فرینڈ ریکوئسٹ اسے موصول ہوئی تھی۔ اس نے فوراً اسے میسج کیا۔ ''اسد! یہ تم ہو مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کہاں غائب رہے اتنے عرصے سے؟''

دوسری طرف سے فوراً میسج ٹائپ ہونے لگا۔ وہ بے چینی سے جواب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

''شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا، ورنہ میرا نہیں خیال تھا کہ دنیا میں میرے باپ کے علاوہ مجھے کوئی جانتا ہے۔'' عثمان کو اس کا میسج دیکھ کر دکھ ہوا۔ اسے یاد تھا کہ نوید نے کیسے ساری زندگی اسے دنیا سے الگ تھلگ رکھا تھا۔

''تم کدھر ہو آج کل؟'' اس نے اگلا میسج ٹائپ کیا۔

اس کا جواب پڑھ کر وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسکرین کو گھورنے لگا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''میں دس سال سے زندان میں قید ہوں۔''

''کہاں؟ کس نے تمہیں قید کر رکھا ہے؟'' اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔

''پتا نہیں، دس سال سے میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔'' عثمان اس کا جواب پڑھ کے اندر تک لرز گیا۔

''اوہ میرے خدا..... جب تم گھر سے غائب ہو گئے تھے تو تمہارے پاپا بہت پریشان تھے۔ میرا خیال تھا کہ تم پہلے کی طرح خود لوٹ آؤ گے مگر یہ تم نے بہت بری خبر سنائی۔''

''انہوں نے تو پریشان ہونا ہی تھا، آخر میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس کے بغیر وہ ایک لمحہ نہیں رہ سکتے تھے۔'' میسج پڑھ کر عثمان کے دل میں نوید کے لیے اسد کے ساتھ ہمدردی جاگی۔ جو شخص اپنے بیٹے کے بغیر ایک لمحہ نہیں گزار سکتا تھا جانے اس پر کیا گزری تھی۔

اس نے افسردگی سے اگلا میسج بھیجا۔ ''تمہیں کس نے قید کر رکھا ہے؟''

''یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔'' اس کا جواب پڑھ کے وہ ششدر رہ گیا۔

''کیوں؟''

''میں ایک وعدے کی زنجیر میں قید ہوں۔''

''کیسا وعدہ..... پلیز، پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف صاف بتاؤ تمہیں کس نے قید کر رکھا ہے۔'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ کچھ دیر وہ میسج کا انتظار کرتا رہا، مگر میسج نہ آیا۔ وہ ''ان ایکٹو'' ہو چکا تھا۔ اس نے پاس لیٹی اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ سو چکی تھی مگر اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ وہ اسد کے متعلق سوچنے لگا۔

☆☆☆

اسد نے واش روم کے دروازے پر آہٹ سنی تو ایک دم فیس بک بند کر دی۔ اس کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے اپنے زنداں کے نگران کی طرف دیکھا۔ وہ تولیے سے بال خشک کر رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے لیپ ٹاپ آف کر دیا۔ دس سال میں اس کا بیرونی دنیا سے یہ پہلا رابطہ تھا۔

کیا مجھے عثمان سے رابطہ کرنا چاہیے تھا؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ شاید نہیں..... اس رابطے کے بعد شاید مجھے اپنی قید مزید مشکل لگنے لگے۔ اس کے اندر سے جواب ابھرا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ کہہ کر لیٹ گیا۔ وہ اسے... گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں سے گھبرا کے اس نے بازو آنکھوں پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

''تمہارے چہرے کی رنگت کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

اسد خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد اسے آہٹ کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھوں سے ذرا سا بازو ہٹا کے جھانکا۔ وہ لیپ ٹاپ اٹھا رہا تھا۔

اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ جلدی میں وہ ''وائی فائی'' آف نہیں کر سکا تھا۔

چند دن پہلے تک اس کے پاس بیرونی دنیا کا کوئی ذریعہ نہیں تھا پھر اچانک ایک دن وہ لیپ ٹاپ پر موویز دیکھ رہا تھا تو اس کی نظر ''وائی فائی کی دستیابی'' کے ''نوٹیفیکیشن'' پر پڑی۔ وہ ناولز اور موویز دیکھ دیکھ کر کسی حد تک وائی فائی کے بارے میں جان چکا تھا۔ اس نے تجسس کے تحت وائی فائی کھولا تو وہ ''اوپن'' تھا۔ اس پر کسی قسم کا پاس ورڈ نہیں لگا تھا۔ اس نے وائی فائی کنیکٹ کیا تو وہ ہو گیا۔ اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ گو کہ وائی فائی کے سگنل خاصے کمزور تھے۔ انٹرنیٹ سست سہی مگر چل رہا تھا۔

ٹی وی اور ناولز کی وجہ سے وہ سوشل سائٹس کے بارے میں کافی کچھ جان چکا تھا۔ اس نے فیس بک پر اپنا اکاؤنٹ بنایا۔ اس نے لیپ ٹاپ کے کیمرے سے ہی ایک تصویر بنا کر بھی لگا دی تاکہ وہ اگر کسی سے رابطہ کرے تو پہچانا جا سکے۔

اس کے ذہن میں چند نام محفوظ تھے، وہ انہیں سرچ کرنے لگا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد اسے عثمان تنویر کی آئی ڈی مل گئی۔ اس پر لگی تصویر دیکھ کر وہ اسے پہچان گیا۔ وہ دس سال بعد کسی جاننے والے کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ سکتہ زدہ انداز میں تصویر کو دیکھ رہا تھا کہ اسے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے فوراً وائی فائی آف کر کے فیس بک بند کر دی۔

وہ اس کے لیے کھانا لایا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کھویا کھویا سا تھا۔ اس نے اس کی کیفیت محسوس کر لی۔ وہ اس کی پریشانی کے متعلق پوچھنے لگا، مگر اس نے اسے ٹال دیا۔

آج دوسرے دن اسے عثمان سے رابطہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ خلاف توقع اس نے اسے پہچان لیا تھا، مگر اب لیپ ٹاپ اس کے نگران کے ہاتھ میں تھا اور وائی فائی آن تھا۔ اس کی نظر اگر وائی فائی کنیکشن پر پڑ جاتی تو اس کا بیرونی دنیا سے رابطے کا واحد ذریعہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا۔ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیپ ٹاپ کی اسکرین اس کی نگاہوں سے اوجھل تھی۔ پتا نہیں وہ لیپ ٹاپ پر کیا کر رہا تھا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔ معاً وہ اس کی طرف مڑا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

☆☆☆

عثمان کی پرسکون زندگی میں اسد کی آمد نے ہلچل مچا دی تھی۔ وہ رات کو کئی گھنٹے تک اسد کے میسج کا انتظار کرتا رہا تھا مگر وہ پھر ''ایکٹو'' ہی نہیں ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے نیند آئی تھی۔

صبح ناشتا کرتے ہوئے اس نے اپنے ماں باپ کو اسد کے بارے میں بتایا تو وہ بھی حیران رہ گئے تھے۔

''نوید کے بارے میں تو میں نے سنا تھا کہ وہ کسی دربار پر ملنگ بن کے جی رہا ہے۔'' اس کے باپ نے کہا تو وہ حیرانی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''اوہ...... کون سے دربار پر؟'' اس نے افسردگی سے پوچھا۔

''یاد نہیں، شاید کوئی محلے دار بتا رہا تھا۔'' وہ نوالہ چباتے ہوئے بولے۔ ان کے انداز میں بے پروائی تھی۔

''آپ نے بتایا نہیں۔'' عثمان نے شکوہ کیا۔

''بس ذہن میں نہیں رہا ہو گا۔ ویسے بھی ان کے ساتھ کون سا ہمارا کوئی قریبی تعلق تھا۔''

''وہ تو اسد کے بغیر ایک لمحہ نہیں جی سکتا تھا۔ اس کی گمشدگی نے اسے پاگل کر دیا ہو گا۔'' زرینہ افسردگی سے بولی۔

''پتا نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ مجھے تو وہ سائیکی لگتا تھا۔ ایسے بھی کرتا ہے کوئی بھلا جیسا اس نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا۔'' ان کے انداز میں نوید کے لیے تنفر تھا۔

''یہ تو ہے مگر میں نے زندگی میں کسی کو اپنی اولاد سے اتنی شدت سے محبت کرتے بھی نہیں دیکھا۔'' زرینہ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولی۔ اس کے انداز میں افسردگی تھی۔

''محبت...... ہونہہ...... کیا فائدہ ایسی محبت کا جو آپ کی اولاد کی ہی زندگی برباد کر دے۔'' وہ تنفر سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تمہیں بتایا نہیں اس نے کہ اسے کس نے قید کر رکھا ہے؟'' زرینہ نے عثمان سے پوچھا۔

''نہیں...... میں نے پوچھا تھا مگر اسی وقت وہ 'ان ایکٹو' ہو گیا۔ اب پتا نہیں وہ کب رابطہ کرتا ہے۔''

''کاش یہ باپ بیٹا واپس ایک دوسرے سے مل سکیں۔'' اس نے حسرت سے کہا۔

''اسد مل جائے تو نوید کو بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اب دعا کریں، اسد سے دوبارہ رابطہ ہو جائے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''او کے، میں چلتا ہوں۔'' اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس کی بیوی زوبیہ اسے روز دروازے تک الوداع کرنے جاتی تھی مگر آج رات اس کی بے اعتنائی کی وجہ سے وہ اس سے ناراض لگ رہی تھی۔ وہ ناشتے کے دوران بھی ایک لفظ تک اس سے نہیں بولی تھی مگر وہ جس ادھیڑ بن میں گرفتار تھا اس کی وجہ سے اسے زوبیہ کی ناراضی کا احساس تک نہیں ہوا تھا۔ وہ انہیں الوداع کہہ کر دفتر کے لیے نکل گیا۔

وہ سارا دن دفتر میں بھی کوئی کام نہیں کر سکا تھا۔ بار بار

...سیل پر اسد کی آئی ڈی نکال کے دیکھتا رہا مگر وہ رات کے بعد ایکٹو ہی نہیں ہوا تھا۔

وہ ایک نیوز چینل پر جاب کررہا تھا۔ ان دنوں وہ معاشرتی مسائل پر مبنی ایک پروگرام کیا کرتے تھے۔ پروگرام میں وہ معاشرے میں پھیلی انوکھی کہانیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا کرتے تھے۔ وہ اس پروگرام کا اسکرپٹ رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اسسٹنٹ ڈائریکٹر بھی تھا۔ اسد کی کہانی اس کی پیش کی گئی کہانیوں میں سب سے انوکھی کہانی تھی، اس لیے بھی اس کی بے چینی سوا تھی۔

اس نے دل ہی دل میں اس تک پہنچنے کی ٹھان لی تھی۔ اسے امید تھی کہ رات کو اسد اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ وہ بے چینی سے رات کا انتظار کررہا تھا۔

☆☆☆

دوسری طرف اسد بھی بے چینی سے رات کا انتظار کررہا تھا۔ اسے پورا دن لیپ ٹاپ استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ رات کو اس کے نگران نے کچھ دیر لیپ ٹاپ استعمال کرنے کے بعد دور رکھ دیا تھا۔ اس تک اسد کی پہنچ ہی نہیں تھی۔ اسے اس کا انداز عجیب لگ رہا تھا۔

''میرے دل میں چور ہے، اس لیے مجھے ایسا لگ رہا ہے، ورنہ اگر یہ میرے رابطے کے بارے میں جان لیتا تو لازماً مجھ سے اس بابت استفسار کرتا۔'' اس نے اندازہ لگایا تھا۔

دن میں عام طور پر لیپ ٹاپ اس کے پاس ہی ہوتا تھا مگر آج رات سے لیپ ٹاپ اسی جگہ پڑا تھا جہاں رات کو رکھا گیا تھا۔ وہ اس سے لیپ ٹاپ مانگنا چاہتا تھا مگر اس کے دل میں چور تھا، اس لیے وہ جرأت ہی نہ کرسکا۔

شام کو اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے لیپ ٹاپ آن کیا تو اسد کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی نظر وائی فائی کی ''لائٹ'' پر پڑی۔ لائٹ آف تھی مطلب وائی فائی آف تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

پتا نہیں وائی فائی اس نے آف کیا ہے یا خود آف ہوا ہے۔ اس کے دل میں کھد بد ہونے لگی۔

''کیا خیال ہے کون سی مووی دیکھیں؟'' وہ بولا تو اسد چونک گیا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوں.....نہیں، آپ دیکھیں مووی۔ میرا موڈ نہیں ہو رہا۔'' وہ نظریں چرا کر بولا۔ اس نے کندھے اچکائے اور ایک مووی لگالی۔

مووی لگانے کے بعد بولا۔ ''بڑی دلچسپ مووی ہے تم دیکھو تمہارا موڈ بن جائے گا۔''

اسد کچھ نہ بولا۔ وہ بظاہر اس کے ساتھ مووی دیکھنے لگا مگر اس کے دماغ میں تو جھکڑ چل رہے تھے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی مووی کی طرف توجہ مرکوز ہی نہ کرسکا۔ مووی ختم ہوئی تو اس نے لیپ ٹاپ اس کے پاس رکھا اور واش روم میں گھس گیا۔

اسد نے بے چینی سے وائی فائی آن کرنے کے لیے لیپ ٹاپ کی سائڈ پر لگے وائی فائی کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ٹٹول کر وائی فائی کا بٹن آن کرنے کی کوشش کی مگر وائی فائی آن نہ ہوا۔ اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کے بٹن دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔

☆☆☆

عثمان رات دو بجے تک اسد کے رابطے کا انتظار کرتا رہا مگر اس کے ہاتھ مایوسی کے سوا کچھ نہیں آیا۔ اس کے بعد دن گزرتے گئے، وقت کے ساتھ اس کے انتظار کی شدت بھی کم ہوگئی۔ قریب تھا کہ وہ اسے ایک بار پھر بھول جاتا کہ ایک اتفاق نے اس کہانی کو نیا موڑ دے دیا۔

اس دن وہ ایک فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں لنچ کرنے کے لیے رکا تھا۔ وہ اس ریسٹورنٹ میں پہلی بار آیا تھا۔ ریسٹورنٹ میں ''سیلف سروس'' تھی۔ وہ کاؤنٹر پر آرڈر نوٹ کرانے گیا تو ایک آواز سن کر چونک گیا۔ یہ آواز اسے جانی پہچانی لگی تھی۔ وہ اس شخص کی طرف مڑا، مگر اس کا سائڈ پوز نظر آرہا تھا۔ وہ شخص پارسل ہاتھ میں اٹھائے ادائیگی کررہا تھا۔ عثمان سائڈ سے بس اس کی لمبی زلفیں اور ڈاڑھی ہی دیکھ سکا۔

وہ ادائیگی کرکے مڑا تو اس کی نظر عثمان پر پڑی، ایک لمحے کے لیے وہ چونکا، عثمان نے اس کی متغیر ہوتی رنگت دیکھی مگر پھر وہ تیزی سے خود کو سنبھال کے باہر کی طرف لپکا۔

اس کا چہرہ دیکھ کر عثمان کو بھی بے چینی کا احساس ہوا تھا، اسے وہ چہرہ جانا پہچانا معلوم ہوا تھا مگر وہ اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔ چند لمحے.....سوچ میں گم رہنے کے بعد وہ باہر کی طرف لپکا۔ ریسٹورنٹ کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے، اس مانوس اجنبی کو ایک گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ ایک سلور رنگ کی کلٹس میں بیٹھ رہا تھا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی ریورس کی اور تیزی سے گاڑی روڈ پر چڑھالی۔ وہ انتہائی جلدی میں لگ رہا تھا۔

عثمان کو اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ جلدی نہیں بلکہ خوف ہے جو جانے کیوں اس شخص کو عثمان کو دیکھتے ہی لاحق ہوا تھا۔ اس کا

انداز دیکھ کر وہ مشکوک ہو گیا۔ کچھ سوچ کر اس کے روانہ ہوتے ہی عثمان تیزی سے اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔ چند لمحے پہلے تک اسے شدت سے بھوک ستا رہی تھی مگر اس شخص کی ایک جھلک سے اس کی بھوک غائب ہو چکی تھی۔

روڈ پر خاصا رش تھا اس کے باوجود، اس نے ممکن حد تک تیزی سے گاڑی ڈرائیو کی۔ کچھ دور پہنچ کر ہی اس کی مطلوبہ گاڑی اس کی نظر میں آ گئی۔ اس نے اس پر نظر رکھ لی، گو کہ رش میں یہ خاصا مشکل کام تھا مگر جب وہ اس مصروف روڈ سے ایک لنک روڈ کی طرف مڑا تب تک عثمان اس کو نظر میں رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ لنک روڈ رش سے خالی تھا۔ بس اِکا دُکا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ سنگل روڈ تھا مگر اس کے باوجود اس کی مطلوبہ گاڑی اس روڈ پر چڑھتے ہی آندھی طوفان کی رفتار سے آگے بڑھنے لگی تھی۔

عثمان نے بھی اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا لی، مگر اسے دیکھے جانے کا خطرہ بھی تھا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر وہ فاصلہ رکھ کر تعاقب کرنے لگا۔ اچانک اس کا سیل بجا، سیل ڈیش بورڈ پر پڑا تھا۔ اس نے سیل کی اسکرین پر دیکھا، کسی اجنبی نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اس وقت وہ جس صورتِ حال سے گزر رہا تھا، کال سننے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، اس نے کال کاٹ دی۔ کال کاٹنے کے بعد اس نے سامنے نظر دوڑائی تو چونک گیا۔ طویل اور سیدھا روڈ کلفٹس کے وجود سے خالی نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ روڈ سے گزرتے ہوئے اطراف پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ ایک رہائشی کالونی تھی جس میں اکا دکا گھر بنے ہوئے تھے۔ ہر چند قدم کے فاصلے پر رہائشی کالونی کے اندر کوئی گلی داخل ہو رہی تھی۔

ایک گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے اندر جھانکا تو اسے اپنا گوہرِ مقصود نظر آ ہی گیا۔ سلور کلٹس ایک گیٹ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس نے گاڑی روک کر ریورس کی اور اس گلی میں داخل ہو گیا۔ اس گلی میں تین چار گھر ہی بنے ہوئے تھے اور وہ بھی خاصے فاصلے پر تھے۔ بیچ میں خالی پلاٹس تھے جن پر جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ وہ اپنے مطلوبہ مکان کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس کی نظر اس شخص پر پڑی۔ وہ گیٹ بند کر رہا تھا۔ عثمان نے فوراً رخ پھیر لیا مگر اسے ایسا لگا جیسے اس نے اسے دیکھ لیا ہے۔

کچھ دور جا کر وہ واپس پلٹا۔ اپنے مطلوبہ مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دزدیدہ نظروں سے ادھر جھانکا۔ یہ پتھروں سے بنی سیاہ گیٹ والی ایک منزلہ عمارت تھی... جو دیکھنے میں تقریباً ایک کنال کے رقبے پر پھیلی لگ رہی تھی۔ اس نے نیم پلیٹ کی تلاش میں گیٹ اور اس کے اطراف میں نظر دوڑائی مگر گیٹ کسی قسم کی نیم پلیٹ سے خالی تھا۔

وہ گاڑی سے اتر آیا۔ گیٹ میں بنی درز سے اس نے اندر جھانکا۔ اس کی نظر کلٹس پر پڑی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ سوچ کر اس نے ساتھ والے مکان کی کال بیل بجائی۔ یہ مکان نیا تعمیر شدہ لگ رہا تھا۔ بیل بجانے کے بعد وہ بے چینی سے کسی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ذہن میں وہ کوئی مناسب بہانہ سوچ رہا تھا جس کی مدد سے وہ اس مانوس اجنبی کے بارے میں جان سکے۔

دوسری بار بیل بجانے کے بعد ایک بیس بائیس سالہ نوجوان باہر نکلا۔ اس نے چھوٹا گیٹ کھول کے باہر جھانکا۔

''جی، فرمایئے۔'' وہ مشکوک نظروں سے عثمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ ساتھ والے گھر میں کون رہتا ہے؟'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے شائستگی سے پوچھا۔

لڑکا اسے مشکوک سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''وہ دراصل، کچھ عرصے پہلے تک میرے ایک انکل کرائے پر ادھر رہتے تھے۔ ابھی میں بیل بجا چکا ہوں مگر لگتا ہے گھر میں کوئی نہیں، میں جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی تک ادھر ہی رہتے ہیں یا گھر شفٹ کر گئے ہیں؟'' اس نے اس بار بھی شائستگی سے سوال کیا۔

''ہم خود ادھر نئے آئے ہیں، میں نہیں جانتا کہ ادھر کون رہتا ہے۔'' لڑکا اکھڑ انداز میں بولا۔ عثمان کا دل چاہا اسے بے نقط سنا دے، جب وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ ساتھ والے گھر میں کون رہتا ہے تو اتنی جرح کی کیا ضرورت تھی۔

وہ مایوس ہو کے پلٹ آیا۔ جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اس کی نظر سامنے والے مکان پر پڑی۔ اس کے پردۂ تصور میں ایک منظر لہرایا۔ نوید اور اسد سامنے گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے۔ یکا یک اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ جس شخص کے پیچھے آج وہ اتنی دیر تک خوار ہوا تھا، وہ اس شخص کو پہچان چکا تھا۔ اس کے وجود میں زلزلہ برپا ہوا، وہ بے یقینی سے سیڑھیوں کو گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

وائی فائی کا حال دیکھ کر وہ اپنا دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ لگتا تھا اس کا 'صیاد' وائی فائی کنکشن کے بارے میں جان چکا تھا۔ وہ مایوسی سے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد واش روم کا دروازہ کھلا اور وہ برآمد ہوا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''کیا بات ہے، تم کچھ مایوس لگ رہے ہو؟''

''نہیں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' وہ چڑ کر بولا۔ اس نے کندھے اچکائے اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر کنگھی کرنے لگا۔

اسد کے دل کے اندر غبار جمع ہوتا جا رہا تھا۔ دس سال بعد اسے اپنے زندان میں ایک روزن نظر آیا تھا، مگر اسے قید کرنے والے نے وہ بھی بند کر دیا تھا۔ اس نے اس قید کو دل و جان سے تسلیم کر لیا تھا مگر اب اسے باقی کا عرصہ کاٹنا مشکل لگ رہا تھا۔

☆☆☆

عثمان شام ہوتے ہی گاڑی لے کر نکل آیا۔ شام تک کا یہ وقت بھی اس نے جلے پیر کی بلی کی طرح پھر پھر کے گزارا تھا۔''

جب وہ گھر میں داخل ہوا تھا تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی زرینہ چونک گئی تھی۔ ''کیا ہوا تمہیں، خیریت تو ہے؟'' اس نے پریشانی سے استفسار کیا۔

اس نے خود کو پُرسکون کرنے کے لیے گہرا سانس لیا اور تھکے تھکے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

''پلیز، پانی پلا دیں۔'' زرینہ پانی لے آئی۔ وہ ایک ہی سانس میں غٹاغٹ سارا پانی پی گیا۔ زرینہ اسے فکرمندی سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا، تم اتنے خوفزدہ کیوں لگ رہے ہو جیسے تم نے کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہو؟''

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور تھکے تھکے انداز میں کہا۔ ''بس سمجھ لیں بھوت ہی دیکھ لیا ہے۔'' وہ اسے تعجب سے دیکھنے لگی۔ اس نے ایک لحظہ رک کے ماں کے چہرے پر نظر ڈالی اور پوچھا۔ ''پتا ہے میں نے آج کسے دیکھا ہے؟''

زرینہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ دھماکا کرنے والے انداز میں بولا۔ ''میں نے آج نوید کو دیکھا ہے۔ اپنے سابقہ پڑوسی نوید کو..... اسد کے باپ نوید کو۔''

زرینہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''کہاں؟'' اس کی آواز حیرت سے لرز رہی تھی۔

عثمان نے سارا قصہ سنا دیا۔ زرینہ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے سارا قصہ سن رہی تھی۔ ''وہ تمہیں دیکھ کے گھبرا کیوں گیا؟''

''اس کے متعلق میں نے جو تھیوری قائم کی ہے وہ ابھی آپ کو بتا نہیں سکتا۔ پہلے مجھے خود چیک کرنا ہوگا۔'' اس نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

اب وہ اس تھیوری کو چیک کرنے کے لیے گھر سے نکل آیا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہاں اسے کتنے جھٹکے لگنے والے ہیں۔

☆☆☆

نوید پارسل اٹھائے... مڑا ہی تھا کہ اس کی نظر ایک نوجوان پر پڑی۔ وہ اسے الجھن بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ یکدم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ وہ اس نوجوان کو پہچان گیا۔ یہ اس کا سابقہ پڑوسی عثمان تھا۔ وہ اسے دس سال بعد دیکھ رہا تھا لیکن اسے پہچاننے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا۔

گاڑی ریورس کرتے ہوئے اس کی نظر ریسٹورنٹ کے دروازے پر پڑی تھی۔ عثمان چہرے پر الجھن لیے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے آندھی طوفان کی طرح گاڑی نکالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ عثمان کو پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ عثمان اس کے پیچھے لگ کے اس کے گھر تک پہنچ چکا ہے۔

☆☆☆

رات آہستہ آہستہ اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ ہر چیز کو تیرگی ڈھانپتی جا رہی تھی۔ عثمان اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی مدد سے تیرگی کا سینہ چیرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ جتنی رفتار سے وہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا اس سے زیادہ تیز رفتاری سے اس کا قلب اس کے سینے میں دھماکے کر رہا تھا۔ وہ لب بھینچے خود پر قابو پائے ایکسیلریٹر پر دباؤ بڑھاتا جا رہا تھا۔

اپنے مطلوبہ مکان کے پاس اس نے ایک خفیہ گوشے میں لے جا کے گاڑی کھڑی کر دی۔ یہاں سے وہ مکان پر نظر رکھ سکتا تھا مگر مکان سے اس کی گاڑی نظر نہیں آتی تھی۔ مکان کی ایک بیرونی روشنی روشن تھی۔ اس کے علاوہ مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا لگ رہا تھا۔ اب اسے انتظار کرنا تھا، جانے کتنی دیر تک کا انتظار.....

اس کے بعد بھی اس کی کامیابی یقینی نہیں تھی لیکن اس کے علاوہ فی الحال اس کے پاس چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔ اسے امید تھی کہ رات کے کھانے کے لیے نوید باہر نکلے گا۔

وہ اسی امید میں بیٹھا رہا۔ اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ وہ شخص نوید ہی ہے۔ اگر یہ نوید ہی تھا تو اس بات کے چانس بھی روشن تھے کہ اسی گھر میں اس کی ملاقات اسد سے بھی ہو جائے گی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسد کو کسی اور نے نہیں اس کے اپنے باپ نے ہی زندان میں قید کر رکھا ہے۔ حالات و واقعات کی کڑیاں جوڑ کے اس نے یہی نظریہ قائم کیا تھا۔ اس کا دل اس نظریے کی تردید کر رہا تھا لیکن دماغ تائید۔ دل و دماغ کی اس

کشمکش سے تنگ آکر اسے آخر کار باہر نکلنا ہی پڑا تھا۔

بھلا کوئی اپنے بیٹے کو خود قید کر کے رکھ سکتا ہے؟ یہ بہت مشکل سوال تھا۔ وہ اس سوال کے جواب کے لیے ہی اس وقت اپنے گھر کا آرام چھوڑ کے یہاں بیٹھا تھا۔

وقت گزاری کے لیے وہ موبائل فون کے ساتھ لگا ہوا تھا۔

نو بجے اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا دورانِ خون تیز ہو گیا۔ اس کے مطلوبہ مکان کا گیٹ کھل رہا تھا۔ گیٹ پر اس نے ایک ہیولا دیکھا۔ وہ گیٹ کھولنے کے بعد گاڑی میں جا بیٹھا۔ گاڑی باہر نکال کے اس نے گیٹ بند کیا اور دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہو گیا۔ لگتا تھا کہ اس گھر میں اس شخص کے سوا اور کوئی نہیں رہتا جو اسے گیٹ بھی خود کھولنا پڑ رہا تھا۔

عثمان کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ گاڑی کے غائب ہوتے ہی وہ تیزی سے اپنی گاڑی سے اتر آیا۔ اپنے مطلوبہ مکان کے پاس پہنچ کر اس نے گیٹ کا معائنہ کیا۔ گیٹ کو باہر سے قفل لگا تھا، اس نے چھوٹے گیٹ کو دھکیلا۔ توقع کے مطابق وہ اندر سے بند تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کلی سنسان تھی۔ وہ اچک کر گیٹ کے اوپر چڑھا اور تیزی سے دوسری طرف اتر گیا۔ اندر ملگجا سا اندھیرا پھیلا تھا۔ اس نے اطراف کا معائنہ کیا۔ گیٹ سے ایک پختہ روش اندر کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے اطراف لان بنا تھا جو اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اندر کی طرف بڑھا۔ اس کے دل کی دھڑکن اس کی کنپٹیوں میں شور برپا کر رہی تھی۔

پختہ روش کے کنارے پر ایک پورچ بنا ہوا تھا۔ پورچ کے آگے سے چند سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے اختتام پر مکان کا داخلی دروازہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھ کر دروازہ دھکیلا۔ توقع کے برخلاف چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا تو اس کا دل جیسے اُچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ دھیرے سے اندر سرک گیا۔ اندر گھس کے اس نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرتے ہی تاریکی چھا گئی۔ اس تاریکی میں بس اسے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ اس کے مسام پسینا اگلنے لگے۔ وہ دروازے کے ساتھ پشت لگا کے گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی زندان میں قید ہو گیا ہو۔

'یہ زندان ہی تو ہے جس میں اسد دس سال سے قید ہے۔' اس نے سوچا۔

'ضروری تو نہیں اسد ادھر قید ہو۔' اس کے دل نے مخالف دلیل دی۔ 'کچھ بھی ہو بغیر تو میں حقیقت نہیں جان سکتا۔' یہ خیال آتے ہی اس نے سیل نکال کر اس کی ٹارچ روشن کی، یہ ایک راہداری تھی جس کے سرے پر وسیع و عریض لاؤنج بنا ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا لاؤنج میں آ گیا۔ وہ ٹارچ لائٹ سے لاؤنج کا معائنہ کرنے لگا۔ لاؤنج کی ہر چیز گرد آلود لگ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ادھر کوئی رہتا ہی نہیں۔

لاؤنج میں دو دروازے تھے۔ اس نے باری باری دونوں دروازے دھکیلے، مگر دروازے لاک تھے۔ ان کی درزوں سے کسی قسم کی روشنی بھی باہر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دروازے پر دستک دینے لگا۔ سناٹے میں یہ آواز کچھ زیادہ ہی بلند محسوس ہو رہی تھی۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔

''اسد'' اس نے پکارا مگر اس کی پکار کا کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ بلند آواز میں اسد کو پکارنے لگا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی آواز اسد تک پہنچ ہی نہیں رہی۔

'شاید میرا اندازہ غلط ہو۔ اسد یہاں قید نہ ہو۔' اس کے ذہن میں ایک بار پھر خیال سر سرایا۔

'کچھ بھی ہو، میں آج اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔' اس نے عزم سے سوچا۔

اچانک گیٹ پر آہٹ کی آواز سنائی دی۔ 'اوہ..... شاید وہ لوٹ آیا ہے۔' یہ خیال آتے ہی اس کے دل کی دھڑکن شور مچانے لگی۔ اس نے متوحش انداز میں ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ چھپنے کی کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا۔ اس کی نظر ایک صوفے پر پڑی۔ اس نے صوفے کو گھسیٹا اور اس کے پیچھے چھپ گیا۔ اس تنگ سی جگہ میں محبوس ہوتے ہی اس کا بدن پسینے سے بھیگنے لگا۔ چند لمحوں بعد اسے گاڑی کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنے کان اس پر مرکوز کر لیے، اسے گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ بے چینی سے اس شخص کا انتظار کرنے لگا جو اس کے خیال میں نوید ہی تھا۔ مکان کا داخلی دروازہ چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کھلا۔ سناٹے میں بلند ہونے والی یہ آواز اسے بہت خوفناک لگی۔ اس کا دل ... پھڑپھڑانے لگا۔

وہ آدمی دھیرے دھیرے چلتا ہوا اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ روشن تھی۔ عثمان صوفے کی اوٹ میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کے ہاتھ میں ایک شاپر نظر آیا۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر چابی سے دروازہ کھولا اور اندر گھس گیا۔

کچھ دیر انتظار کے بعد عثمان صوفے کی اوٹ سے نکلا اور دھیرے سے دروازے کو دھکیلا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ اندر تاریکی تھی۔ عثمان نے اپنے سیل کی ٹارچ روشن کی۔

اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ٹارچ روشن ہونے کے بعد وہ کمرے کا معائنہ کرنے لگا۔ یہ بیڈ روم لگ رہا تھا جس میں ایک بیڈ اور دو کرسیاں لگی تھیں۔ کمرے میں ایک ہی دروازہ تھا جو نیم وا تھا۔ عثمان نے قریب پہنچ کر اندر لائٹ جلائی۔ یہ واش روم تھا۔ اس نے حیرانی سے کمرے کا پھر معائنہ کیا۔ تفصیلی معائنے کے بعد وہ ہکا بکا نظر آنے لگا۔ کمرے کی سپاٹ دیواریں جیسے اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ اس شخص کو جانے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔

☆☆☆

'اس کمرے میں شاید کوئی خفیہ دروازہ ہے جس سے وہ شخص اندر گیا ہے۔' اس نے قیاس کیا۔

وہ کمرے میں گھوم گھوم کے دیواروں پر ہاتھ سے ضرب لگا کر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ اسے دیوار کھوکھلی محسوس ہوئی۔ اس نے دوبارہ چیک کیا۔ یہاں سے واقعی ضرب لگانے پر مختلف آواز برآمد ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سنسنی آمیز تاثرات نمودار ہوئے۔ اس نے اسد کا زندان دریافت کرلیا تھا مگر اسے کھولنے کے لیے اس کے پاس علی بابا کا منتر نہیں تھا۔

اس نے فلموں میں دیکھا تھا کہ ایسے دروازے کھولنے کے لیے کوئی کھٹکا ہوتا ہے جسے دبانے سے دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ ٹٹول ٹٹول کے کوئی کھٹکا تلاش کرنے لگا مگر پورا کمرا چھان مارنے کے بعد بھی اس کی تلاش رنگ نہ لائی۔

وہ مایوس ہو کے بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس نے موبائل پر وقت دیکھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ وہ اس شخص کو باہر نکالنے کی کوئی تدبیر سوچنے لگا مگر کوئی بھی تدبیر کارگر نظر نہیں آ رہی تھی۔ اب سوائے صبح کے انتظار کے اس کے پاس کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔ وہ بیڈ کے ساتھ کارپٹ پر لیٹ کے اسد اور اس کی کہانی کے متعلق سوچنے لگا۔

سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے خوفناک خواب ستاتے رہے۔ بار بار اس کی آنکھ کھل جاتی۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے تکلیف دہ رات تھی۔ اس کے کانوں میں اذان کی آواز آئی تو وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

'اب انتظار کی گھڑیاں تھوڑی رہ گئی ہیں۔' اس نے خود کو تسلی دی لیکن اس کا خیال باطل ثابت ہوا۔

وقت دھیرے دھیرے سکستا رہا۔ گھڑی نے دوپہر کے بارہ بجا دیے مگر ہنوز دیوار میں شگاف پیدا ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ پانی تو کئی بار وہ واش روم کے نلکے سے پی چکا تھا مگر بھوک کا اس کے پاس کوئی حل نہ تھا۔ بھوک کی شدت تیز ہوئی تو وہ اس سارے معاملے کو بھاڑ میں جھونکنے کا سوچ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اٹھا ہی تھا کہ اسے ایک آہٹ سنائی دی۔

☆☆☆

''میں لنچ کے لیے کچھ لینے جا رہا ہوں۔ تب تک تم شیو بنا لو، دیکھو کیا حال بنا رکھا ہے تم نے۔'' اس کے لہجے میں ہمدردی تھی۔ اسد اسے خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔

''شاباش..... میں واپس آؤں تو مجھے تمہارا تر و تازہ چہرہ ملے۔'' وہ اس کا کندھا تھپک کے چل پڑا۔ اس کے جاتے ہی وہ ہاتھوں کے پیالے میں منہ دے کر بیٹھ گیا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی بے چین لگ رہا تھا۔

اس نے اس قید کو خود قبول کیا تھا مگر جب سے اس کا عثمان سے ایک بار رابطہ ہوا تھا اسے یہ قید گراں گزرنے لگی تھی۔ وہ اداسی سے اپنے پاؤں میں پڑی بیڑیوں کو دیکھنے لگا۔ ان بیڑیوں سے اسے ہفتے میں ایک بار چند لمحوں کے لیے ہی رہائی نصیب ہوتی تھی، جب وہ لباس تبدیل کرتا تھا۔

شروع شروع میں نوید اسے باہر لان تک لے جاتا تھا لیکن چند سال بعد جب یہ علاقہ آباد ہونے لگا تو اس نے اسے باہر لے جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب تو جانے کتنے سال سے اس نے آسمان کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔

وقت گزارنے کے لیے اس کمرے میں ہر شے موجود تھی۔ ٹی وی، لیپ ٹاپ، ڈھیر ساری موویز اور کتابیں۔ وہ دونوں ٹی وی دیکھتے اور مختلف پروگرامز پر تبادلہ خیال کرتے رہتے۔ موویز اور کتابوں کے معاملے میں بھی ان کی پسند ملتی جلتی تھی۔ وہ ان سے بور ہوتے تو تاش، شطرنج اور دیگر گیمز کھیلنے لگ جاتے۔ یہ ویسی ہی زندگی تھی جیسی وہ بچپن سے گزارتا چلا آ رہا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ پہلے وہ باپ کی نظروں کے زندان میں قید رہتا تھا مگر اب بیڑیوں میں..... نوید چاہے اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن اس پر اعتبار ہرگز نہیں کرتا تھا، یا اسے اپنی قسمت پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ اس کے وعدے کے باوجود اس کی طرف سے کبھی غافل نہ ہوا تھا۔ شاید وہ بھی اس کی نفسیاتی کیفیات میں آنے والے اتار چڑھاؤ کا اندازہ رکھتا تھا۔

جب اسد نے پہلی بار دروازہ کھول کے اپنے اغوا کار کا چہرہ دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا تھا۔ سرخ انگارہ اندر کو دھنسی ہوئی متوحش آنکھیں، زرد اور کمزور چہرہ، بکھرے بال..... اس کے چہرے پر اتنی وحشت تھی کہ اسے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ نوید..... اس کا اپنا باپ ہے۔ یہ چہرہ اسے یکسر اجنبی لگا تھا۔

☆☆☆

نوید، اسد کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ اسے نہ

لوگوں کی پروا تھی نہ ان کی باتوں کی۔ اسے بس اسد کی ضرورت تھی اور اسد اس کے ساتھ تھا۔ مسئلہ تب ہوا جب اسد جوان ہونا شروع ہوا۔ اس عمر میں بچوں کی دلچسپیاں تبدیل ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ گھر سے باہر نئے تعلق بنانے لگتے ہیں۔ اپنے فیصلے خود کرنے لگتے ہیں۔ یہ سب فطری ہے لیکن نوید یہ نہیں جانتا تھا۔ اسد کا اس سے گریز اسے تڑپانے لگا۔

وہ تو چاہتا تھا کہ اسد بس اس کا ہو کے رہے، لیکن اسد نئے نئے لوگوں سے ملنا چاہتا تھا۔ باہر کی دنیا دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے اس رویے نے اسے خوفزدہ کر دیا۔ یہ اس کی سوچ تھی لیکن دوسری طرف وہ اسد کے رویے میں در آنے والی تبدیلیاں بھی نوٹ کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسد کسی بھی وقت دنیا کی باتوں میں آ کے اسے چھوڑ دے گا اور لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ دو بار اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ تیسری بار کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

اسے لگ رہا تھا کہ عثمان، تنویر اور دوسرے پڑوسی اسے اس کے باپ کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ وہ نہ انہیں منع کر سکتا تھا نہ اب اسد پر چوبیس گھنٹے کا پہرا لگا سکتا تھا۔ اس نے گھر شفٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کی تو عادت تھی یکدم فیصلوں کی، اس بار بھی اس نے فیصلہ کرتے ہی اس پر عملدرآمد شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے شہر کے مضافات میں ہی ویران علاقے میں گھر خرید لیا۔ اس گھر کے بارے میں معلومات اسے اس کے پڑوسی ہی نے دی تھیں جب وہ اسد کو وہاں سے لینے کے لیے گئے تھے۔ یہ گھر ہر لحاظ سے اس کے لیے موزوں تھا۔ یہاں نہ اسد کو کسی سے ملنے کا موقع ملتا نہ وہ نوید کے متعلق برا سوچتا۔

اس دن اس کا شفٹنگ کا پروگرام تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اسد شفٹنگ میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ اس لیے اس نے جوس کے چند پیکٹس میں بے ہوشی کی دوا ملا رکھی تھی۔ گھر شفٹ کرنے سے پہلے وہ گاڑی بھی تبدیل کرنا چاہ رہا تھا۔ اس دن وہ اپنی گاڑی بیچ کے نئی گاڑی خریدنے گیا ہوا تھا۔ اسد کو اس نے گھر میں رکنے کی ہی تلقین کی تھی۔ جب وہ گھر پہنچا، گھر اسد کے وجود سے خالی تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ اسے بلند آواز میں پکارنے لگا۔ اسد کو گھر میں ڈھونڈتے ہوئے اسے علم ہوا کہ اس کا بیگ، کپڑے اور چند دوسری چیزیں بھی غائب تھیں۔ اس بار لگ رہا تھا کہ اسد پوری منصوبہ بندی سے گھر چھوڑ کے گیا ہے۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

اسے ایسا لگا کہ اس نے ہمیشہ کے لیے اسد کو کھو دیا ہے۔ وہ گاڑی لے کر باہر نکل آیا۔ اس کے دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔

''یا خدا، ایک بار مجھے اس سے ملا دے، پھر میں کبھی اسے خود سے دور نہیں جانے دوں گا۔'' وہ روتے ہوئے خدا سے التجا کر رہا تھا۔ خدا نے اس کی سن لی۔ اس کی نظر روڈ کے کنارے چلتے، اسد پر پڑی۔ اس نے اسد کے قریب جا کے گاڑی روکی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ بہت الجھا اور بکھرا ہوا لگ رہا تھا۔ نوید کو اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ اس نے اسے جوس کا پیکٹ دیا۔ وہ جوس پیتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ نوید اسے نئے گھر لے آیا۔

راستے میں ہی اس کے ذہن میں نیا خیال پروان چڑھا۔ کچھ بھی تھا وہ اب اسد کو صرف محبت و توجہ کے زندان میں قید نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ موقع پاتے ہی پھر بھاگ جاتا۔ وہ اسے خود سے دور جانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ پتا نہیں، اس کی محبت نے اسے خودغرض بنا دیا تھا یا اس کے تحفظ کے خوف نے۔ کچھ بھی تھا وہ ایک بھیانک فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ فیصلہ ایک باپ نے نہیں کیا تھا۔ یہ ایک ٹوٹے بکھرے خوفزدہ شخص نے کیا تھا۔ اس نے اسد کو گھر کے تہ خانے میں بند کر دیا۔ وہ اسے قید رکھنے کے لیے بیڑی بھی ساتھ لے آیا تھا۔ اس کے پاؤں میں بیڑی ڈالتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ''بیٹا، مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہاری بہتری کے لیے، تمہارے تحفظ کے لیے ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔'' وہ روتے ہوئے خود کو تسلی دے رہا تھا۔

وہ اب اسد پر دنیا کا سایہ بھی نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ دنیا کی نظر میں اسد کو غائب کرا دے۔ اپنے گھر لوٹنے کے بعد اس نے اسد کی تلاش شروع کر دی۔ اس کی توقع کے مطابق کسی بھی محلے دار نے اسد کی تلاش میں اس کا ساتھ نہ دیا۔ وہ اپنے گھر آ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس نے اسد کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ اس گھر میں اس کا بچپن، اس کا لڑکپن بکھرا تھا۔ لاتعداد خوبصورت لمحے اور یادیں بکھری تھیں۔ اب وہ اس گھر میں کبھی اسد کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو اسد اس گھر میں اس کے ساتھ رہتا تھا وہ مر چکا تھا، آج سے اسد نے نیا جنم لیا تھا۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس کی وحشت بڑھنے لگی۔ وہ گھر سے نکل آیا۔ نئے گھر پہنچ کے اسے احساس ہوا کہ اسد کا سامنا کرنا اس کے لیے کتنا مشکل ہو گا۔ وہ ایک لمحہ بھی اسد کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا لیکن آج کتنے گھنٹوں سے وہ اسد کے بغیر رہ رہا تھا۔

جانے کتنے گھنٹے اس کو اسد سے ملنے کے لیے ہمت مجتمع کرنے میں لگے تھے۔ اسے خوف تھا کہ جب اسد کو علم ہو گا

کہ اس کے باپ نے اسے قید کر دیا ہے تو اس پر جانے کیا گزرے گی۔ اس کے بعد اس کے وجود کو تو شاید وہ ساتھ رکھ لیتا لیکن کیا وہ ویسے ہی اس کے ساتھ واپس رہ سکتا تھا جیسے پہلے رہتا رہا تھا؟ یہ اس کے لیے انتہائی مشکل سوال تھا۔

”کچھ بھی ہو مجھے ہر حال میں اسے اپنے ساتھ رہنے کے لیے تیار کرنا ہوگا۔ مجھے اسے باور کرانا ہوگا کہ یہ سب میں اس کی بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔ اسے یہ قید دل سے قبول کرنا ہی ہوگی۔“ وہ خود سے کہہ رہا تھا۔

آخر وہ ہمت مجتمع کر کے گھر کے اندر داخل ہوا۔ وہ بھاری قدموں سے تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کی نظر اسد پر پڑی۔ وہ سکتہ زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

اسد بے یقینی سے اپنے باپ کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہے۔

یکدم اس کا باپ متوحش انداز میں چلّایا۔

”تم مجھے چھوڑ کے بار بار چلے جاتے تھے نا... اب نہیں جا سکو گے۔ اب مرتے دم تک ہم نے ساتھ رہنا ہے۔“ وہ اسے پتھریلی نظروں سے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے چند لمحے اس کی بات کا مفہوم سمجھنے میں لگ گئے تھے۔ جب اس پر مفہوم آشکار ہوا تو اس کی آنکھوں میں بے یقینی لہرائی۔ وہ جنونیوں کے انداز میں چلّایا۔

”کیا...... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کا محبوب بیٹا۔ آپ تو مجھ سے بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔ میرے لیے آپ نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔“

”ہاں ...... تم میرے محبوب بیٹے ہو۔ تمہارے لیے میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ تمہاری محبت نے میرے قدموں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ میں نے تمہارے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہے۔ میں پندرہ سال تک ہر لمحہ تمہارے لیے جیا، اب تمہیں ہر لمحہ میرے لیے جینا ہوگا۔ جس دنیا کی محبت میں تم نے میری محبت کو ٹھکرایا تمہیں اس دنیا کو چھوڑنا ہوگا۔ تم میرے ۔۔ رف میرے...... اور صرف میرے لیے ہی جیو گے۔“ اس کے انداز میں اتنی وحشت تھی کہ اسد اندر تک کانپ گیا۔ اس کی آنکھیں جیسے خون اگل رہی تھیں۔ اسد خوفزدہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

اسے ڈرا ہوا دیکھ کر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اسد میرے بچے...... میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا۔ میں اپنی بدنصیبی سے ڈرتا ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی تمہیں مجھ سے چھین کے لے جائے گا لیکن اب...... اب کوئی تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتا حتیٰ کہ میری بدنصیبی بھی نہیں۔“ نرمی سے بولتے بولتے یک دم وہ پھر وحشیوں کی طرح چلّانے لگا تھا۔ اسد مجسمے کی طرح ساکت اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے احساسات جیسے برف کی طرح منجمد ہو کے رہ گئے تھے۔

”دیکھو تم ڈرو نہیں...... میں تمہارا باپ ہوں۔ یہ سب تمہاری بہتری کے لیے ہی کر رہا ہوں تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی...... یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ ایک بدنصیب باپ کا وعدہ۔“ وہ یکدم سسکیاں لے لے کے رونے لگا۔ اسد کا دل تڑپ اٹھا۔

”دیکھو تم مجھے چھوڑ کے نہ جانا...... میں بھی تو پندرہ سال تک صرف تمہارے لیے جیا ہوں۔ یہ عرصہ قرض ہے تم پر...... کیا تم ساری زندگی نہ سہی پندرہ سال ہی سہی، میرے لیے...... میرے ساتھ نہیں جی سکتے۔ کیا میری پندرہ سالہ محبت کا قرض تم لوٹا نہیں سکتے؟“ وہ سسکیوں کے درمیان بولتا جا رہا تھا۔ اپنے باپ کو اس حالت میں دیکھ کر اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ گواہ تھا اس کی محبت کا...... وہ مقروض تھا اس کی محبت کا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کا دامن بھگونے لگے۔

”میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔ مجھے یقین ہے تم میری مجبوری سمجھ جاؤ گے۔ آخر کیوں نہیں سمجھو گے، تم بھی تو مجھ سے، اپنے باپ سے بے تحاشا محبت کرتے ہو۔“ اب وہ آس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسد کا دل تڑپ اٹھا۔ اس کے نرم پڑتے تاثرات دیکھ کر نوید بولا۔

”تم ایسے میری مجبوری نہیں سمجھو گے۔ مجھے تم کو سب کچھ بتانا ہوگا۔ میں...... میں ماضی کے زندان میں قید ہوں...... میں خوف کے زندان میں قید ہوں۔ میں...... میں تمہاری محبت کے زندان میں قید ہوں۔ مجھے تم کو وہ حالات بتانے ہوں گے جن کے باعث میں تمہارے ساتھ ایسا کرنے پر مجبور ہوا۔“ وہ سسکیاں لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اسد کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس کے لبوں کو جیسے کسی نے سی دیا تھا۔ وہ ابھی تک اس دھچکے سے سنبھلا ہی نہیں تھا کہ اس کے باپ نے...... اس سے بے تحاشا محبت کرنے والے باپ نے اسے زندان میں قید کر دیا ہے۔ وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ اسے خاموش دیکھ کر تھکے تھکے انداز میں اس سے کچھ فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”تم جاننا چاہو گے کہ میں تمہارے ساتھ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہوا؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ اسد دھیرے دھیرے چلتا ہوا جا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

اسے پیچھے دیکھ کر نوید اسے اپنے ماضی کے قصے بتانے لگا۔ اس کے لہجے میں اتنا درد تھا، اتنا سوز تھا کہ اسد کا دل پگھلنے لگا۔ اپنے باپ کے دکھ اس کی آنکھیں بھی بھگونے لگے۔ اپنے باپ کی مجبوریاں، اس کا خوف...... اس کے پیچھے وجہ...... سب اسے سمجھ آنے لگا۔ نوید کہہ رہا تھا۔

''تم پھر بھی خوش قسمت ہو کہ تمہیں میرا ساتھ تو میسر ہے۔ میں نے ساری زندگی تنہا گزاری۔ مجھے جب اس دنیا میں کوئی سہارا نہ ملا تو میں نے خیالوں ہی خیالوں میں ایک پیکر تراش لیا۔ میں اسی کے ساتھ باتیں کرتا۔ اسی سے کھیلتا، اس سے اپنا دکھ سکھ بانٹتا، لیکن جب تم پیدا ہوئے تو مجھے اس خیالی پیکر کی ضرورت بھی نہ رہی۔ اس کی ضرورت تو تمہاری شکل میں پوری ہو چکی تھی۔ میرا دوست، میرا غمگسار میرے خیالوں سے نکل کے مجسم میرے سامنے آچکا تھا۔ اب مجھے اس کی کیا ضرورت تھی۔ پلیز...... تم بس میرے رہو۔ مجھ سے میرا واحد سہارا نہ چھینو۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے روتے ہوئے اس کی منت کرنے لگا۔ اسد نم آنکھوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی زبان جیسے گنگ ہو کے رہ گئی تھی۔

''دیکھو اسد، باہر کی دنیا میں تمہارے لیے کچھ نہیں رکھا۔ باہر کی دنیا بہت ظالم ہے۔ تم نے خود بھی سب کا رویہ دیکھا ہے۔ تم کبھی اس معاشرے کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں ہو سکتے۔ میں نے جو بھی کیا ہے خوب سوچ سمجھ کے تمہاری بہتری کے لیے کیا ہے۔ ادھر تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ میری ضرورت بس تم ہو اور تمہاری ہر ضرورت میں پوری کر دوں گا' یہ وعدہ ہے میرا تم سے۔'' اب وہ اسے دوسرے زاویے سے قائل کر رہا تھا۔

اسد کے پردۂ تصور پر وہ سارے مناظر ابھرنے لگے، جب جب اس کی اعتماد سے عاری شخصیت دیکھ کے لوگوں نے اس پر طنز کیے تھے۔ اسے یہ کمرا گوشۂ عافیت نظر آنے لگا جہاں وہ دنیا کے مظالم سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

اسد کا دل موم ہو چکا تھا، اس کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ اسی کیفیت کے زیر اثر بولا۔

''ہاں...... میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔ میں آپ کی محبت کا قرض لوٹاؤں گا۔ میرا وعدہ ہے آپ سے...... آپ پندرہ سال میری محبت کے قیدی بن کے رہے میں اگلے پندرہ سال آپ کی قید میں گزاروں گا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ نوید کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات نمودار ہوئے۔ اس کے ہونٹ نیم وا ہوئے، اچانک اس کی آنکھوں میں خوشی چمکی۔ آنسوؤں سے بھری ان آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھ کر اسد سوچنے لگا تھا کہ اس نے خود کو وعدے کی زنجیر میں جکڑ کر غلط نہیں کیا۔

''تم...... تم سچ کہہ رہے ہو نا...؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''ہاں...... میں وعدہ کر چکا ہوں آپ سے۔ میں یہ وعدہ نبھاؤں گا۔ میں کبھی خود کو اس بیڑی سے آزاد نہیں کروں گا۔ آپ چاہیں گے بھی تو نہیں......'' وہ اپنے پاؤں میں پڑی بیڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔ نوید بے یقینی سے اس کی طرف بڑھا۔ پاس پہنچ کر اس نے اسد کو اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ اسے چومتے ہوئے بولا۔

''مجھے معاف کرنا میرے بیٹے۔ میں مجبور ہوں۔ میں چاہوں بھی تو تمہیں اس بیڑی سے آزاد نہیں کر سکتا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

آج ان دونوں کو محبت اور مجبوری کے اس بندھن میں قید، دس سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے آج پھر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

معاً اس کے کانوں نے ایک آہٹ سنی۔ اس نے سر اٹھایا تو اپنی جگہ پر اچھل کر رہ گیا۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں مل کے دیکھا۔ سامنے کے منظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان دس سالوں میں آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ دروازے پر نوید کے بجائے کوئی اور کھڑا تھا۔

☆☆☆

نوید کو اپنی محبت کی طاقت پر پورا بھروسا تھا۔ اسی بھروسے کے ساتھ اس نے اسد کا سامنا کیا تھا۔ اس کے دلائل کا اسد بھی کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔ وہ قائل ہو گیا۔ اسے قائل ہونا ہی تھا۔ نوید کو خوشی کا احساس ہوا۔

اسد اس کے ساتھ ہوتا تو وہ ساری زندگی اس گھر میں رہ سکتا تھا۔ وہ صبح صبح ہی باقی دنیا سے تعلق توڑنے نکل کھڑا ہوا۔ وہ اسد کے غیاب میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے پولیس اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس کی توقع کے مطابق ایف آئی آر درج ہی نہیں کی گئی تھی۔ چند دن میں اس نے گھر بیچ دیا۔ اب اس محلے سے اس کے لوگوں سے اس کا ہر رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اس کی دانست میں اس کے اور...... بیٹے کے تعلق کو توڑنا چاہتے تھے۔ اس نے ان سے تعلق توڑ دیا تھا، لیکن دس سال بعد یہ تعلق پھر سے بول اٹھا تھا۔

☆☆☆

عثمان نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا۔ وہ اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔ لمبی زلفوں کے ساتھ ہاتھوں کے

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

پیالے میں چہرہ ٹکائے وہ اسد ہی تھا۔ اس کے پاؤں میں بیڑیاں دیکھ کر اسے بے پناہ تکلیف ہوئی۔ وہ اتنا کمزور، اتنا دبلا پتلا لگ رہا تھا کہ کچھ عرصہ قبل وہ اس کی تصویر نہ دیکھ چکا ہوتا، تو ہرگز اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔

آہٹ کی آواز سن کر اسد نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ بے یقینی سے اسے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے آنکھیں ملیں، اسے جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ دروازے میں اپنے باپ کے علاوہ بھی کسی کو دیکھ سکتا ہے۔

اس کا چہرہ انتہائی زرد نظر آرہا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، اندر کو دھنسے رخسار دیکھ کر اسے لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی اسد ہے جسے اس نے دس سال قبل دیکھا تھا۔ کچھ لمحات تک دونوں ایک دوسرے کو بے یقینی سے دیکھتے رہے، پھر عثمان بولا۔

''اسد..... یہ میں ہوں عثمان۔ تمہارا دوست۔'' اسد نے اسے حیرت سے دیکھا اور سوچا کیا پاپا کے علاوہ بھی کوئی مجھے اپنا دوست کہہ سکتا ہے؟

''اسد..... تم نے مجھے پہچانا؟'' اس کی خالی خالی نظریں دیکھ کر اس نے سوال کیا۔

''میرے پاپا کہاں ہیں؟'' وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے دھیرے سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرا رہے تھے۔

''میں تمہیں چھڑانے آیا ہوں۔'' وہ بھی اس کا سوال نظر انداز کر کے چابی لہراتے ہوئے بولا۔

''میں اس بیڑی میں تو قید نہیں۔'' وہ اپنے پاؤں میں لپٹی بیڑی کی طرف اشارہ کر کے عجیب سے انداز میں بولا۔ ''میں تو اپنے وعدے کی زنجیر میں قید ہوں، جو میں نے اپنے پاپا سے کر رکھا ہے۔ تم مجھے اس سے آزاد کرا سکتے ہو؟''

''ہاں..... میرے دوست تم ہر وعدے سے آزاد ہو چکے ہو۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ تڑپ کے ہذیانی انداز میں بولا۔

''کیا کیا ہے تم نے میرے پاپا کے ساتھ؟''

عثمان نے اس سے نظریں چرالیں۔ اس کے پردۂ تصور میں کچھ دیر قبل کے واقعات چلنے لگے۔

☆☆☆

آہٹ کی آواز سنتے ہی، وہ بیڈ کے نیچے جھک گیا تھا۔ اس نے بیڈ کے ساتھ رکھا ایک بھاری گلدان تھام لیا جو اسی مقصد کے لیے رات کو ہی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

نوید بیڈ کے پاس سے گزر رہا تھا کہ عثمان تیزی سے اٹھا اور دونوں ہاتھوں میں گلدان کو مضبوطی سے تھام کے گھمایا۔ نوید کو شاید اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے گھوما۔ بھاری گلدان اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ کنپٹی سے یکدم خون کی پھوار نکلی اور دیوار کو داغدار کر گئی۔ گلدان پر بنے پھول کی نوک شاید اس کی کنپٹی میں گھس گئی تھی۔ اس نے ہاتھ پھیلائے۔ عثمان گھبرا کے ایک قدم پیچھے ہٹا اور ہاتھ میں پکڑے گلدان سے ایک اور زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر لگائی۔ اس بار گلدان کا پیندا اس کی کنپٹی سے ٹکرایا۔ ضرب اتنی زوردار تھی کہ گلدان ٹوٹ گیا اور اس کی کرچیاں زمین پر بکھر گئیں۔ یہ وار وہ سہہ نہ سکا، اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامنے کی کوشش کی مگر اس کی کوشش بے سود رہی۔ وہ آگے پیچھے ڈولا اور اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے چت گرا۔ اس کا جسم ایک لمحے کے لیے اینٹھا اور اگلے ہی پل اس کا وجود ساکت ہو گیا۔ اس کے بازو اطراف میں پھیل گئے۔ اس کی کنپٹی سے رستا خون سرخ کارپٹ میں جذب ہونے لگا۔ عثمان ہاتھ میں گلدان کا ایک سرا پکڑے ہکا بکا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، جو کچھ ہوا تھا بالکل اچانک ہوا تھا، گو کہ اس سب کے لیے اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا مگر اب..... جب سب ہو گیا تھا تو اس کا دل جیسے اپنے قابو میں ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جیسے پسلیوں کے پنجرے کو توڑ کے باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اس نے بہ مشکل اپنے دھڑدھڑاتے دل کو سنبھالا اور اس کے پاس بیٹھ گیا۔

نوید بے نور آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔ بے یقینی اور حیرت کے تاثرات جیسے اس کی آنکھوں میں ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔

عثمان نے اس کی نبض تھام لی۔ اس کی نبض ڈوب رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ادھر ہی بیٹھا رہا۔ کچھ ہی دیر میں نبض کی حرکت یکسر ہی معدوم ہو گئی۔ عثمان ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے احساسات پر جیسے برف پڑ گئی تھی۔ کچھ دیر قبل اسے نوید سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی مگر اب جیسے اس کے سارے احساسات نوید کے ساتھ ہی مر گئے تھے۔

کچھ دیر بعد اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو اسے صورتحال کی سنگینی کا ادراک ہوا۔ اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا اور اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیب سے چابیوں کے علاوہ ایک چھوٹا سا ریموٹ برآمد ہوا۔ ریموٹ پر دو بٹن لگے تھے۔ اس نے سبز رنگ کا بٹن دبایا تو سامنے دیوار میں ایک شگاف نمودار ہوا۔ عثمان کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترا تو آگے ایک اور دروازہ تھا۔ اس نے ہاتھوں میں موجود چابیوں کے گچھے سے ایک چابی نکالی اور دروازہ کھولنے لگا۔ پہلی ہی چابی سے دروازہ کھل گیا تھا۔

☆☆☆

عثمان دھیرے دھیرے چلتا ہوا اسد کے پاس پہنچا۔

''میں تمہاری بیڑیاں کھولتا ہوں۔'' وہ کہتا ہوا اس کے پاؤں میں بیٹھ کر اس کی بیڑیاں کھولنے لگا۔ اسد گنگ بیٹھا اسے دیکھتا رہ گیا۔ بیڑیاں کھولتے ہوئے اس کی نظر اسد کی پتلی پتلی ٹانگوں پر پڑی۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ دس سال پہلے وہ بالکل صحتمند ہوتا تھا، مگر زندان میں قید ان دس سالوں نے اسے انتہائی لاغر کر دیا تھا۔

کلک کی آواز کے ساتھ بیڑی کا تالا کھلا۔ عثمان نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ وہ اسے عجیب سے انداز میں گھور رہا تھا۔ عثمان کو اس کی نظروں سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اس سے نظریں چرا کے بولا۔

''چلو۔'' اسد یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ عثمان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ یکدم عثمان نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اسے گلے سے لگاتے ہی جانے کیوں اس کا دل بھر آیا۔ وہ ہچکیاں لے لے کے رونے لگا۔ اسد اس کی ہچکیاں اپنے سینے پر محسوس کر رہا تھا مگر وہ ایسے ساکت کھڑا تھا جیسے روبوٹ ہو۔

کچھ دیر کے بعد عثمان اسے چھوڑ کے پیچھے ہٹا اور اسد کو دیکھنے لگا۔ اس کی خاموشی اسے ڈرانے لگی تھی۔ ''بہت برا ہوا تمہارے ساتھ...... ایسا دنیا میں کسی کے باپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا ہو گا جیسے تمہارے باپ نے تمہارے ساتھ کیا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اس کے لہجے میں نوید کے لیے تنفر تھا۔ اسد اب بھی خاموش رہا۔

عثمان اس کا ہاتھ تھام کے آگے بڑھا۔ اسد میکانکی انداز میں چلنے لگا۔ آج دس سال بعد ایسا ہو رہا تھا کہ اس کے چلنے سے بیڑی کی جھنکار نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اسے عجیب سا لگا۔ وہ اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا ہوا، خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ دروازہ کھول کے عثمان زینے چڑھنے لگا۔ وہ اپنے عقب میں چلتے اسد کو بار بار مڑ کے دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے عثمان کو لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے حواس میں نہیں۔ اس کی عجیب و غریب کیفیت عثمان کو ڈرا رہی تھی۔ اس لیے وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اسد کی حالت آہستہ آہستہ سنبھل جائے گی، اور پھر جب وہ اس کو میڈیا پر لائے گا تو ہر طرف دھوم مچ جائے گی۔ یہ تاریخ کا ایک انوکھا کیس ہو گا جس میں ایک باپ، اپنے محبوب بیٹے کو اتنے عرصے تک زندان میں قید رکھتا ہے۔ وہ خیالوں میں گم سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

اوپر والا خفیہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر نوید کی لاش پر پڑی۔ وہ [illegible] نظروں سے چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی کنپٹی [illegible] خون جمنے لگا تھا۔

یکدم اسے احساس ہوا کہ اسے نوید کی لاش وہاں سے ہٹا دینی چاہیے تھی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اسد اس کے برابر کھڑا ساکت اپنے باپ کی لاش کو گھور رہا تھا۔

''یہ...... یہ......'' عثمان کو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیسے اس سب کی وضاحت کرے۔ اسد نے مڑ کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اتنی وحشت تھی کہ عثمان کا دل اندر تک لرز گیا۔

''تم...... تم نے میرے باپ کو مار دیا۔'' وہ غراتی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ اس کا وحشت بھرا انداز دیکھ کر عثمان کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر اترتی محسوس ہوئی۔ وہ اپنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے پیچھے کی طرف ہٹا۔ اسد نے یکدم اس کا گلا پکڑ لیا اور دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

عثمان نے اپنے بچاؤ کے لیے اسے زور دار دھکا دیا۔ وہ اڑتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ دیوار سے ٹکرا کے وہ آہستگی سے کھسکتا ہوا فرش پر گرا۔ اس کا کمزور وجود اس کا دھکا سہہ نہیں سکا تھا۔ اس کی گردن عجیب سے زاویے پر مڑی ہوئی تھی۔ عثمان ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے پاس پہنچا، اس نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ عثمان کے جسم سے جیسے یکدم ساری طاقت زائل ہو گئی۔ اسد کا بازو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کا مُردہ وجود فرش پر گرا۔ اس کا ہاتھ نوید کے ہاتھ پر پڑا۔

اگر اس وقت نوید زندہ ہوتا تو شاید خوشی سے مر جاتا۔ جس بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اس نے زنجیروں میں قید کر رکھا تھا، اس کے جانے کے بعد...... اسے زندگی بھی اپنے زندان میں قید نہیں رکھ سکی تھی۔ وہ زندگی کی قید سے جان چھڑا کے اس کے پاس پہنچ چکا تھا۔ نوید کے مُردہ ہاتھ میں اسد کا ہاتھ ایسے رکھا تھا جیسے وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے کا عہد کر رہا ہو۔ عثمان اسے قید سے رہائی دلانے آیا تھا لیکن اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

عثمان ایک ساتھ پڑی دونوں لاشوں کو سکتہ زدہ دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر قبل دونوں ایک ساتھ تھے، ان کے وجود زندگی کی حرارت سے معمور تھے مگر اب...... اب وہ ساتھ تو تھے مگر ان کے وجود زندگی کی حرارت سے محروم ہو چکے تھے۔ اس عجب کہانی کے عجب کردار اپنے اپنے زندان سے آزاد ہو چکے تھے۔

⌘⌘⌘